جلد ۳۷ نمبر ۱

اپریل ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن بیورو انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

عنوانات

افسانہ

آزادی کا قیدی

ڈاکٹر صبیحہ انور

فورتھ پیریڈ شروع ہوا۔ گھنٹی بجنے کے تھوڑی دیر بعد تک فضا میں ایک جھنجھناہٹ گونجتی رہی۔ برآمدوں میں گھسٹتی چپلیں، دبی دبی ہنسی اور جلدی جلدی کرسیوں کے کھینچے جانے کی آوازیں چاروں طرف سے ایک ساتھ آئیں اور ایک ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔ کلاس شروع ہو گیا اور چاروں طرف ایک مصروف سنّاٹا چھا گیا۔ آفس کے سامنے والا گل مہر کا پیڑ پھولوں سے اس طرح لد گیا تھا کہ دُور سے شبہ ہوتا آگ لگی ہے۔ مالی حوض میں پائپ لگا کر شاید بھول گیا تھا۔ پانی حوض کے چاروں طرف گر رہا تھا۔

اُدِشا کا دل چاہا کہ اٹھ کر مالی کو آواز دے کر نل بند کرنے کے لیے کہے۔ وہ ضرور یہیں کہیں آس پاس اپنی نئی دُلہن سے عشق کر رہے ہوں گے، مگر پھر کچھ سوچ کر آنکھوں سے چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور خود کرسی سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے اگر آنکھیں نہ بند کر لیتی تو ڈر تھا کہ آنکھوں کے بند سوتے پھر اس سے روکے نہ رکیں گے۔ اتنی کمزوری تو اس نے کبھی بھی محسوس نہ کی تھی ۔ آج تو وہ بالکل بے بس تھی ___ کمزور باندھ پر پشتے باندھتے باندھتے پورا جسم شل ہو چکا تھا۔ کیا کروں — ؟ بے بسی کے عالم میں اس نے سوچا اور دونوں پیروں کو چپل سے نکال کر اس طرح کھینچا کہ پورے جسم کی رگیں کھنچ گئیں۔ ہاتھ کی انگلیوں کو چٹخایا۔ اور اکتا کر اپنا سر میز پر رکھ دیا۔

کالج ختم ہونے میں ابھی پورے تین گھنٹے باقی تھے جیسے تین صدیاں۔ کہیں تین صدیوں کے بعد اس ٹائپ رائٹر کی مستقل ٹپ ٹپ سے نجات ملے گی ___ سامنے ہاسٹل کے اندراجات کا رجسٹر کھلا پڑا تھا، جسے کلرک ابھی اس کے سامنے چیک کرنے کے لیے رکھ گیا تھا ___ ایک بیباک حقیقت کنڈلی مارے ناگ کی طرح رجسٹر کے ان صفحات کی لکیروں میں سمٹی اسے ڈسنے کی منتظر تھی ___ صبح سے اس کا موڈ بے حد خراب تھا ___ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اپنے کو خیالات کی رو سے آزاد نہ کرا سکی تھی ___ اُدشا نے ہمّت کر کے رجسٹر کو اپنی جانب گھسیٹا، اور چشمے کو ناک پر جماتی ہوئی پڑھنے لگی۔

"رشمی مہتہ" نام کے خانے میں میٹرن کی مخصوص رائٹنگ میں لکھا تھا۔ باپ کا نام۔ اجے کمار مہتہ۔ ایگزیکیٹو انجینیر۔ الٰہ آباد۔ اس نے ایک بار پھر زیرِ لب پورا پتہ دُہرایا۔ اجے کا نام زبان پر لاتے ہوئے اسے بڑا عجیب لگا۔ اجے آج خیال کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں میں قید اس کے سامنے ہے۔ ایک ایسا نام، جس میں ایک ساتھ اتنی تصویریں دل اٹھیں کہ ان کا سامنا کرنے کی تاب اُدشا کے اندر نہیں تھی۔ اجے سے الگ ہو کر اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بیس سال سے بھی زیادہ گزر چکے تھے۔ بیس سال میں بیس ساون آئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پھواریں پڑیں۔ برہا کی چنگاری چمکی اور جیٹھ بیساکھ کی تپتی دوپہریں بتا گئیں کہ ہجر کی تڑپ اور گھٹن کیسا کیسا جلاتی ہے۔

گزرے ہوئے برہا کے دنوں میں انٹر کالج میں پڑھنے والی اُدشا جو ان دنوں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ تیز تیز سائیکل چلاتی تھی دو چوٹیاں گوندھتی تھی ___ اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد لندن سے اکنامکس میں ایک خصوصی ڈگری لے آئی تھی ___ دھیرے دھیرے اس کی یہ ڈگریاں اور اس کے گزرتے ہوئے ماہ و سال اس کے بیچ میں ایک ایک

اپنی بات

ابھی جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری کے انتقال کا زخم تازہ ہی تھا کہ اردو زبان و ادب کو ایک اور زبردست صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ صدمہ احسان دانش کے انتقال کا تھا، جو ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء کو لاہور میں ہوا۔ احسان دانش بھی جوشؔ اور فراقؔ کی طرح بنیادی طور پر اتر پردیش کے ہی تھے۔ وہ مغربی اتر پردیش کے قصبہ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) کے باشندے تھے اور تقسیم ملک سے پہلے ہی تلاش معاش میں لاہور چلے گئے اور وہیں بس گئے تھے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک مزدور کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر کے دوران مزدوری کر کے کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے باغبانی اور چوکیداری بھی کی تھی۔ شمامیں مالی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر نہ صرف دسترس بلکہ ادبی مہارت بھی حاصل کر لی۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ "آتش خاموش" ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد اور مجموعے بھی شائع ہوئے، جن میں دارین، مقتل سلاسل، نوائے کارگر، شیرازہ اور گورستان خاص طور سے مشہور ہوئے۔ ان کی آخری تصنیف "جہان دانش" ہے جو ان کی خود نوشت سوانح ہے، اس کے علاوہ ان کے اور بھی کئی مجموعے ہیں جن میں حدیث ادب، درد زندگی، تفسیر فطرت، چراغاں، جادۂ نو، زخم و مرہم اور مقامات نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ان کی بعض نظمیں بھی بے حد مقبول و مشہور ہوئیں مثلاً مزدور کی بیٹی، بیتے ہوئے دن، اور غریب بچے کی عید، خاص طور سے ان کی نظم بیتے ہوئے دن ایک ایسی نظم ہے جو جذباتی سطح پر بھی بہت اپیل کرتی ہے۔ احسان دانش مشاعروں میں بھی بے حد مقبول تھے اور مشاعروں میں پڑھے جاتے تھے۔ انھوں نے کبھی کوئی نظریاتی فلسفہ طرازی نہیں کی۔ کیونکہ وہ عملی طور پر مزدوروں کے شاعر تھے۔ انھوں نے بہت ہی سخت اور پریشان کن حالات میں زندگی گزاری لیکن صبر و استقلال کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹا نہیں۔ وہ عروض کے بھی ماہر تھے اور اردو لغت کی تحقیق کے سلسلے میں بھی انھوں نے بہت ہی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی شاعری میں مزدوروں کی زندگی، ان کے مسائل اور ان کے کرب کی بڑی ہی موثر اور درد انگیز تصویر کشی ملتی ہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۹۰ برس تھی۔ گذشتہ سال ان پر فالج کا بڑا ہی سخت حملہ ہوا تھا اور وہ اس کے بعد ہی سے صاحب فراش تھے۔ ادارہ نیا دور، شاعر مزدور کے انتقال کو اردو زبان و ادب کا نقصان عظیم تصور کرتا ہے اور انھیں اپنا پرخلوص خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

● ہندی کے ممتاز مزاحیہ شاعر پنڈت چند ربھوشن ترویدی جو ادبی دنیا میں رمئی کاکا کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے، ۱۸ اپریل کو چل بسے۔ ان کا انتقال مختصر سی علالت کے بعد بلرام پور اسپتال (لکھنؤ) میں ہوا۔ ان کی عمر ۷۶ برس کی تھی۔ رمئی کاکا اودھی زبان کے بہترین طنز و مزاح کے شاعر تھے۔ ان کے یہاں فیشن پرستی، مغرب زدگی، نمائش پسندی اور سماج میں پائی جانے والی مخالفت طرح کی بے اعتدالیوں پر بھرپور طنز ملتا ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ عوام میں بے حد مقبول تھے۔ مشاعروں اور کوی سمیلن میں بھی وہ بے حد ہردلعزیز تھے۔ ۳۵ سال تک وہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔

لکھنؤ ریڈیو کے پنچایت گھر پروگرام میں وہ بہرے بابا کا کردار بھی ادا کرتے تھے۔ یہ نیم مزاحیہ کردار بہت ہی دلچسپ ہوتا تھا۔ اس کردار کے ذریعہ بھی انھیں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس پروگرام کے لیے وہ فیچر بھی خود ہی لکھتے تھے۔ ہندی کی طنزیہ و ظریفانہ شاعری کے اس ہردلعزیز نمایندے کے انتقال پر ادارۂ نیا دور سوگوار ہے اور انھیں پرخلوص نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔

● پریس سے متعلق بعض دشواریوں کے سبب نیا دور کے شمارے گذشتہ تین ماہ سے کچھ تاخیر سے شائع ہو رہے ہیں جس کے لیے ادارہ اپنے قارئین اور معاونین سے انتہائی معذرت خواہ ہے۔ ہم پوری طرح کوشاں ہیں کہ آئندہ ماہ سے نیا دور کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو اور پرچہ وقت پر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جایا کرے تاخیر کے سبب ہمارے قارئین اور معاونین کو جو زحمت ہوئی ہے اس کے لیے بھی ادارہ انتہائی معذرت خواہ ہے۔

● جنوری۔ فروری ۸۲ء کے شمارے میں نیا دور کا فراقؔ نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ خصوصی نمبر فراقؔ صاحب کے شایان شان ہو۔ اس کے لیے ملک کے ممتاز اور مقتدر ادیبوں کے ساتھ ساتھ فراقؔ صاحب کے قریبی حلقوں اور ان سے متعلق افراد کا قلمی تعاون مطلوب ہے۔ اس تعاون کے ذریعہ ہی فراقؔ صاحب کی حیات و شاعری، ان کے نظریۂ فن، ادبی محاسن اور تنقیدی افکار کا احاطہ ممکن ہو سکے گا۔

—— ایڈیٹر

غزل

میکش اکبرآبادی
تکیہ میوہ۔ آگرہ

یہ رنگ و نور بھلا کب کسی کے ہاتھ آئے
کدھر چلے ہیں اندھیرے یہ ہاتھ پھیلائے

خدا کرے کوئی لے کر چراغ آ جائے
دھڑک رہے ہیں مرے دل میں شام کے سائے

بجھا نہ شام کو بھی وہ چراغِ لالہ رُخاں
جو شامِ حسن میں نظروں سے ہم جلا آئے

کہاں وہ اور کہاں میری پُرخطر راہیں
مگر وہ پھر بھی میرے ساتھ دور تک آئے

چلے چلو کہ بتا دے گی راہ خود رستے
کہاں ہے وقت کہ کوئی کسی کو سمجھائے

حرم کی آبرو ہم نے بہت رکھی پھر بھی
کئی چراغ صنم خانے میں جلا آئے

میں اپنے دل کو تو تسکین دے بھی لوں میکش
وہ مضطرب ہیں بہت کون ان کو سمجھائے

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : نشانِ منزل

مصنف : پروفیسر جگن ناتھ آزاد قیمت : چالیس روپے
ناشر : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹۔ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

پیشِ نظر کتاب پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے چودہ مضامین اور نو نشریات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے دو تین تو بہت مختصر ہیں (مثلاً ایک خط کا جواب جوش ملیح آبادی کی دو نظمیں، رام لعل کا فن، خورشید احمد جامی) اور انھیں مضمونچے کہا جا سکتا ہے۔ بقیہ مضامین کی فہرست یہ ہے : حسرت موہانی اور اقبال۔ ہندستان کے تہذیبی عناصر اور اُردو۔ جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ۔ ترقی پسند شاعری۔ فرحت کی رامائن۔ امر سنگھ منصور۔ جدید اُردو شاعری۔ ہندستان میں اُردو کا مسئلہ آزادی کے بعد۔ عالمی معیار اور اُردو۔ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟ ——— نشریات میں درج ذیل عنوانات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے : ———

ادب اور ادبی تخلیق۔ انشا پردازی۔ فکر اور جذبہ۔ اُردو زبان اور اس کا صحیح استعمال۔ اُردو شاعری میں جدید رُجحانات۔ محروم کا فی البدیہہ کلام۔ غالب اور اقبال۔ اقبال عالمی کانگریس۔ کچھ یادیں دُوسرے ملکوں کی۔

پروفیسر جگن ناتھ بحیثیت شاعر اور بحیثیت ماہر اقبالیات تو ادبی دُنیا میں عرصے سے معروف ہیں۔ لیکن پیشِ نظر مجموعہ مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ وہ ایک متوازن تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں اور ان کی رائیں بغیر کسی مصلحت کے صحیح ادبی پس منظر پیش کرنے کے بعد قائم ہوتی ہیں۔ مثلاً اپنے مضمون "ترقی پسند شاعری" اور "جدید اُردو شاعری" پر جن سنجیدہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور متوازن رائیں دی ہیں وہ قابلِ قدر بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ "فرحت کی رامائن" کی جو ادبی خوبیاں انھوں نے بیان کی ہیں اس سے ان کے گہرے مطالعے کے علاوہ یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ایسی اچھی مثنوی ہمارے ادب میں موجود تھی اور اس کی طرف ہمارے نقادانِ فن نے خواہ مخواہ توجہ نہیں دی تھی۔ اسی طرح "جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ" بھی نہرو کی خدمات ادب کا ایک اچھا جائزہ ہے جس کو پیش کر کے پروفیسر آزاد صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ اُردو داں عوام کو موقع دیا ہے کہ وہ نہرو کی عظیم شخصیت کے ادبی پہلو سے بھی متعارف ہو سکیں۔ اپنے مضمون "عالمی معیار اور اُردو" میں اگرچہ پروفیسر آزاد نے حکیم الدین صاحب کے ان اعتراضات کا مدلل جواب دے دیا ہے جو انھوں نے کلامِ اقبال پر کیے تھے لیکن اُردو میں کئی ایسی اور قدآور شخصیتیں ہیں جو عالمی ادب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ ان کے نام تو پروفیسر صاحب نے لیے ہیں مگر ان پر ذرا اور تفصیل سے لکھنا چاہیے تھا۔ مضمون "اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟" نہایت اچھا اور قابلِ قدر مضمون ہے اور آزاد صاحب نے بہت مدلل طریقے پر ثابت کر دیا ہے کہ اقبال صرف مسلمانوں کے نہیں، انسانیت کے شاعر تھے۔

اس مجموعہ مضامین میں ریڈیو سے نشر کیے گئے مضامین اگرچہ مختصر ہیں لیکن بہت کار آمد اور قابلِ مطالعہ ہیں اور ہر ادب کے طالب علم کی معلومات میں ان سے کچھ نہ کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی نشانِ منزل ایک قابلِ قدر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس سے تنقیدی بصیرت مستفید ہو سکتی ہے۔ **

نام کتاب :۔ آنکھیں ترستیاں ہیں

مصنف : پروفیسر جگن ناتھ آزاد قیمت :۔ چھتیس روپے
ناشر : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

اس کتاب میں پروفیسر آزاد نے اپنے ان بائیس دوستوں، اُستادوں اور بزرگوں کے سوانحی خاکے پیش کیے ہیں جو اب اس دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کی فہرست یہ ہے :۔ تاجور نجیب آبادی۔ صلاح الدین احمد۔ ابوالکلام آزاد۔ عبد المجید سالک۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ مولوی عبد الحق۔ شیخ سر عبد القادر۔ سروجنی نائیڈو۔ عبد القادر سروری۔ مہندر ناتھ۔ سلیمان ادیب عرش ملسیانی۔ محمد دین تاثیر۔ درگا پرشاد دھر۔ بنّے بھائی۔ کرشن چندر،

انتخابِ غالب پر ایک نظر

کاظم علی خاں
۳۱ وکٹوریہ اسٹریٹ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

انتخاب غالب کے عنوان سے کئی کتابیں چھپی ہیں[۱] لیکن پیش نظر مضمون میں انتخاب غالب : مرتبہ محمد عبد الرزاق چشتیہ پریس چھتہ بازار حیدر آباد دکن طبع ۱۳۴۵ھ کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب اب خاصی کم یاب ہے۔ انتخاب غالب طبع ۱۳۴۵ھ رضا لائبریری رام پور میں میری نظر سے گزری۔ انتخاب غالب کا ایک ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں دین محمدی پریس لاہور سے بھی نکلا تھا۔ انتخاب غالب کے متعلق پاکستانی ادیب جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کا ارشاد ہے : "یہ کتاب محمد عبد الرزاق نے مرتب کر کے دین محمدی پریس لاہور سے ۱۳۴۵ھ میں شائع کرائی تھی"[۲] خلیل الرحمٰن داؤدی کا یہ بیان محلِ نظر ہے۔ انتخاب غالب ۱۳۴۵ھ میں دین محمدی پریس لاہور کے بجائے چشتیہ پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی تھی اور دین محمدی پریس لاہور سے یہ کتاب ۱۳۴۵ھ [۱۹۲۰ء] کے بجائے ۱۹۴۳ء [مطابق ۱۳۶۲ھ تا ۱۳۶۳ھ] میں شائع ہوئی تھی۔ انتخاب غالب کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل رسالہ تحفہ حیدر آباد دکن بابت اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء میں قسط وار شائع ہوئی تھی[۳] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتخابِ غالب کتابی صورت میں شاید دسمبر ۱۹۲۶ء کے بعد ۱۹۲۷ء کے نصف اول میں شائع ہوئی ہوگی۔ ہجری کیلنڈر کی رو سے کتاب کا سالِ اشاعت ۱۳۴۵ھ ہے۔ تقویم ۱۳۴۵ھ کو ۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء سے ۳۰ جون ۱۹۲۷ء تک کی درمیانی مدت کے مطابق بتاتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ کتاب نصف آخر ۱۳۴۵ھ [مطابق نصف اول ۱۹۲۷ء] میں شائع ہوئی ہوگی۔

انتخاب غالب طبع ۱۳۴۵ھ کی ضخامت جناب مالک رام نے ۲۸ صفحات درج فرمائی ہے[۴]۔ یہ اندراج نظر ثانی کا محتاج ہے۔ انتخاب غالب طبع ۱۳۴۵ھ [مملوکہ رضا لائبریری رام پور] مجھے ۵+۱۹=۲۴ صفحات پر مشتمل ملتی ہے۔ کتاب کے ابتدائی پانچ صفحات سرنامے، اشتہار اور دیباچہ مرتب پر مشتمل ہیں۔ ان ابتدائی پانچ صفحوں کے بعد صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۹ کے ماتحت صفحات کا جو نیا سلسلہ ملتا ہے اس میں غالب کے بعض منثور و منظوم اردو ادبی آثار ہیں۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں غالب کی بعض منثور اردو تحریریں ہیں اور دوسرے حصے میں غالب کے چند منتخب اردو اشعار ملتے ہیں۔ کتاب کے شروع اور آخر میں غالب کا تحریر کردہ دیباچہ و خاتمہ بھی شامل ہے۔

انتخاب غالب طبع ۱۳۴۵ھ میں دیباچہ مرتب کے بعد اردو نثر میں غالب کی ایک تحریر ہے۔ قاضی عبد الودود نے غالب کی اس تحریر کو تمہید بتایا ہے[۵] لیکن انتخاب غالب کے خاتمے (ص ۱۹) میں خود غالب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر دراصل کتاب کا دیباچہ ہے۔ انتخاب غالب کے اس دیباچے کو مولانا غلام رسول مہر نے "دیباچہ رقعاتِ غالب" کے عنوان[۶] سے شائع کیا ہے حالاں کہ اس کا عنوان "دیباچہ انتخاب غالب" ہونا زیادہ اچھا تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی کتاب مجموعہ نثر غالب اردو (ص ص ۳۶۵ تا ۳۶۶) میں دیباچہ انتخاب غالب کے متن میں طباعت کی غلطی سے ایک ایسی عبارت ["کیا ہوا اگر ایک نقش ... تا روزِ شمار رہے گا۔ فقط"] شامل ہو گئی ہے جو دیباچہ انتخاب غالب سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ فاضل عبارت دراصل غالب کی تحریر کردہ تقریظ گلزارِ سرور کا جز ہے۔ تقریظ گلزار

جاں نثار اختر، رتیش کمار شاد، حسرت موہانی، پریم ناتھ در اور ان کے والد تلوک چند محروم سے ظاہر ہے کہ یہ سب مقتدر ہستیاں تھیں جنھوں نے اپنے ادبی اور ثقافتی کارناموں سے ادب اور کلچر کو بہت کچھ دیا ہے۔ آج ان کی نجی زندگی کی معمولی جھلکیاں یا ان سے متعلق تھوڑی سی معلومات بھی مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔

ایسے سوانحی خاکوں میں تناسب رنگ آمیزی اور دلچسپی دراصل خاکہ نگار کی شخصیت اور اس کی فن کارانہ تحریر کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ پروفیسر آزاد نے جس خلوص، انکساری اور ادب سے اپنے بزرگوں اور استادوں کو اور جس محبت سے اپنے دوستوں کو یاد کیا ہے اس نے ان کے قلم میں روانی اور شگفتہ بیانی اور اسٹائل میں انفرادیت پیدا کردی ہے۔ اسی لیے بلاشبہ ان یادوں کو سوانحی خاکہ نگاری میں ایک قابل قدر اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ خصوصاً ارضِ پاک خطۂ پنجاب کے ان سربرآوردہ ادیبوں کے سوانحی خاکے جن کے متعلق ہماری معلومات کافی نہیں ہیں یا 'سدِ پاکی' قائم ہوجانے کے باعث ہم جن سرحد پار کے زعمائے ادبِ اُردو کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہیں کرپاتے۔

—— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: **بُوند بُوند اُجالے** (شعری مجموعہ)

شاعر: تسنیم فاروقی

ملنے کا پتہ: سی ۱۸۴- تلسی داس مارگ، نزد ہاسپٹل، لکھنؤ ۳

تسنیم صاحب کے کلام میں دلوں کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے حالاتِ حاضرہ کی تصویر کشی بھی ہے اور حقیقت نگاری بھی۔

"بوند بوند اُجالے" میں اگر ایک جانب سوز و گداز ہے تو دوسری جانب طنز و مزاح کا رنگ بھی جھلکتا ہے مگر ایسا طنز و مزاح جو کسی کو گراں نہ گزرے۔ وہ بڑے فن کارانہ انداز میں جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے قطعات اور رُباعیوں میں نفسیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

ذیل میں ان کی چند رُباعیات اور قطعات پیش کر رہی ہوں انھیں پڑھیے اور ان کے ندرتِ تخیل کی داد دیجیے۔

بجھ گئی دل سی رہنما قندیل
تیرے غم نے دلِ غم چھین لیا
زندگی کی سیاہ وادی میں
تو نے مجھ سے چراغ چھین لیا

دل پہ ہوتا ہے گردِ غم کا اثر
لگتی ہے آئینے کو دھول کی چوٹ
جس کا احساس کچھ مہذب ہو
اس کو کافی ہے ایک پھول کی چوٹ

جو آپ دے سکیں وہ زمانے کو دیجیے
دنیا جو دے سکے وہی دُنیا سے لیجیے
سب دوست سب عزیز ہیں سب جاں نثار ہیں
لیکن کبھی کسی سے توقع نہ کیجیے

آرزو کی اُداس وادی میں!
غم کے سارے اُصول چبھتے ہیں
صرف کانٹوں کو کیوں کرو رُسوا
دل دُکھا ہو تو پھول چبھتے ہیں

اے گُل انعام بجا ہے کہ میں سلطان نہیں
دے نہیں سکتا میں افلاس کی آہوں کا بدل
کیا کروں میں کہ میں تعمیر نہیں کر سکتا!
خاک اور خون پہ ہنستا ہوا اک تاج محل

* —— صبا مصطفیٰ
انا نگر، مدراس

سرقہ پر راقم الحروف نے ایک مضمون ۱۹۵۶ء میں مفصل گفتگو کی ہے۔

۴- دیباچۂ انتخاب غالب کا متن سطور ذیل میں منقول ہے:

"یہ کتاب جو دو باب کی ہے حقیقت یہ اس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو دیباچے اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اسی خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اردو زبان میں لکھا جائے ان اشعار میں سے شعر محل و مقام کے مناسب سے [کذا کی مناسبت سے] درج کیا جائے۔ اور یہ مجموعہ نذر اس جناب رفعت مآب کی ہے جس سے عزت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کی [ہے]۔ صاحب والا مناقب عالی شان، علم اور اہل علم کے قدر دان، یگانۂ روزگار جن کا مطیع و محکوم ہونا اہل ہند کو سرمایۂ عزت و افتخار، والا پایہ عالی رتبہ معلی القاب حضرت فلک رفعت میکلوڈ صاحب بہادر فنانشل کمشنر بہادر قلمرو پنجاب۔ پس یہ کتاب اگر ان کے حکم سے چھاپی جائے گی تو صاحبان تازہ وارد ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی۔ اس کتاب کا نذر کرنے والا جو اپنی نذر قبول ہونے کا طالب ہے 'نصراللہ بیگ خاں بہادر رئیس سونسا کا بھتیجا موسوم بہ اسداللہ خاں و متخلص بہ غالب ہے۔ میرے چچا کی سرداری اور ریاست کا حال گورنمنٹ اعلا کے دفتر میں مرقوم ہے اور میرے قصیدے کا جناب مستطاب لارڈ والن برا بہادر کے ذریعے سے وزیر اعظم کے پاس پہنچنا اور حضرت قدر قدرت شہنشاہ بحر و بر ملکہ معظمہ و محتشمہ کے حضور پرنور میں گزرنا از روئے مشاہدۂ خطوط آمدہ ولایت جو بہ سبیل ڈاک مجھ کو ولایت سے آئے ہیں، گورنمنٹ بہادر ہندستان کو معلوم ہے۔ البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ کوئینس پوئٹ [POET QUEEN'S] کہا جاؤں اور اس علاقے سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں۔ اگر زیادہ نہ بڑھایا جائے، قدیم عزت میں تو فرق نہ آنے پائے۔

اے جہاں آفریں خدائے کریم
صانع ہفت چرخ و ہفت اقلیم
نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور
یہ ہمیشہ بہ صد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادمان رہے
اور غالب پہ مہربان رہے"

انتخاب غالب کا یہ دیباچہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔

یہ دیباچہ غالب کے مطبوعہ اردو دیباچوں کی محدود تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ دیباچۂ انتخاب غالب کو ملا کر غالب کے اردو دیباچوں کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔

دیباچے میں غالب کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ انتخاب غالب کے دوسرے حصے میں غالب کے ایسے اردو اشعار ہیں جو اردو مکتوب نگاری میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں غالب کے اردو خطوط اور دوسرے حصے میں خطوط کے لیے غالب کے اشعار کی موجودگی پتا دیتی ہے کہ اس زمانے تک غالب اردو مکتوب نگاری سے غیر معمولی دل چسپی لینے لگے تھے۔

دیباچے سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ انتخاب غالب نصابی نوعیت کی کتاب ہے جسے غالب نے انگریزوں کی درس و تدریس کے مقصد سے لکھا تھا۔ نکات غالب و رقعات غالب طبع فروری ۱۸۶۷ء کا مقصد بھی یہی تھا۔ اسی سلسلے میں اردو نظم میں غالب کی مختصر کتاب قادر نامہ بھی آتی ہے جو بچوں کی تدریس کے لیے لکھی گئی تھی۔ غالب کے اردو خطوط کے مجموعے اردوئے معلی حصہ اول کے پہلے ایڈیشن کے سرورق پر اردوئے معلی کو "تعلیم اطفال کے لیے دستور العمل" قرار دیا گیا ہے۔ گویا اردوئے معلی (حصہ اول): غالب اکمل المطابع دہلی طبع اول مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء بھی طلبا کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے شائع ہوئی تھی۔ یہ تمام کتابیں درسی کتب میں غالب کی دل چسپی کی

منظر ہیں۔

دیباچۂ انتخابِ غالب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب اس کتاب کے ذریعے انگریزی حکومت سے منصب و خطاب کے طالب تھے اور وہ خود کو "کوئینس پوئٹ" کے خطاب کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ دیباچہ اردو نثر میں غالب کے اُس مقفّٰی اسلوبِ نگارش کا نمونہ ہے جس کے نقوش ان کے اردو خطوط میں خال خال ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اردو خطوط میں تو مقفّٰی اسلوب کے عادی نہ تھے لیکن اردو دیباچوں اور تقریظوں میں وہ مقفّٰی اسلوب کو برتنے کے قائل تھے۔

دیباچے میں غالب کے بیان سے انکشاف ہوتا ہے کہ انتخابِ غالب اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب مسٹر میکلوڈ پنجاب کے فنانشیل کمشنر تھے اور نہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نہ ہوئے تھے۔ سر ڈانل میکلوڈ ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر رہے تھے اور اس سے قبل وہ پنجاب کے جوڈیشیل اور فنانشیل کمشنر رہ چکے تھے[۱۲]۔ ان امور سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخابِ غالب ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء سے قبل اُس زمانے میں لکھی گئی تھی جب سر میکلوڈ کو پنجاب کی لیفٹیننٹ گورنری کا عہدہ نہ ملا تھا۔

دیباچۂ انتخابِ غالب کا خاتمہ غالب نے سر میکلوڈ کے لیے اپنے جن تین عدد مدحیہ اردو اشعار پر کیا ہے وہ غالب کے غیر متداول کلام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اشعار سے غالب کے متداول اردو دیوان کی وہ پانچوں اشاعتیں خالی ہیں جو غالب (متوفیٰ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) کی زندگی میں اکتوبر ۱۸۴۱ء، مئی ۱۸۴۷ء، جولائی ۱۸۶۱ء، جون ۱۸۶۲ء و نیز ۱۸۶۳ء کے دوران منظرِ عام پر آئی تھیں[۱۳]۔ دیوانِ غالب طبع اپریل ۱۸۸۲ء بھی ان تینوں اشعار سے محروم ہے[۱۴]۔ یہ تینوں اشعار اب غالب کے غیر متداول کلام کی حیثیت سے غالب کے منسوخ دیوان میں انتخابِ غالب ہی کے حوالے سے شامل ملتے ہیں[۱۵]۔ اس طرح دیباچۂ انتخابِ غالب کی رو سے دیوانِ غالب میں تین غیر متداول اشعار کا اضافہ ہوتا ہے۔ دیوانِ غالب طبع ۱۸۶۳ء کا زیرِ بحث اشعار سے محروم ہونا اس امر کا مشعر ہے کہ یہ اشعار ۱۸۶۳ء کے بعد کہے گئے ہوں گے۔ ان حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتخابِ غالب ۱۸۶۳ء کے بعد [مگر ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء سے قبل] شاید ۱۸۶۴ء کے آس پاس مکمل ہوئی ہوگی۔

دیباچے کے بعد انتخابِ غالب کے پہلے حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ غالب کی منثور اردو تحریروں پر مشتمل کتاب کے اس باب میں خود غالب اور غالب کی تقلید میں جناب مالک رام و جناب قاضی عبدالودود کے بیانات کے بموجب دو عدد دیباچے شامل ہیں[۱۶] لیکن کتاب کے پہلے باب (ص ۲ تا ۵) میں دو دیباچوں کے بجائے ایک تقریظ اور ایک دیباچہ ملتا ہے۔ تقریظ مرزا رجب علی بیگ سرور کی کتاب گلزارِ سرور پر ہے اور دیباچہ خواجہ بدر الدین خاں کی کتاب حدائق انظار پر ہے۔ انتخابِ غالب میں گلزارِ سرور پر غالب کی جس تحریر کو دیباچہ قرار دیا گیا ہے وہ دراصل تقریظ ہے۔ غالب کی یہ تحریر "تقریظِ گلزارِ سرور" کے طور پر گلزارِ سرور، عودِ ہندی و اردوئے معلیٰ حصہ دوم میں شائع ہو چکی ہے[۱۷]۔ ان حقائق کے پیشِ نظر تقریظ "گلزارِ سرور" کو دیباچہ قرار دینا درست نہیں۔

تقریظِ گلزارِ سرور کے بعد انتخابِ غالب کے پہلے باب میں خواجہ امان کی کتاب حدائق انظار پر غالب کا دیباچہ ہے۔ خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان (متولد ۱۸۱۱ء، متوفیٰ اگست ۱۸۷۹ء) کی کتاب حدائق انظار در اصل میر تقی خیال کی ضخیم فارسی داستان بوستانِ خیال کا اردو ترجمہ ہے۔ حدائق انظار کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے کتاب کا سالِ تکمیل ۱۲۷۵ھ مستخرج ہوتا ہے:

حدایق انظار = ح ۸ د ۴ ا ۱ ی ۱۰ ق ۱۰۰ ا ۱ ن ۵۰ ظ ۹۰۰ ا ۱ ر ۲۰۰ = ۱۲۷۵ھ

ان امور کی روشنی میں کتاب حدایق انظار کا نام "حدائق الانظار" لکھنا درست نہیں۔ جناب مالک رام، جناب غلام رسول مہر، جناب مولانا امتیاز علی عرشی نیز جناب قاضی عبدالودود جیسے صفِ اول کے غالب شناسوں نے ان امور کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث کتاب حدایق انظار کا نام "حدائق الانظار" درج فرمایا ہے جو محلِ نظر ہے۔ حدایق انظار کا ۱۲۹۲ھ میں شائع ہونے والا دوسرا ایڈیشن رضا لائبریری رام پور میں میری نظر سے گزرا ہے اور اس ایڈیشن میں بھی کتاب کا نام حدایق انظار ہی درج ملتا ہے۔ انتخابِ غالب کے پہلے باب میں شامل حدایق انظار پر غالب کا دیباچہ بھی نیا نہیں ہے۔ یہ دیباچہ عودِ ہندی طبع اول مطبوعہ اکتوبر ۱۸۶۸ء (ص ص ۱۸۲ تا ۱۸۴) نیز اردوئے معلیٰ حصہ دوم طبع اپریل ۱۸۹۹ء (ص ص ۵ تا ۸) میں شائع ہو چکا ہے۔ انتخابِ غالب [زمانۂ تالیف ۱۸۶۴ء مطابق ۱۲۸۰ھ-۱۲۸۱ھ] میں حدایق انظار پر غالب کے دیباچے کی شمولیت سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا یہ دیباچہ ۱۸۶۴ء تک لکھا جا چکا تھا۔ حدایق انظار ۱۲۷۵ھ [مطابق ۱۸۵۸ء-۱۸۵۹ء] میں لکھی گئی تھی اور اس کا پہلا ایڈیشن مطبع اکمل المطابع دہلی سے ۱۲۸۲ھ [۱۸۶۶ء-۱۸۶۵ء] میں شائع ہوا تھا۔ حدایق انظار کا یہ پہلا ایڈیشن شاید ۱۲۸۱ھ [مطابق ۱۸۶۴ء] میں چھپنا شروع ہوا تھا جو لفظ "غفار" [غ ۱۰۰۰ ف ۸۰ ا ۱ ر ۲۰۰ = ۱۲۸۱ھ] سے برآمد ہوتا ہے جیسا کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے سرورق کے ایک اندراج سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حدایق انظار میں غالب کا دیباچہ شروع میں شامل ہے۔ ان شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدایق انظار طبع اول کی اشاعت کے آغاز [۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء] سے قبل ہی اس کتاب پر غالب کا زیرِ بحث دیباچہ لکھا جا چکا ہوگا۔ ان قرائن سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انتخابِ غالب ۱۸۶۴ء [مطابق ۱۲۸۱ھ-۱۲۸۰ھ] کے آس پاس لکھی گئی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ ان امور پر مزید تحقیق میرے معروضات کی تصدیق کر سکے گی۔

انتخابِ غالب کے پہلے باب (ص ص ۶ تا ۱۴) میں میر مہدی حسین مجروح کے نام غالب کے گیارہ اردو مکاتیب ہیں۔ مالک رام نے ان خطوط کی تعداد خلافِ واقعہ بارہ بتائی ہے۔ [ذکرِ غالب ص ۱۷۴]۔ مجروح کے نام یہ تمام خطوط بعض اختلافات کے ساتھ عودِ ہندی، اردوئے معلیٰ اور خطوطِ غالب حصہ اول مرتبہ مالک رام طبع ۱۹۶۲ء میں مل جاتے ہیں۔ یہ تمام خطوط جولائی ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۳ء تک کے درمیانی زمانے کے ہیں۔ انتخابِ غالب میں ۱۸۶۳ء تک کے خطوط کی موجودگی اور ۱۸۶۴ء یا اس کے بعد کے خطوط کی عدم موجودگی سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۶۳ء کے بعد ۱۸۶۴ء کے آس پاس مکمل ہوئی ہوگی۔ یہ کتاب غالب کے بعض خطوط کی تاریخوں کے تعین میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے [رک خطوطِ غالب مرتبہ مالک رام ص ۳۲۰ حاشیہ ۳]۔

خطوط کے بعد انتخابِ غالب کے پہلے باب (ص ص ۱۴ تا ۱۶) میں ایک لطیفہ اور دو نقلیں بھی شامل ہیں۔ یہ تینوں اردو تحریریں اب غالب کی نادر تحریروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اردو نثر میں یہ تینوں چیزیں غالب کی ظرافت کا نمونہ ہیں۔

انتخابِ غالب کا دوسرا باب (ص ص ۱۶ تا ۱۹) غالب کے ایسے اکتیس اردو اشعار پر مشتمل ہے جو بہ قولِ غالب مکتوب نگاری میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ان ۳۱ شعروں میں سے پہلا اور آخری شعر درج ذیل ہے۔ پہلا شعر:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی[۲۹]

آخری شعر:

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

انتخابِ غالب کے دیباچے میں غالب کا بیان ہے کہ یہ اشعار خط و کتابت میں استعمال کیے جا سکتے ہیں لیکن اشعار دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے متعدد اشعار مکتوب نگاری کے لیے کسی خصوصی افادیت کے حامل نہیں اور میری رائے میں خود غالب کے کلام سے خط و کتابت کے لیے مفید مطلب اشعار کا اس سے بہتر انتخاب ہو سکتا تھا۔

کتاب کے ایک حصے میں خطوط اور دوسرے حصے میں خط و کتابت کے لیے اشعار کا التزام کوئی ایسا نیا طریقہ کار بھی نہیں جو انتخابِ غالب میں پہلی بار سامنے آیا ہو۔ انتخابِ غالب ۱۸۶۴ء کے آس پاس مرتب ہوئی تھی اور غالب اس سے قبل اپنی فارسی نثر کی کتاب پنج آہنگ طبع اول مطبوعہ اگست ۱۸۴۹ء میں اس طریقۂ کار کا التزام کر چکے تھے۔ پنج آہنگ کی تیسری آہنگ غالب کے مکتوبی فارسی اشعار پر مشتمل ہے اور اس کتاب کی پانچویں آہنگ میں غالب کے فارسی خطوط شامل ہیں۔ گویا انتخابِ غالب کی ترتیب میں کسی حد تک پنج آہنگ کی ترتیب کی تقلید کی گئی ہے۔ ان حالات میں بہ لحاظِ طرزِ ترتیب انتخابِ غالب دراصل پنج آہنگ کا نقشِ ثانی ثابت ہوتی ہے۔ نقشِ ثانی عموماً نقشِ اول سے بہتر ہوتا ہے لیکن یہاں نقشِ ثانی کا نقشِ اول سے بہتر ہونا تو درکنار نقشِ ثانی کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے نقشِ اول کے برابر بھی نہیں نظر آتا۔ میرے نزدیک یہاں نقشِ ثانی [انتخابِ غالب] دراصل نقشِ اول [پنج آہنگ] کا ایک غیر معیاری اور ناکام چربہ ثابت ہوتا ہے۔

پنج آہنگ کے مقابلے میں انتخابِ غالب کی ناکامی کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ پنج آہنگ کی کامیابی میں فارسی ادب سے غالب کی غیر معمولی دل چسپی بھی ایک اہم سبب معلوم ہوتی ہے۔ انتخابِ غالب جیسی مختصر سی اردو کتاب کی تیاری میں غالب نے کچھ زیادہ دل چسپی نہ لی ہوگی۔

پنج آہنگ [طبع ۱۸۴۹ء] انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل چھپ چکی تھی اور غالب اس وقت تک ان روح فرسا مصائب سے محفوظ تھے جو انھیں غدر ۱۸۵۷ء میں برداشت کرنا پڑے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے دل شکن اور ہوش ربا مصائب نے غالب کے قلب و ذہن کی دنیا کو درہم و برہم اور تہہ و بالا کر ڈالا تھا۔ ایسے ہمت شکن حالات کے بعد ۱۸۶۴ء میں انتخابِ غالب کی ترتیب کے لیے غالب کی ادبی صلاحیتوں کا پوری قوت سے بروئے کار نہ آنا حیرت کی بات نہیں۔

پنج آہنگ کی پہلی اشاعت [اگست ۱۸۴۹ء] تک غالب [متولد دسمبر ۱۷۹۷ء] کا سن کم و بیش ۵۲ سال تھا اور اس سن میں غالب صحت اور توانائی کی اس دولت سے محروم نہ ہوئے تھے جو انتخابِ غالب کی ترتیب [۱۸۶۴ء] کے وقت تک ۶۷ برس کے سن میں ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ انتخابِ غالب کی ترتیب ۱۸۶۴ء کے آس پاس عمل میں آئی تھی۔ خطوطِ غالب کے مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ غالب رجب ۱۲۷۹ھ [مطابق جنوری ۱۸۶۳ء] "تا جمادی الآخر ۱۲۸۰ھ [مطابق نومبر ۱۸۶۳ء] کے دوران مہینوں پھوڑوں اور پھنسیوں کے باعث بڑے شدید جسمانی اور روحانی آزار میں گرفتار رہے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں غالب کا سن تقریباً ۶۶ سال تھا۔ ۶۶ برس کے بوڑھے آدمی کا ۱۸۶۳ء کے دوران کئی ماہ تک طویل علالت میں مبتلا رہ کر ۱۸۶۴ء میں انتخابِ غالب مرتب کرنا آسان کام نہ تھا۔ بڑھاپے، بیماری اور کمزوری کے عالم میں ۱۸۶۴ء کے دوران مرتب ہونے والی کتاب انتخابِ غالب کے لیے غالب زیادہ محنت اور مشقت کرنے کی حالت ہی میں نہ تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر پنج

آہنگ کے مقابلے میں انتخابِ غالب کی ناکامی حیرت کی بات نہیں رہتی۔

غالب کے ادبی آثار میں سوالاتِ عبدالکریم — اور لطائفِ غیبی نام کے دو مختصر رسالے بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں رسائل غالب نے اپنے نام کے بجائے دوسروں کے نام سے شائع کرائے تھے۔ میری اطلاع کے مطابق غالب نے یہ دونوں رسائل بھی ۱۸۶۴ء میں لکھے تھے[۲]۔ اس طرح ۱۸۶۴ء میں غالب جیسے ۶۷ سال کے ضعیف شخص کو انتخابِ غالب، سوالاتِ عبدالکریم اور لطائفِ غیبی نام کے تین عدد رسائل تیار کرنا پڑتے تھے۔ ان حالات میں انتخابِ غالب کی تیاری کے لیے غالب کے پاس زیادہ وقت بھی میسر نہ رہا ہوگا۔ انتخابِ غالب ان ہی تمام وجوہ سے غالب کی ایک ناکام ادبی کاوش ثابت ہوتی ہے۔

انتخابِ غالب جیسی معمولی اور ناکام کتاب شاید ان ہی کمزوریوں کے باعث اپنی ترتیب (۱۸۶۴ء) کے ایک عرصے بعد تک اشاعت سے محروم رہ کر گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی تھی۔ مولانا حالی کی یادگارِ غالب اور مولانا غلام رسول مہر کی کتاب غالب میں انتخابِ غالب کا ذکر موجود نہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ضخیم کتاب غالب اور مطالعہ غالب بھی انتخابِ غالب کے بارے میں خاموش ملتی ہے۔ تاریخ ادبِ اردو مترجمہ مرزا محمد عسکری اور داستانِ تاریخ اردو مولفہ مولانا حامد حسن قادری جیسی ضخیم کتابیں بھی انتخابِ غالب کے ذکر سے خالی ہیں۔ البتہ شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب غالب نامہ میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے[۳]۔

انتخابِ غالب کی شانِ نزول کے متعلق یہ پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں پروفیسر عربی کالج دلی انگریز افسروں کو اردو پڑھانے کے لیے ایک انشا مرتب کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں غالب سے بھی تعاون کے طالب ہوئے۔ غالب نے یہ مجموعہ مرتب کرکے ان کے سپرد کیا۔ مولوی ضیاء الدین خاں نے اس مجموعے میں سے صرف غالب کے خطوط کو اپنی مرتبہ انشائے اردو (حصہ دوم) مطبع فیض احمدی طبع ۱۸۶۶ء میں شائع کرا دیا۔ کتاب کا قلمی نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے کتب خانے سے جب عارضی طور پر محمد عبدالرزاق راشد کو دستیاب ہوا تو انھوں نے اسے انتخابِ غالب کے نام سے ۱۳۴۵ھ میں حیدرآباد دکن سے شائع کرا دیا۔ اس کتاب کا نام انتخابِ غالب دراصل غالب کے بجائے عبدالرزاق راشد کا تجویز کردہ ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس بھی موجود تھا۔ مولوی ضیاء الدین خاں کے نام غالب کا ایک طویل اردو خط بھی ملا ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے اس خط کا سالِ تحریر ۱۸۶۴ء متعین کیا ہے[۴]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اور مولوی ضیاء الدین کے مابین ۱۸۶۴ء میں دوستانہ روابط قائم تھے۔ شاید ان ہی دوستانہ تعلقات کی وجہ سے غالب نے ۱۸۶۴ء میں کتاب انتخابِ غالب کا مسودہ تیار کیا ہو۔

حواشی

ـله مثلاً: (۱) انتخابِ غالب: مرتبہ امتیاز علی قرشی۔ مطبع قیمۃ بمبئی طبع ۱۹۴۲ء (۲) انتخابِ غالب: ممتاز حسین اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع ۱۹۵۰ء (۳) انتخابِ غالب: منشی بشیر احمد (بہ حوالۂ غالب ببلیوگرافی: ڈاکٹر محمد انصار اللہ علی گڑھ طبع ۱۹۷۲ء حصہ اول ص ص ۳۵ تا ۳۶) ـعه بہ حوالۂ ذکرِ غالب: مالک رام مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع فروری ۱۹۷۶ء ص ۱۶۵ ـعه مجموعۂ نثرِ غالب اردو: مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مجلسِ ترقی ادب لاہور طبع نومبر ۱۹۶۷ء ص ۲۶۱ ـله ذکرِ غالب: ص ۱۶۵ (حاشیہ ۲) ـشه ایضاً ص ۱۶۳۔

خلیل الرحمٰن داؤدی نے بھی مجموعۂ نثرِ غالب اردو (ص ۲۶۱) میں انتخابِ غالب کی ضخامت ۴۸ صفحات بتائی ہے جو محلِ نظر ہے۔
۶؎ عیارِ غالب: مرتبہ مالک رام علمی مجلس دلی طبع فروری ۱۹۶۹ء ص ۹۹ [مضمون "جہانِ غالب" از قاضی عبدالودود] ۷؎ خطوطِ غالب:
مرتبہ غلام رسول مہر۔ ممی پرنٹنگ پریس لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۵۰۶ ۸؎ ملاحظہ ہو مضمون کاظم علی خاں، "گلزارِ سرور پر غالب کی تقریظ" مشمولہ
فوائد ادب بمبئی ماہ اکتوبر ۱۹۸۱ء ۹؎ غالب کا یہ بیان محلِ نظر ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں دراصل ایک دیباچہ اور ایک تقریظ شامل ہے۔
تفصیل آگے آے گی۔ ۱۰؎ یہ دیباچہ مندرجہ ذیل مصادر میں شامل ہے۔ (۱) انتخابِ غالب: مرتبہ محمد عبدالرزاق۔ چشتیہ پریس حیدرآباد
دکن طبع ۱۳۴۵ھ متن ص ص ۱ تا ۲ (۲) غالب کی نادر تحریریں: مرتبہ خلیق انجم۔ مکتبہ شاہراہ دہلی طبع فروری ۱۹۶۱ء ص ص ۱۲۹-۱۳۰
(۳) خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر ص ص ۵۰۶ تا ۵۰۷ (۴) مجموعۂ نثرِ غالب اردو ص ۲۶۳ (۵) علی گڑھ میگزین
(غالب نمبر ۴۹ و ۱۹۴۸ء): مرتبہ مختار الدین احمد آرزو ص ص ۹۸ تا ۹۹ ۱۱؎ بہ حوالہ نکاتِ و رقعاتِ غالب: مرتبہ اکبر علی خاں عرشی زادہ
کوہ نور پریس دہلی طبع ۱۹۶۲ء ص ۱۷ ۱۲؎ تفصیلات کے لیے دیکھیے قادر نامۂ غالب: مرتبہ عبدالقوی دسنوی۔ علوی پریس بھوپال
طبع ۱۹۷۱ء ۱۳؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ: کاظم علی خاں۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۸۱ء ص ص ۹۰ تا ۹۴۔
۱۴؎ بہ حوالہ: (۱) مکاتیبِ غالب: مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی۔ ناظم پریس رام پور طبع ۱۹۳۷ء (حواشی ص ۱۸۰ حاشیہ ۸) (۲) باغِ دو در:
غالب۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی لاہور طبع ۱۹۷۰ء (تحقیق نامہ ص ۱۲۸) ۱۵؎ بہ حوالہ ذکرِ غالب ص ص ۱۶۵ تا ۱۶۷۔ ۱۶؎ دیوانِ
غالب۔ مطبع صدر مجلس لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء [مملوکہ کاظم علی خاں] ۱۷؎ غالب کا منسوخ دیوان: مرتبہ مسلم ضیائی۔ ادارۂ یادگارِ غالب
کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ۳۰۱ ۱۸؎ ر.ک: (۱) انتخابِ غالب متن ص ۱ (۲) ذکرِ غالب: مالک رام ص ص ۱۴۳ تا ۱۴۵۔
(۳) عیارِ غالب: ص ۱۰۰ (مضمون قاضی عبدالودود) ۱۹؎ ر.ک: (۱) گلزارِ سرور: رجب علی بیگ سرور۔ مطبع افضل المطابع
فرنگی محل لکھنؤ [سنہ اشاعت ندارد] پشتِ سرورق پر غالب کی تقریظ شامل ہے۔ گلزارِ سرور کا یہ بظاہر پہلا ایڈیشن ہے جو غالب اور
سرور کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور اب کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ (۲) عودِ ہندی: غالب۔ مطبع مجتبائی میرٹھ
طبع اول مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ [مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء] ص ص ۱۸۰ تا ۱۸۲ [مملوکہ کاظم علی خاں] (۳) اردوئے معلیٰ (حصہ دوم):
غالب۔ مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ص ۱۱ تا ۱۲ [اس کم یاب کتاب کا ایک نسخہ حال ہی میں مجھے جناب توفیق احمد تاجر نادر کتب امروہہ
سے دستیاب ہوا ہے] ۲۰؎ تفصیلات کے لیے دیکھیے میرا مضمون "حدائق الانظار پر غالب کا دیباچہ" ۲۱؎ ذکرِ غالب: مالک رام
طبع ۱۹۷۶ء ص ۵۰۔ ۲۲؎ خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر طبع ۱۹۶۸ء ص ۳ نیز ص ۵۰۶۔ ۲۳؎ مکاتیبِ غالب: مرتبہ امتیاز
علی خاں عرشی طبع ۱۹۳۷ء (دیباچہ ص ۲۴۵ نیز ص ۲۵۲) ۲۴؎ عیارِ غالب ص ۱۰۰ (مضمون جناب قاضی عبدالودود) ۲۵؎ حدائق الانظار
مترجمہ خواجہ بدرالدین خاں۔ مطبع بدر الدجیٰ دہلی طبع ۱۲۹۲ھ [اس کتاب کی ضخامت ۵۵۶ صفحات ہے۔ ناپ ۱۰×۱۵" (انچ) ہے۔
سطر ۲۹ سطری ہے اور کتاب (ص ص ۲ تا ۳) میں غالب کا دیباچہ شامل ہے] ۲۶؎ بہ حوالہ عودِ ہندی: مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلس ترقی
ادب لاہور طبع جون ۱۹۶۷ء ص ۳۲۔ (حاشیہ ۱) ۲۷؎ بہ حوالہ خطوطِ غالب (حصہ اول): مرتبہ مالک رام۔ سرفراز پریس لکھنؤ طبع
۱۹۶۲ء، نیز بہ حوالہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ ۲۸؎ غالب کی نادر تحریریں: مرتبہ خلیق انجم ص ص ۱۳۷ تا ۱۳۸ ۲۹؎ انتخابِ غالب
طبع ۱۳۴۵ھ ص ۵۶ ۳۰؎ ایضاً ص ۱۹ ۳۱؎ تفتہ، جنون، قدر، علائی، آرام، میر سرفراز حسین، سیاح، ذکا، چودھری عبدالغفور
سرور اور محمود مرزا کے نام ۱۸۶۳ء کے متعدد خطوط میں غالب نے اپنی طویل علالت کا ذکر کیا ہے۔ مکتوبِ غالب بہ نام شفق مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۳ء
میں بھی غالب نے اپنی بیماری کے متعلق لکھا ہے۔ غالب کے یہ تمام خطوط مندرجہ مصادر میں دیکھے جا سکتے ہیں: (۱) اردوئے معلیٰ (حصہ اول)،

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

عالم فتحپوری

نیند اور شاعر

رک گئی آکے مرے کلبۂ احزان کے قریب
ایک دوشیزۂ معصوم بہ ایں حالِ تباہ
بھوک کی آگ سے مرجھایا ہوا روئے حسیں
آنکھیں جلتی ہوئی کجلایا ہوا نورِ جبیں
گرد ان آتشیں آنکھوں کے گلابی حلقے
اشکِ پیہم کی روانی کے نشاں ہوں جیسے

دے کے دستک مرے دروازے پہ یوں کہنے لگی
نیند ہے نام مرا میں تو عزیزہ ہوں تری
پوچھ دنیا سے کہ میں جان سے بھی پیاری ہوں
کھول دروازہ کہ اس وقت تھکی ہاری ہوں

بارہا گاؤں کی پیچیدہ گزرگاہوں میں
خاک چھانی ہے صعوباتِ سفر جھیلے ہیں
اوس پڑتی ہوئی راتوں میں کھڑے رہ رہ کر
بند دروازے پہ کاٹی ہیں اندھیری راتیں
مجھ پہ سوزِ غمِ انساں کی حقیقت بھی کھلی

پھول سی خلد بداماں وہ درخشاں آنکھیں
روبرو میرے ہوئیں شعلۂ تر میں تحلیل آہ
گھٹ گھٹا یا درِ دہقاں کو بھی جا کر میں نے
اس کے غم خانہ کا انداز نرالا دیکھا
خاک کا ڈھیر تھا سوراخ تھے اتنے چھت میں
جس کے آگے دلِ عاشق بھی خجل ہو جائے
التجا کی کہ میں آئی ہوں ذرا کھول دوار
تیرے اس حالِ پریشاں پہ دل و جاں سے نثار
میں نے دروازے کے کھلوانے پہ اصرار کیا
ایک خموشی کے سوا کچھ نہ ملا پھر بھی جواب
ایک دل دوز حقیقت تھی خموشی کا سبب
اپنی چھت کے انھیں ٹوٹے ہوئے سوراخوں سے
تک رہا تھا وہ فلک کو نگہِ یاس کے ساتھ
خود فراموشی کے عالم میں مری کیا سنتا

بالاخانے پہ طوائف کے بھی چڑھ کر میں نے
دے کے دستک کہا تیرا ہی درِ ناز ہو وا
میں ترے واسطے اے خوابِ پریشاں کی اسیر
آئی ہوں ساتھ ہی تسکین کا تحفہ لے کر
اسی اثنا میں دریچہ سے جو جھانکا میں نے
اک عجب عبرتِ دل دوز کا منظر دیکھا
سخت بیداری سے بھاری تھے پپوٹے اس کے
پھر بھی ایک نفس کا شیدائی غرض کا بندہ
جس کی آنکھوں میں تھی مکروہ چمک سونے کی
اسی ہر بزم سے ٹھکرائی ہوئی عورت کے
دست و پا چوم رہا تھا کچھ اس انداز کے ساتھ

جیسے وہ اس کے لیے جان بھی دے ڈالے گا
بے خبر آپ سے تھی میری خبر کیا لیتی

سوختہ بخت ہوں مردہ زمانہ ہوں میں
لاکھوں ان خواب زدہ آنکھوں کی ٹھکرائی ہوئی
خواب آلودہ شبِ تیرہ کی تاریکی میں
ایک لمحہ بھی پلک تک نہیں جھپکی جن کی

میں نے وہ مرد بھی دیکھے ہیں کہ جن کے
رات بھر آنسوؤں سے بھیگے ہوئے رہتے ہیں
ایسی بہنوں کو بھی دیکھا ہے جوانی جن کی
رات بھر آنسوؤں میں غسل کیا کرتی ہے

میرے شاعر میری عصمت کا محافظ تو ہے
تیرگی میں مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے
تو مجھے اپنے ہی غم خانے میں آجانے دے
رحم کر مجھ پہ ذرا رکھ بھی دے اک سمت بیاض
پاس آجاؤں گی تو روشنی دھیمی کر لے
رات بھر تو یوں ہی بیٹھا ہوا کیا کرتا ہے
بڑی سنجیدگی سے نیند نے پوچھا مجھ سے
میں نے جھنجھلا کے دیا نیند کو سختی سے جواب
سخت حیرت ہے مجھے بے خبری پہ تیری
دیکھ اس پردۂ ستم پیشہ کے سائے میں ابھی
سامنے کتنی بیاباں میں پڑی ہیں لاشیں
آج تک جن کے مقدر میں نہیں گور و کفن
ہڈیاں دیکھ وہ تازہ و جواں لاشوں کی
گھونسلے جن سے سجائے ہیں ابھی چیلوں نے
ان کی بو تیری مانند ادھر آتی ہے

میرے دل میری رگِ جاں میں گھسی جاتی ہے
ایسے عالم میں قرار آئے تو کیوں کر آئے
کوئی پتھر نہیں حساس ہوں شاعر ہوں میں

میں بھی سو جاؤں یہ منشا یہ تمنا ہے تری
جانِ جاں تیری تمنا نہیں پوری ہوگی
نہ کھلے گا نہ کھلے گا مرا در تیرے لیے
تجھ سے پوشیدہ ہے شاید ابھی شاعر کا مقام
میں جو سو جاؤں تو یہ سارا جہاں سو جائے
مجھ پہ لازم ہے کہ ہر وقت میں بیدار رہوں
اور سوتے ہوئے انسان کو بیدار کروں
تجھ سے نادان یہ اصرار ہے بیکار ترا
جا کہ بزمِ مہ و انجم میں جگہ ہے تیری
یا کسی شبنمی وادی میں بسیرا کر لے
کیونکہ یہ رات تو انساں پہ بہت بھاری ہے
سینکڑوں مر چکے اس رات کی تاریکی میں
سینکڑوں موت کا ارمان لیے بیٹھے ہیں
صرف دو چار ہیں خونخوار درندے ایسے
جن کے کاندھوں پہ دکھانے کو ہے انساں کا لباس
وہی مشتاق ہیں تیرے وہی طالب ہیں ترے
تیری زلفوں کو وہ شانوں پہ پریشاں کر لیں
ناامیدی کے سوا کچھ نہ ملے گا مجھ سے
نہ کھلے گا نہ کھلے گا مرا در تیرے لیے
جا کہ بزمِ مہ و انجم میں جگہ ہے تیری

محمد اسحاق صدیقی
۵۔اے۔ گوئن تالاب لکھنؤ

ایرانی تہذیب
فارسی اعداد کے آئینے میں

ہر زبان اس کے بولنے والوں کی تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ سی بھی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لینے سے اس امر کا بخوبی اندازہ سکتا ہے کہ اس کے بولنے والے تہذیب کی کس منزل میں ہیں۔ یا وہ ن منزلوں سے گزر چکے ہیں۔ جیسے جیسے انسان کی تہذیب ترقی رفتا جاتی ہے اس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع ہوتا جاتا ہے۔

چنانچہ مختلف زبانوں کا جائزہ لینے سے ایسے الفاظ کا پتہ چلتا ہے جن کا پہلا جز کسی خاص شے کی ایک مخصوص تعداد کو ظاہر کرتا ہے نہیں عددِ معدود کہتے ہیں۔ مثلاً عربی میں اربع عناصر، خمسہ حواس، سبع سیارہ وغیرہ۔

اگر عربی، فارسی، سنسکرت، اردو اور ہندی کے ایسے مرکب الفاظ یکجا کیا جائے تو ان زبانوں کے بولنے والوں کے بارے میں نہایت ہم ثقافتی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ مؤلف کے لیے یہ کام محنت طلب سہی، لیکن اس طرح قاری کی رسائی نہایت آسانی سے ایک یسے ذخیرۂ معلومات تک ہو سکتی ہے۔ جیسے کوزے میں دریا، کہنا چاہیے۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے اس مضمون میں فارسی زبان کے یے ایک سو عددی مرکبات کو جمع کیا ہے جو ایرانی تہذیب کی عکاسی رتے ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں میں نے فرہنگ آصفیہ، مہذب اللغات، لغاتِ کشوری، لغاتِ حیرا کے علاوہ ایک خاص مضمون سے مدد لی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے۔

انگریزی رسالے اسلامک کلچر (ISLAMIC CULTURE) کے مندرجۂ ذیل شماروں میں جناب امین الدین خاں۔ ایم۔ اے (گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی) کا ایک تحقیقی مقالہ شائع ہوا تھا۔ (NUMERICAL COMPOUNDS IN PERSIAN) (یعنی فارسی میں "عددی مرکبات")

جولائی ۱۹۴۰ صفحات ۴۳۳ – ۹۰ ۴ نیم سے دو تک
اکتوبر ۱۹۴۰ ″ ۴۸۵ ۔ ۵۰۴ سے شش تک
جنوری ۱۹۴۱ ″ ۱۲۴ ۔ ۹۱ ، ہفت سے ہزار تک

فاضل مضمون نگار نے حروفِ تہجی کے لحاظ سے نیم سے ہزار تک عددی مرکبات کی فہرست مع تشریح پیش کی ہے۔ مضمون کو مستند بنانے کے لیے جابجا فارسی قصیدوں سے اشعار درج کیے ہیں۔ اس سلسلے میں لغاتِ مندرجہ ذیل سے استفادہ کیا ہے؛

"آصف اللغات / بحر عجم / بہار عجم / برہانِ قاطع / چراغِ ہدایت / فرہنگ آنند راج / فرہنگِ جہانگیری / فرہنگِ رشیدی / غیاث اللغات / کشف اللغات / مصطلاحات الشعراء / مویدالفضلا / ہفت قلزم / جانسن کی فارسی، عربی، انگریزی ڈکشنری / ریڈ ہاؤس کی ترکی انگریزی ڈکشنری۔

موصوف نے یہ بے بہا علمی مقالہ مجلد صورت میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ مضامین کا یہ مجموعہ مرحوم کے نادر کتب خانے میں آج بھی محفوظ ہے اور زیر نظر مضمون کا ماخذ ہے۔ یہ مضمون مجھے میرے کرم فرما جناب ڈاکٹر نیّر مسعود کی مہربانی سے دیکھنے اور ترجمہ کرنے کو ملا۔ جب میں نے ترجمہ شروع کیا تو احساس ہوا کہ خیالات کی تکرار بہت ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ بجائے لفظی ترجمہ کرنے کے تلخیص مع اضافہ پیش کی جائے۔ طوالت کے خوف سے فارسی اشعار بھی نظر انداز کر دیے ہیں۔ ان کی جگہ جا بجا اردو اشعار نقل کیے ہیں۔ جن اعداد سے متعلق قابلِ ذکر الفاظ نہیں ملے۔ انھیں بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔"

امید ہے ناظرین اسے دلچسپ اور مفید پائیں گے۔

۱۔ نیم آدمی: عورت، کیونکہ اسلامی شرع کے مطابق دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔

(قرآن مجید، سورہ ۲، آیت ۲۸۲)

۲۔ دوآبہ: دو دریاؤں کے بیچ کی زمین (سنسکرت میں دو آب) مثلاً گنگا، جمنا، اور دجلہ و فرات کا دوآبہ

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں۔
سوکھا پڑا ہے اب تو مدّت سے یہ دوآبہ
(میر)

۳۔ دوآتشہ: شراب یا عرق جو دو بار آگ پر رکھ کر کھینچا گیا ہو۔

۴۔ دوآشیانہ: ایک قسم کا دو حصّوں کا تمبو، دوہرا خیمہ۔

۵۔ دوپرا: ایک قسم کا پتنگ، جس کو دو پلکا بھی کہتے ہیں۔

۶۔ دوپلکا: ایک قسم کا جڑاؤں نگینہ

اے جانِ جہاں کم سخنی ختم ہے تم پر
لب بستہ دہن ہے کہ نگینہ ہے دوپلکا
(بحر)

۷۔ دوپیازہ: گوشت جس میں پیاز سے بگھارنے کے ترکاری کی جگہ پیاز ڈالتے ہیں۔

۸۔ دوچوبہ: دو چوب کا خیمہ (ایک چوبہ اور پنچ چوبہ ہوتے ہیں)

۹۔ دوحرف: مُراد لفظ کُن سے ہے (بہ معنی، ہو جا جیسے خدا نے کہا اور دنیا بن گئی۔

۱۰۔ دورُوبہ: گلاب، جس کا ایک رخ سفید اور دوسرا یا زرد ہو۔

۱۱۔ دوزانو: گھٹنوں کے بل بیٹھنا۔ یہ طریقہ مشرق سے مخصوص

۱۲۔ دوشاخہ: (۱) دو شاخیں جڑی ہوئی (۲) گردنی یہ ایک لکڑی ہوتی ہے۔ جس میں مجرم کی گردن پھنسا ہیں۔

۱۳۔ دوگانہ یا مخفف دگانہ: (۱) دو رکعت نماز۔ نفل نماز کی دو رکعت جیسے دوگانہ ا

(۲) دو بچے جو ایک حمل سے پیدا ہوں۔ (۳) جڑواں دوہرا پھل جیسے دوگانہ آم یا کیلا۔ اگر ایسا پھل نہ میں کسی کو چھپا کر دے دیں اور لینے والا بھولے۔ سیدھے ہاتھ میں لے لے اور دینے والا کہے "فرامُ ہو سو" تو اس کے بدلے میں لینے والے کو وہی پھل دینا پڑتا ہے۔ اگر لینے والا جان جائے اور کہہ دے ہے، تو کچھ نہیں دینا پڑتا۔

۱۴۔ دو عالم: دو جہان، دو کون، دنیا و آخرت۔

۱۵۔ دومار: مُراد ضحاک بادشاہ سے، جس کے دونوں کندھوں پر شیطان کے بوسے لینے کے بعد دو سانپ نکل آئے تھے۔

۱۶۔ سہ انگشت: ترشول

۱۷۔ سہ برگہ: ایک قسم کا پھول۔ جس میں تین پتیاں ہوتی ہیں۔ تیتیا۔ یہ پھول ٹوپی وغیرہ پر کاڑھا جاتا ہے۔

۔ سہ لبعد: ابعاد ثلاثہ، لمبائی، چوڑائی اور اونچائی۔

ا۔ سہ تارہ:- تین تار والا باجہ۔ مخفف ستار، یک تارا، دو تارا (یک تارا، دو تارا) بھی ہوتے ہیں۔

۲۔ سہ درہ:- تین در کا دالان، لکڑی یا پتھر کے تین محراب دار دروازے۔

۲۔ سہ روح:- موالید ثلاثہ۔ جمادات، نباتات، حیوانات سہ شاخ بھی کہتے ہیں۔

۲۔ سہ کوہک:- تین کونے والا کانٹا۔ اسے بسا اوقات لوہے کا بناتے اور دشمن کے راستے میں یا قلعے کے پاس زخمی کرنے کے لیے ڈالتے تھے۔

۲۳۔ سہ قبلہ:- یہودیوں، عیسائیوں، اور مسلمانوں کا قبلہ۔ بیت المقدس۔

۲۴۔ سہ قرقف:- جنت کی تین شرابیں۔ جن کی ہر یہ ہیں۔ زنجبیل، سلسبیل اور طہور، ان کا قرآن مجید میں ذکر ہے (سورہ ۷۶، آیات ۲۱، ۱۸، ۱۷) سہ

زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی (غالب)

۲۵۔ سہ گل: توت سہ گل۔ ایک قسم کا شہتوت، توت جنتی۔

۲۶۔ چار اسباب:- چار علتیں:- علت مادی۔ وہ اسباب جس سے فاعل نے کوئی شے بنائی ہو۔

علت فاعلی:- جس نے کوئی شے بنائی ہو۔

علت صوری:- چیز کی بننے کے بعد جو صورت ہو جائے۔

علت غائی:- وہ فائدہ جس کے واسطے کوئی شے بنائی جائے۔

۲۷۔ چار امام:- ابو حنیفہ، شافعی، مالک، حنبل۔

۲۸۔ چار آئینہ:- ایک قسم کی زرہ، جس میں لوہے کے چار ٹکڑے جڑے ہوتے ہیں، جن کا رخ پہننے والے کے [illegible] کی طرف ہوتا ہے۔ یہ آہنی ٹکڑے بانات یا مخمل سے منڈھے ہوتے ہیں۔

۲۹۔ چار باغ:- (۱) چوکور باغ۔ جو چار حصوں میں بنا ہو۔ اس نام کے کئی باغ تھے۔ اصفہان، کابل، دہلی اور لکھنؤ میں، جن کے آثار یا نام باقی ہیں۔
(۲) دوشالی رومال، جس کے چاروں گوشوں پر چار رنگ کے گل بوٹے کڑھے ہوں سہ

چار عنصر کے سب تماشے ہیں
واہ یہ چار باغ کس کا ہے

۳۰۔ چار بالش:- مسند شاہی، تخت حکومت، اس کو چار بالشت بھی کہتے ہیں۔ سہ

خاک میں وہ چار بالشت حکومت مل گیا
چار تختوں کے تلے دارا ہے کیکاؤس ہے (بحر)

زمانہ قدیم میں روسا و امراء کی مسند پر چار تکیے ہوتے تھے۔ دو داہنی طرف اور دو بائیں طرف کبھی ان چار تکیوں میں سے ایک کو پشت پر اور ایک کو سامنے رکھ لیا کرتے تھے۔ چار بالش، یہی چار تکیے کہلاتے تھے۔ چار اتکیں کو مسند سے تعبیر کرنے لگے۔ (مہذب اللغات ۱۱۱/۴)

۳۱۔ چار برگ:- نام ایک پھول کا، پہاڑی لالہ۔ واضح ہو کہ لالہ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً کوہی، صحرائی، نعمانی، خطائی، دلسوز، دلسوخت، متراعی، دختری وغیرہ۔ واقعات بابری میں لکھا ہے کہ کابل کے اطراف میں پچاس طرح کا لالہ دیکھا گیا ہے۔ (لغات ہیرا، ص۔۲۴۶)

۳۲۔ چار بیخ:- چار جڑیں جو دواؤں میں کام آتی ہیں: بیخ کرفس، بیخ بکر، بیخ رازیانہ، بیخ کاسنی۔

۳۳۔ چار تخم:- چار بیج: تخم ریحان، اسبغول، بالنگا، خرفہ۔

۳۴۔ چار تکبیر:- نماز جنازہ، جس میں چار تکبیریں ہوتی ہیں۔

۳۵۔ چار جامہ:- وہ پوشش، جسے گھوڑے پر ڈال کر سوار ہوتے ہیں۔

۳۶۔ چار جوڑے بہشتی ! جنت کے چار دریا۔ (۱) دودھ کا (۲) شہد کا (۳) شراب کا (۴) پانی یا کافور کا۔

۳۷۔ چار خم :- پہلوانی کے ایک پیچ کا نام ہے۔ خمدار کمان کی ایک قسم۔ جب کوئی طاقت ور آدمی کمان کو پوری طاقت سے کھینچتا ہے اور وہ کان تک آجاتی ہے تو کہتے ہیں کمان چار خم ہوگئی۔

۳۸۔ چار چادر :- عورت کے جنازے کو قبر میں اتارنے کے لیے چار چادروں سے پردہ کرنا۔

۳۹۔ چار رکن :- کعبہ کے چار گوشے، شامی، یمنی، عراقی حجر اسود۔

۴۰۔ چار ضرب :- ایک قسم ہے صوفیوں کے ذکر اور شغل کی اور ایک قسم ہے ساز بجانے کی جس کو ہندی میں چوتالا کہتے ہیں۔

۴۱۔ چار طوفان : (۱) پانی کا۔ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں آیا۔
(۲) ہوا کا۔ حضرت ہود کے زمانے میں آیا۔
(۳) آگ کا۔ حضرت لوط کے زمانے میں آیا۔
(۴) خاک کا۔ حضرت صالحؑ کے زمانے میں آیا۔

۴۲۔ چار عنصر : خاک، باد، آتش، آب۔ وہ اصلی چار جز، جن سے موجودات کی تخلیق ہوئی۔ ان کے لیے فارسی میں تقریباً ۲۷ ترکیبیں ہیں۔ مثلاً:
چار احصاد / چار ارکان / چار اسباب / چار اصل
چار آخر / چار بسیط / چار جوہر / چار حمال
چار ریش / چار گوہر / چار مادر / چار نظم وغیرہ۔

۴۳۔ چار قب : تورانی کے امرا کا ایک خاص قسم کا لباس۔

۴۴۔ چار قل : قرآن مجید کے آخری پارے کی چار سورتیں جو لفظ قل سے شروع ہوتی ہیں انھیں ایصال ثواب کے لیے سورۂ فاتحہ (الحمد) کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

۴۵۔ چار مذہب :- اہل سنت کے چار فرقے، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی (دیکھیے چار امام)

۴۶۔ چار مرغ خلیل : کبوتر، کوّا، مرغ، مور، ان چاروں کو حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم سے ذبح کیا۔ ان کا گوشت ایک میں ملا کر پہاڑ پر رکھ دیا اور پھر ایک ایک کو آواز دی۔ خدا کے حکم سے ہر ایک زندہ ہو کر آپ کے پاس چلا آیا۔

۴۷۔ چار ملائکہ : خدا کے چار مقرب فرشتے :
جبرئیل :- پیغمبروں پر وحی لانا کام تھا
میکائیل :- رزق پہنچانے پر مامور ہیں۔
عزرائیل :- روح قبض کرتے ہیں۔
اسرافیل :- قیامت کے روز دو مرتبہ صور پھونکیں گے پہلی آواز پر تمام مخلوق مر جائے گی اور دوسری آواز پر زندہ ہو جائے گی۔

۴۸۔ چار ملت :- (۱) موسیٰ، (۲) داؤد، (۳) عیسیٰ اور (۴) حضرت محمدؐ کے چار مسلک، ان پیغمبروں پر چار آسمانی کتابیں نازل ہوئیں: موسیٰ پر توریت / داؤد پر زبور / عیسیٰ پر انجیل / حضرت محمدؐ پر قرآن۔

۴۹۔ چار منزل :- تصوف کی چار منزلیں، شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت۔

۵۰۔ چار میخ :- سزا دینے کا طریقہ۔ اوندھا یا چت لٹا کر چاروں ہاتھ پاؤں میخ سے باندھنا۔ یا ان میں میخیں ٹھوکنا۔

۵۱۔ چار یار :- پیغمبر اسلام کے وہ چار مشہور صحابی، جن کو اہل سنت بعد رسول یکے بعد دیگرے خلیفہ مانتے ہیں:
(۱) حضرت ابوبکر صدیق
(۲) حضرت عمر فاروق
(۳) حضرت عثمان غنی۔

(۴) حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

۵۲۔ **پنج ارکان:** اسلام کے پانچ ارکان، جن کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔
توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ۔ حج۔

۵۳۔ **پنج ارکانِ حج!** حج کے وہ پانچ رکن، جن کے بغیر حج پورا نہ ہو۔
(۱) احرام باندھنا۔ سلے ہوئے کپڑے اتار کر، تہ بند اور اور چادر سے ستر پوشی کرنا۔
(۲) سعی۔ صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا۔ یہ مکہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں۔
(۳) طوافِ کعبہ:۔ خانہ خدا کے سات چکر لگانا۔
(۴) وقوفِ عرفات:۔ عرفات کے میدان میں قیام۔ عرفات مکہ کے قریب ایک پہاڑ ہے۔
(۵) وقوفِ مزدلفہ:۔ مزدلفہ میں قیام۔ عرفات اور منیٰ کے کے درمیان ایک مقام ہے۔

۵۴۔ **پنج آیت:۔** قرآن کے پانچ سورے جو فاتحہ میں پڑھے جاتے ہیں: ——— / سورۂ کافرون / سورۂ اخلاص / سورۂ فلق / سورۂ ناس / سورۂ فاتحہ۔

۵۵۔ **پنج پوشیدہ:۔** پانچ مخفی علوم، کیمیا، لیمیا، سیمیا، ریمیا، ہیمیا۔

۵۶۔ **پنج تریاق:۔** ایک دوا جو زہر کا اثر دور کرنے کے لیے جنطیانا رومی، حب الغار، راوند، مر، اور شہد ملا کر بنائی جاتی ہے۔ آخر الذکر کو چھوڑ کر باقی کو تریاقِ اربعہ کہتے ہیں۔

۵۷۔ **پنج تن:۔** پانچوں تن سے

خدا کے نور سے پیدا ہوئے ہیں پانچوں تن
محمدؐ و علیؓ و فاطمہؓ و حسینؓ و حسنؓ

۵۸۔ **پنج سورہ:۔** قرآن شریف کے پانچ سورے جو خاص اہمیت کے حامل ہیں:
یٰسین (۳۶) الفتح (۴۸) الرحمٰن (۵۵) الملک (۶۷) المزمل (۷۳)

۵۹۔ **پنج عیب:۔** پانچ نقص، وہ گھوڑا جس میں پانچوں بڑے عیب موجود ہوں۔ یعنی عشری، کری، شب کور، کہنہ لنگ اور منہ زور ہو۔

۶۰۔ **پنج عیبِ شرعی:۔** چوری، زناکاری، قماربازی، شراب خواری، دروغ گوئی۔

عیبِ شرعی ترے پانچوں نہیں عالم پہ نہاں
دی ہے اندھیاری تری آنکھوں پہ مغشّع نے کہاں (سودا)

۶۱۔ **پنج کوہہ:۔** فوج کے پانچ حصے: مقدمہ، قلب، میمنہ، میسرہ، ساقہ۔

۶۲۔ **پنج گنج:۔** پانچ خزانے۔ نظامی کی پانچ مثنویوں کا مجموعہ، (۱) مخزنِ اسرار، (۲) خسرو شیریں (۳) لیلیٰ و مجنوں، (۴) سکندر نامہ، (۵) ہفت پیکر۔

۶۳۔ **پنج نوبت:۔** (۱) وہ پنج وقتہ نوبت جو بادشاہوں کے دروازے پر بجا کرتی تھی۔ پہلے تین وقت، مگر سلطان سنجر کے عہد سے پانچ وقت بجنے لگی۔
(۲) پنجگانہ نماز (۳) جنگ کے پانچ باجے: دہل، دمامہ، طبل، دف اور سنج (فارسی جنگ)

۶۴۔ **پنج ہنگام:۔** پنج گانہ نماز کے اوقات اردو میں پانچوں وقت، فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا۔ اسد

گو ادا کی نماز پانچوں وقت
نہ ملا یار وقت پر بھی گئے اسدؔ

۶۵۔ **شش پہ:۔** ایک قسم کا گرز، جس کے سر میں چھ پہلو ہوتے ہیں۔

۶۶۔ **شش جہت:-** چھ سمتیں، شمال، جنوب، مشرق، مغرب، فوق۔ تحت۔ فوق اور تحت (اوپر نیچے) کو چھوڑ کر باقی کو چار جہت کہتے ہیں سہ

شش جہت میں نہیں اس روئے کتابی کی نظیر
معنی تو ہیں ہر اک فقرے میں دو چار جہت (آتش)

۶۷۔ **شش روز:-** چھ دن، جن میں خدا نے کل مخلوقات کو پیدا کیا۔ شش روزہ کنایہ عالم اس لیے کہ دنیا چھ دن میں پیدا ہوئی۔

۶۸۔ **ہفت اقلیم:** مراد تمام دنیا سے ہے۔ کیونکہ زمانۂ قدیم میں جتنی دنیا معلوم تھی حکما نے اس کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر حصے کا نام اقلیم تھا۔ سکندر رُخ ہفت اقلیم اسی لیے کہلاتا ہے کہ بعض روایات کے مطابق اس نے تمام دنیا فتح کر لی تھی۔

۶۹۔ **ہفت الوان:-** اشیائے خوردنی، جو حضرت عیسیٰؑ کے لیے آسمان سے نازل ہوئیں۔ (قرآن مجید، سورہ ۵ آیات ۱۱۵-۱۱۴) تفصیل ان کی یہ ہے۔ روٹی، نمک، مچھلی، سرکہ، شہد، مکھن اور کاہو کا ساگ۔

۷۰۔ **ہفت امام:-** سُنّی فقہ کے سات امام:
۱۔ امام اعظم ابوحنیفہ۔
۲۔ امام شافعی۔
۳۔ امام مالک۔
۴۔ امام احمد بن حنبل۔
۵۔ امام ابو یوسف۔
۶۔ امام محمد۔
۷۔ امام زفر۔

۷۱۔ **ہفت پیر:-** قرآن مجید کے سات قاریوں سے مراد ہے۔
۱۔ نافع مدنی۔
۲۔ عبداللہ ابن کثیر مکی۔
۳۔ ابو عمرو بصری۔
۴۔ ابن عامر دمشقی۔
۵۔ عاصم کوفی۔
۶۔ حمزہ کوفی۔
۷۔ علی کوفی ملقب بہ کسائی۔ (لغاتِ پیرا ص ۲۵۔۱۳۴۴)
ہفت قرأت بھی انہیں سات قاریوں کے نام سے مشہور ہے۔

۷۲۔ **ہفت چشمۂ بہشت:** جنت کے سات چشمے جن کے نام کسی نے بڑی خوبی سے یوں نظم کیے ہیں سہ

کوثر و کافور و میم و سلسبیل
باز تسنیم و معین و زنجبیل

۷۳۔ **ہفت خوانِ رستم:-** ایران اور توران کے درمیان سات نہایت خطرناک منزلیں جنہیں رستم طے کر کے کیکاؤس بادشاہِ ایران کو قید مازندران سے چھڑا کر لایا تھا۔ سہ

کن مشکلوں سے ٹوٹے ساتوں جو آسماں تھے
اے تیر آہ یہ بھی رستم کے ہفت خواں تھے (قدر)

۷۴۔ **ہفت دریا:-** سات سمندر جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ دریائے اخضر	CASPIAN SEA
۲۔ دریائے عمان	SEA OF OMAN
۳۔ دریائے قلزم	RED SEA
۴۔ دریائے بربر	SEA OF BARBARY
۵۔ دریائے اوقیانوس	ATLANTIC OCEAN
۶۔ دریائے قسطنطنیہ	MEDITERRANEAN
۷۔ دریائے اسود	BLACK SEA

جدید تحقیق کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے۔ اوقیانوس بحر اعظم ہے۔ باقی بحیرے (سمندر) ہیں۔

۷۵۔ **ہفت دوزخ:-** سات دوزخیں۔ دراصل دوزخ تو ایک ہی ہے۔ مگر اس کے سات طبقے ہیں۔

جن کے نام یہ ہیں :

۱۔ سقر
۲۔ سعیر
۳۔ لظیٰ
۴۔ حطمہ
۵۔ جحیم
۶۔ جہنم
۷۔ ہاویہ

ان میں عذاب تدریجاً بڑھتا ہے۔ ہاویہ سب سے نیچے کا طبقہ ہے۔ اور اس میں عذاب سب سے زیادہ ہے۔

۷۶۔ ہفت سُبع :- (۱) مرکب ہے۔ ہفت یعنی سات اور سُبع (بروزن رُبع) سے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کا ساتواں حصہ۔ ہفت سبع کو ہفت منزل بھی کہتے ہیں اور مراد ہے۔ تمام قرآن سے۔

صاحب غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ قاریانِ سلف نے قرآن شریف کو سات حصوں میں بانٹ کر سات روز میں پورا قرآن ختم کرنا مقرر کیا ہے اور لفظ فمی بشوق کے حروف کی ترتیب سے سورتوں کا تعین کیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے :

پہلے دن	سورۂ فاتحہ سے شروع کرتے ہیں	ف
دوسرے دن	سورۂ مائدہ سے	م
تیسرے دن	سورۂ یونس سے	ی
چوتھے دن	سورۂ بنی اسرائیل سے	ب
پانچویں دن	سورۂ شعرا سے	ش
چھٹے دن	سورۂ والصافات سے	و
ساتویں دن	سورۂ قاف سے خاتمے تک	ق

ہر روز جو کچھ پڑھا جائے اسے ایک منزل کہتے ہیں۔

(۲) بعض کے نزدیک اس سے مراد معنا یعنی قرآن کی سات اقسام ہیں :

وعدہ، وعید، وعظ، قصص، امر، نہی، ادعیہ۔

۷۷۔ ہفت سلام :- قرآن مجید کی سات آیتیں جن کے شروع میں لفظ سلام آتا ہے۔

۱۔ سلام قولاً من رب رحیم ۔ پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائے گا)۔ ۳۶/۵۸
۲۔ سلام علیٰ نوح فی العالمین ۔ تمام جہان میں نوح پر سلام ۔ ۳۷/۷۹
۳۔ سلام علیٰ ابراھیم ۔ ابراہیم پر سلام ہو۔ ۳۷/۱۰۹
۴۔ سلام علیٰ موسیٰ و ھارون ۔ موسیٰ اور ہارون پر سلام ۳۷/۱۲۰
۵۔ سلام علیٰ الیاسین ۔ یاسین پر سلام ۳۷/۱۳۰
۶۔ سلام علی المرسلین ۔ اور پیغمبروں پر سلام ۳۷/۱۸۱
۷۔ سلام ھی حتیٰ مطلع الفجر ۔ یہ (رات) طلوعِ صبح تک (امان اور) سلامتی ہے۔ ۹۷/۵

۷۸۔ ہفت سلطان : (۱) سلطانِ خراسان۔ (۲) سلطان ابراہیم ادہم۔ (۳) سلطان بایزید بسطامی۔ (۴) سلطان ابوسعید ابوالخیر۔ (۵) سلطان محمود غزنوی۔ (۶) سلطان سنجر۔ (۷) سلطان اسماعیل سامانی۔

۷۹۔ ہفت قلم :- عربی و فارسی رسم الخط کی سات مشہور قسمیں۔ ثلث، محقق، توقیع، ریحان، رقاع، نسخ، تعلیق۔

۸۰۔ ہفت کشور :- دنیا کی سات سلطنتوں کے نام۔ چین، ترکستان، ہند، ایران، توران، روم، شام۔

بعض نے ترکستان کے بجائے فرنگ لکھا ہے۔

سات پہاڑ، قاف، دماوند، سراندیپ

۸۱۔ **ہفت کوہ** :۔ گلستان، (طوس کے قریب) دزن۔

دزکیاں۔ چین۔

(۱) سات آسمان (۲) ہفت تسبیح۔

۸۲۔ **ہفت منزل** :۔ (دیکھیے) (۳) سات وادیاں، جن کا

فریدالدین عطار کی مشہور مثنوی منطق الطیر میں ذکر ہے۔

۱۔ وادیٔ طلب۔

۲۔ وادیٔ عشق۔

۳۔ وادیٔ معرفت۔

۴۔ وادیٔ استغنا۔

۵۔ وادیٔ توحید۔

۶۔ وادیٔ حیرت۔

۷۔ وادیٔ فنا۔

کشمش، سرمش، انجیر، انگور، شفتالو،

۸۳۔ **ہفت میوہ** :۔ خرما، آلوچہ۔

وہ سات دعائیں، جو ایک ہفتہ میں

۸۴۔ **ہفت ہیکل** :۔ (ہر روز ایک) پڑھی جاتی ہیں۔

تاکہ پڑھنے والا امن و سلامتی میں رہے۔

آٹھ جنتیں: خلد، دارالسلام، دارالقرا

۸۵۔ **ہشت بہشت** ! جنتِ عدن، جنت الماویٰ، جنت النعیم،

علیین، فردوس۔

انھیں ہشت باغ / ہشت باغِ بقا / ہشت بستاں /

ہشت جناں / ہشت خلد / ہشت ماویٰ / ہشت مرعیٰ /

ہشت ہیکل رضواں بھی کہتے ہیں۔

خداوندی: سمع، بصر، کلام، ارادہ،

۸۶۔ **ہشت صفات** :۔ علم، حیات، قدرت، ادراک

انسانی: (۱) خدا کی معرفت۔

(۲) علم (۳) ہر حال میں شکر ادا کرنا۔

(۴) قسمتِ ازلی پر راضی ہونا۔

(۵) بلا اور رزق کی کمی پر صبر کرنا۔

(۶) خدا کے حکم کی تعظیم کرنا۔

(۷) خدا کی مخلوق سے محبت رکھنا۔

(۸) گناہوں سے بچنا۔

نورتن: لعل، یاقوت، فیروزہ، الماس

۸۷۔ **نہ گوہر** :۔ نیلم، زمرد، دُر، عقیق، مرجان۔

بارہ امام۔ (عربی اثنا عشری)

۸۸۔ **دوازدہ امام** :۔ (۱) حضرت علیؓ

(۲) حضرت امام حسنؓ

(۳) حضرت امام حسینؓ

(۴) حضرت امام زین العابدینؒ

(۵) حضرت امام محمد باقرؒ

(۶) حضرت امام جعفر صادقؒ

(۷) حضرت امام موسیٰ کاظمؒ

(۸) حضرت امام علی رضا بن موسی الرضاؒ

(۹) حضرت امام محمد تقیؒ

(۱۰) حضرت امام علی نقیؒ

(۱۱) حضرت امام حسن عسکریؒ

(۱۲) حضرت امام محمد مہدی۔

آخر الذکر قربِ قیامت میں ظہور فرمائیں گے۔

بارہ اماموں کو ماننے والا فرقہ اثنا عشریہ کہلاتا ہے۔

(فرہنگ آصفیہ ۲۴۲)

رسولِ خداؐ، فاطمہ زہراؓ،

۸۹۔ **چہاردہ معصوم** :۔ اور بارہ امام۔

قرآن شریف کو تیس پاروں میں تقسیم کیا

۹۰۔ **سی پارہ** :۔ گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو سی پارہ

یا پارہ کہتے ہیں۔ ؎

حالتِ دل کا بیاں کرتا کسی سے میں تو کیا

عشق میں اک مصحفِ رخسار کے سیپارہ تھا۔ (آتش)

۹۱۔ **ہفتاد و دو ملت** :۔ اسلام کے ۷۲ فرقے ؎

ہفتاد و دو فرقے حد کے مدعی ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حد سے ہیں
(ذوق)

بنیادی فرقے ۶ ہیں (رافضیہ، خارجیہ، جبریہ، قدریہ، جہمیہ، مرجیہ) ان میں سے ہر ایک کے بارہ بارہ فرقے ہیں جن کی مفصل کیفیت غیاث اللغات میں لکھی ہے۔
(فرہنگ آصفیہ ۱۹۷/۴)

۹۲۔ **صد برگ** :۔ سو پتیوں والا پھول، گیندا۔ ؎

خوب پھولی تھی باغ میں نرگس
گلِ صد برگ و جعفری ہے یاد (فائز)

۹۳۔ **صد پا** :۔ سو پاؤں والا کیڑا۔ کن کھجورا، یا کن کھجورار ہندی میں گوجر ~~गो जर~~ کہتے ہیں۔ انگریزی (CENTIPEDE) یہ زہریلا اور تیز رفتار کیڑا چار پانچ انچ تک لمبا ہوتا ہے اور ٹانگیں تین سو یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہیں۔

۹۴۔ **صد چراغ** :۔ سو چراغوں والا جھاڑ۔

۹۵۔ **صد و چہاردہ** :۔ ایک سو چودہ، قرآن مجید کے ۱۱۴ سورہ مراد ہیں۔

۹۶۔ **ہزار پا یا ہزار پایہ** :۔ ہندی میں اسے رام گھوڑی کہتے ہیں۔ برسات میں نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے ہزار ٹانگیں نہیں ہوتیں۔ کن کھجورے سے البتہ زیادہ ہوتی ہیں۔ انگریزی میں اسے (MILLIPEDE) کہتے ہیں۔ اس کے زہر نہیں ہوتا۔ رفتار سست ہوتی ہے۔

۹۷۔ **ہزار دانہ** :۔ ایک قسم کی تسبیح، جس میں ہزار دانے ہوتے ہیں۔ عام طور پر تسبیح میں سَو دانے ہوتے ہیں۔

۹۸۔ **ہزار داستان** :۔ بلبل ہزار داستان، ہزار آواز بھی کہتے ہیں ؎

یارب میرے خامہ کو زباں دے
منقار ہزار داستاں دے (نسیم لکھنوی)

۹۹۔ **ہزار ستون** :۔ (۱) اصطخر کا ایک مشہور محل جس میں ہزار ستون تھے۔ (۲) وہ محل جو سلطان ناصر الدین محمود نے رائے پتھورا کے قلعے میں بنوانا شروع کیا تھا۔ جسے غیاث الدین بلبن نے پورا کیا۔ یہ سنگِ خارا کا تھا۔ (۳) وہ عمارت جو سلطان محمد بن تغلق نے جہاں پناہ میں لکڑی کی بنوائی تھی۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے میں اس کے چوبی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ (فرہنگ آصفیہ۔ ص ۷۱۵، ۴)

۱۰۰۔ **ہزارہ** :۔ ہزار پتوں والا گیندا ؎

میں نے پھینکی تھی کلی اس کی طرف
اس نے شوخی سے میرے پھول ہزارہ مارا (ذوق)

طوالت کے خوف سے انسانی جسم اور علم نجوم (فلکیات) سے متعلق عددی مرکبات کو اس فہرست میں جگہ نہیں دی گئی ہے ان کا ذکر ایک دوسرے مضمون میں کیا جائے گا۔

نامی انصاری
۹/۱۰ پریڈ کانپور

کمال ہاشمی
کرنیل گنج کانپور

غزلیں

نہ دیرہ اڑتی ہوئی سوئے ہوئے گھر دیکھوں
شہر میں اس کے سوا کون سا منظر دیکھوں

دل کو اندیشہ کہ میلا نہ ہو رخسارِ سخن
حوصلہ یہ ہے کہ اک دن اسے چھو کر دیکھوں

چشمِ شب میں جو کھبے ایسا کوئی پیکر ہو
اک صنم اور تراشوں جسے دن بھر دیکھوں

دل کا اصرار کہ ممکن ہی نہیں راہِ نجات
درد کہتا ہے کہ دو گام تو چل کر دیکھوں

عکس رہ جائے گا تعبیر بکھر جائے گی
شام کی آنکھ سے کیا صبح کا منظر دیکھوں

حادثہ بن کے ابھرتے ہیں شناسا پیکر
دیکھنا چاہوں بھی اک بار تو کیوں کر دیکھوں

زخم لگتے ہیں کہاں، درد ابھرتا ہے کہاں
اپنے گھر میں بھی ذرا پھینک کے پتھر دیکھوں

یہ بھی اک طرفہ تماشائے سخن ہے نامی
فکر کی آنچ میں شعروں کو تپا کر دیکھوں

خوشبو کے پرندے جب گلشن سے نکلتے ہیں
موسم تری یادوں کے سو رنگ بدلتے ہیں

اک پیار کے رستے کے دونوں ہی مسافر ہیں
وہ چھاؤں میں چلتے ہیں ہم دھوپ میں چلتے ہیں

اس محرمِ نگہ ہی کا ہوتا ہے اثر یکساں
چاندی بھی پگھلتی ہے پتھر بھی پگھلتے ہیں

امید کے جگنو جب اٹھتے ہیں فضاؤں میں
کچھ غم کے شرارے بھی پلکوں پہ مچلتے ہیں

دیوانوں کی فطرت کو سمجھا ہی نہیں کوئی
وہ شہرِ نگاراں میں رکتے ہیں نہ چلتے ہیں

کل رنگ امیدوں کا کیا ہو کوئی کیا جانے
وہ روز تبسم کے انداز بدلتے ہیں

پڑتی ہیں پھواریں سی ہر سمت اجالوں کی
وہ رات گئے جب بھی بے پردہ نکلتے ہیں

چل جاتے ہیں جادو جب ان شوخ نگاہوں کے
ہم درد کے مارے بھی گر گر کے سنبھلتے ہیں

ملتی ہے نظر اپنی جس وقت کمال ان سے
قربت کے حسیں لمحے اشعار میں ڈھلتے ہیں

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی
صدر شعبۂ اردو مہاتما گاندھی
کالج سنبھل

سنبھل کے چند مجاہدینِ آزادی

انسانی شعور کے ارتقا کی مختلف منزلوں میں آزادیٔ فکر و اظہار کے چراغ کو روشن رکھنے کی جدوجہد ہر دور میں ملتی ہے۔ بقول رشید حسن خاں "جب کبھی بھی تاریخ کو پیچھے کی طرف لے جانے والے حکمرانوں نے انسانی ضمیر کی آواز کو دبانا چاہا ہے، آزادیٔ فکر و اظہار کے متوالے سرفروشی کی تمنا لے کر میدانِ عمل میں کود پڑے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب پہلی بار غیر ملکی حکمرانوں کو وطنِ عزیز سے باہر نکالنے کے لیے عملی قدم اٹھایا گیا تو وطن کے جیالے سپوت سر سے کفن باندھ کر گھروں سے نکل پڑے۔ بہادر شاہ ظفر، جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپے، نانا صاحب، بیگم حضرت محل، مجو خاں، احمد اللہ شاہ اور ان جیسے سینکڑوں فدائیانِ وطن کی قیادت میں انگریزوں سے لڑی جانے والی جنگ کی آگ ملک کے کونے کونے اور چپہ چپہ پر پھیل گئی۔ شمعِ آزادی کے پروانے دیوانہ وار نثار ہونے لگے۔ سینکڑوں نے جامِ شہادت نوش کیا، ہزاروں نے تختۂ دار کو چوما اور لاکھوں خانماں برباد ہوئے مگر حریت و آزادی کا جذبہ ظلم و زیادتی کے ساتھ ساتھ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ گرچہ انقلابیوں کو بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ناکامی ہوئی لیکن نفرت کے جو شعلے دلوں میں بھڑکے تھے، ان کی آنچ مدھم ضرور ہوئی سرد نہیں پڑی۔ یہ شعلے سلگتے رہے، وقت کا انتظار کرتے رہے اور جب وقت آیا تو انگریزی سامراج کو جلا کر خاک کر دیا۔"

روہیل کھنڈ جیسے تاریخ ساز خطے میں، ضلع مرادآباد کا قدیم ترین اور نامور قصبہ سنبھل جو اپنی تہذیب و تمدن، علم و دانش کے باعث فخرِ روزگار رہا ہے اور جہاں شیخ حاتم اور ملا عبدالقادر جیسے جید عالموں اور بزرگوں نے علم کی وہ شمع روشن کی جس کا اجالا دور دور پھیلا، ناموسِ وطن اور آزادیٔ فکر و اظہار کی خاطر ہمیشہ سرگرمِ عمل رہا ہے۔ اور وطن کی آن کی خاطر جان دینے والوں کی یہاں کمی نہیں رہی چنانچہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں یہاں کے سپوتوں نے نہ صرف تن من دھن کی قربانیاں دیں بلکہ بعد کی منازل بھی طے کرنے میں پیش پیش رہے۔
منشی امام الدین اکبر شاہ ثانی کے عہد میں نائب میر منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر کے عہدِ حکومت میں مرزا الٰہی بخش کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر اپنے وطن سنبھل واپس آ گئے۔ تحریکِ انقلاب کے دوران جب شہزادہ فیروز بخت سنبھل آیا تو منشی امام الدین نے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر شہزادے کا زبردست استقبال کیا۔ اس جرم کی پاداش میں انگریزوں نے انھیں مرادآباد میں پھانسی دے دی اور نعش چونے کی بھٹی میں پھونک دی گئی اور ان کی ساری جائیداد ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ انھیں دنوں مرادآباد کے مجو خاں کو ہاتھی کے پیروں تلے روند کر شہید کر دیا گیا اور ان کی ساری جائیداد ضبط ہو گئی۔ مرادآباد کی جیل انھیں کی املاک کے حدود میں واقع ہے۔

منشی امام الدین اور نواب مجو کی قربانیوں اور کارناموں پر ملک جتنا ناز کرے کم ہے۔ انھوں نے حبِّ قومی کا جو صور پھونکا تھا اس کی

آزادی نے ہر فردِ بشر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور سنبھل میں بعض ایسے مجاہدین وطن پیدا ہوئے جن کی خدمات ملک کی قومی تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔ منشی امام الدین کی شہادت کے کافی عرصہ کے بعد جب تحریک ترکِ موالات اور تحریک خلافت ۔۔۔ ملک بھر میں حکومت برطانیہ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ چکی تھی، ملک کے گوشے گوشے میں ہندو اور مسلمان متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو رہے تھے، حکومت کی طرف سے بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا، سنبھل میں بھی انگریز دشمنی اور وطن پرستی کی لہر تیز ہوئی ہے منشی جی کا خون رنگ لایا۔ ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ ساتھ ان گنت جیالے میدان کارزار میں کود پڑے۔ لالہ چند دلال، چودھری ریاست علی خاں، لالہ جیتن سروپ، مولوی عبدالوحید، لالہ روپ کشور، مولانا عبدالقیوم، رادھے لال پودار، مولوی نورالحسن، لالہ پریم پال، مولانا محمد اسماعیل، لالہ باسدیو اور نہ جانے کتنے سرفروشانِ وطن اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے اور اپنی بے مثال قربانیوں اور کارناموں سے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس قافلے کے افراد نے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں، دربدر کی خاک بھی چھانی، ظلم و ستم کا سامنا بھی کیا گھر بار بھی لٹایا لیکن حق گوئی و بے باکی کے ساتھ اس راستے پر چلتے رہے جو ملک و قوم کی خاطر انھوں نے اختیار کیا تھا۔

گرچہ سنبھل کے مجاہدین آزادی کی یہ فہرست نا تمام اور نامکمل ہے اور یہاں کے سرفدائیٔ وطن کی حکایت خونچکاں بیان کرنے میں تلاش و جستجو اور کافی وقت درکار ہے۔ تاہم اس مختصر مضمون میں صرف ان مجاہدوں و سرفروشوں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے جن کے حالات فی الوقت دستیاب ہو سکے تاکہ ہماری قومی تاریخ ان بزرگوں کے مجاہدانہ کارناموں سے بے خبر نہ رہے۔

منشی معین الدّین انصاری مرحوم:

منشی امام الدین کے بیٹے منشی حمید الدین مرحوم بعض ناگزیر مجبوریوں کے باعث تحریک آزادی میں عملی طور پر شریک نہ ہو سکے لیکن انھوں نے اپنے وطن پرور خیالات اور باغیانہ جذبات کو اپنی اولادوں میں منتقل کر دیا۔ یہ ان کے باغیانہ خیالات و رجحانات کا اثر تھا کہ ان کے بڑے بیٹے منشی نورالدین نے تحریک خلافت میں سرگرمی سے حصہ لیا اور میرٹھ ضلع کانگریس کے صدر کی حیثیت سے آزادیٔ وطن کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ آخرکار گرفتار ہوئے۔ اور میرٹھ جیل میں قید کر دیے گئے۔ اس وقت وہاں مولانا آزاد بھی اسیرِ فرنگ تھے، مولانا کے فیضِ صحبت سے ان کے خیالات کو جلا ملی۔ رہائی کے بعد گڑھ مکتیشور میں رہائش اختیار کر کے خدمتِ وطن میں لگ گئے۔

۔ ان کے چھوٹے بھائی معین الدین بھی بزرگوں کی تقلید میں پیچھے نہ رہے اور اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔

منشی معین الدّین کے مورثِ اعلیٰ مولانا محمود احمد عباسی مؤلف تاریخ سنبھل کے بقول مغلیہ سلطنت کے اراکین میں تھے۔ انصاری خاندان کے تین حقیقی بھائیوں میں ایک بھائی لکھنؤ میں آباد ہوئے جو فرنگی محل کے انصاریوں کے جدِ امجد تھے۔ دوسرے بھائی نے پانی پت میں سکونت اختیار کی جن کی یادگار مولانا حالی تھے، تیسرے باسٹر ضلع بجنور میں بسے۔ جہاں اب صرف شیخ فیضی صدیقی کا مزار اور مدرسے کے کھنڈرات باقی ہیں۔ شیخ صدیقی خاندان سے مناکحت کے تعلقات قائم تھے اکبر کے منشی ابوالفضل کی آخری اولاد ایک خاتون تھیں جو منشی جی کے مورثِ اعلیٰ کے نکاح میں آئیں۔ منشی کا لقب اسی کی یادگار ہے باسٹر کی ویرانی کے بعد یہ خاندان سنبھل آ گیا۔ منشی امام الدین اپنے زمانے کے کامیاب وکیل اور ۴۳ مواضعات کے زمیندار تھے اور سنبھل و مرادآباد میں کافی جائیداد تھی۔ مرادآباد کے محلہ اہ گنڈہ میں ان کا مکان مستقل مستقر تھا اسی گھر میں ان کے یہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ حمید الدین نام رکھا گیا۔ منشی امام الدین کی شہرت قلعہ معلیٰ تک پہنچ چکی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے میر منشی نے انھیں نائب منشی کی حیثیت سے قلعہ معلیٰ بلا لیا۔ اگرچہ وہ قلعہ کے حالات سے دل برداشتہ تھے لیکن بادشاہ نے انھیں چھوڑا نہیں، ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کی

گورنر اترپردیش، شری چندریشور پرشاد نرائن سنگھ ۲۹ مارچ ۱۹۸۲ء کو راج بھون لکھنؤ میں مرکزی
وزیر سیاحت و شہری ہوابازی مسٹر اے۔ پی۔ شرما سے محو گفتگو ہیں۔

وزیر اعلیٰ اترپردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۲۰ مارچ کو الہ آباد میں اپنے بڑے بھائی
جسٹس چندرشیکھر پرشاد سنگھ کے جسد خاکی کو کندھا دیتے ہوئے

مرکزی وزیر صنعت شری نرائن دت تیواری ۱۱ راپریل کو پریس کلب لکھنؤ میں کارکن صحافیوں کی ہندستانی فیڈریشن کے
ممبر صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں وزیر اطلاعات شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ، وزیر مالیات شری برہم دت اور وزیر
شری کاشی ناتھ مصرا بھی نظر آ رہے ہیں۔

مرکزی نائب وزیر برائے اطلاعات و نشریات شری عارف محمد خاں ۲۵ رمارچ کو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے ہال میں منعقد
میں مرحوم قاضی عدیل عباسی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔ تصویر میں وزیر قومی یکجہتی و تعمیرات عامہ ڈاکٹر عمار رضوی
رام سنگھ کھنّا، وزیر ریاست برائے اطلاعات شری کاشی ناتھ مصرا اور وزیر ریاست برائے صنعت شری محمد امین ال
ہیں۔ اس موقع پر دانشوروں، ادیبوں اور ادب دوستوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی

بیلرایاں (لکھیم پور کھیری) میں دھان خریداری مرکز پر خریداری
سے پہلے پنکھے کے ذریعہ دھان کی صفائی کی جا رہی ہے

پاکستان کے مشہور قوال حاجی غلام فرید صابری اور مقبول صابری ۲۰ اپریل کو ٹلٹ پور میں
بابا شدن شاہ کے سالانہ عرس کے موقع پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے

اس عرس اور قوالی کے موقع پر عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی پہلی صف
میں ڈاکٹر عمار رضوی بھی نظر آ رہے ہیں۔

وفات ہوگئی۔ میر منشی بھی راہی عدم ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر شاز شیون کا شکار ہوئے۔ وفاداروں کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ ۱۸۴۰ء میں منشی جی قلعہ چھوڑ کر چلے آئے۔ بعد کے حالات اور ان کی شہادت کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ حمید الدین ضعف بصارت کی وجہ سے تحریک آزادی میں حصہ نہ لے سکے لیکن دونوں بیٹوں نور الدین اور معین الدین کو اس ماحول میں ڈھالا کہ وہ ان کی جگہ پُر کر سکیں۔

منشی معین الدین اگست ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہی حاصل کی۔ اوائل عمر سے ہی قومی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کی رکنیت اختیار کی اور سماجی و قومی خدمت میں لگ گئے۔ ایک مدت تک سنبھل کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو باغیانہ تقاریر کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ جیل کی طرح طرح کی صعوبتیں جھیلیں۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی اردن معاہدے کے تحت رہائی ملی۔ ۱۹۴۲ء میں جب بمبئی میں کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تو انھیں بھی حراست میں لے لیا گیا۔ حکام نے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا کہ وہ کانگرس کی حمایت ترک کر کے انگریزوں کی وفاداری کا وعدہ کر لیں لیکن ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ ۱۰ر اگست کو انھیں مرادآباد جیل میں قید کر دیا گیا۔ جہاں مولانا حسین احمد مدنی پہلے ہی سے اسیر تھے۔ نظربندوں کو پانچ کوٹھریوں والا حصہ دیا گیا اور سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ایک ہفتہ کے اندر مولانا حفظ الرحمان مرحوم، مولانا سید محمد میاں، مولانا اسماعیل سنبھلی مرحوم، قاری عبداللہ، حافظ محمد ابراہیم مرحوم وغیرہ بھی یہیں بھیج دیئے گئے۔ حافظ ابراہیم اور منشی جی کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں ان کے بعض خیر خواہوں نے ان کی لاعلمی میں پیرول پر رہا کرنے کی درخواست دیدی جو منظور ہو گئی۔ لیکن انھوں نے رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں سید محمد میاں اور منشی جی کے سوا سبھی قیدی پیرول پر رہا ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں، جب گاندھی جی نے جواہر لال کو اپنا جانشین مقرر کر کے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بین الاقوامی سیاست نے نیا موڑ لیا، جنگ عظیم کے اثرات ہندستان میں بھی نمایاں ہونے لگے تو منشی جی کو بھی رہا کر دیا گیا اور وہ قومی و ملکی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۷ر فروری ۷۴ء کو ریاستی حکومت نے انھیں تامر پتر دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ۱۹۷۹ء میں ان کی وفات ہو گئی اور آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد اسمٰعیل: مولانا محمد اسماعیل کا تعلق ترک برادری سے ہے، سلطان التمش کے قلعہ سنبھل کے شمالی علاقہ میں ترکوں کی آبادی ہے۔ ۱۸۹۸ء میں پیدائش ہوئی۔ والد کا نام منشی کفایت اللہ ہے۔ جن کی ۱۹۱۴ء میں وفات ہو گئی۔ مولانا اسمٰعیل کی ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہی ہوئی پھر مدرسہ سراج العلوم میں داخل ہوئے۔ اسی زمانے میں جلیان والا باغ کا انسانیت سوز اور خونیں واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ سنبھل میں بھی عام ہڑتال کی گئی اور ایک بڑا جلسہ ہوا اس میں مولانا اسمٰعیل نے بھی نہایت جوشیلی تقریر کی۔ مقرروں میں مولانا سب سے چھوٹے اور ناتجربہ کار تھے۔ اسی تقریر سے ان کی قومی زندگی کا آغاز ہوا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی وفات کے چند ماہ بعد جب وہ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے، ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں اور تیزی آئی اور وہ پرجوش تقاریر اور باغیانہ خیالات کے باعث انگریزوں کی نگاہ میں کھٹکنے لگے اور ۲۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ دو تین دن کے بعد مرادآباد جیل میں مقدمہ شروع ہوا اور دو سال قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ جیل میں مولانا کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ کولہو چلانے، چکی پیسنے کے ساتھ ساتھ پنجرے میں بھی بند کیے جاتے تھے۔ رات کو سوتے وقت ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی جاتی تھیں اور ستمبر ۱۹۲۳ء میں رہائی ملی۔ قید فرنگ سے رہائی پا کر مولانا نے ادھوری تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ دی اور تقریباً ڈیڑھ سال مدرسۃ الشرع سنبھل میں فنون کا مطالعہ کیا پھر دیوبند جا کر سید انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر عثمانی اور دوسرے اساتذہ سے سند

فراغت حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا نعرہ دیا ۲۶ر جنوری کو پورے ملک میں یوم آزادی منایا گیا۔ ۱۲ر مارچ کو ملک کے قانون کی خلاف ورزی کے لیے مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ اس میں جمعیۃ العلما نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دائرہ حربیہ قائم کیا۔ اس سلسلہ میں مفتی کفایت اللہؒ، مولانا احمد سعیدؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا مبارک حسین سنبھلی گرفتار ہوئے ان کے بعد مولانا اسمٰعیل ساتویں ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتار کیے گئے اور چھ ماہ قید بامشقت کی سزا ملی۔ دہلی جیل کے بی کلاس میں رکھا گیا۔ اور ایک ماہ بعد ملتان جیل منتقل کر دیے گئے اور مدت پوری ہونے کے بعد رہا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر مولانا یونٹی بورڈ مرادآباد کے نگراں نامزد کیے گئے بورڈ کے امیدوار کی کامیابی میں مولانا کا بڑا ہاتھ تھا اور ان کا اثر کافی بڑھ چکا تھا۔ صوبہ جاتی اسمبلیوں کے انتخاب کے موقع پر جب مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو مسٹر جناح نے جمعیۃ کے بیس ممبر نامزد کیے۔ مرکزی بورڈ کے تحت صوبہ جاتی بورڈ بنے تو یو۔پی میں مولانا کو بھی شامل کیا گیا اور تحصیل بلاری وسنبھل سے انھیں امیدوار بھی بنایا گیا۔ ان کے مقابلے میں معروف شخصیت نواب عاشق حسین خاں کو کھڑا کیا گیا جو دس ہزار روپے کے مال گزار اور بیس سال سے میونسپل بورڈ کے چیئرمین تھے۔ لیکن الیکشن میں مولانا کو فتح حاصل ہوئی اور قوم پرور طبقہ کو بڑی تقویت ملی۔ الیکشن میں حکومت پرست جماعتوں کے مقابلے میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے امیدواروں کو شاندار کامیابی ملی۔ لیکن کامیابی کے بعد محمد علی جناح نے حکومت نواز شخصیتوں کو پارٹی میں شامل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مولانا نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اعلان کیا کہ وہ اپنے نصب العین چھوڑنے کے لیے نہیں، صرف الیکشن کی غرض سے بورڈ میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی ولولہ انگیز تقریر کا متن مولانا مدنی کی ایک کتاب میں شامل ہے۔ اس کے بعد ہی مولانا باقاعدہ طور پر کانگریس میں شامل ہو گئے۔

۱۹۴۰ء میں عدم تشدد پر مبنی تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی جس میں مولانا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا انجام کار انھیں مرادآباد میں گرفتار کر لیا گیا اور نو ماہ قید کی سزا ملی۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کے تحت پھر گرفتار ہوئے۔ تقریباً ایک سال بعد رہائی ملی۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں انھوں نے مسلم لیگ امیدوار کے مقابلے پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا اور دوسری بار ممبر چن لیے گئے۔ ممبر اسمبلی ہونے کے بعد انھوں نے مدرسہ شاہی کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ ۱۹۵۲ء کے الیکشن میں شریک نہیں ہوئے اور جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دہلی چلے گئے۔ چار سال خدمت انجام دینے کے بعد عمر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مستعفی ہو گئے۔ اور عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ امروہہ کے مدرسہ جلّہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے بلا لیے گئے۔ چار سال وہاں مقیم رہے۔ پھر آنند گجرات میں کم و بیش نو سال حدیث کے استاد کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔ آخر عمر میں وطن مالوف میں خاموشی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں معروف رہے۔ دو کتابیں اردو میں مقامات تصوف اور اخبار التنزیل شائع ہو چکی ہیں۔

۲۳ر نومبر ۱۹۷۵ء کو سنبھل میں ہی راہی ملک بقا ہوئے اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

[illegible] مانوی
پوسٹ مل، ضلع لکھنؤ

کرشن کی بانسری

لاکھوں صدیاں گذرنے پہ بھی دو دستو ہے جو اس قدر کرشن کی بانسری
ایسا لگتا ہے جیسے کہ سنتے ہیں ہم آج بھی جھوم کر کرشن کی بانسری

ہم نے دل میں محبت جگائی نہیں پریت من موہنا سے لگائی نہیں
ایک رادھا کے دل سے کوئی پوچھ لے کر گئی کیا اثر کرشن کی بانسری

اب بھی مدھوبن کے ماحول میں ہر طرف پریت اور گیت بکھرے نظر آئیں گے
پیار کا ایک جادو ہے ماحول میں اور ماحول پر کرشن کی بانسری
ایسا محسوس ہوتا ہے جذبات میں مسکراتی ہوئی چاندنی رات میں
دے گئی ہم کو پیامِ حیات آ کر یہ بن کے ہمراہ بر کرشن کی بانسری
آج کے دور کا خود غرض آدمی پھر تباہی کے پربت کی چوٹی پہ ہے
آج بھی ذہنِ انساں ہو مطمئن ذہن میں ہو اگر کرشن کی بانسری
کنس کے روپ میں سیکڑوں بھیڑیے ظلم کے ناگ ہیں سر اٹھائے ہوئے
پھر ضرورت ہے دنیا میں زندہ کریں آج ہر موڑ پر کرشن کی بانسری
ہم نے روحانیت کا گلا گھونٹ کر مادیت کو حاجت روا کہہ دیا
ہم نہ جنگوں سے دو چار ہوتے کبھی دل میں ہوتی اگر کرشن کی بانسری
دل دکھانے کے سامان کر تو لیے دل لبھانے کا سامان کوئی نہیں
بم و توپ و راکٹ مزائل ادھر اور تنہا ادھر کرشن کی بانسری
رات دن خوف سے دل پریشان ہے نسلِ انساں کے مٹنے کا امکان ہے
آج بھی امن عالم کا سامان ہے ایک جادو اثر کرشن کی بانسری
میں نہ میرا نہ رسکھان نہ رسکھان ہوں کرشن سے پیار کرتا ہوا انساں ہوں
میرے اشعار اشرف امر کیوں نہ ہوں ہو گئی جب امر کرشن کی بانسری

غزل

کوثر نظامی
۲۴، پانا نالا، لکھنؤ ۳

رُخ مُڑے یا نہ مُڑے ذہنوں کو موڑا جائے
یوں نئی نسل کو آزاد نہ چھوڑا جائے

لوگ کس طرح وطن چھوڑ دیا کرتے ہیں؟
ہم سے دو دن کے لیے شہر نہ چھوڑا جائے

کیفِ آواز سے ماحول کھنک اُٹھے گا
ساز ٹوٹا ہے مگر دل تو نہ توڑا جائے

دیکھیں کس کس کا لہو موجبِ رنگینی ہے
آج گلزار کی مٹی کو نچوڑا جائے

وہ جو طوفان کا رُخ موڑ دیا کرتے تھے
آج کشتی کا بھی رُخ ان سے نہ موڑا جائے

ایک پیراہنِ گلچیں کو بنانے کے لیے
کتنے پھولوں کا لہو روز نچوڑا جائے

اک محبت ہی ملاتی ہے بس انسانوں کو
رابطے کا یہ ذریعہ ہے نہ توڑا جائے

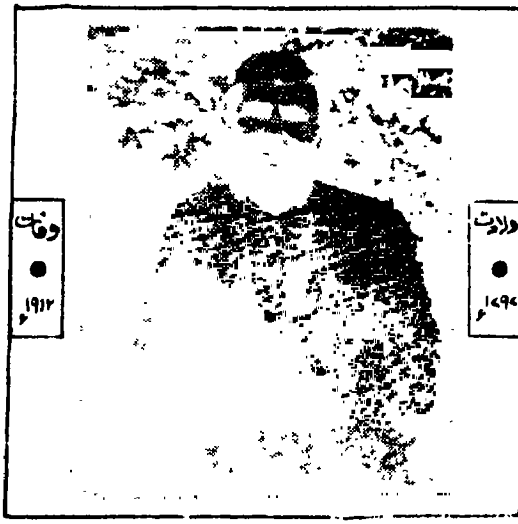
سحر ہے نیند ہے کیا ہے کوئی اٹھتا ہی نہیں
گھر کا گھر سوتا ہے کس کس کو جھنجھوڑا جائے

نظمِ میخانہ ہے فرسودہ ابھی تک کوثر
آج کچھ [illegible] روایات کو توڑا جائے

عطا فیض آبادی

میر انیس کے ایک گمنام شاگرد

جب اودھ کی صوبے داری کا قرعۂ فال سعادت خاں برہان الملک کے نام نکلا، اس وقت اودھ کی حالت انتہائی زبوں تھی۔ صنعت و حرفت، فن و ادب میں اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی لیکن برہان الملک اور ان کے لائق جانشینوں کی مسلسل کاوشوں کی بنا پر اس کے خط و خال نمایاں ہونے لگے اور ایک بار پھر تاریخ میں اس کا نام اپنے جمال و کمال کی بنیادوں پر ابھرنا شروع ہو گیا۔ رام لچھمن کی سرزمین ایک بار پھر امن و آشتی کے ساتھ علوم و فنون کا گہوارہ بن گئی۔ ایرانی تہذیب نے ہندستانی تہذیب کی آمیزش سے ایک نئی گنگا جمنی تہذیب کی داغ بیل ڈالی۔ شجاع الدولہ اور بہو بیگم صاحبہ کی سخاوتوں نے فیض آباد کو فیض بنیاد بنا کر دوسروں کے لیے سامان کشش مہیا کیے۔ ادب کی اجڑی ہوئی دنیا میں ایک تازہ روح پھونکی گئی اور اس طرح ہماری تہذیب کا ایک خاص اسلوب وجود میں آ گیا۔ اس تہذیب کے اولین معماروں میں احسان و گدا، خلیق و ضمیر و دلگیر تھے۔ اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھ کر انیس و دبیر تک پہنچ گیا۔ ان دونوں بزرگوں نے تہذیب و تمدن، اخلاق و کردار کو بلند کرنے میں نمایاں رول ادا کیا اور اپنی شعری کاوشوں کے ذریعہ بزرگان ادب کی تہذیب کو "زندہ اور متحرک" بنا دیا۔ اسی عہد میں بعض شخصیتیں ایسی بھی تھیں جو زمانے کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر کے دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ان کا شعری سرمایہ گرد و غبار میں منتشر ہو گیا اور کچھ پرتہہ در تہہ خاک پڑتی رہی، اسی خاک میں دبی ہوئی ایک شخصیت عطاؔ کی بھی تھی جن کی شعری خصوصیات کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں کرنا ممکن نہیں۔



آغا وزیر حسین خاں[1] عطاؔ کے بزرگوں کا سلسلۂ نسل خواجہ بیرم ترکمان گورنر موسل و بخارا زمانۂ سلطان اویس الخانی [illegible]ھ/ ۱۳۷۰ء سے ملتا ہے۔ ان کے اسلاف میں خواجہ بیرم کے بعد قرا محمد شاہ [illegible]ھ/ ۱۳۸۰ء۔ قرا یوسف شاہ ۸۰۲ھ/ ۱۴۲۰ء بداغ شاہ ۸۱۰ھ، جہاں شاہ ۸۴۱ھ حسین علی شاہ ۸۷۲ھ۔ شاہ ناصر میرزا ۹۴۷ھ۔ شاہ منصور میرزا ۹۸۶ھ (جاگیردار نیشاپور) شاہزادہ محمد قلی خاں بیگ شاہزادہ جعفر خاں بیگ۔ میرزا محمد مقیم (وزیر دہلی) میرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ گورنر اودھ سے ملتا ہے۔ اس

---

[1] عطاؔ کے نانا کا نام دلیر الدولہ محمد علی خاں عرف آغا میرزا حیدر اور خطاب فیروز جنگ تھا۔ وہ انیس کے ممدوحوں میں تھے۔ انیس نے اپنے ایک مرثیے کے خاتمے پر فیروز جنگ اور ان کی اولاد کے لیے دعائیہ اشعار نظم کیے ہیں جو آئندہ کسی مقالے میں پیش کروں گا۔ (راقم)

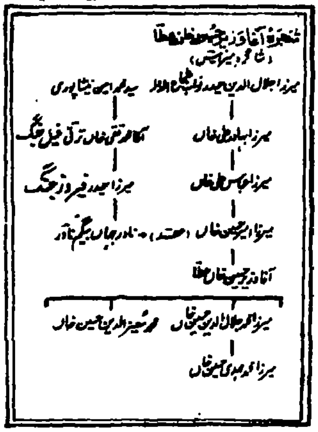
طرح عطاؔ خواجہ بیرم کی سولھویں پشت میں تھے۔ آغا وزیر حسین کے والد میرزا امیر حسین خاں کی شادی نادر جہاں بیگم نادرؔ بنت میرزا حیدر بن آغا محمد تقی خاں ترقیؔ سے ہوئی۔

عطاؔ ۱۸۹۰ء میں اپنے آبائی مکان معروف بہ خرد محل فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ قدیم دستور کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم ہوئی —— ان کی والدہ محترمہ نادر جہاں نادرؔ ایک اچھی شاعرہ تھیں، اس طرح کم سنی ہی میں شعری ذوق پیدا ہوا اور شعر کہنے لگے۔ نادرؔ کے والد میرزا حیدر کے تعلقات میر حسن خلیقؔ سے تھے ممکن ہے کہ وہ ان کو اپنا کلام دکھاتی ہوں۔ سید محمد ہادی لائقؔ مرحوم کے بقول "آغا ابو صاحب اور آغا وزیر حسین خاں عطاؔ میر انیسؔ کے شاگرد تھے، اور انہی کے احاطہ میں شعر و شاعری کے علاوہ تلوار چلانے کی مشق بھی کی جاتی تھی..."

سن شعور کو پہنچنے کے بعد انیسؔ کے سے قادر الکلام کے شاگرد ہوئے، ابتدا میں رباعی، غزل اور سلام پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ بعد میں غزل کی جانب زیادہ متوجہ رہے اور ہزاروں غزلیں کہیں۔

میر انیسؔ نے جب فیض آباد کی سکونت ترک کی تو عطاؔ بھی لکھنؤ چلے آئے۔ ابتدا میں ایک کرائے کے مکان میں رہے۔ کچھ عرصہ بعد کشمیری محلہ لکھنؤ میں پنڈت سورج نرائن بہادر زتشی کے مکان کے مقابل مکان تعمیر کرایا اور اسی میں ایک مردانہ نشست گاہ بھی نکالی۔ نقاشی کا شوق تھا، ناخن گیر سے کشکوسے کے کاغذ پر جانور اور پودے تراشتے اور قریبی احباب کے بچوں کو یہ کٹکیاں تقسیم کر دیتے، دن کے مشاغل کے بعد شب کا کھانا تناول فرما کر قرآن مجید کی کتابت فرماتے، یہاں تک کہ گرمی کے ایام میں چاند کی روشنی میں لکھا کرتے تھے۔ جب موسم سرما ہوتا تو چاندنی دیکھ کر افسوس کا اظہار فرماتے کہ ہائے اس روشنی میں کیونکر لکھوں، باہر سردی میں کیسے بیٹھوں۔ جب قرآن مجید مکمل کر لیتے تو دفتری سے اس کی نہایت حسین جلد بنواتے اور راحلہ سے اس کا جزدان سلواتے اور کسی نہ کسی دوست کو دے دیتے تھے۔ دوستوں میں ان کا نمبر پہلے آتا جو عطاؔ سے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کو مانگنے کی فرمائش کرتا تھا۔

جب تک فیض آباد میں رہے، ایک نہایت نفیس بجرہ بجار رہتا جس پر قریبی احباب کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے اور رہا شیر، مچھلی کا شکار کھیلتے تھے، سہ پہر کو شکرم (چوپہیا گاڑی) پر سیر و تفریح کو نکلتے اور رات ہونے سے قبل واپس چلے آتے تھے، اس کے بعد احباب کے آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ نشست گاہ میں ایک مخصوص جگہ پر ایرانی قالین بچھا رہتا تھا اسی پر گاؤ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ سامنے خاصدان اور پیچوان (ایک قسم کا حقہ) رہتا تھا۔ احباب اور مصاحبین کنارے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ہر شخص کی اس کے رتبے کے اعتبار سے جگہ مقرر تھی، وہ اپنے داہنے ہاتھ پر ایک جگہ خالی رکھتے تھے، جب میر انیسؔ ان کے پاس جاتے تو وہ اسی جگہ بیٹھا کرتے تھے۔ انیسؔ کے انتقال کے بعد ان کے پوتے دولھا صاحب عروجؔ کے لیے یہ جگہ مخصوص تھی جب دولھا صاحب عطاؔ کے پاس تشریف لے جاتے تو اسی مخصوص جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے تھے۔ ان کا پیچوان چند شخصیتوں کے علاوہ کوئی نہ پیتا تھا۔ ان لوگوں میں عروجؔ بھی شامل تھے۔ اس وقت کی تہذیب کے مطابق عطاؔ انھیں اپنے حقہ کی مہنال بڑھاتے اور دولھا صاحب اسے دو منٹ پکڑے رہتے اور دست بستہ ہتھیلی پر رکھ کر ادب کے ساتھ مہنال کو لگا کر عطاؔ کو واپس کر دیتے تھے۔ خصوصی اشغال میں ایک ہفتہ وار



مجلس بھی شامل تھی جس میں لکھنؤ کے مشہور سوزخوان اچھے صاحب سوزخوانی کرتے تھے۔

عطا نے کچھ عرصے کے بعد خود محل اپنے مختلف بھائیوں کو محل کر دیا۔ فیض آباد کی زمینداری ایک رشتے کے بھائی کو دے دی۔

عطا کو منقش انگوٹھیوں کا بہت شوق تھا، خصوصاً عقیق سرخ اور عقیق یمنی کے دلدادہ تھے۔ اگر کوئی شخص فروخت کرنے کی غرض سے کوئی نگینہ یا انگوٹھی لے کر آتا تو منھ مانگی رقم دے کر اسے خرید لیتے تھے، ان کے خاص ملازم رضا حسین ساتھ رہتے تھے وہی آنے والے کو ان کے چمڑے کے تھیلے سے رقم نکال کر دیا کرتے تھے۔

عطا گرمیوں میں انگرکھا اور جاڑوں میں اچکن پہنتے تھے، جو اس دور میں شرفا کا لباس تھا، وہ کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے، وہ جو کچھ نظم کرتے اسے محل سرا کی نجی محفلوں میں سناتے تھے، اور آنے والے شعرا کے کلام کو سن کر ان کی ہمت افزائی فرماتے، یہی نہیں بلکہ بعض شعرا کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔

۱۹۱۳ء میں عطا آخری مرتبہ عتبات عالیہ کی زیارت کو ہندوستان سے روانہ ہوئے۔ جب کاظمین کے سفر میں تھے تو دن بھر گھوڑے کی سواری کرتے اور شام کو کسی مناسب جگہ قیام فرماتے۔ اس سفر میں ان کے چھوٹے بیٹے محمد معیز الدین حسین خاں ساتھ تھے۔ وہاں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی، عطا بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئے، تھوڑی بہت دوا بھی ہوئی مگر مشیت الٰہی کے آگے کسی کو چارا نہیں۔ اسی مرض میں راہی جنت ہوئے۔ ان کے بیٹے نے انھیں وہیں سپرد خاک کیا۔

عطا کی غزلوں میں انیس کے کلام کی چھاپ نمایاں ہے۔ زبان و بیان میں بھی اہمیت ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر انیس سلام کہتے تو عطا بھی اسی زمین میں غزل کہہ دیتے تھے۔ مثلاً انیس نے ایک طویل سلام کہا جس کا مطلع یہ ہے ؎

مرا راز دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں [1]

عطا نے بھی اسی زمین میں غزل کہی جو درج ذیل ہے ؎

یہ دل ہے تمھارا ہمارا نہیں	کسی پر یہ راز آشکارا نہیں
سہے ظلم کیا کیا شب ہجر میں	بجز شکر دم ہم نے مارا نہیں
پھڑک کر نکل جائے گا دم مرا	ترے ہجر کا مجھ کو یارا نہیں
کیا قتل سب کو مجھے چھوڑ کر	کہو تو میں عاشق تمھارا نہیں
یہ داغ جگر ناز پروردہ ہے	کبھی دل سے میں نے اتارا نہیں
رہا خانۂ دل میں ان کا خیال	کبھی گھر سے میرے سدھارا نہیں
ہزاروں ہی گزرے رہ عشق میں	کسی نے بھی دم اس میں مارا نہیں
قلق ہجر کی شب کو کیا کیا رہا	ترا نام لے کر پکارا نہیں
نہ تو روبرو ہے نہ پہلو میں دل	کوئی زندگی کا سہارا نہیں
اڑائیں گے کیا آتش رنگ یاں	یہ دل کشتۂ لب ہے پارا نہیں
قسم جس کی چاہو صنم مجھ سے لو	کہ تم سے سوا کوئی پیارا نہیں
گماں اختر صبح کا ہے عبث	شرر آہ کا ہے یہ تارا نہیں
گیا اس کے کہنے سے قاتل کے پاس	کبھی دل کو میں نے تو مارا نہیں
کبھی بازی عشق میں اے جنوں	ترے ہاتھ ہمت میں ہارا نہیں
خدا سے کروں میں بتوں کا گلا	کہ اب ضبط کا مجھ کو یارا نہیں
عدم میں فرشتوں سے پوچھیں گے ہم	یہاں تو بتوں کا اجارا نہیں
جو کہتا ہو چھوڑا عطا عشق کو	تو کہتے ہیں کچھ میرا چارا نہیں [2]

عطا کی زبان عام فہم اور سادہ ہے، ان کے شعروں میں رنگ تغزل بھی ہے اور کہیں کہیں ناصحانہ انداز بھی، وہ حیات انسانی کی مشکلات اور زمانے کے مصائب کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں معشوق کی زلف کی نکہتوں اور اس کی کافر

[1] ملاحظہ ہو تجلیات انیس - مرتبہ: سید یوسف حسین شائق صفحہ ۴۳ - [2] ماخوذ از دیوانہ عطا قلمی صفحہ ۵۵

اوادں کا ذکر بھی ہے۔ چند شعر پیش ہیں ؎

زلفِ جاناں میں اور خوشبو ہے کیا یہاں ذکر مشک و عنبر کا
جان دی ہے جو گورے کھوڑے پر لوحِ مرقد ہے سنگ مرمر کا
کوچۂ زلف ہے وہ ٹیڑھی راہ چھوٹ جاتا ہے جی دلاور کا

بام پر آن کے چہرے سے الٹ دو جو نقاب
چاند رخ سے تری شرمائے گا کیسا کیسا

کیا کیا نہ جور ہم پہ حسینوں کے ہو گئے ظلم و ستم نہ کون سا ایجاد ہو گیا
مشہور تیرا عشق ہے اب آجکل عطاؔ مجنوں کا دور شہرہ فرہاد ہو گیا
گلہ نہیں جو ہزاروں ستم کیے مجھ پر کبھی تو حال پہ میرے وہ مہرباں ہوتا
عطاؔ نہ جذب محبت نے کی کشش افسوس تمہارا خانۂ دل یار کا مکاں ہوتا

ایک بوسہ کے لیے محشر میں کیا دو گے جواب
اے بت کافر جو خونِ عاشقاں ہو جائے گا

کروٹیں لیں صبح تک میں نے وہ سوئے چین سے
ہے گلا مجھ کو تو اپنی آہ بے تاثیر کا

گیسوئے مشکیں کمر تک آ گئیں ہیں آپ کی
خاطرِ نازک پہ یہ بارِ گراں ہو جائے گا

بے ثباتیٔ دہر کی اک دم میں ثابت ہو گئی
جس بگولے نے اٹھایا سر وہ زائل ہو گیا

عطاؔ کے دیوان میں ایسے اشعار بکثرت موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عربی و فارسی کے علاوہ ہندی زبان سے بھی واقف تھے۔ مثلاً

کھا کے سوگند ترے حُسن کی کہہ سکتا ہوں
منھ تو ہے چاند سا پر (کرم خوردہ) آہن تیرا

عاشق چشم فسوں ساز ہوں میں اے نرگس
میری نظروں میں سماتا نہیں جوبن تیرا

عطاؔ کی غزلوں میں مذہبی رنگ بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے، اس دور میں مجلسی زندگی پر مذہب اس حد تک غالب تھا کہ کوئی شاعر چاہے غزل کہے یا کسی اور صنف میں طبع آزمائی کرے، اپنے عقائد کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے، عطاؔ نے



بھی درج ذیل اشعار میں اس کا اعتراف کیا۔ فرماتے ہیں ؎

جب سے اوّل مد بسم اللہ ہو تحریر میں
سب حسینوں میں ہے یوں نقشہ تری تصویر کا

اگر وصفِ پیمبرؐ لکھ کے لکھوں وصفِ حیدرؓ کا
سریر کلک ہو نعرہ مجھے اللہ اکبر کا

معتقد ہوں میں اس غضنفر کا در اکھاڑا ہے جس نے خیبر کا
خوف کیا مجھ کو روز محشر کا ہوں ازل سے غلام حیدر کا

کربلا چھوڑ کے کیوں آئے عطاؔ جانبِ ہند
دیکھیے اب درِ آقا پہ گزر کب ہوگا

عطاؔ کا یہ دیوان بے ترتیب ۲۰×۳۰/۱۶ سائز میں ہے اور جگہ جگہ دیمک نے کھا لیا ہے۔ صفحات کی تعداد پانچ سو چھ اور ہر صفحہ پر چھ اشعار لکھے گئے ہیں۔ دیوان کی ابتدا زیر نظر مطلع سے کی گئی ہے ؎

معتقد ہوں میں اس غضنفر کا در اکھاڑا ہے جس نے خیبر کا

ابتدائی صفحات تلف ہو چکے ہیں یہاں تک کہ بعض غزلیں غیر مربوط ہیں۔ آخری صفحہ پر صرف دو شعر ہیں ؎

اب مآلِ دشت گردی خوب حاصل ہوگیا
کوچۂ دلدار میں قطع منازل ہوگیا
جب ترا تیرِ نگہ ظاہر میں بسمل ہوگیا
کوئی کیا جانے مزا کیا دل کو حاصل ہوگیا

انجیؔ نے عطاؔ کے بعض شعروں پر اصلاح بھی فرمائی ہے۔
مثلاً عطاؔ کا یہ شعر ؎

افسوس ہے کہ موت اسی وقت آئے گی
آہ رسا پہونچ گئی دیوار کے قریب

مصرعہ اولیٰ کو اس طرح بنا دیا ہے

افسوس ہے کہ موت اسی وقت آئی جب
آہ رسا پہونچ گئی دیوار کے قریب

یا یہ شعر ؎

ابھی جلے دلِ بلبل بہ شکلِ پروانہ
جو کوئی گل میں کوئی جلائے چراغ

مصرعہ ثانی بدل دیا گیا ہے جو درج کیا جاتا ہے

جو کوئی روغنِ گل میں کہیں جلائے چراغ

عطاؔ کے قلمی دیوان میں ردیفوں کو ترتیب وار نہیں تحریر کیا گیا ہے اس لیے راقم نے مطلع اول کے مصرع اول کو بنیاد بنا کر حرف آغاز سے فہرست ترتیب دی ہے جو درج ذیل ہے:-

مطلع اول	تعداد شعر
اگر وصف پیمبرؐ لکھ کے لکھوں وصف حیدرؑ کا	۲۸
اپنے بیمار کے پاس اب نہ اگر آئیے گا	۲۲
اس گلبدن کو میں نے جب گلعذار باندھا	۱۲
ارماں کوئی عاشق کے نکلنے نہیں دیتا	۱۵
اثر بس اتنا ہی آہ ہزار میں بھی تھا	۱۲
اپنے دل سے جوشِ وحشت میں ہے یہ تقریر اب	۲۹
آئی محفل میں مری شمع مزار آپ سے آپ	۱۵
ابھی تو زخم ہیں آلا ذرا تم دیکھتے جاؤ	۱۳
اڑائی بلبل خوش لہجہ نے زبان مری	۱۸
افتخارِ آدم و حوا ہوئے	۲۵
اس کی الفت مجھ کو خاطر خواہ ہے	۱۷
اُس کی نظروں میں نگارستان حیرت خانہ ہے	۱۹
اک پری پیکر پہ دل مفتوں ہوا	۱۲
(ب)	
برگشتہ صنم سے دلِ ناشاد نہ ہوگا	۱۸
بر سر رحم نہ کیوں ہوگا نگہباں اپنا	۱۴
بلبل کا کچھ لحاظ نہ گل کا کریں گے آج	۱۰
بلبل گلوں کو دیکھتی ہے خار کی طرح	۱۱
بے سبب نالاں نہیں قمری و بلبل باغ میں	۱۲
برگِ گل تک اب تو گلچینوں کے دامن میں نہیں	۱۷
باردر نخلِ تمنا کا شجر کب تک ہو	۱۲
بت پرستی میں ہے جو لطف وہ ہم دیکھیں گے	۱۹
(پ)	
پھیلا جب تیغِ قاتل کا گلو سے مل گیا	۱۵
پردۂ چشم سے اشکِ غمِ ہجراں نکلے	۲۰
پیامِ وصل سن کے مسکرا کے	۱۴
(ت)	
تشہیر کیا حکم دیا دربدری کا	۱۵
تیرے دل میں میری الفت کا اثر کچھ بھی نہیں	۲۸
تمھارے عارضِ تاباں سا گل چمن میں نہیں	۱۷
تری رفتار پر حور و ملک قربان ہوتے ہیں	۱۳
تعمیل حکم یار نہ کرنا گناہ ہے	۱۹
تسخیر کیا دل کو تری عشوہ گری نے	۱۶
(ج)	
جو یار کو نہ مرے شوقِ بوستاں ہوتا	۲۳
جب دوپٹہ آپ کا آب رواں ہوجائے گا	۳۳

★

نوٹ :- ہم ممنون ہیں جناب میرزا محمد مہدی حسین خاں دہشت کے جنھوں نے عطا کا دیوان استفادہ کے لیے فراہم کیا اور حالات بتائے نیز آغا وزیر حسین خاں عطا کی تصویر عنایت فرمائی۔ (دانش)

انتخابِ غالب پر ایک نظر : صفحہ ۱۰ کا بقیہ

۱ غالب ۔ اکمل المطابع دہلی طبع اول مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ص ۲۹ تا ۳۰ ، ص ص ۲۹۵ تا ۲۹۶ نیز ص ص ۲۲۲ تا ۲۲۳ (۲) اردوئے معلّیٰ (حصہ دوم) ؛ غالب ۔ مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ص ۳۱ تا ۳۲ ، ص ۳۴ نیز ص ۴۳ ۔ (۳) اردوئے معلّیٰ صدی ایڈیشن حصہ دوم ؛ مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ۔ مجلس ترقیِ ادب لاہور طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ص ۹۰ تا ۹۰ (۴) خطوطِ غالب (جلد ۱) ؛ مرتبہ مالک رام ص ص ۱۸۶ تا ۱۸۷ ، ص ص ۲۷۰ تا ۲۷۲ نیز ص ۴۴۶ ۔ (۵) خطوطِ غالب ۔ مرتبہ غلام رسول مہر ص ۲۶۷ ، ص ۴۴۴ ص ۴۲۶ نیز ص ۴۴۵ ۔ ۳۲ تفصیلات کے لیے لطائفِ غیبی اور سوالاتِ عبدالکریم پر میرے مضامین ملاحظہ ہوں ۔ ۳۳ غالب نامہ شیخ محمد اکرام ۔ احسان بک ڈپو لکھنؤ ص ۱۲۳ (حاشیہ) ۳۴ بہ حوالہ ذکرِ غالب ، ص ۱۴۳ (حاشیہ ۲) نیز ص ۱۰۵ ۔ ۳۵ د۔ک اردوئے معلّیٰ صدی ایڈیشن حصہ سوم ؛ مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی مجلس ترقیِ ادب لاہور طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ص ۱۱۲ تا ۱۱۳

✦

غزل

جعفر عسکری
سرور منزل ممتاز محل کمپاؤنڈ
گولہ گنج، لکھنؤ

شہر میں ہم ہی نہیں اک بے نشاں آباد ہیں
بے در و دیوار کے صدہا مکاں آباد ہیں

زیرِ صحرائے تپاں بھی سرد چشمے ہیں رواں
برف زاروں میں بھی تو آتش فشاں آباد ہیں

اک شعاعِ شادمانی تک نہیں جن کو نصیب
اُن کے سینوں میں بھی رخشندہ جہاں آباد ہیں

ہو گئے حالانکہ سب ہی نذرِ برقِ حادثات
خاک ہو کر بھی مگر وہ آشیاں آباد ہیں

سخت مشکل ہے مٹانا دہر سے ہم کو کہ ہم
خانماں برباد ہو کر بھی یہاں آباد ہیں

اپنے ویرانوں کی رونق ہیں ازل سے خار و خس
اور ہم سمجھیں انھیں کو گلستاں آباد ہیں

اب فلک سے آگ برسے یا زمیں شق ہو کہ ہم
بس غنیمت ہے کہ زیرِ آسماں آباد ہیں

وصل کے صحرا میں جعفر پھر بہم ہوں گے ضرور
ہم تو بس تیرے لیے اے جانِ جاں آباد ہیں

عشرت بریلوی
محلہ پنجاب پورہ گلی شیر محمد خاں بریلی

رنگین حجابوں میں ہے نازِ گلِ تر سے
پہچان رہا ہوں تمھیں اندازِ نظر سے

توبہ پہ ترشح سا ہے موسم کے اثر سے
انداز بتاتے ہیں کہ بادل کہیں برسے

لاچار سمجھ کر کوئی غمخوار نہ ہو جائے
میں بچ کے نکل جاتا ہوں دنیا کی نظر سے

مرنا ہے تری راہ میں اک صورتِ ہستی
جینے کی تمنا میں گزرتا ہوں اُدھر سے

آنکھوں نے دُعا کی ہے اُٹھا کر کفِ مژگاں
ایسا نہ ہو آنسو کہیں گر جائیں نظر سے

اے شانِ کریمی مجھے مایوس نہ کرنا
تقدیر بدلتا ہے دُعاؤں کے اثر سے

گستاخیِ نظارہ کا الزام نہ دیجے
مجبور تھا عشرت خلشِ ذوقِ نظر سے

عصرِ جدید اور انسان

احسان خاں انباروی

سوال

یہ جہاں یہ جلوہ گاہِ آب و رنگ
ہائے یہ جولانگہِ طاؤس و چنگ
ہر نظر آئینۂ سرشارِ ذوق
ہر نفس صد شعلۂ پیغامِ شوق
ایک اک رُخ گل فروش و لالہ بار
ہر تبسم جلوۂ موجِ بہار
گردشِ مینا و پیہم رقصِ جام
زندگی راحت گہِ عیشِ دوام
عصرِ نو پایندہ و تابندہ تر
یہ شبِ عہدِ کہن کی ہے سحر
فکرِ انساں آج ہے کتنی بلند
جس نے ڈالی ماہ و انجم پہ کمند
پھر بھی ناآسودہ کیوں انسان ہے
چہرۂ امید کیوں بے جان ہے

ہر تگ و تازِ تمنا بے ثبات
ہے کہاں تنویرِ عرفانِ حیات؟

جواب

ایک وہ آدم کہ تھا رازِ حیات
سوز و سازِ آرزوئے کائنات
تو ہے خود اپنی شکستِ آرزو
مستیٔ کردار سے خالی سبو
ایک وہ اور عشق کی سرمستیاں
تو ہے اور عقل و خرد کی پستیاں
گرچہ ہے آئینۂ دل پاش پاش
کاش رازِ زندگی تجھ پر ہو فاش
کر لہو سے پھر یقیں کی تیز لَو
جس سے روشن ہو ضمیرِ عہدِ نو

پھر وہی جذبِ جنوں بیدار ہو
آبلہ پائی حریفِ خار ہو
یہ حرم، یہ دیر، یہ بزمِ مدام
یہ جہانِ کاخ و کو بدلے تمام
پھر کوئی رنجِ گرانباری نہ ہو
پھر کوئی دردِ سبکساری نہ ہو
سوزِ نظارہ کا ہو دل کو پیام
پھر کہے دیوانۂ لغزیدہ گام
سجدہ ہائے شوق رقصِ در جباہ
اے تمنائے ہزاراں جلوہ گاہ

(افسانہ)

بلقیس شبیبہ
ڈونڈہ میں اکولہ

دھلیز کا قیدی

" بیلا ...." بھیا نے اسے آواز دی " تیری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ان کے لیے اک پیالی چار بنا لا ۔"

ماں اتنے دن سے بیمار ہے بھیا کو اتنی فرصت نہ ملی کہ ماں کو آکر دیکھ جائیں " رسوئی میں آکر بیلا بڑبڑانے لگی " اس روز دیدی کو بخار تھا تو بھیا نے انھیں ڈانٹ کر اٹھایا تھا کام کرنے کے لیے .... اور اب ! بھابی کی ذرا سی طبیعت خراب ہے تو کتنی ناز برداری ہو رہی ہے ۔" چار کی پیالی بھابی کے ہاتھ میں تھما کر وہ پاؤں پٹکتی کمرے میں آئی ۔ غصّے سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا ۔ وہ بے حد جذباتی لڑکی تھی ۔

" ماں ... ! " وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی ماں سے روٹھی ہوئی آواز میں بولی " تم نے ہمیں پیدا کیوں کیا ؟ اس کے غصّے کا سبب ماں کی سمجھ میں نہ آیا ۔ لیکن اس کی بڑی بہن بینا اس کی یہ گستاخی برداشت نہ کر سکی ۔ سلائیاں اور اون کا گولا ٹیبل پر رکھ کر وہ اٹھی اور بیلا کے قریب جا کر اس کے گال پر ایک چانٹا جڑ دیا " بدتمیز ! "

بیلا نے منھ سے کچھ نہ کہا ۔ گال پر ہاتھ رکھے دوڑتی ہوئی بستر پر اوندھی گر گئی اور سسک سسک کر رونے لگی اماں نے دکھ سے اپنے ہونٹ سکیڑے اور بستر سے اٹھ کر کراہتی ہوئی کمرے کے باہر نکل گئی ۔ بینا کو اچانک اپنی زیادتی کا احساس ہوا ۔ وہ بہن کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور آہستہ سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا ۔ اس کا خیال تھا کہ بیلا غصّے سے اس کا ہاتھ جھٹک دے گی ۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ بیلا کے رونے میں اور شدّت آگئی ۔

" بیلا " بہن پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں گھماتی ہوئی بولی " تجھے ماں سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی "

پھر کس سے کہوں ؟ " وہ اک دم سیدھی ہوتی ہوئی غصّے سے بولی ۔ دراصل وہ دیدی کے چانٹے کی چوٹ سے نہیں تلملائی تھی ۔ بلکہ بھیا کے بولوں کا درد جسے وہ سہہ رہی تھی جو الاؤ کی طرح پھوٹ پڑا تھا ۔

تو نہیں جانتی بیلا ماں ہم دونوں کے لیے کتنی دکھی رہتی ہے " بینا نے اداسی سے کہا ۔

" اسی لیے تو کہتی ہوں دیدی بھگوان نے ہم دونوں کو کیوں پیدا کیا " وہ بہن کی گود میں سر رکھ کر بلک اٹھی ۔ بینا کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے " بھیا کتنے خود غرض ہیں " وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی ۔ پڑھائی کا سارا بوجھ انھیں تو نہیں اٹھانا پڑ رہا تھا ۔ فیس معاف ہونے کے لیے بیلا نے فارم بھر دیا تھا ۔ رکشا سواری کا بھی کوئی خرچ نہیں ۔ بے چاری پیدل جانے کے لیے تیار تھی ۔ صرف تھوڑی سی کتابیں اور بھیا بھابی کی اجازت .... لیکن بھیا کتنی بری طرح دہاڑے ....

" یہاں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو رہا ہے ۔ اور تمھیں کالج

بڑھنے کے چونچلے سوجھ رہے ہیں۔ کسی کو میری فکر نہیں۔ میں سب کے لیے کولھو کا بیل بن گیا ہوں ؟ بھیا کو تو ذرا سی بات پر بھاشن دینے کی عادت ہے...... بے چاری بیلا.... شوق لی ماری.... اپنی کلاس فیلو ہم سن لڑکیوں کو کالج میں ایڈمیشن لیتا دیکھ کر اس کے بھی من میں ارمان کی کونپل پھوٹی تھی۔ لیکن بھیا نے اسے اکھاڑ پھینکا۔

بھابی کی زبان سے اپنا نام سن کر مینا کے قدم ٹھٹھک گئے۔ اندر بھیا اور بھابی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ دروازے کے پاس ہی رک گئی۔

"لڑکا کیسا ہے؟" بھابی کے لہجے میں تجسس اور اشتیاق تھا۔

"لڑکا.....!" بھیا کا ایک قہقہہ ابھرا۔ انھوں نے آہستہ سے بھابی سے کچھ کہا جسے بینا نہ سن سکی۔

"ماں کیا کہیں گی!" بھابی کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔

"وہ کیا کہہ سکتی ہیں؟" بھیا تیکھے پن سے بولے۔ "بابا کے مرنے کے بعد اکیلا ہی سب کا بوجھ اٹھا رہا ہوں۔ ان کا چھوٹا بیٹا بھی تو ہے۔ کیا اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ کر تو یہ، دیا دھرا کیا سب ہمارے ہی لیے ہے؟"

"آہستہ بولیے۔ بار بار دُہرا کر سب کیے دھرے پر پانی نہ پھیریے۔" بھابی نے کہا "ماں جی سے ذکر کیا آپ نے۔؟"

"نہیں..." بھیا کا موڈ ایک دم آف ہو گیا "تم بتا دینا" وہ غصے سے بولے "اور ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ اب کوئی اڑچن نہ ڈالیں۔ بیلا بھی اب شادی لائق ہو گئی ہے۔ دو دو شادیوں کے لیے روپیہ پیسہ کہاں سے آئے گا۔ بابا میں فدا دور اندیشی نہ تھی۔ چار بیٹے نہ چھوڑے لڑکیوں کے لیے... آخر میری بھی تو اولاد ہے۔ ان کے لیے بھی سوچنا ہے۔ بیگار کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے ہی عمر آدھی ہو گئی۔.....!"

بہت دیر سے بھابی ماں کے پاس بیٹھی کچھ کہہ رہی تھیں۔

بینا کے کانوں میں بھابی کے یہ شبد پڑے۔

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دینے لینے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ جہیز کے نام پہ اک کوڑی بھی خرچ نہ ہو گی" ماں نے کوئی جواب نہ دیا، یا دیا بھی ہو تو اس قدر رازداری سے کہ بینا نہ سن پائی۔

چاروں طرف خاموشی کا راج تھا۔ برآمدوں میں مدھم مدھم بلب روشن تھے۔ گھر کے در و بام تک اونگھ رہے تھے۔ باہر موٹر سے لوگوں کے اترنے، بوٹوں اور سلیپروں کی ملی جلی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ رات کا کوئی گیارہ بجا ہو گا۔ اس نے اک نظر آسمان پر ڈالی۔ مسکراتا جھلملاتا چاند۔ بھاگتے دوڑتے روشن سیارے...... آسمان کی دنیا جاگ رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کے ارد گرد کا ماحول اونگھ رہا تھا..... رو رہا تھا.... اس کے پیروں تلے سے جیسے زمین کھسک رہی تھی۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں موند لیں، جیسے خوابوں کی شاہراہ پر چل رہی ہو۔ اس کے ارمانوں کی کلیاں اس کے ہی قدموں تلے روندی جا رہی ہوں۔ اسے ایک ٹھوکر لگی۔ وہ گرا ہی چاہتی تھی کہ تارا موسی نے اسے اپنے ضعیف بازوؤں پر سنبھال لیا۔ اسی جگہ اس کے خوابوں کا شیش محل گر کے چکنا چور ہو گیا۔

"سنبھل کے چلو بیٹی!" موسی نے بڑے پیار سے کہا۔

"یہ پہلی ٹھوکر ہے"..... بینا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اب نہیں گروں گی"

"پلّو اوپر اٹھاؤ..... آنکھیں کیوں موند لی ہیں؟" تارا موسی نے اس کا آنچل سرکا کر کہا۔

"اب انھیں بند ہی رہنا چاہیئے..... وہ آگے بڑھی۔

ایک قدم!.... دو قدم!..... تین قدم....!! ہر قدم کے ساتھ اس کے ارمانوں کا چراغ گُل ہوتا گیا۔ اس کے راستے کی تاریکی بڑھتی گئی۔......! اب خیالوں کے سارے ہی فانوس بجھ گئے تھے...... چاروں طرف بکھرا ہوا اندھیرا...... ارمانوں کی لاشوں پر روتی بین کرتیں اس کی اپنی

آہیں... گھٹی گھٹی کراہیں...... یا ہر ابھی تک آہٹیں ہو رہی تھیں.... لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ بالائی منزل پر قدموں کی آہٹیں ہو رہی تھیں۔ شاید گھر والے اپنی اپنی خواب گاہوں میں جا رہے تھے۔

"کیسی گھٹن! کیسی خاموشی.... ! کیا اسے ہی کہتے ہیں لڑکی کی جنت؟.... ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کوئی بستا ہی نہیں.... آہ! میرا دل گھبرا رہا ہے تارا موسی۔"

"گھر.... رشتے دار چھوڑنے کے بعد پہلی دفعہ سسرال میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے بیٹی۔" موسی نے بینا کو تسلی دی۔

"مگر موسی جی!" بینا حیرت سے بولی۔ "یہاں تو نہ باراتی ہیں نہ باجے گاجے.... یہ کیسی شادی ہے؟ ایسا لگ رہا ہے میری لاش کو لال کفن پہنا کر اس کمرے کے تابوت میں اتار دیا گیا ہے..."

"چھی! ایسی باتیں نہ کرو۔" موسی بولیں۔ "دیکھتی نہیں ہے۔ کتنی بڑی حویلی ہے.... کتنا خوبصورت کمرہ ہے.."

موسی مرعوب کن نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولیں: "بہت بڑے لوگ ہیں شاید شور ہنگاموں کے عادی نہیں.... اور پھر بیٹی..." بڑی ہمت کر کے تارا موسی نے صحیح بات کہہ ہی ڈالی: "دوہاجو کی شادی ہے۔ اس میں بینڈ باجے تھوڑے بجتے ہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے.... تو بہت تقدیر والی ہے بینا بیٹی! بہت بڑے گھر بیاہی گئی ہے... بھگوان نے کس بات کی کمی دی ہے.... اک پیسے کا بھی جہیز نہ مانگا۔"

بینا نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ یہ باتیں تو وہ بھیا بھابی کی زبانی سنتے سنتے بیزار ہو چکی تھی۔ کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ بینا نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اس کے سامنے والے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئے۔ بینا نے گردن جھکا لی۔ دل نے کہا۔ یہ تیرا عروسی کمرہ ہے ــــ یہ تیری سہاگ رات ہے.... یہ تیرے خوابوں کا شہزادہ ہے.... پورے سراپے میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں.... میٹھی میٹھی سی کسک.... کسی نے آہستہ سے اس کا گھونگھٹ ہٹایا.... وہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی...

"گھر میں کوئی بڑا بوڑھا نہیں جو تمھارا ایک دولھن کی طرح سواگت کرتا۔" اک بھدی اور کرخت آواز بینا کے کانوں سے ٹکرائی۔ ادھر بینا کے سارے تار جھنجھنا کر ٹوٹ گئے۔

"میرے اپنے پانچ بچے ہیں..... دو چھوٹی بہنیں ہیں... تین بن بیاہے بھائی ہیں.... آج سے یہ ساری ذمے داری تمھیں سونپ رہا ہوں...." بینا نے پہلی بار جھجکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا.... اسے یوں لگا جیسے وہ اچانک بہت بوڑھی ہو گئی ہو۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ اس میں نہ اقرار کی ہمت ہوئی نہ انکار کا حوصلہ....

پتہ نہیں.... رات بھر..... وہ سوتی رہی..... یا جاگتی رہی.... مگر اس کے دل کو کوئی دونوں ہتھیلیوں میں دبائے بوند بوند لہو ٹپکاتا رہا۔ جیسے رات بھر صلیب پر ٹنگی رہی ہو.... غربی دریچہ سے چاند ڈوبتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کی طرح چاند کی چاندنی بھی ماند پڑ گئی تھی وہ آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا ــــ اس کے دل کی طرح... انھوں نے کروٹ بدلی "تم جاگ گئی ہو؟"

"نیچے جاؤ.... کچن میں رسوئیا موجود ہے۔ ملا سے بچوں کا منھ ہاتھ دھلوا کر اپنی نگرانی میں انھیں ناشتہ کروا کر سب کو تیار کر کے اسکول روانہ کر دو۔"

وہ اٹھی.... مرے مرے قدموں سے..... جیسے میلوں چل کر آئی ہے ــــ

"اور سنو ــ" انھوں نے تکیے سے قدرے سر اٹھا کر کہا۔ وہ دروازے تک جا کر رک گئی۔

"مجھے دیر تک سونے کی عادت ہے۔"

"اچھا!" وہ بہت آہستہ سے بولی۔

"تم نہیں تھیں تو میں مرلی سے اپنے ہاتھ پیر دبواتا تھا... مگر اب.... ! تم آ گئی ہو نا.... ذرا بچوں سے جلدی نپٹارا کر کے اوپر چلی آنا...." وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

کر بیٹھے۔ بینا کے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ جیسے اسے کوئی خوفناک بات یاد آگئی ہو۔ اس کے بدن کا رُواں رُواں پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے میکے جانے کی اجازت مانگی۔

"جلدی لوٹ آنا سمجھیں.....؟ تمھیں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہیئے۔ اتنا بڑا گھر... نوکر چاکر سب کی دیکھ ریکھ کون کرے گا؟"

یہ اس انداز سے کیوں گفتگو کرتے ہیں؟ بینا سوچنے لگی کیا انھیں نرمی سے پیار سے گفتگو کرنا نہیں آتی!"

پیار کی گرمی سے عورت کتنی جلد پگھل جاتی ہے....
لیکن یہ تو ایک شریک سفر کی طرح نہیں بلکہ ایک گدھے کی طرح مجھ پر اپنی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ لاد رہے ہیں۔

"دو روز میں خود ہی لوٹ آؤ گی یا ادھر سے نوکر بھیجنا ہوگا؟" وہ بڑی رعونت سے بولے

"جی..... میں..... خود ہی..... چلی آؤں گی" ——

وہ ڈرتے ڈرتے مجرم کی طرح سر جھکا کر بولی۔ وہ موٹر سے اتری گھر میں جانے کے لیے اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ ماں نے لپک کر اسے اپنی چھاتی سے لگایا۔ وہ بمشکل اپنے آنسو روک سکی۔

بھابی نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی بولیں "ہماری بینا تو "رانی" بن گئی ہے۔" رانی....."

جیسے بھابی نے اک تیر اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔

"ہاں.... شاید....!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز میں سسکیوں کی گرہیں پڑ گئیں۔

"میری پیاری دیدی..." بیلا اس سے آکر لپٹ گئی.."

ابھی تو ہونا دیدی...."

"پیار کے یہ بول سننے کے لیے وہاں میرے کان ترس گئے تھے" بینا نے بہن کو لپٹاتے ہوئے کہا۔

بیلا نے حیرت سے بہن کی طرف دیکھا۔ اسے بہن کی آنکھوں میں اس کے ٹوٹے خوابوں کی کرچیں نظر آگئیں۔ "جیجا جی تو اچھے ہیں نا؟..."

"ہاں....! لیکن.... بھابی میں "رانی" نہیں صرف اس گھر کی "نگراں" اور چوکیدار ہوں"

"سہاگ کا تاج پہن کر عورت یہ سارے کام اک حکمراں کی طرح بخوبی کر سکتی ہے" — بھابی بولیں "وہ تو.... مجھے.... اپنے بچوں کی آیا.... ان کی خدمت گزار.... اور اپنے گھر والوں کی تابع دار سمجھتے ہیں — پیار کے دو بول بھی مجھے نہیں دے سکتے.... بس حکم دیتے ہیں ابھیمان کے ساتھ۔ وہ صرف میرے حاکم ہیں، مالک ہیں.... اور بس...."

آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی۔

+

غزلیں

نظیر صفی پوری
۳۳۵/۱۶۴ محمود نگر لکھنؤ

سایہ کے دھوپ بھی دیکھو غم کی کارگاہوں میں
چھاؤں ڈھونڈھنے والو زلف کی پناہوں میں

فرصتِ گنہ جن کو ہے وہ لوگ کیا جانیں
کیسا لطف ملتا ہے بے کیے گناہوں میں

اب کبھی وہ بھولے سے اس طرف نہیں آتے
روشنی رہی جن سے دل کی شاہراہوں میں

کوئی پڑھ نہیں سکتا روشنی سے آنکھوں کی
اس کا نام میں اب تک لکھ رہا ہوں راہوں میں

جب خوشی کا وقت آیا صلح کی نہیں ہم نے
زندگی گذری ہے غم کے خیر خواہوں میں

حاشیوں پہ راہوں کے یہ پڑے ہوئے سائے
زندگی کی قبریں ہیں غم کی خانقاہوں میں

اے نظیرؔ کیا ڈھونڈیں دوسروں کے عیبوں کو
ہم تو غرق رہتے ہیں اپنے ہی گناہوں میں

انجم صدیقی بہرائچی
آزاد انٹر کالج
بہرائچ

پُرخطر ہے رہِ عاشقی
ہر قدم موت ہے زندگی

تیری آنکھوں کی مے جب سے پی
بڑھ گئی اور تشنہ لبی!

ہے یہ توہینِ دیوانگی
اپنا چاکِ گریباں نہ سی

ہر نفس غم ہر اک پل ستم
کس قدر ہے نوازش تری

دردِ دل ہے لئے چارہ گر
ہے عبث تیری چارہ گری

بے بسی جس نے دیکھی نہ ہو
دیکھ لے وہ مری زندگی

سب ترے حسن کا عکس ہیں
ماہ و انجمؔ گھٹا چاندنی

رفعت حمیدی
تاج محل کوڈا اڈن کالونی
گومیہ، دھنباد (بہار)

اردو ریسرچ کے مسائل

ریسرچ ایک انگریزی لفظ ہے لیکن یہ اردو زبان میں اس طرح شامل ہو گیا ہے گویا اردو ہی کا لفظ ہے جیسے لالٹین، ٹکٹ، اسکول، اسٹیشن، موٹر، ٹرک، جنکشن وغیرہ۔ کسی زبان سے جب عربی میں کوئی لفظ لیا جاتا ہے تو اس کو معرّب اور فارسی زبان میں جب کسی دوسری زبان کا لفظ لیا جاتا ہے تو اسے مفرس یا معجم کہتے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں "معرب" اور مفرس یا معجم" کی جگہ کوئی لفظ نہیں جس کا مذکورہ الفاظ کے لیے استعمال کیا جائے۔ ریسرچ حقیقت میں دو لفظوں کا مرکب ہے۔ "ری" اور "سرچ" جس کے معنی تلاش، تفتیش اور تحقیق کے آتے ہیں۔ اور ری (Re) انگریزی کا ایک لفظ ہے جب یہ کسی لفظ کے پہلے رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے معنی میں تکرار پیدا ہو جاتی ہے جیسے فریش (FRESH) بمعنی تازہ اور ری فریش (REFRESH) بمعنی دوبارہ تازہ ہونا۔ ری کنسیڈر (RECONSIDER) دوبارہ غور کرنا۔ وغیرہ وغیرہ اس اصول کے مطابق ریسرچ کے معنی میں بھی تکرار ہونا چاہیے یعنی بار بار تلاش کرنا، بار بار تحقیق کرنا یہاں تک کہ افکار و نظریات اور مشاہدات پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں۔

ریسرچ انسان کی ایک پیدائشی صفت ہے جو زندگی بھر اس سے جدا نہیں ہوتی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی تلاش و جستجو جاری رہتی ہے۔ جاہل ہو یا عالم، بچہ ہو یا بوڑھا۔ عورت ہو یا مرد ہر فرد ہمہ وقت ریسرچ میں مشغول رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی ریسرچ میں [illegible] کی ترتیب۔ ادبی اور سائنسی اصطلاحات ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ [illegible] اہم مقصد کو اپنی ریسرچ کے پیش نظر نہ رکھتے ہوں لیکن ہر فرد اپنی ضرورت کے لحاظ سے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے کائنات کی ریسرچ میں مبتلا ہے۔ اخبارات میں ان کے مضامین شائع نہیں ہوتے، سیمنار اور اجلاس میں ان کے مقالے پڑھے نہیں جاتے، اپنی تحقیقات کو وہ کتابی صورتوں میں بھی قلمبند نہیں کرتے، اصطلاحات کے جال میں بھی وہ اپنی تحقیقات کو نہیں پھنساتے لیکن سادہ الفاظ میں ضرور ایک دوسرے سے اپنا حاصل تحقیق بیان کرتے رہتے ہیں۔ انسان تو انسان ہے میرا خیال تو یہ ہے کہ حیوانات بھی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ریسرچ کر لیتے ہیں اور ان کی ریسرچ عموماً اتنی صحیح اترتی ہے کہ اس میں تبدل و تغیر کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انسان نے حرارت اور آگ حاصل کرنے کا طریقہ دریافت کیا ہوگا۔ کھانا پکانے اور کپڑا بننے کے متعلق بھی ریسرچ ہوئی ہوگی۔ دشمنوں سے بچنے کی تدبیر اور ان کو ہلاک کرنے کی ترکیبیں بھی ریسرچ کی موضوعات رہی ہوں گی لیکن جو ریسرچ قدیم اور عام ہو جاتی ہے، اس کی اہمیت ہماری نگاہوں میں باقی نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے دماغ میں قدرت نے ایک خاص فیکلٹی یا قوت ودیعت کی ہے جس کے ذریعہ وہ ریسرچ کرنے پر مجبور رہتا ہے۔ ہر مستور و نامعلوم چیز کو معلوم کرنے کی اس میں تڑپ اور بے قراری پائی جاتی ہے۔ ملے کامیابی ہو یا نہ ہو۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ لیکن ہر چیز کے متعلق اس کے دماغ میں سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی عقل و خرد کے تحت سلسلۂ غور و فکر بھی جاری رکھتا ہے۔

لیکن انسان کی یہ طبعی اور خلقی قوت تحقیق اور ریسرچ اس وقت تک برانگیختہ نہیں ہوتی جب تک اس کو کوئی قوت یا ضرورت مجبور نہ کرے۔ اور دیوانہ وارگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے سامنے کوئی ایسی ضرورت پیش آ جائے جس کے نہ پورا ہونے سے وہ تکلیف محسوس کرے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریسرچ کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اہم مقصد، ضرورت اور دیوانہ وارگی۔ انسان کو اپنے اہم مقاصد حاصل کرنے کے لیے طبعی طور پر ایک لگن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہی دیوانہ وارگی

اس کو اپنے مقاصد میں کامیاب بناتی ہے۔ اور زندگی میں آگے بڑھاتی ہے۔ انسان کے پیش نظر کبھی ذاتی اغراض ہوتے ہیں جن کا تعلق خود اس کی ذات سے ہوتا ہے اور کبھی کلی اغراض ہوتے ہیں جن کا تعلق اس کے خاندان والوں کی جماعت، اس کی قوم یا اس کے ملک سے ہوتا ہے۔ ذاتی اغراض کے لیے اس کو کوئی قدم ایسا اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی جس میں اس کی ذات کو صدمہ پہنچے۔ اس کی ریسرچ کی کوششیں اسی حد تک محدود ہیں جہاں تک اس کی ذات محفوظ رہے۔ لیکن جب ریسرچ کی بنیاد قومی اور ملی اغراض و مقاصد پر ہوتی ہے اس میں اشخاص و افراد اپنی جانیں بھی قربان کر دیتے ہیں۔

آپ کو بھی یاد ہوگا یورپ میں سینکڑوں انسانوں نے ہوائی جہاز، ہمالہ کی چوٹی کی فتح، چاند کی تسخیر، ایٹم بم، گیس اور مختلف تجربات میں اپنی جانیں دیدہ و دانستہ قربان کر دیں۔ یہ قربانیاں روپے پیسے کے معاوضے میں نہیں تھیں۔ یہ قربانیاں اس لگن کے نتیجے میں تھیں جو ان کو ایک مقصد کے سلسلے میں پیدا ہو گئی تھیں۔ اگر ہمارے یہاں کسی ریسرچ کے سلسلے میں اس کا عشر عشیر بھی حادثہ پیش آ جائے تو خدانخواستہ دوبارہ ان خالی جگہوں کو بھرنے والا کوئی نصیب نہ ہو۔ ریسرچ ایسے پروفیسروں کا کام نہیں جو تنخواہ کی خاطر ریسرچ کرتے یا کراتے ہیں۔ ریسرچ تو اس انسان کا کام ہے جس کے دل میں لگن اور دماغ میں اپج موجود ہو، رات میں اپنے مقصد کے متعلق خواب دیکھتا ہو اور دن بھر اس کی تلاش میں غور و فکر کرتا ہو جس کی راتیں غور و فکر میں کٹتی ہوں اور جس کے دن بے چینی اور بے قراری میں گذرتے ہوں۔

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے
اقبال

لیکن جس کا مقصد ملازمت کر کے یہی زندگی کے دن پورے کرنا ہو، اس کو ریسرچ سے کیا واسطہ۔ ریسرچ کے نام پر روپیہ ضرور کمائیں گے لیکن کائنات کے چھپے ہوئے اسرار و رموز اور علم و ادب کی پیچیدہ گتھیوں تک ان کی رسائی غیر ممکن ہے۔ ادبی ریسرچ میں ان کی طبعی کاوش غیر ممکن ہے۔

ہندستان میں انگریزوں نے کچھ ایسے اصول جاری کر دیئے تھے جن کی وجہ سے سائنٹفک اور لٹریری ریسرچ صفحۂ زینت قرطاس رہی۔ اپنی ایجادات، تحقیقات و تعلیمات، افکار و نظریات سے ہمیں تعلیم کی ترغیب دی لیکن طریقۂ تعلیم ایسا رکھا کہ ہم کارہائے نمایاں کی انجام دہی سے نہ صرف محروم رہیں بلکہ مدح سرائی میں رطب اللسان ہو جائیں۔ اور بغیر تنخواہ کے غیر شعوری طور پر ان کے ایجنٹ بن جائیں۔ اور ہمارے اندر ایسی ذہنیت پیدا ہو جائے کہ ہم یورپ کی ہر آواز پر سر تسلیم خم کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا خیر جو ہوا سو ہوا۔ لیکن افسوس تو اس کا ہے کہ ابھی تک ہماری آنکھیں نہیں کھلیں۔

اس سلسلے میں ہم صرف ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اردو کے ریسرچ اسکالر کے لیے عام طور پر فرسٹ کلاس کی مانگ ہوتی ہے حالانکہ فرسٹ کلاس کا تعلق محنت، قوت حافظہ اور امتحان کے وقت دماغ کے صحیح کام کرنے سے یا اس تائید غیبی سے ہے جو قسمت سے بعض اوقات ہاتھ آ جاتی ہے اور انسان بغیر محنت کے فرسٹ کلاس بن جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے انسان میں قوت تالیف و تصنیف بھی بدرجۂ اتم موجود ہو۔ امتحان پاس کرنے کی دماغ میں فیکلٹی جداگانہ ہوتی ہے اور تالیف و تصنیف کی صلاحیت کا خزانہ علاحدہ ہوتا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اکثر فرسٹ کلاس جو غیر معمولی محنت کر کے یہ امتیاز حاصل کرتے ہیں وہ اپنی بہت سی دماغی اپج اور تصنیف و تالیف کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ریسرچ کے لیے ایسے شخص کا انتخاب عمل میں آنا چاہیے جس کے دماغ میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت ہو جس کے اندر غور و فکر میں منطقی ترتیب ہو۔ ممکن ہے یہ صفت آپ کو فرسٹ کلاس میں نہ ملے اور تھرڈ کلاس اس کا مستحق ہو۔ تالیف و تصنیف کے لیے اس کی متقاضی صلاحیتوں کا لحاظ کرنا چاہیے میں یہ نہیں کہتا کہ ہر فرسٹ کلاس ان صفات سے محروم ہوتا ہے گنے چنے ایسے فرسٹ کلاس بھی ملیں گے جن میں دوسری صلاحتیں

نثری داستانیں" تحریر کیا۔ سید وقار عظیم نے "ہماری داستانیں" قلم بند کی۔ سید محمود نقوی نے "اردو نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ" تحریر کیا۔ انور یزدانی نے "رام پور کی داستان گوئی" قلمبند کی ہے۔ تذکروں پر کام کرنے والوں کا یہی حال ہے شعری اور نثری دونوں اصناف میں تکرار پائی جاتی ہے۔ آخر اس میں قصور کس کا ہے، ماہرین اردو کی ذاتی کمزوری کا یا موضوع کی منظوری دینے والے بورڈ کا یا مختلف موضوعات کی نگرانی کرنے والے ماہرین کا جو اردو ریسرچ اسکالر کو موضوع کے سلسلے میں مفید مشورہ نہیں دیتے ہیں یا پھر خود ان کا ہے جو تکرار کی جانب خفیف خود کو لے جاتے ہیں۔ اردو ریسرچ کی رفتار پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے بڑی سچی بات کہی تھی۔ "تحقیق کی رفتار کا اندازہ کرنے کے لیے تحقیقی کاموں کی تعداد جاننا کافی نہیں ان کی نوعیت کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے"[1] موصوف کی تحریر کی روشنی میں ہم اردو ریسرچ کا جائزہ لیتے ہیں تو مایوسی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جتنے مقالے دستیاب ہوتے ہیں ان کی صحت پر شبہہ ہونے لگتا ہے۔ مقالات کے عنوانات سے ہی قاری کا ذہن وسوسے کا شکار ہو جاتا ہے۔ مقالات کے عنوانات اور طریقۂ کار میں کس حد تک یک رنگی اور یکسانیت ہے آپ خود ہی اندازہ کیجیے "اردو شاعری میں قنوطیت" (قاضی عبدالستار) "اردو شاعری میں قومیت کا تصور" (منیف الدین فریدی) "اردو شاعری میں تلمیحات" (ڈاکٹر مصاحب علی) "اردو شاعری میں منظر نگاری" (ڈاکٹر عبدالسلام) "اردو شاعری میں مناظر فطرت" (حامد حسین بلگرامی) "اردو شاعری میں رومانی عنصر" (محمد عتیق) مذکورہ عنوانات سے ہی تفتیش و تحقیق کی یک رنگی صاف جھلکتی ہے۔ مذکورہ حضرات کو اردو شاعری کی تاریخ اور جائزے پر یکساں محنت کرنی ہے۔ مابعد "قنوطیت" "قومیت کا تصور" "تلمیحات" "منظر نگاری" "مناظر فطرت" اور "رومانی عناصر" پر صرف روشنی ڈال دینی ہے۔ دراصل مقالے کی نوعیت ایک ہے صرف تکمیل میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ دراصل اس طرح کے ریسرچ ورک کی حیثیت عالمانہ سے زیادہ پیشہ ورانہ ہے۔

ریسرچ اسکالرز نے اپنے پیش روؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا اور موجودہ تحقیق کے کاموں سے چشم پوشی کر لی۔ حالانکہ انہیں دور حاضر کے تمام مواد کا جائزہ لینے اور قدیم و جدید دلائل پر گہری نظر سے غور کرنے کی ضرورت تھی تاکہ ذہن یکطرفہ دلائل کی زنجیروں میں گرفتار نہ ہو جائے اور دماغ کو آزادانہ طریقے سے دلائل و شواہد پر صحیح فیصلہ کرنے کا موقع مل جائے۔ اس طرح کے ریسرچ ورک کی حیثیت مستند ہوتی ہے۔

میری نگاہ میں اردو ریسرچ کی بہت زیادہ اہمیت ہے اس وقت ادبی ریسرچ پر نہایت دانشمندی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ عام طور پر نگراں کی عام شہرت پر اعتماد کر کے کام شروع کر دیا جاتا ہے اور مقالہ مکمل ہو کر سامنے آتا ہے تو بیساختہ قاری کی زبان پر آجاتا ہے کہ یہ کوئی نئی دریافت نہیں، اس میں کوئی نئی چیز نہیں۔ وہی رسمی، وہی پرانی اور وہی روایتی بحث ہے۔ اس وقت احساس ہوتا ہے کہ مقالے پر محنت، وقت اور روپے سبھی ضائع ہوئے۔ اردو کے بہت سے مقالات کا یہی حشر ہوا، اس لیے اردو ریسرچ کے معیار کو بلندی سے ہمکنار کرنے کے لیے اور اردو کی ادبی تحقیق کو کامیاب بنانے کے لیے ریسرچ کے شعبہ کے اصول و ضوابط پر نظر ثانی اشد ضروری ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ریسرچ کا کام انتہائی سخت اور دشوار ترین ہے۔ یہ کام بہت مشکل سہی لیکن ناممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صبر و تحمل کی سخت ضرورت ہے۔ صبر کے ساتھ اگر لگن میں ڈوب کر تحقیقات کی راہوں پر منزلیں طے کرتے چلے جائیں تو ایک وقت ایسا آجانا کچھ بعید نہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں انتہائی شاندار تحقیق کا پرچم لہرائے۔ سالہا سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کی دیگر زبانیں اس ارتقائی منزل پر پہنچ چکی ہیں لیکن ان میں صبر تھا۔ کاوش تھی، آرزو تھی۔ ہمت تھی، لگن تھی۔ ہم بھی اسی طرح کوشش کرتے رہے تو ہمارے خواب شرمندۂ تعبیر ضرور ہوں گے اور ہم میں سے کوئی افق ادب پر تارے کی طرح

[1] اردو میں تحقیق کا معیار: ماہنامہ "آج کل": تحقیق نمبر

اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

ادارہ

"سبھی خوشحال وشادماں رہیں" ہمارا قدیم ترین آدرش ہے جو ہندستان کے ہر باشندے کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ ہم حکومت کی کارکردگی کا جائزہ بھی اسی نقطۂ نظر سے لیتے تھے کہ جس کے عہد میں ہر شخص خوشحال وشادماں ہے اور امن وچین کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہی مثالی حکومت ہے۔ اپنے تہذیب تمدن کے اسی بنیادی اصول کو عملی شکل دینے کے لیے ہی موجودہ حکومت نے ہمہ گیر ترقی کا عہد کیا اور ترقی کے رُخ کو شہروں کے ساتھ ساتھ جھونپڑیوں کی طرف موڑ دیا، جس کے نتیجے میں سبھی زمروں کی پیداوار میں توقع سے زیادہ اضافہ ہوا۔ آبپاشی، کیمیاوی کھاد کی تقسیم، زراعت، صنعت اور بجلی وغیرہ کی پیداوار اور تقسیم میں زبردست اضافہ ہوا جو اس بات کا آئینہ دار ہے کہ ریاست اپنے اس نصب العین کی تکمیل کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔

زراعت

- سال ۸۱-۱۹۸۰ میں غلہ کی مجموعی پیداوار ۲۴۴٫۹۲ لاکھ میٹرک ٹن، جو اب تک کی سب سے زیادہ پیداوار ہے۔
- سال ۸۰-۱۹۷۹ میں ایک طرف شدید بارش اور دوسری طرف خشک سالی کے باوجود آبپاشی اور کیمیاوی کھاد کے بھرپور بندوبست کے باعث غلہ کی مجموعی پیداوار ۱۹۲٫۳۹ لاکھ میٹرک ٹن۔
- سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں گنے کی پیداوار ۶۴۲٫۲۴ لاکھ میٹرک ٹن، تلہن کی پیداوار ۱۱٫۵۰ لاکھ میٹرک ٹن اور آلو کی پیداوار ۴۲٫۴۴ لاکھ میٹرک ٹن۔ گزشتہ سال کے مقابلہ میں گنے کی پیداوار میں ۴٫۵۴ فیصد اور تلہن کی پیداوار میں ۶٫۰۸ فیصد کا اضافہ۔
- سال ۸۲-۱۹۸۱ میں گنے کی پیداوار ۷۰٫۰۷ لاکھ میٹرک ٹن اور آلو کی پیداوار ۴۳ لاکھ میٹرک ٹن ہونے کا اندازہ۔

آبپاشی

- موجودہ حکومت کے دور میں سال ۸۰-۱۹۷۹، اور ۸۱-۱۹۸۰ کے اختتام تک ریاست کی آبپاشی صلاحیت بڑھ کر بالترتیب ۱۸۲،۱۵ ہیکٹر اور ۱۹۲۲۴۴ ہیکٹر۔
- گزشتہ برسوں کے مقابلہ میں آبپاشی صلاحیت میں سال ۸۰-۱۹۷۹ اور ۸۱-۱۹۸۰ میں بالترتیب ۱۵٫۵ فیصد اور ۷٫۰ فیصد کا اضافہ۔

صنعتی پیداوار

- سال ۸۱-۱۹۸۰ میں شکر، بناسپتی، سیمنٹ اور سوتی کپڑے وغیرہ سے متعلق خاص صنعتوں میں پیداوار بالترتیب ۲۴٫۱۲ لاکھ میٹرک ٹن، ۱۳۰٫۳ ہزار میٹرک ٹن، ۵۱۶٫۰ ہزار میٹرک ٹن اور ۲۹۶۹ لاکھ میٹر۔ گزشتہ سال کے مقابلہ میں ان کی پیداوار میں بالترتیب ۲۲٫۹ فیصد، ۳۶٫۰ فیصد، ۱۴٫۶ فیصد اور ۹٫۲ فیصد کا اضافہ۔
- سال ۸۱-۱۹۸۰ میں سوتی دھاگے کی پیداوار ۶۲٫۴ ہزار میٹرک ٹن جو گزشتہ سال کے مقابلہ میں ۴٫۷ فیصد زیادہ ہے۔
- سال ۸۲-۱۹۸۱ کی اول سہ ماہی کی صنعتی پیداوار ۸۱-۱۹۸۰ کے اسی مدت کے قیمتوں کے اشاریہ کے مقابلہ میں ۱۲٫۲ فیصد زیادہ جس سے ۸۲-۱۹۸۱ء میں صنعتی پیداوار میں کافی اضافہ کا امکان۔

بجلی کی پیداوار

سال ۸۰-۱۹۷۹ اور ۸۱-۱۹۸۰ میں ریاست کی بجلی کی پیداوار بالترتیب ۱۰۱۳۲۴ کیلوواٹ گھنٹہ اور ۱۰۹۰۵ کیلوواٹ گھنٹہ۔

- سال ۸۱-۱۹۸۰ میں سال ۷۹-۱۹۷۸ کے مقابلہ میں ۸٫۰ فیصد اور سال ۸۰-۱۹۷۹ کے مقابلہ میں ۶٫۰ فیصد کا اضافہ۔
- اپریل ۱۹۸۱ء میں ۸٫۱ فیصد کا اضافہ اور اپریل ۱۹۸۱ سے جنوری ۱۹۸۲ء تک بجلی کی پیداوار ۹۴۷۹ ملین یونٹ جبکہ گزشتہ سال اسی مدت میں یہ پیداوار صرف ۸۲۳۹ ملین یونٹ تھی۔
- موجودہ حکومت کی کوششوں کے نتیجہ میں ایک سال کے اندر ۱۵ فیصد کا عدیم المثال اضافہ۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب "حزنِ اختر" (تصنیف واجد علی شاہ)

مرتب: امجد علی خاں۔ صفحات: ۲۲۴۔ قیمت مجلد تیس روپے

تقسیم کار: واجد علی شاہ اکاڈمی ۵۶ کچا احاطہ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

امجد علی خاں کا نام تاریخ اودھ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نیا نہیں ہے۔ اُن کی دو کتابیں تاجدارِ اودھ اور تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ اس سے قبل شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ واجد علی شاہ کی مثنوی حزنِ اختر کی یہ تحقیقی اور تنقیدی ترتیب اسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔

حزنِ اختر واجد علی شاہ کی خود نوشت سوانح عمری ہے جس میں انھوں نے انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے بعد کلکتے میں اپنی اسیری کے حالات لکھے ہیں۔ واجد علی شاہ کی دوسری خود نوشتی تحریروں کی طرح حزنِ اختر بھی مصنف کی حیرت خیز بے ریائی اور دیانتِ اظہار کی آئینہ دار ہے اور اس کا شمار اردو کی اہم آپ بیتیوں میں ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے اس مثنوی میں صرف اپنا نہیں بلکہ ان ملازموں کا بھی ذکر کیا ہے جو قید خانے میں اُن کے ہمراہ تھے، مثلاً باقر علی اور محمد جان چوبدار، جمال الدین چپراسی، امام علی حقہ بردار، امیر بیگ خواص، کریم بخش ستقہ، قادر بخش کہار، مہدی خانم پوشاک دوز وغیرہ۔ اس وسیلے سے اودھ کی گزشتہ تہذیب کی تشکیل کرنے والے بہت سے ایسے چہرے بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں جو اودھ کی رسمی تاریخوں میں نظر نہیں آتے۔ ان کرداروں کی وجہ سے حزنِ اختر کو ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

کتاب پر امجد علی خاں کا طویل مقدمہ (۔۔ صفحات) خاصے کی چیز ہے جس کے ذریعے واجد علی شاہ اور ان کے عہد کی ایک واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔ مرتب نے مقدمے میں جن اہم ماخذوں سے استفادہ کیا ہے ان میں کمال الدین حیدر کی تاریخ اودھ کا وہ قلمی نسخہ بھی ہے جس کے بہت سے مطالب مطبوعہ ایڈیشن میں حذف کر دیے گئے۔ مطبوعہ تاریخ انتزاعِ سلطنتِ اودھ کو حق بجانب قرار دینے کی کوشش کرتی ہے لیکن قلمی نسخہ کہتا ہے:

"سب رعایا اور غربا اور ملازم اگر درحقیقت برطبق مضمون اشتہار نالاں اور گرفتارِ مصائب کے ہوتے تو راضی اور شادماں ہو کر شکر گزار اور مداح سرکار انگریزی کے ہوتے، لیکن برعکس اس کے سب رعایا اور غربا اور ملازم بلکہ قیدی جو قید سے چھٹ گئے ہیں نالاں اور فریاد کناں ہیں کہ ہمیں وہ قید اور گرفتاری پسند اور قبول تھی۔ عہد بادشاہِ رحمت مجسم میں سب شروں سے محفوظ ہو کر اپنے حال میں خوش تھے۔ اب اس [انگریزی] عمل میں رہائی کو اشدِ قید جانتے ہیں۔۔۔۔ پس جب حال قیدیوں کا، جو چھٹ گئے ہوں، یہ ہو تو کیفیت حالِ خلائق کہ گھر گھر کوچہ بہ کوچہ حسراتِ ماتم و بکا برپا ہے۔" [مقدمۂ حزنِ اختر صفحہ ۴۲]

امجد علی خاں نے مقدمے میں واجد علی شاہ کی سوانح عمری کے علاوہ اُن کے روزمرہ کے نظام الاوقات اور عہدِ واجدی کی اہم تاریخوں کی جدولیں بھی تیار کی ہیں جن سے بادشاہ کی شخصیت اور اس کے عہد کی مجموعی صورتِ حال کا نقش بن جاتا ہے۔

"فرہنگِ اسماء مع اشاریہ" اس کتاب کی ایک اور اہم چیز ہے۔ "حزنِ اختر" میں جن افراد اور مقامات کے نام آئے ہیں ان کو الفبائی ترتیب اور صفحوں کی نشان دہی کے ساتھ درج کر کے امجد علی خاں نے ان کے بارے میں ضروری معلومات بھی فراہم کر دی ہیں۔

حزنِ اختر میں بہت سے ایسے لفظ اور اصطلاحات استعمال ہوئے ہیں جو آج کے قاری کے لیے نامانوس اور وضاحت طلب ہیں۔ "فرہنگ الفاظ" میں امجد علی خاں نے اس طرح کے تقریباً سو لفظوں اور اصطلاحوں کی تشریح کر کے کتاب کے مطالعے کو مزید آسان کر دیا ہے۔ اُن کی یہ نئی کتاب ترتیبِ متن کا معیاری نمونہ ہے اور وہ اس کی اشاعت پر شکریے کے مستحق ہیں۔

(ڈاکٹر نیر مسعود)

★



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے حال ہی میں متحدہ عرب امارات کے وزیر آب و توانائی جناب [illegible] بن [illegible]
کی دہلی آمد پر ان سے ملاقات کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے





جلد ۳۷ | نمبر ۲

مئی ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

بتشرو: بال کرشن چترویدی

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو.پی.
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: اسپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن بیورو، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ - لکھنؤ

دفتر: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے اعلان کردہ نئے بیس نکاتی پروگرام میں بنجر آراضی پر کاشت سے متعلق تکنیکی معلومات کی ترویج و تشہیر کے ساتھ ساتھ آبپاشی صلاحیت اور غلے کی پیداوار میں اضافہ کرنے پر خاص زور دیا ہے۔ انھوں نے دالوں اور تلہن کی پیداوار بڑھانے کے لیے خصوصی کوششیں کرنے کی بھی تلقین کی ہے۔ دیہاتوں کی ہمہ جہت ترقی اور دیہاتوں سے متعلق قومی سطح کے روزگار پروگرام کو مستحکم بنانا اور اسے توسیع دینا بھی ۲۰ نکاتی پروگرام میں شامل ہے۔ شریمتی گاندھی نے قابل کاشت آراضی کی حد بندی کے نفاذ پر بھی زور دیا ہے اور حد بندی کی مقررہ حدود سے زائد آراضی بے زمینوں میں تقسیم کرنے کی بات بھی کہی ہے۔ اس کے لیے اس پروگرام کے بموجب قانون اور نظم و نسق سے متعلق تمام دشواریوں کو دور کر کے آراضی کے سارے ریکارڈ جمع کیے جائیں گے اور انھیں مکمل طور پر درست کیا جائے گا۔

وزیر اعظم نے زرعی مزدوروں کو کم سے کم اجرت دلانے سے متعلق قوانین کا جائزہ لینے اور انھیں موثر ڈھنگ سے نافذ کرنے پر بھی زور دیا ہے۔ پابند مزدوروں کی آبادکاری کا بندوبست کرنا اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی ترقی سے متعلق کاموں کی رفتار تیز تر کرنا بھی اس پروگرام کے اہم جز ہیں۔ دور افتادہ علاقوں میں واقع تمام مواضعات میں ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت پینے کے پانی کا بندوبست کیا جائے گا اور دیہی علاقوں کے اُن خاندانوں کو جن کے پاس اپنا مکان بنانے کے لیے زمین نہیں ہے، زمین دی جائے گی اور ان کے لیے مکان بنانے کے سلسلے میں امداد دینے سے متعلق پروگراموں کی توسیع کی جائے گی۔ بیس نکاتی پروگرام کے تحت وزیر اعظم شریمتی گاندھی نے جھگی جھونپڑی والی بستیوں کے ماحول کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر کمزور طبقوں کے لیے تعمیر مکانات پروگرام کی عمل آوری پر بھی زور دیا ہے اور کہا ہے کہ زمین کی قیمتوں میں جو غیر ضروری اضافہ ہو رہا ہے اسے روکنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ بجلی کی پیداوار کو انتہائی حد تک بڑھایا جائے گا، بجلی بورڈ کے طریقہ کار کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ مواضعات میں بجلی پہنچائی جائے گی۔ اس پروگرام میں شجرکاری کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا، سرکاری باغات اور باغبانی نیز بایو گیس اور توانائی کے متبادل وسائل کو فروغ دینے کے پروگرام کو آگے بڑھانا بھی شامل ہے۔ وزیر اعظم نے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو ایک عوامی مہم کی شکل دینے اور عوام کو رضاکارانہ طور پر خاندانی منصوبہ بندی کی جانب مائل کرنے پر بھی زور دیا ہے۔

عوامی ابتدائی صحت خدمات سے متعلق سہولتوں کو توسیع دینا نیز جذام، ٹی۔ بی اور اندھے پن پر قابو پانے کے لیے اقدامات کرنا بھی وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام کے دائرہ عمل میں شامل ہے۔ اس پروگرام کے تحت خواتین اور بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق کاموں میں تیزی لائی جائے گی اور حاملہ عورتوں، ماؤں نیز بچوں خاص طور سے آدی واسیوں، پہاڑی اور پسماندہ علاقوں میں رہنے والوں کو قوت بخش غذا فراہم کرنے سے متعلق پروگرام تیز رفتاری سے چلائے جائیں گے۔

وزیر اعظم نے بیس نکاتی پروگرام کے تحت چھ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے وسیع پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا بندوبست کرنے پر بھی زور دیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے گی اور بالغان کی ناخواندگی کو دور کرنے کی غرض سے تعلیمی پروگراموں کے سلسلے میں طلبا اور رضاکار تنظیموں کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔ سستی اشیا کی دکانوں کی تعداد بڑھا کر اور دور افتادہ علاقوں میں گشتی دکانوں کا بندوبست کر کے اور صنعتی علاقوں میں برسرکار مزدوروں اور ہاسٹلوں میں رہنے والے طلبا کی ضرورتیں پوری کرنے کی غرض سے سستی دکانوں کے ذریعہ عوامی نظام تقسیم کا دائرہ عمل وسیع تر کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ نصابی کتابوں اور کاپیوں کی فراہمی کو بھی اولیت دی جائے گی۔ اور صارفین کی ضروریات پوری کرنے کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں گے۔ سرمایہ کاری کے طریقہ کار و صنعتی پالیسی کو منصوبوں کی بروقت تکمیل کے لیے آسان بنایا جائے گا۔ نیز دستکاری، ہتھ کرگھا اور دیگر دیہی صنعتوں اور پیشوں کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی تاکہ وہ ترقی کر سکیں اور اپنی تکنیک کو جدید بنا سکیں۔

بیس نکاتی پروگرام کے تحت ایسا بندوبست بھی کیا جائے گا کہ کالا دھن جمع نہ ہو سکے۔ اس کے لیے اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں و ٹیکس چوروں کے خلاف سخت اقدام کیا جائے گا۔ سرکاری سیکٹر [illegible] کی کارکردگی، اس کی صلاحیت کے استعمال اور ملکی ذرائع سے پیداواری صلاحیت میں اضافہ کر کے انتظامی طریقہ کار کو بہتر بنانے کا منصوبہ بھی ہے۔ اس طرح وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے نئے بیس نکاتی پروگرام نے زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ زراعت، دیہاتوں کی ہمہ گیر ترقی، قابل کاشت آراضی، زرعی اور پابند مزدوروں کے مسائل، اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی ترقی، دیہاتوں میں پینے کے پانی کی قلت دور کرنے، دیہی علاقوں میں رہائش کے مسائل، جھگی جھونپڑی

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

فضا ابنِ فیضی
مئو ناتھ بھنجن، یوپی

غزل

خوگر جو میں پُرانے اسالیب کا نہ تھا | پرتو مرے کلام پہ تشبیب کا نہ تھا
کچھ ہم بھی تھے خیال کے ابلاغ سے جدا | سارا تصور، لفظوں کی ترتیب کا نہ تھا
بنجر زمین میں تھی نئی حسّیت کی کاشت | واں التزام، بندش و ترکیب کا نہ تھا
سب اپنے پیکروں کی نمائش میں محو تھے | موقع وہاں شعور کی تہذیب کا نہ تھا
عالی نسب تھے خوش لقبانِ ہنر ترے | میں چپ رہا کہ حق مجھے تادیب کا نہ تھا
آندھی تھی تیز، پاؤں زمیں سے اکھڑ گئے | قائل تو وہ بھی ذات کی تخریب کا نہ تھا
وہ کتنے پتھروں کو بنا نا نشانِ میل | تنہا معاملہ مری تنصیب کا نہ تھا
ہم نے پڑھی ہے غور سے اس کی کتا جسم | عنواں کوئی گناہ کی ترغیب کا نہ تھا

تفہیم شعرِ نو کی ہے مشکل بہت فضاؔ
شوق اس کو ورنہ کچھ مری تکذیب کا نہ تھا

پنڈت نہرو کی وصیت

عزیز تابانی عزیزی
نئی دنیا - جون پور

سلام اہلِ چمن تم نے ہمیشہ میری عزت کی
میں قیمت دے نہیں سکتا ہوں جذبات محبت کی
بہاروں کا زمانہ ہو کہ موسم ہو خزاؤں کا
تمہارا شکریہ ہر حال میں تم نے رفاقت کی
اجازت دو مجھے میرے چمن والو خدا حافظ
بہت تم نے نوازش کی بہت تم نے عنایت کی

مری خواہش ہے میری راکھ اُن کھیتوں میں برسانا
...کے پسینوں سے جہاں اگتا ہے ہر دانا
اسی کا جزو بن جائے اسی میں جذب ہو جائے
کہاں خاکسترِ دل سے بہت مشکل ہو سمجھانا
سلام ارضِ وطن جب میں نہ ہوں گا تیری خدمت میں
مری جانب سے میری خاک ہوگی میرا نذرانہ

روایات و عقائد پر کہاں مجھ کو بھروسہ ہے
اگر رسماً بھی ان کو مان لوں تو ایک دھوکہ ہے
کسی کو دے نہیں سکتا ہوں دھوکہ اپنا شیوہ ہے
مرے جذبات کو گنگ و جمن سے ایک رشتہ ہے
بہا دینا ادب کے ساتھ میری راکھ سنگم میں
یہی میری وصیت ہے یہی میرا نوشتہ ہے

ستم ہے آدمی پابند ہو رسم و روایت کا
یہ بندھن توڑ ڈالوں یہ تقاضہ ہے صداقت کا
مگر ماضی سے رشتہ توڑ لینا بھی نہیں آساں
کہ میں بھی سلسلہ ہوں اس کی زنجیرِ محبت کا
میں اس کی قدر کرتا ہوں اسی نے حوصلہ بخشا
اسی نے راستہ مجھ کو دکھایا عزم و ہمت کا

مجھے گنگ و جمن کی ان فضاؤں سے عقیدت ہے
یہ تہذیبوں کا سنگم ہے بہشتِ نازِ فطرت ہے
اسی سنگم پہ گذرا ہے زمانہ میرے بچپن کا
اسے حاصل مرے عہدِ جوانی کی رفاقت ہے
یہ ماضی سے نکل کر بہہ رہی ہے سوئے مستقبل
یہ اندیشوں کی دھرتی ہے تمناؤں کی جنت ہے

یہ ہے کتنی انجمن افروز اس کی شامِ تنہائی
ہجومِ غم میں بھی ملتا ہے اک اندازِ رعنائی
خراماں ہے یہاں روحِ غزل موجِ ترنم میں
یہاں ہر شاعر و فنکار کو راحت کی خیرائی
یہیں میں نے سجائی ہے تخیل کی حسیں جنت
یہیں پائی ہے میرے جذبۂ دل نے پذیرائی

یہاں تاریخ کے ہر دور کے اسرار ملتے ہیں
جدھر دیکھو شکست و فتح کے آثار ملتے ہیں
یہاں دیکھا ہے میں نے مختلف نسلوں کے تیور کو
جو میدانِ عمل میں بر سرِ پیکار ملتے ہیں
یہاں اک گیت اک سنگیت اک افسانہ اک نغمہ
یہاں جس سمت بھی دیکھو لبِ گفتار ملتے ہیں

یہاں تاریخ کے ملتے ہیں آکر سلسلے کتنے
یہاں آئے ہیں پیاسے اپنی پیاس بجھانے قافلے کتنے
یہاں دار و رسن پر گیت گائے ہیں شہیدوں نے
یہاں طے ہو چکے ہیں زندگی کے مرحلے کتنے
اسی ساحل پہ اکثر یاد آتے ہیں وہ دیوانے
جنھیں بخشے ہیں صحرائے جنوں نے آبلے کتنے

اگر پیغامِ مرگِ ناگہاں گلشن سے دور آئے
اسی گلشن میں عاشق کا جنازہ بھی ضرور آئے
تمنا ہے وطن کی پاک دھرتی میں سما جاؤں
مری مٹی بنے غازہ رُخِ گیتی پہ نور آئے
مری خاکِ جنوں دیوانوں میں تقسیم کر دینا
اگر تجھ کو نسیمِ گلشنِ ہستی شعور آئے

ڈاکٹر محسن نشاط
صدر شعبہ اردو۔ ایم۔ ایس ڈگری کالج
سیرد (ضلع سیوان (بہار))

ناسخ اور تحریکِ اصلاحِ زبانِ اردو

زبان کی ابتداء اور اس کی نشوونما ایک سماجی اور فطری عمل ہے لیکن علمی اور ادبی زبان بالغ شعور کی مسلسل کاوش کا مرہونِ منت ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان بھی اصلاح کے مسلسل عمل سے گزری ہے۔ چونکہ اس زبان کی توسیع شمال تا دکن اور مغرب تا مشرق ہوتی رہی اس لیے تہذیبی اور ثقافتی مراکز کے ردوبدل کے ساتھ ساتھ سند کے معیار بھی بدلتے رہے اور ایک علاقے کا محاورہ دوسرے علاقے کے مقابلے میں برتر سمجھا جانے لگا۔ شعراء اور اہلِ علم نے اس لسانی کشمکش کو اصلاحِ زبان کی شکل میں پیش کیا۔ اصلاحِ زبان کی یہ تحریکیں زبان میں اضافوں سے اس قدر متعلق ہیں کہ جس قدر کہ متروکات سے۔ دہلی والوں کا ہمیشہ نظریہ رہا کہ دکن کی زبان کا بیشتر حصہ "پچر" ہے۔ اہلِ لکھنؤ دہلی کے الفاظ کو "روڑے" سے تعبیر کرتے تھے۔

دکن میں اردو زبان دہلی سے درآمد ہوئی تھی۔ اس کا سلسلہ فتوحاتِ علائی سے شروع ہوتا ہے اور محمد تغلق کے تبادلۂ دارالحکومت تک جاری رہتا ہے۔ بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد یہ مقامی زبان کے طور پر نشوونما پانے لگی ہے۔ چونکہ دکن کی اجنبی زبانوں کے ماحول میں اس کا ارتقاء ہوتا ہے اس لیے یہ بہت جلد ایک مخصوص ادبی معیار حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے برخلاف اپنے مولد و مخزن "دہلی" میں مختلف لسانی اثرات کے تحت اس کا ارتقاء مسلسل ہوتا رہا۔ لیکن فارسی کی درباری اور سرکاری حیثیت نے اسے کبھی بھی ادبی شکل اختیار نہیں کرنے دی تا آنکہ ولی دکنی کی دلی میں آمد نے اسے ایک نئی زندگی بخشی۔

ولی دکنی کی آمد سے پہلے کی زبان کا ذکر ہم دانستہ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ دہلی میں ولی سے قبل چند ہزل گو شعراء نظر آتے ہیں جو اپنی مشق کو ریختہ گوئی کا نام دیتے ہیں ان میں جعفر زٹلی اور اس قبیل کے شعراء کا نام سرِفہرست ہے۔ اس قسم کے شعراء کی زبان سے استناد مزید۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کس قدر عوام و خواص میں مقبول تھی۔ لہٰذا اردو کا صحیح دور ولی کی دہلی آمد کے بعد ہی شروع ہوتا ہے کیونکہ ان کے کلام کی مقبولیت نے بہت سے شعراء کو ریختہ گوئی اور دیوان سازی کی طرف متوجہ کیا۔ بے محل نہ ہوگا اگر اسی سلسلے میں ہم ولی کی زبان پر بھی کچھ روشنی ڈالتے چلیں تاکہ اس کے تدریجی ارتقاء کو بخوبی سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس طرح عہد بہ عہد اس زبان کو جن جن مراحل سے گزرنا پڑا اس کی تصویر اچھے انداز میں پیش کی جاسکتی ہے۔

تاریخ زبان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کی آمد سے قبل شمالی ہند میں اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے مشاغل شروع ہو گئے تھے۔ جس کے ثبوت میں مرزا بیدل، سعد اللہ گلشن

جائزہ دینا ہے جو شاہ حاتم نے پیش کیے تھے۔ اس سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر شاہ مبارک آبرو کا وہ قطعہ پیش کیا جائے جس میں شاہ حاتم کی تحریک اصلاح کی روح سموئی ہوئی ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو:-

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
ان ستی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اس کے ریختہ میں حرف ہے

اب ہم شاہ حاتم کے مقرر کردہ ان اصول سے بحث کریں گے جن پر ان کی تحریک اصلاح زبان کا ڈھانچہ تیار ہوا تھا۔ اس سلسلے میں شاہ حاتم کا سب سے پہلا اصول یہ ہے۔

ا۔ لسان عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند۔

یعنی عربی و فارسی کے وہ الفاظ جو جلدی سمجھ میں آجانے والے ہوں اور کثرت کے ساتھ زبانوں پر ہوں ان کا استعمال اردو میں عام کیا جائے۔ اس اصول سے شاہ صاحب کی اس بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے جو زبان کی اصلاح میں نمایاں رول ادا کر سکتی ہے۔ چونکہ اردو زبان کے رشتے فارسی و عربی سے قدیمی طور سے وابستہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بجا طور پر سوچا کہ اردو میں ان دو زبانوں کے کثیر الاستعمال الفاظ کو ضرور جگہ دی جائے۔ کیونکہ اردو کا پس منظر دنیا کی ان دو بڑی زبانوں (فارسی اور عربی) سے مل کر بنا ہے جن کے پاس علم و ادب کا بیش بہا خزانہ ہے۔ لہٰذا اردو کی ترقی کے لیے ان کی قربت ازبس ضروری ہے ان اصول کے تحت جن الفاظ کو بعد تصحیح حضرت موصوف نے پیش کیا وہ یہ ہیں:

عربی و فارسی الفاظ کی صحت

تسبی کو تسبیح
صحی " صحیح
بگانہ " بیگانہ
دوانہ " دیوانہ
مروت کو مروّۃ
عورت " عورۃ

اس کے بعد ہم دوسرے اصول کا بھی جائزہ لے لیں تو بہتر ہوگا۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں:-

۲۔۔۔ روزمرہ دہلی کہ مرزایان ہند و فصیحان رند محاورہ دارند منظور داشتہ۔

اس کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ شاہ حاتم نے یہ بہتر سمجھا کہ اردو کو دہلی کے روزمرہ کے ساتھ ساتھ فصحاء اور مرزاؤں کی زبان سے مزین کیا جائے اور یہ تجویز بلاشبہ ہر خاص و عام کے لیے قابل قبول تھی۔ کیونکہ فصحائے وقت کا ایک ایسا طبقہ تھا جسے صحیح معنوں میں زبان کا سرپرست کہا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف قلعہ شاہی سے متعلق ایک اور ایسا طبقہ تھا جسے علم کے ساتھ ساتھ نفاست مزاج اور خوش طبعی بھی حاصل تھی۔ اس صورت میں زبان کی سرپرستی کا حق اسے بھی حاصل تھا۔

اس کے بعد دوسری اہم تبدیلی جو شاہ حاتم کے قلم سے ہوئی وہ بھاشا کے الفاظ کا ترک کر دینا تھا۔ انھوں نے ہندی الفاظ کو متروک قرار دیا اور ان کے بجائے فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال روا رکھا ہے۔ جیسے یہ الفاظ:

"نین، جگ، نت، بسر، مارو، موادغیرہ"

یوں تو شاہ حاتم نے اس قبیل کے متعدد الفاظ ترک کیے مگر وہ خود بھی اس اصول پر پوری زندگی سختی سے عامل نہیں رہے۔ جس کی مثالیں ان کے مختلف اشعار سے ملتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی شاہ موصوف نے حروف میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا کی ہے۔ جس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:-

سے بجائے ستی
اُدھر " اودھر
کدھر بجائے کیدھر

شاہ موصوف نے یہ تصرف الفاظ کے لسانی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے کیا کیونکہ وہ خود فرماتے تھے کہ:-

"...... چوں آئینہ زیادتی حرف باشد ...."

اس کے علاوہ کچھ وہ الفاظ جو تخفیف کے ساتھ استعمال کیے جاتے تھے۔ حاتم کے ذوقِ سلیم پر گراں تھے۔ لہٰذا انھوں نے ان الفاظ کو حسبِ ذیل انداز میں پیش کیا۔

یہ	بجائے	یہ
یہاں	"	یاں
وہاں	"	واں

اس کے بعد شاہ حاتم نے جو مزید اہم تبدیلی کی وہ یہ ہے کہ رائے فارسی کو رائے ہندی (ڑ) کے ساتھ قافیہ کرنے کو متروک قرار دیا۔

گھوڑا	قافیہ	.بورا
دھڑ		سر

اس سلسلے میں شاہ حاتم کی آخری اصلاح انھیں کے الفاظ میں یہ تھی کہ ...

"...... گر ہائے ہوز را بدل کردن بہ الف کہ عام تا خاص در محاورہ دارند بندہ در یں امر بمطابقت جمہور است...."

مختصر یہ کہ شاہ موصوف کسی محاورہ میں ہائے ہوز کے بجائے الف استعمال کرنے کو غیر فصیح سمجھتے تھے۔

مثلاً. بندہ	کو	بندا
پردہ	"	پردا

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اصول بہ حسن و خوبی ایک عہد میں ترتیب پا گئے۔ مگر سچ پوچھیے تو ان پر اس وقت اتنی سختی سے عمل نہیں کیا گیا جس قدر سختی سے انیسویں صدی میں ہوا حالانکہ اس صدی کے شعرا کا شعور صرف متروکات کی حد تک محدود تھا۔ لیکن جب ان متروکات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو ان کی تہہ میں وہی اصول ملتے ہیں جن کی طرف سب سے پہلے خان آرزو نے اشارہ کیا اور پھر بعد میں مظہر جانجاناں، شاہ حاتم اور دیگر مصلحین زبان نے ان پر عمل کیا۔ لہٰذا ان متروکات کی ایک طویل فہرست مہیا کی جاتی ہے۔

نین	بجائے	چشم
گیٹ	"	پگڑی
ماس	"	گوشت
موہن	"	معشوق
من	"	دل
پرت	"	غیر
درس	"	دیدار
پیتم	"	معشوق
سُرج	"	سورج
بجلی	"	بجلی
چند	"	چاند
کال	"	مصیبت
ساجن	"	معشوق
درشن	"	زیارت
متا	"	تجویز
پیو	"	دوست، یار
برہا	"	فراق
سنسار	"	دنیا
باٹ	"	رستہ
دارو	"	دوا
سریجن	"	معشوق
جیو	"	جی
جھوٹا	"	جھوٹا
عن	"	طرح
بھیتر	"	اندر
نا	"	نہ، نہیں
سیں، سوں، سی	"	سے
اگے	"	آگے
باج	"	بغیر

منیں، منے	بجائے	میں
دوجے، دوجا	"	دوسرا
کن	"	پاس
نزیک، نزک	"	نزدیک
بنا	"	بن
تلک	"	تک
کون	"	کو
کدھی، کدھیں	"	کبھی
اتا	"	اتنا
نئیں	"	نہیں

زبان اردو کی اصلاحات کے سلسلے کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قارئین اس کے پس منظر سے بخوبی واقف ہو جائیں جس کو تحریک اصلاح زبان بعہد ناسخ کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ ان مختلف تحریکات کی تفصیل اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو کہ اصلاح زبان اور خاص طور پر متروکات سے متعلق ناسخ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں یا تمام تر متروکات کو جس طرح صرف ناسخ ہی سے منسوب کیا گیا ہے وہ کس قدر جانب دارانہ نظریہ ہے۔

اردو زبان کی تدریجی ترقی کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ خان آرزو، مظہر جانجاناں اور شاہ حاتم کی اصلاحی کوششوں کو اپنے عہد میں وہ قبول عام حاصل نہ ہو سکا جو ان کے ایک صدی بعد دلی میں شاہ نصیر اور ذوق، اور لکھنؤ میں ناسخ و آتش کی کاوشوں کو ہوا۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ایک صدی پہلے تحریک اصلاح زبان نہ شروع ہوئی ہوتی تو ہم ناسخ جیسے استاد فن اور مصلح زبان کی خدمات سے محروم رہتے۔ لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ناسخ نے جو تحریک اصلاح زبان شروع کی اور اس پر پوری زندگی سختی سے عامل رہے اس کے کیا کیا منفی اور مثبت اثرات اردو زبان و ادب پر پڑے اور یہ تحریک بذات خود کس حد تک کامیاب یا ناکام رہی؟

لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ اس تحریک کی اوّلیت کا سہرا ناسخ کے سر ہے۔ یا سید انشاؔ نے "دریائے لطافت" لکھ کر ناسخ کے لیے پہلے سے راہ ہموار کر دی تھی۔ جس کو بنیاد بنا کر ناسخ نے اپنے اصول وضع کیے۔ صاحبِ تذکرہ جلوۂ خضر کے استدلال کی رو سے دریائے لطافت ناسخ کے اصولِ اصلاح کو بنیاد بنا کر لکھی گئی۔ اس کی دلیل میں صاحب تذکرہ یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ انشاؔ کی شاعری بذات خود ان اصولوں پر نہیں ہے جو دریائے لطافت میں موجود ہیں۔ بلکہ ناسخ نے ان اصولوں پر سختی سے عمل کیا لہٰذا اس لحاظ سے ناسخ کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہونا چاہئیے۔ کیونکہ انھیں اصول پر وہ کتاب مدون کی گئی ہے حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اصول ساز بھی اصول پر پابند رہنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ قدماء میں شاہ حاتم وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

صاحب تذکرہ کی اس غلط فہمی کی تردید یوں کی جا سکتی ہے کہ اوّل تو انھوں نے ناسخ کی عمر تقریباً سو سال مان کر اس بحث کا آغاز کیا ہے۔ حالانکہ جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا کہ ناسخ کی عمر انتقال کے وقت ۷۸ یا ۷۹ سال کی تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انشاؔ کی دریائے لطافت ۱۲۲۳ھ یعنی ۱۸۰۸ء میں منظر عام پر آئی اس کے ایک سال بعد مصحفی کا دیوان ششم ۱۲۲۴ھ میں مرتب ہوا۔ جس میں مصحفی نے ناسخ کی شاعری کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے قبل کوئی تذکرہ ناسخ کا ذکر نہیں کرتا۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ناسخ اس وقت تک کھل کر میدان شاعری میں نہیں آئے تھے۔

اس ضمن میں یہ بات انشاؔ کے لیے بدنصیبی سے کم نہیں کہ جو اصول انھوں نے مرتب کیے وہ خود ہی انھیں کلام میں نہ لا سکے اور اغیار نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی عظمت کا لوہا منوا لیا۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کسی جانب داری سے کام نہیں لینا چاہیے دریائے لطافت پہلی کتاب ہے۔۔۔۔۔ جس میں باقاعدہ طور پر اصلاح زبان کے اصول لکھے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں

اس اصول کو بہت غلط ملط کرکے پیش کیا گیا ہے مگر پھر بھی یہ کوشش مستحسن اور قابلِ ستائش ہے لیکن اس کا سہارا پاکر ناسخ نے جو عمارت تعمیر کی وہ دنیائے فن میں اور بھی بہ نظرِ استحسان دیکھی گئی یہاں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ناسخ نے کیوں اصلاحِ زبان کی طرف اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مرکوز کر دیا؟ اور اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ خاص کر متروکات کی طرف توجہ مبذول کی۔

ان کے اسباب حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) دہلی کے تفوق کو ختم کرنے کے سلسلے میں دہلی کے خلاف ہر شعبۂ زندگی میں ردِ عمل۔

(۲) مکمل احساسِ آزادی۔

(۳) اقتصادی اور معاشی فارغ البالی۔

دہلی اور اہلِ دہلی چونکہ صدیوں سے فخرِ بلاد سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ سیاسی اقتدار حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب میں بھی اہلِ دہلی کو پورے ملک میں امتیاز حاصل تھا۔ جو لہر دہلی سے اٹھتی تھی وہ ملک کے ہر گوشے کو سیراب کرتی تھی۔ لیکن جب حکومتِ مغلیہ زوال پذیر ہونا شروع ہوئی تو اس کے ساتھ وہ تمام صلاحیتیں جو اہلِ دہلی کا طرۂ امتیاز تھیں۔ آہستہ آہستہ مائل بہ انحطاط ہونے لگیں۔ اس کی سب پہلی اور بنیادی وجہ معاشی بدحالی تھی جس کی وجہ سے شعرا اور اہلِ علم یکسوئی اور دلجمعی سے ہاتھ دھو بیٹھے افراط و تفریط کا وہ عالم تھا کہ ہر آن قیامتِ صغرا کا انتظار رہتا تھا۔ حالات ابھی کچھ ہیں اور ابھی کچھ ہو گئے۔ کوئی بساط اچھی طرح بچھنے بھی نہ پاتی تھی کہ ہوا کا کوئی تند جھونکا اسے آن کی آن میں الٹ دیتا تھا۔ اس کے باوجود اہلِ دہلی کو اپنے تفوق کا احساس تھا اور وہ اس کا اظہار مخصوص حالات میں کر جاتے تھے اس کے ثبوت میں مہاجرین شعرائے دہلی کے متعدد اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جو دہلی سے ہجرت کے بعد لکھنؤ پہنچ کر بھی اپنی فوقیت کا پرچم لہرانے سے باز نہ رہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میر تقی میرؔ ؎ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

مصحفی ؎ صحرایانِ پورب کا جانتے ہیں اس کو
اے مصحفی جدا ہے انداز اس بیاں کا
اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں
دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ ؎
ہزار حیف کہ دلّی سا شہر ویراں کر دیا
کیا ہے یاروں نے آباد ملک پورب کو

اس قسم کے اشعار قریب قریب ہر دہلوی شاعر کے ہاں ملتے ہیں۔ جنھیں بخوفِ طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

بہرحال ان اشعار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہلِ دہلی کا یہ احساسِ تفوق سب کچھ لٹ جانے کے بعد بھی قائم رہا۔

جب ہر چہار طرف سے اہلِ لکھنؤ کے کانوں میں ایسی صدائیں آئیں تو ایک عرصہ تک وہ لوگ اسے گوارا کرتے رہے۔ اور اہلِ دہلی کی فوقیت کا احترام کرتے رہے۔ لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور اہلِ لکھنؤ نے اپنے دیار کا جائزہ لیا تو اہلِ دہلی کے خلاف ایک طرح کا جذبۂ ردِ عمل ان کے دلوں میں موجزن ہوا اور کیوں نہ ہوتا۔ آخر کب تک کوئی کسی کی خودستائی کو سراہے گا۔ کچھ عرصے بعد۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جبکہ وہ خودستائی کرنے والے پر حرف گیری کرنے کی جرأت کرے گا۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ طلسم خود بخود کمزور پڑتا جائے گا۔ اور نتیجے کے طور پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جبکہ سارا شیرازہ منتشر ہو کر رہ جائے گا۔ یہی حشر اہلِ دہلی کے احساسِ تفوق کا ہوا۔ یعنی ناسخ و آتش کے ہاتھوں اردو شاعری میں ایسی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ اس کا اعتراف ایک عرصہ بعد اہلِ

دہلی کو بھی کرنا پڑا۔ ان تبدیلیوں کے منفی اور مثبت اثرات کس کس شکل میں ظاہر ہوئے اس کا جائزہ آئندہ کے صفحات میں لیا جائے گا۔

بہر حال یہ ردِ عمل جو اہل دہلی کے خلاف زندگی کے ہر شعبہ میں ہوا تھا خصوصی طور پر اردو شاعری پر زیادہ نمایاں انداز میں ہوا جس کے نتیجے کے طور پر عہد ناسخ و آتش سے دہلی کے علاوہ دبستان لکھنؤ کی داغ بیل پڑی اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جذبۂ ردِ عمل کن اسباب کے تحت بیدار ہوا؟ اس کی خاص وجوہات دو ہیں:۔

(۱) مکمل آزادی کا احساس۔ (۲) اقتصادی اور معاشی فارغ البالی۔

مغلیہ حکومت کے اقتدار کے خاتمہ نے دہلی میں وہ فضا پیدا کر دی کہ اہل علم و فن بدحال و پریشان ہو کر دیگر بلاد و امصار کو ہجرت کرنے لگے جن کی کثیر تعداد وارِ د لکھنؤ ہوئی۔ یہاں کے نوابین نے مہاجرین شعراء اور اہل فن کی سرپرستی ہی نہیں بلکہ قدر دانی، اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ لیکن اس کے باوجود اہل دہلی اپنی برتری کا سکہ جماتے رہے اور یہ چیز اہل لکھنؤ کے جذبۂ اخلاص پر ایک ضرب کاری کا کام کرتی رہی۔ کیونکہ اہل لکھنؤ غازی الدین حیدر کے عہد سے اپنے کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار سمجھ رہے تھے۔ لہٰذا اس جذبہ کے تحت وہ اب دہلی اور اہل دہلی کو وہ مقام دینے کو تیار نہیں تھے۔ جس کا اظہار اہل دہلی بار بار کرتے تھے۔ چونکہ اب نواب اودھ نواب نہیں رہا تھا۔ بلکہ اسے اقتدارِ انگلشیہ سے بادشاہ کا خطاب مل چکا تھا۔ لہٰذا ان حالات میں فطری طور پر اہل لکھنؤ کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اب کسی بڑی حکومت کے زیر اثر نہیں رہے۔ بلکہ ان کا نواب بادشاہ کا رتبہ حاصل کر چکا ہے۔ آزادی کے اس تصور نے اتنی پختگی حاصل کر لی کہ وہ اب لکھنؤ کے علاوہ کسی دوسری سرزمین کو اس کا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا دیگر شعبہائے حیات کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب پر بھی اس احساس آزادی کی گہری چھاپ پڑی۔

ابھی ہم نے مکمل احساس آزادی کے اثرات کا جائزہ لیا اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ احساس آزادی کن حالات کے تحت پختہ تر ہو گیا کہ اس سے پورا ملک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی بنیادی وجہ اقتصادی اور معاشی خوشحالی تھی۔ اور اس خوش حالی کا لازمی نتیجہ بےفکری اور فرصت کی فراوانی تھی۔ لہٰذا ایسے حالات میں عوام کے لیے اور کیا مشغلہ ہو سکتا تھا کہ ان کا وقت اچھی طرح گزر رہا ہے۔ اس کا واحد حل فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ ان فنون میں خاص طور پر فن شاعری کو دہلی کے مزاج میں زیادہ دخل تھا جس کی بنا پر لوگ اسی کو فن تر سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ عام انسانی زندگی پر بھی اس خوش حالی کا اثر پڑا۔ یعنی خورد و نوش اور پوشش میں نئی نئی تراشیں اور وضعیں نکالی گئیں۔ جس کی مثالیں اس عہد کے کھانوں اور لباسوں سے دی جا سکتی ہیں۔ ان حالات کے تحت کیا وجہ تھی کہ اردو زبان اس سے متاثر نہ ہوتی اور اسے متاثر ہونا پڑا۔ البتہ بہت سی بدعتیں ملک ادب میں بھی شروع ہو گئیں جن کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں۔ لہٰذا ان بدعتوں کی اصلاح بھی ضروری تھی لہٰذا وہ اصلاح مخصوص حالات میں آتش، ناسخ کی مجتہدانہ کوششوں سے عمل میں آئی جن کے لازمی نتائج کچھ نعمتوں اور کچھ زحمتوں کی شکل میں رونما ہوئے۔ اب اس کے بعد بہتر ہوگا کہ ناسخ کی اصلاح زبان اردو کا مکمل جائزہ لیا جائے۔

ناسخ اور اصلاح زبان

اصلاح زبان اردو کی مختلف تحریکات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ حاتم کے بعد اردو ادب میں یہ تحریک کبھی بھی مستقل صورت میں ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اصلاحات کا سلسلہ شعوری یا غیر شعوری طور پر از خود قائم رہا مگر کسی فرد یا جماعت نے بطور خاص اسے موضوع فن نہیں بنایا۔

بلکہ وہ انفرادی طور پر قطعی ویسے اور جیسے اصلاح کو رائج رکھتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ باقاعدہ اس کے اصول متعین کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے اپنے شاگردوں کو مجبور کریں۔ بلکہ تلامذہ انھیں بحیثیت استاد سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ استاد نے ایک چیز کو روا رکھا مگر تلامذہ نے اسے مذموم سمجھ کر نکال باہر کیا اور اکثر اس کے برعکس بھی ہوا۔ لہٰذا اس نہج پر کوئی مستقل تحریک بھی نہیں چل سکتی تھی۔ البتہ متفرق اوقات میں مکاتیب اور دیگر نجی تحریروں کی شکل میں کہیں کہیں اظہار خیال ضرور مل جاتا ہے۔ جیسے ناسخ سے جب کسی نے لفظ "تیئں" کے استعمال کے سلسلے میں کچھ استفسار کیا تو انھوں نے بشکل مکتوب حسب ذیل جواب دیا۔

مستفسر :- "لفظ "تیئں" خلاف محاورہ است متروک مترقب کر صحت وسقم دستخط شود قائلے می گوید

تمہارے تئیں سنگ دل کس نے ٹھانا صنم
شیشۂ دل پر عبث سنگ لگانا صنم

جواب شیخ ناسخ مرحوم :-

"این چنیں الفاظ البتہ متروک بندہ است والا کسے ترک نہ کردہ ان یومنا ہذا اساتذہ لفظ مذکور را با دیگر الفاظ متروک کہ جائز داشتہ اند مطلقاً عیب نیست۔ بندہ ہم معیوب نگاہ دارد و سوائے ایں قباحت در شعر مرقوم بہ نظرمی آید و جناب قبلہ اگر غزلے بعد ازیں در زمیں موزوں فرمایند البتہ انشراح خاطر بندہ گرداند....."

اس تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ ناسخ اسے (تیئں) متروک مانتے ہوئے بھی استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔

اس قبیل کی نگارشات مکتوبات غالب کی زینت بن گیئں لہٰذا ان نگارشات کی بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شاعر غالب، فلاں خیال کا مبلغ تھا اور فلاں اصول فن سے احتراز کرتا تھا۔ بلکہ ہمارے قدما اپنی افکار کا اظہار اسی انداز میں کیا کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہر شاعر کے ذہن میں اصلاح زبان سے متعلق مسائل ابھرتے تھے بلکہ یہ روش عام تھی جو آج بھی شعرا کے درمیان عام ہے۔

اب اس کے بعد ہم متروکات ناسخ سے بحث کریں گے۔ جو عہد ناسخ سے لے کر اب تک ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر قریب قریب ہر تذکرہ نگار اور مورخ ادب نے اظہار خیال کیا ہے اور اس سلسلے میں صفیر بلگرامی نے متروکات ناسخ کے نام سے "تذکرۂ جلوۂ خضر" میں ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کر دی ہے۔ جس کی بنا پر ناسخ کو متروکات کا میر کارواں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن یہ متروکات بھی قابل اعتراض ہیں کیونکہ ان میں صفیر نے بہت سے الفاظ ناسخ کے نام سے منسوب کر دیے ہیں جو حقیقتاً ناسخ سے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ترک کی فوقیت انشا، مصحفی وغیرہ کو حاصل ہونی چاہیے۔

جب ہم کلام انشا، مصحفی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان اساتذہ نے میر اور میرزا کے بہت سے الفاظ مستعملہ کو ترک کرنا شروع کر دیا تھا اور بہت حد تک اس میں کامیاب رہے۔

بہر حال اس کی تفصیل سے آئندہ بحث کی جائے گی۔
اس وقت جو فہرست صفیر بلگرامی نے پیش کی تھی پیش خدمت ہے۔"

فہرست الفاظ

محاورہ بہ وقت میر حسن	محاورہ بہ وقت ناسخ	محاورہ بہ وقت میر حسن	محاورہ بہ وقت ناسخ	محاورہ بہ وقت میر حسن	محاورہ بہ وقت ناسخ
دم بہ دم	دم بدم	ڈبیا	رویا	[illegible]	اُس پہ

بیک	نیکن	شن تن	سنگر	بھرکے آہ	بھر کے ایک آہ
میں	میں نے	جون	مثل، مانند	مت	نہ
کیونکہ	کیوں کر	اسطے ہے	اشتا ہے	سیری و فرہاد	شیریں و فرہاد
پھر پھر کہہ	ہر پھر کہہ کے	نہیں معلوم تجھ پر بھی	نہیں معلوم مجھ کو بھی	بن کہے	بے کہے
زخمیں (موث)	زخم (مذکر)	ٹک	ذرا	ایک بوسے کی خاطر کو	ایک بوسے کی خاطر
لوہو	لہو	بچارہ	بے چارہ	ترے بن	بے تمہے
مت	ہمیشہ	کس کس طرف	کس شخص طرف	تیرے تئیں	تجھکو
دل کو سحر کیا	دل پر سحر کیا	تجھ سوا	تیرے سوا	ہم ہی نے	ہمیں نے
نپٹ	بہت	کیا باتوں	کیا جانیں	نمط	طرح
دیا	چراغ	تپنگ	پتنگا.. پروانہ	پھر پھر	ہر پھر
جھوٹ بھی کہا	جھوٹوں بھی کہا	اس ڈھب کا۔	اس طرح کا	میاں	صاحب
سونپ کر کنج	ڈال کر کنج	کیا کیا خواریاں	کیا کیا خواری	ولیک	ولیکن
قفس میں	قفس میں	مشت غبار پہ بھیا	مشت غبار کی ہے	ساتھی	ساتھ ہی
ودا	وداع	ہوجو	ہوجیو	خانخواہ	خواہ مخواہ
تک کر	تاک کر	گزری	گزری	مثل تپنگ	تپنگ کے مثل
طرف	طرفداری	رم ہوگئی	رم کر گئی		
انھوں کا	ان لوگوں کا	جگ	زمانہ	پہونچائے ہیں ہم	پہونچائے ہیں ہم نے
رہیگی	رہے	آفریں باد	آفریں ہو		
دیکھ	دیکھ کر	لگا	لگا کر	سہے ہے	سہا جاتا ہے
نفسِ شوم	نفسِ شوم	کیونکہ	کس طرح	جوں	مثل
کبھو	کبھی	کوہ چیرا	کوہ پھاڑا	اپنے رشک حور کا	اپنے رشک حور کی
سمیت	ساتھ	چشم	چشم داشت امید	گلگوں لگادے	محبت لگادے
گھٹائیں چھائیں	گھٹائیں چھائیں	دیکھیے	دیکھئے	عاقبت	آخر کو بآخر
لگے ہے	معلوم ہوتا ہے۔	پھلکاری	پھولام	کاڑھنے سیکھا ہے	کاڑھنا سیکھا ہے۔

انتخاب محاورہ از دیوان سودا۔ (جلوۂ پنجم صفحہ ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶):

لفظ بہ وقت سودا	بہ وقت ناسخ	بہ وقت سودا	بہ وقت ناسخ	بہ وقت سودا	بہ وقت ناسخ
پنہیر	پہن	تیرے	تو	جگ	دنیا

نپٹ	بہت	راہ گیروں	راہ رووں	جن نے	جس نے
پرے	الگ	دوانہ	دیوانہ	پھرے ہے	پھرتا ہے
میں	میں نے	آن نے	اس نے	مجھ	مجھ سے
آگو	آگے	تجھ بن	بے تیرے	سے صبح سے تا شام	صبح سے شام
طرح غنچہ	غنچہ کی طرح یا مثل	اس کو پوچھنا	اس سے پوچھنا	جاے ہیں	جاتے ہیں
کریو	کیجیو	سجن	صنم	پتھروں	پتھروں
انکھڑیاں ملیاں	انکھڑیاں ملیں	ٹوٹو میاں	کھوجی	بغل بیچ	بغل میں
بدلا کرنا	بدلا لینا	حال سہنا	صدمہ سہنا	کتیں	کو
طرف	طرف	یوں بھی	ہوا چلی	اون نے	اس نے
رووں	روؤں	ستی	سے	سیتی	سے
لاگا	لگا۔	تجھ تیغ	تیری تیر	رپٹے ہے	پھسلتا ہے

انتخاب از دیوان میر تقی میر۔ جلوۂ پنجم ۱۴۶۔۱۴۷

محاورہ بہ وقت میر	تبدیلی بہ وقت ناسخ	محاورہ بہ وقت میر	تبدیلی بہ وقت ناسخ	محاورہ بہ وقت میر	تبدیلی بہ وقت ناسخ
رنگ جھمکے ہے	رنگ جھلکتا ہے	پات	پتا	ہر پات ہرے کی اوجھل	ہر ایک ہری پتی کے اوجھل
کرے ہے	کرتا ہے	ٹک	ذرا	تئیں	کو
کسو	کسی	جوں	جس طرح	خاک میں رل جانا	خاک میں مل جانا
ان نے	اوسنے	کبھو	کبھی	دریا کا سا	دریا سا
جامۂ کم گھیر	کم گھیر کا جامہ	ندان	ہمیشہ	اُدر	طرف
اوس دم تئیں	اس وقت تک	ہم تواب دیکھا	ہم نے خواب دیکھا	دیکھیے	دیکھیے
دیوے	دے	دیا	چراغ	جوں ایندھن	ایندھن کی طرح
بن	بغیر	لوہو	لہو	دارو	دوا
کیونسے کے	کس طرح	ستارہ	شہرہ	کب رُو ہے	کب منہ ہے
باآنکہ	باوجودیکہ	کیونکہ	کیونکر	چلا جا ہے	چلا جاتا ہے
شمع سا گلنا	شمع سا پگھلنا	دخت تاک	دخت رز	مائی	مٹی
دامن چلنا	دامن مسکنا	بچاروں	بیچاروں	اودسے مغفرت ہو	اوسکی مغفرت ہو
مہندی کے رنگ	برنگ حنا	ایدھر	ادھر	نگاہ کا نالہ	نالۂ سحر

دیے	مگر و لیکن	سر کو فرو لانا	سر کو فرو کرنا	لیک	لیکن
داغ ہوں	داغ کھاتا ہوں	جاتا جاتا ہے	سمجھا جاتا ہے	تنک	ذرا
کھوج	نشان	نشا	نشہ	تمہ	تب
مرے موے گئے	مرے مرنے کے بعد	دل ڈھائے کر	دل ڈھا کر	تجھ	تجکو
دیدار پانا	دیدار ہونا	خواب لے جانا	خواب آنا	منھ پر نقاب لینا	منھ پر نقاب ڈالنا
اودھر	اُدھر	جاگہ	جگہ	شور وشرا با	شور وشر
بھتیاں ہیں	بہتی ہیں	قلابا	قلابہ	خرابہ پھیلنا	خرابی پھیلنا
شرح دینا	شرح کرنا	اوس کنے	اس کے گھر	سمٹ	طرح
ٹُرت	طرَت	قاصد چلانا	قاصد بھیجنا	زنجیری رہنا	قید رہنا
تئیں	تونے	تدھر	اودھر	ڈکا	عشرہ محرم
تجھ تئیں	تجھ تک	دارو	شراب	اودنہ	دگر ورنہ
جلا بیگا	جلاوے گا	لب بام ہوگا	لب بام آئے گا	خیال لینا	خیال باندھنا
نت	ہمیشہ	ایکوں	ایک	دار کھینچنا	دار پر کھینچنا
بدشراب	بدمست	انتہا لانا	انتہا کو پہونچنا	پلک ماروں ہوں	پلک جھپکاتا ہوں
یونا	جھکنا	کرئے	کیجئے	پہنچئے	ہوجئے
بجو	میرے	جائے باش	جائے بود و باش	قصے کہ	اوس قسم سے کہ
وہ خدی چیز ہے	وہ جدا چیز ہے	ہلاکی کو پہونچنا	ہلاکت کو پہونچنا	ہوجو	ہوجیو
سمندر بلونا	سمندر راو بھنا	ایر	اوپر	پالہ	پیالہ
کتیں	کو	بہروسا پڑنا	بہروسا ہونا	دم باز پس	دم باز پسیں
رُدھ رکھنا	منھ رکھنا	مت کر لیو	نہ کیجیو	یاں تئیں	یہاں تک

انتخاب محاورہ از دیوان انشاءؔ ۔ جلوۂ پنجم صفحہ ۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷

محاورہ بوقت انشاء	تبدیلی بوقت ناسخ	محاورہ بوقت انشاء	تبدیلی بوقت ناسخ	محاورہ بوقت انشا	تبدیلی بوقت ناسخ
جی چلا	رغبت ہوئی	کہیں ہیں	کہتے ہیں	دیا جلا	جلا دیا
ٹُرت	طرت	اسی نمط	اسی طرح	ٹک	ذرا
بیگا	ہے	ہو	ہوکر	چھوڑ	چھوڑ کر
دیکھ	دیکھ کر	مت	نہ	کھنچے	کس نے
رہے ہے	رہتا ہے	ہووے گا	ہوگا	میں تمہارا نام لے لے	میں تمہارا نام لے کر

چادر مہتاب اوپر	چادر مہتاب کے اوپر	کا سا	کی طرح	آپ بن	بے آپ کے
ہم نے کہا	ہم نے کہا	دوانہ	دیوانہ	تجھ بن	بے تیرے
تو کہے	جیسے۔ گویا	گھڑی ایک میں	ایک گھڑی میں	کڈھب	بے ڈھب
ملے	و لیکن	میاں	صاحب	نشتر	نشتر
آخرش	آخر	اونے	اوس نے	دیکھ لیجے	دیکھ لیجئے
زرہ چہ	زرہ	گڑ کہ	بگڑ کر	تبھی	جبھی
نے لیویں گے	نے لیں گے	کی سی طرح	کی طرح	تس پر	اوس پر
مجھ پاس	میرے پاس	جوں ساقی نے	جوں ہی ساقی نے	رہ نداں	زنداں
جوں	مثل	—	—	—	—

انتخاب محاورہ از دیوان مصحفیؔ جلوہ پنجم ص ۱۹۷

محاورہ بوقت مصحفیؔ	تبدیلی بوقت ناسخؔ	محاورہ بوقت مصحفیؔ	تبدیلی بوقت ناسخؔ	محاورہ بوقت مصحفیؔ	تبدیلی بوقت ناسخؔ
دیویں	دیں	طرح نرگس کا	نرگس کی طرح	ٹک	ذرا
نگر	دیار، شہر	وے	مگر۔ لیکن	کیونکہ	کس طرح۔ کیونکر
چپکے سے	چھپتا ہے	پھرے ہے	پھرتا ہے	تو کہے	گویا۔ جیسے
نت	ہمیشہ	لوٹوں ہوں	لوٹتا ہوں	عدو	غیر
میں	میں نے	سما گیاں	سما یوں	چھوڑانا لب حنا	لب سے حنا چھڑانا
وے	وہ	آنے کہا تھا	آنے کو کہا تھا	—	

اس فہرست متروکات کے پیش کرنے کا یہ مقصد ہے کہ قارئین کو اس کا صحیح طور پر اندازہ ہو جائے کہ عقیل بگرامی نے کسی طور پر یہ فہرست مرتب کی۔ [illegible] مدون کتاب نہیں تھی جسے وہ ناسخ کے نام سے منسوب کر کے فائدہ اٹھا سکتے۔ [illegible] دریائے لطافت کے علاوہ کوئی ایسا با قاعدہ [illegible] تھا جس کو سامنے رکھ کر صاحب تذکرہ [illegible] کام کر سکتے۔ [illegible] کے مطالعہ کے بعد [illegible] یہ فہرست متروکات

مرتب کی ہے۔ لیکن جب ہم اس فہرست سے قطع نظر کلیات ناسخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں متعدد ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جنہیں ناسخ نے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ جیسی کہ متروکات ناسخ سے متعلق یہ ایک عام رائے چلی آرہی ہے کہ انھوں نے ہندی کے نرم و شیریں الفاظ کو متروک قرار دیے جو شعر و ادب کے لیے زیب و زینت کا کام دے سکتے تھے، درست نہیں۔ میں نے کلیات ناسخ کے مطالعے کے بعد جہاں تک اندازہ لگایا ہے وہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا رائے عوام میں غلط طور پر

مائج ہو گئی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس رائے میں غلو سے کام لیا گیا ہے تو نامناسب نہ ہوگا کیونکہ تاریخ ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ناسخ نے بنفس نفیس کوئی ایسی منظم تحریک نہیں چلائی تھی جس کا ثبوت اب تک کہیں سے فراہم ہو سکے۔ البتہ اس موضوع سے متعلق ان کے شاگردوں کی زبانی بہت سی ایسی افواہیں اب تک زندہ ہیں جن کی نہ تو کوئی سند ہے اور نہ ادبی وقار بلکہ ان کی حقیقت چند سنی سنائی باتوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں اور نہ ابتک ناسخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب ہو سکا ہے جس کی بنا پر انھیں متروکات کے سلسلے میں ایک ادبی مجرم گردانا جائے۔ بہر حال، اس بحث کو مختصر کرتے ہوئے میں سردست وہ فہرست الفاظ پیش کرنا چاہتا ہوں جو ہندی الفاظ پر مشتمل ہے اور جس کے مطالعہ کے بعد اس عام رائے کی تردید ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہو جاتی ہے کہ ناسخ نے ہندی کے نرم و شیریں الفاظ کو سرے سے متروک قرار دیا۔ وہ فہرستِ الفاظ حسب ذیل ہے۔

"بن، اچنبھا، سُدھ، جل تھل، سُمرن، بھونر، بیر، ہر، راگ، پھاٹک، جاگا، جاگ، سوت، جاگرت، سرنگ، چنپت، دھیان، دان، مرگ چھالا، دُوب، چندھیانا، گھات، رانگا، جاداں، سکھیاں، ڈور، گیدڑ بھبکی، چھنال، کال، کھب، نگری، بھبوتے، تباہ تراہ، سانگ، کھیس، کمر بند، لکھوٹا، اشنان، بجوگ، نگ، باڑھ، کولی، بھبوکا، پوجا، بن، پونٹوں، بتاسے، پوجا، لنگا، بانبی، لون، بوند، کٹاری، چاٹ، مالا، سینکنا، چاندنا، کائی، چاہا، گڑھا، چھرکھٹ، ڈھنگ، چھایا، جھانواں، ہتول، اڑیل، ٹھیرا، گھٹا، ٹوپ، دھواں دھار، اوجھل، پچھتانا، بھوج، گھونج، دڑاڑیں، گڑھے، باڑھ، کنکری، تان، بھیتیاں، بات، سنڈنا، بگر، ڈھیلے، انانج، سیندور، مینہ، ہانسی، ناگ، جڑاؤ، روگ، چیم دائرہ، اودا ہٹ، رچی، جھٹ، پٹ، گھونگھٹ، لگاوٹ، مرگھٹ، پیٹ، جگمگ، لٹ، توبنی، بڑ، کٹاری، جاگرت، کنگھی، جاگ، ناگ، ناگ، پوپلا، منتر، بیٹڑیا، بلک، موہنی، پگھنی، اپنی دیس جگ، پاؤ، بے آس۔

مندرجہ بالا پیش کردہ ہندی الفاظ میں متعدد الفاظ ایسے ہیں جن کو صاحب تذکرہ جلوۂ خضر نے متروکات ناسخ کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ یہاں میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس موقع پر یہ الفاظ میں نے صرف دو دواوین ناسخ سے منتخب نہیں کیے ہیں۔ بلکہ تینوں دواوین جو آج بھی آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہیں۔ ان کے معتبر ترین نسخوں سے انھیں منتخب کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں یہ حکم لگانا آسان نہیں کہ ناسخ نے اس قسم کے الفاظ صرف دور اول میں استعمال کیے ہیں۔ جبکہ ان کا استعمال موقع بہ موقع آخر وقت تک کلیات ناسخ میں مل جاتا ہے۔

اب اس کے بعد زبان ناسخ سے متعلق جو سب سے زیادہ اہم نکتہ ہے وہ ہے قواعد کی جگہ و اصلاح۔ اس سلسلے میں بھی ناسخ نے مخصوص انداز فکر سے کام لے کر اپنی مجتہدانہ شان قائم رکھی۔ لیکن یہاں بھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس نقطۂ نظر کی تخلیق میں بھی دلی والوں کے خلاف وہی جذبۂ ردعمل کارفرما تھا جس کے تحت مجموعی طور پر لکھنؤ اسکول معرض وجود میں آیا۔ یعنی ناسخ نے اہل دلی کی بنائی ہوئی قواعد کو بھی چیلنج کیا جس کا ثبوت مندرجہ ذیل اصول زبان سے مل جاتا ہے۔

۱۔ ہندی اور فارسی الفاظ کو مع زور تانیث سے نہ باندھا جائے۔

۲۔ لفظ کے حروف کو نہ بڑھانا یا ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن یا مخفف کو مشدد اور مشدد کو [illegible]

۳۔ عربی، ہندی، یا فارسی الفاظ کو مع زور تانیث کے ساتھ نہ باندھنا تاکہ وزن پورا ہو جائے۔

۴۔ ثقیل اور غیر ثقیل الفاظ سب کو بلا تفریق باندھنا۔
۵۔ لغات کی سختی سے پابندی کرنا۔
۶۔ ترکیب اضافی میں سختی کرنا۔ یعنی ایک لفظ ہندی اور دوسرے لفظ فارسی کے مابین اضافت ممنوع۔
۷۔ مفرد ردیفوں کا استعمال جائز۔

مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں جب ہم زبان ناسخ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس سے ان کی شخصیت کا وہ پہلو ہمارے سامنے آتا ہے جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

چونکہ عرصۂ دراز سے ناسخ کی اصلاح زبان سے متعلق یہ ایک عام رائے چلی آرہی ہے کہ انھوں نے متروکات کا سلسلہ شروع کر کے زبان کو شدید نقصان پہنچایا اس لیے آج بھی ہم اس غلط رائے کو تسلیم کر کے اسی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں جو ہمیں زیب نہیں دیتا۔ بہر حال اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم اسے مان بھی لیں کہ ناسخ کی اصلاحات نے کچھ حد تک زبان کو ضرر پہنچایا تو ساتھ ہی اس کھلی حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اصلاحات کے اس عمل نے بعد کے دور کو ایک ایسی زبان اور اسالیب بیان دیا جس سے غالب کے فکر کو اور انیس کے زور بیان کو توانائی ملی۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ناسخ زبان اردو کو ان آلائشوں سے پاک نہ کرتے جن سے متداول کا شعری ادب بھرا پڑا تھا۔ تو ممکن تھا آج وہ پیمانہ میسر نہیں آسکتا تھا جو اقبال کے فلسفیانہ افکار کا متحمل ہو سکتا اور نہ صنف نظم کو وہ ترقی مل سکتی تھی جو آج اسے نصیب ہوئی۔

گزشتہ سطور میں اس حقیقت کی تفصیل پیش کر دی گئی ہے کہ عہد ناسخ میں یا ناسخ کے ہاتھوں اصلاح زبان کے سلسلہ میں جو کچھ بھی شدت پسندی اختیار کی گئی اس میں بلا شبہ دہلی کے خلاف جذبۂ ردعمل مزید کار فرما تھا۔ مگر اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ اسی زمانے زبان اردو کو وہ لہجہ بھی مل گیا جس پر جدید شاعری کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ اس موقع پر علامہ دتاتریہ کیفی کے وہ چند جملے پیش کر دینا چاہتا ہوں جن سے میرے خیال کی تائید ہی نہیں ہوتی بلکہ ساتھ ہی یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے مابین جو عصبیت تھی اس کے شکار اہل دہلی اور اہل لکھنؤ دونوں بیک وقت تھے۔

"لکھنؤ والوں نے دہلی کی خصوصیات کو اور دہلی والوں نے لکھنؤ کی خصوصیات اور اغلاط کو متروکات قرار دے دیا اردو کے متروکات اور متروک کی تعریف ہر ایک کے ذہن سے پرے ہی پرے رہی ...."

پنڈت کیفی کی اس رائے کو اگر بنیاد بنا کر اس موضوع پر بحث کی جائے تو یہ حقیقت سو فیصدی سامنے آئے گی کہ ترک و متروک کا یہ سلسلہ جسے ارادی عمل پر محمول کیا جاتا ہے بڑی حد تک عصبیت کا پیدا کردہ تھا۔ کیونکہ عہد ناسخ میں یا اس کے اردگرد کبھی بھی کسی فرد یا جماعت کو یہ احساس باقاعدہ طور پر نہیں ہوا کہ زبان اردو ہنوز تشنۂ اصلاح ہے بلکہ غیر شعوری طور پر یہ عمل معرض وجود میں آیا۔ اس دعوے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اصلاح زبان کا اتنا زبردست کام ایک صدی میں شروع ہوا اور باقاعدہ طور پر اس کے لیے تحریری شکل میں کوئی مبسوط کتاب کسی مصلح نے مرتب نہیں کی اور ناسخ کے معتقدین نے ان کے نام سے کوئی کتاب منسوب بھی کی تو آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ ؏

"ایں چہ بوالعجبی ست"

صاحب تصنیف "لکھنؤ کی زبان" نے اتنا کام محنت سے ضرور کیا ہے کہ جہاں ناسخ کو بغیر کسی وقیع تاریخی حوالے کے اردو زبان کا مجدد ثابت کیا ہے وہیں ان کی شان مجتہدانہ کو مستحکم بنانے کے لیے ان سے متعلق جتنی آرا مل سکی ہیں انھیں یکجا کر دیا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں انھیں کے حوالے سے چند مستند شعرا اور ادبا کی آرا پیش خدمت ہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ فرماتے ہیں :-

"زبان کو اگر زبان کر دکھایا تو لکھنؤ والوں نے اور لکھنؤ میں ناسخؔ نے ......"

ان کے بعد علامہ امام اثرؔ عظیم آبادی بھی کچھ لفظی تبدیلیوں کے ساتھ ناسخؔ کے متعلق لکھتے ہیں :-

"فی الواقعی جیسی ترقی اردو کو ناسخؔ کی بدولت ہوئی ایسی کسی دوسرے شاعر کی بدولت ظہور میں نہیں آئی۔ بے شک اردو پر ناسخؔ کا بڑا احسان ہے۔ اگر ناسخؔ نہ ہوتے تو جیسی زبان لکھنؤ کی فصیح و شستہ ہو رہی ہے یہ خوبیاں اسے نصیب نہ ہوتیں۔"

ایک اور بیان مرزا غالبؔ کا ملاحظہ فرمائیے :-

"... ہم فقیر اعلانِ کلمۃ الحق میں بے باک اور گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخؔ طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے ....."

اسی سلسلہ میں صفیرؔ بلگرامی یوں رقم طراز ہیں :-

"... ناسخؔ کے تصرفات ایسے مقبول ہوئے جو آج تک جاری ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ناسخؔ کے تصرفات اصول سے ہوئے ...."

اس مضمون میں آگے چل کر صفیرؔ نے ایک اور فقرہ لکھا ہے جو سچ پوچھیے تو کسی تاریخ یا مستند حوالے سے پیش نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی محققانہ استدلال سے کام لیا گیا ہے بلکہ ذکر کو طول دیتے ہوئے کہا ہے :-

"ناسخؔ نے صرف و نحو کے اصول پر زبان کو ڈال دیا ہے جو ایک طرح سے تمام ملک میں سکھائی جا سکتی ہے۔"

آخر میں ناسخؔ کی مصلحانہ شخصیت کا سب سے زیادہ ٹھوس ثبوت دے کر یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں۔ یہ ثبوت ہے مصحفیؔ کا وہ کھلا اعتراف جو انھوں نے اپنے اردو دیوان ششم میں کیا ہے :

"غزلیات ایں دیوان ششم را اکثر بہ روئے ایشان (ناسخؔ) گفتہ ...."

اس کے معنی یہ ہیں کہ ناسخؔ نے مصحفیؔ کے زمانے ہی میں اپنی راہ الگ نکالی تھی۔ ہاں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا مصحفیؔ ناسخؔ کی زباں دانی سے متاثر ہوئے یا ان کے انداز بیان سے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ مصحفیؔ بہر حال ناسخؔ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے ناسخؔ کی طرز شاعری پر اپنا چھٹا دیوان تیار کیا۔ ان تمام متعلقات کا جائزہ لینے سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زبان و بیان کے معاملہ میں ناسخؔ نے جس بیدار مغزی سے کام لیا شاید اسی نے غالبؔ، ظفرؔ نے مصحفیؔ کو خیرہ کیا جس کی بنا پر انھوں نے اپنے خورد کی اتباع کو شعر و ادب کے لیے مفید سمجھا کیونکہ بقول

"بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال"

لہٰذا ظاہری شواہد کی روشنی میں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ اصلاحِ زبان سے متعلق جو کچھ کام لکھنؤ میں ہوا اس میں سب سے بڑا ہاتھ ناسخؔ کا ہے اور ان کے بعد اس سلسلہ میں زیادہ تر شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے کسی داخلی کیفیت یا تحریک کی بنا پر شعر نہیں کہے بلکہ صرف اصلاحِ زبان کی غرض سے اشعار کہے اور یقینی طور پر اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

حواشی

۱؎ قائمؔ — قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ، اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی۔

۲؎ رجب علی بیگ سرورؔ فسانۂ عجائب کے دیباچے میں لکھتے ہیں ... "ہم دلی کے روڑے ہیں، لاور(؟) ... پاؤں توڑے ہیں۔"

٣ مقدمہ تاریخ زبان اردو (مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں)

٤ شاہ حاتم: دیوان زادہ (قلمی نسخہ حبیب گنج کلکشن، آزاد لائبریری علی گڑھ)

٥ غلام ہمدانی مصحفی: تذکرہ ہندی گویاں۔

قائم چاندپوری:
ہو روم روم مرا گیسوؤں نہ خوش کہ وہ جبیں — یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سر شام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ — تلاش ہے مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

رفیع السودا:
سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا — پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو گوش کرنے تھا جہاں میں اہل کمال — یہ سنگ ریزہ ہوا ہے در عدن مجھ سے

میر تقی میر:
دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے — بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

٦ شاہ حاتم: دیوان زادہ (قلمی نسخہ حبیب گنج کلکشن)

٧ صفیر بلگرامی (مؤلف تذکرہ جلوۂ خضر)

٨ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قطعہ برائے نام تبدیلی کے ساتھ مصحفی کا ہے (احسن نشاط)

٩ صفیر بلگرامی (مؤلف تذکرۂ جلوۂ خضر، جلد پنجم صفحہ ٢١٣ تا ٢١٥)

١٠ انشاء:
فقیرانہ دل مقیم اس کی رہ کا — خوشی کیا کر محتاج ہر بادشاہ کا
سدا گم آہ کاری فلک بے مروت ہے — بیر و سر آ تاروں کی مت کر تمنا کا
تیری آشنائی میں کیا ہم نے پایا — دیا نقد دل اور اپنی گرہ کا
(دیوان انشاء صفحہ ١٤٩)

١١ میر او سعادت علی رنگین و دیگر تلامذہ (احسن نشاط)

اپنی بات: (ص۲ کا بقیہ)

والی صنعتوں کی صورت حال، کم ترقی یافتہ علاقوں کے ساتھ مناسب سلوک، بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے اور دیہاتوں کی بجلی کاری، شجرکاری [illegible] کے تبادل وسائل کو فروغ دینے، اقتصادی منصوبہ بندی کے تحت [illegible] فلاح و بہبود، تعلیم کی توسیع [illegible] کی نا انصافی کو دور کرنے، محاصل نظام تعمیر کی توسیع اور [illegible] صنعتی پالیسی [illegible] [illegible] اور [illegible] کی [illegible] میں اضافہ کرنے کے لئے بیس نکاتی پروگرام کے تحت صرف یہ کہ پوری توجہ دی گئی ہے بلکہ ان مسائل کے فوری حل [illegible] اس بیس نکاتی پروگرام پر تیز رفتاری کے ساتھ عمل درآمد کی ہر سطح پر ضرورت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ [illegible] فلاح و ترقی اور سارے طبقوں کی خوشحالی کا راز مضمر ہے۔

—— ایڈیٹر

ایم کوٹھیاوی راہی
قاضی پور خورد گورکھپور

بادِ صبا کا موسم

وہ مجھے بھی کوئی تحریک کہ خاموش ہوں میں
زندگی برف کے مانند جمی جاتی ہے
کوئی پرچھائیں، کوئی خواب، کوئی جسم نہیں
جس سے جی بہلے کہ شب یونہی ڈھلی جاتی ہے

ماہ وش ہو تو جگا دو کوئی رنگیں جادو
زندگی یوں بھی ہوا کرتی ہے مشغول رواں
پھر کوئی درد، کوئی ٹیس، کوئی تازہ خلش
کوئی صورت کہ دوبارہ پیدا کر چلے کاروان

اب بھی اکثر سنا کرتا ہوں لہو کی آواز
"زرد لوگوں" کا بدن آج بھی یاد آتا ہے
خشک ہوتی ہی نہیں ہے کہ احساس کی جھیل
چاند جل اٹھتا ہے جب خواب ٹھہر جاتا ہے

آج بھی یاد کی وہ جھیل ہے آنکھوں کے قریب
جس سے وابستہ چلی آتی ہے رومان کی شام
تم مرے ہو نہ سکے غیر کسی کے ہو جاؤ
ایک دوشیزۂ معصوم سے پیمان کی شام!

میں کسی اور کا کیا ہوتا جو اپنا نہ ہوا
ہاں مگر میرے خیالات نے کروٹ بدلی
آسماں پر تمہارے خوں شدہ جذبوں کا داغ
خواب کے ریشمیں لمحات نے کروٹ بدلی

پیار پر نظم جو اکثر میں سناتا تھا تمہیں
گائی تھی اس طرح لوگوں میں کہ پتھر پگھلے
کانپ اٹھا میری صداؤں سے طلسمات کا شہر
سونے چاندی سے مزین تھے جو پیکر پگھلے

پھر نہ پازیب کی آواز تھی درکار مجھے
اور مطلوب نہ تھا رنگ حنا کا موسم
پیار کی موت پہ احساس کے سناٹے میں
خود بخود دفن ہوا بادِ صبا کا موسم!

ڈاکٹر انوار الحق
شعبۂ علوم شرقیہ
(لکھنؤ یونیورسٹی)

قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی علمی اور تہذیبی اثرات

مختلف قوموں کے باہمی ارتباط سے مختلف تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ اثرات زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں۔ رسم و رواج، عقائد و مسالک، علم و ادب، فنون و صنائع کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جس پر ایک دوسرے کے اثرات منطبق نہ ہوتے ہوں۔

قدیم ہندوستان میں ایران کے راستے نیز دوسرے ذرائع سے آریائی اقوام داخل ہوئیں تو وہ بھی اپنے ساتھ اپنے تہذیبی سرمایہ کو لائیں اور یہاں کی مقامی آبادی کے میل جول سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔ ایک زبان نے دوسری زبان سے بہت سے الفاظ لیا اور ان کے ادبی اختلاط نے بعد کو سنسکرت کی ترقی یافتہ شکل اختیار کی۔

ہندوستان کے زمانۂ قدیم میں تہذیبی ارتقاء کی کہانی ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ میں داخل ہونے تک مختلف ادوار ایسے گزرے ہیں جن میں ہماری ملکی تہذیب بیرونی اقوام سے متاثر ہوتی رہی ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ہم جب کوئی مکان بناتے ہیں تو تازہ ہوا کے لئے کھڑکیاں دروازے رکھتے ہیں، کھڑکیاں اور دروازے ضرور رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو گھٹ گھٹ کر ایک بند کمرے میں مر جائیں۔ ہمارا ملک اسی لحاظ سے بہت اہم رہا ہے کہ یہاں شروع ہی سے بیرونی اقوام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے ساتھ ان کے تہذیبی اثرات ہماری نشاۃ ثانیہ میں ممد و معاون رہے۔ بقول پروفیسر محمد مجیب:

"ہندوستان کی حالت (آٹھویں صدی کے بعد) اس درخت کی سی تھی کہ جسے چھانٹا نہ جائے تو اس میں پھل آنا بند ہو جاتے ہیں۔"

ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول نے ایک نئے ہندوستان کو دنیا کے نقشے پر نمایاں کر دیا جس کے علوم و فنون کی بوقلمونی اور جس کی تہذیبی رنگا رنگی ساری متمدن دنیا کے لیے جاذبِ نظر ثابت ہوئی اور اگر یہ کہا جائے کہ قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان دنیا میں علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم ذریعہ بنا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ بھگتی تحریک اور تصوف کے خیالات کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا جس نے ہندوستان کی ادبیات پر گہرے نقوش یادگار چھوڑے۔

اس اجمال کی تفصیل کے لیے مغلوں کے ورودِ ہندوستان سے قبل کی چند جھلکیاں دیکھیے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان کس طرح ایک گنگا جمنی تہذیب کو جنم دے رہا تھا جو مغلوں کے زمانۂ حکومت میں ارتقاء کی بلند ترین منزلوں تک پہنچ گئی تھی۔

ہندوستان کی عظیم سلطنت غلام خاندان کے فرماں روا قطب الدین ایبک کے زیر نگین ہے ملک کی سیاسی، تمدنی، علمی اور تہذیبی تاریخ کے ایک نئے اور شاندار دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جو صدہا برس تک ایک طرف اپنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کرتا ہے، عدل و انصاف کا بازار گرم کرتا ہے، دوسری طرف اکابرین اسلام کی اتباع، بزرگان دین سے خلوص عقیدت اور علم نوازی کو اپنا شعار بناتا ہے۔

اسی کے حکم سے خواجہ صدر الدین نظامی نے تاج المآثر نامی تاریخ مدون کی جو اگرچہ زبان و بیان کے لحاظ سے موضوع تاریخ کے لیے مناسب نہ تھی۔ لیکن تاریخی مواد کے اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ بعد کے مورخین نے تاریخ الفی، طبقات اکبری، منتخب التواریخ، آئین اکبری اور تاریخ فرشتہ کی تدوین میں اس کتاب سے استفادہ کیا۔ اسی کے عہد حکومت میں ہندوستان میں علم حدیث کا رواج ہوا۔ ممتاز ترین عالم دین امام رضی الدین صغانی اسی عہد کے بلند مرتبہ فاضل تھے۔ علم حدیث میں مشارق الانوار ان کی بہت معروف و مقبول کتاب ہے۔ وہ حدیث کے علاوہ علم لغت کے بھی ماہروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ عربی لغات میں بہت سی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ فخر مدبر بھی اسی عہد کا ممتاز اہل قلم تھا۔

ناصر الدین قباچہ (۱۲۱۰-۱۲۲۸ء) نے سرزمین ملتان کو دہلی پر سبقت دلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مختلف علوم و فنون کے یگانۂ روزگار ماہر اس کی علم دوستی، ادب پروری اور سرپرستی سے فیضیاب ہوئے تھے۔ شمس الدین بلخی اسی زمانے کا بے مثل خطاط تھا اور بقول عوفی شاعری میں انوری کا ہم مرتبہ تھا۔ مولانا ابو عمر منہاج الدین عثمان جو عام طور پر منہاج سراج، کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی عہد کے نامور فاضل تھے۔ جن کی کتاب "طبقات ناصری" ایک گرانقدر تالیف ہے اور اسی زمانے کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ فارسی کا قدیم ترین تذکرہ "لباب الالباب" مولفہ سدید الدین محمد عوفی اسی عہد میں مرتب ہوا۔ اسی فاضل مصنف کی دوسری اہم کتاب "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" ہے۔ جس میں مختلف تاریخی کتابوں سے اخلاقی کہانیاں لی گئی ہیں۔ اسی عہد میں تاریخ سندھ "چچ نامہ" کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

شمس الدین التمش (۱۲۱۱-۱۲۳۶ء) قطب الدین ایبک کے بعد دہلی کا فرماں روا ہوا۔ اسے مشائخ سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے صوفیہ، علما، فضلا اور شعرا کی بڑی سرپرستی کی۔ قاضی حمید الدین ناگوری، نجم الدین صغریٰ، سید نور الدین مبارک، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ عثمان ہارونی، شیخ نظام الدین اولیاء جیسے اکابرین علما و مشائخ اور شعرا میں خواجہ ابو نصر ناصری، امیر روحانی، تاج الدین ریزہ، حمید سنائی جیسے بلند مرتبہ لوگوں سے اس کے گہرے روابط تھے۔

غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۷) علما و فضلا کا بڑا سرپرست تھا لیکن اس کے شہزادہ محمد سلطان کا علمی دربار ہندوستان کے لیے سرمایۂ افتخار تھا۔ اس لائق شہزادے نے شعرا کی جس طرح قدردانی اور سرپرستی کی ہے اس کے تذکرے تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ امیر خسرو دہلوی اور حسن سجزی دہلوی جیسے بلند مرتبہ شعرا بھی اس کے دربار سے منسلک تھے۔ امیر خسرو نے اپنی زباندانی کا لوہا ایران والوں سے بھی منوا لیا تھا۔ انہیں شاعری کی مختلف اصناف پر بڑی قدرت حاصل تھی اور ان کی شہرت ہندوستان سے باہر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ خسرو نے فارسی کے علاوہ ہندوی میں بھی طبع آزمائی کی۔ انہیں اردو شاعری کا بھی باوا آدم مانا گیا ہے۔ وہ ہمہ گیر صفات کے حامل غیر معمولی ذہین اور بڑے باصلاحیت انسان تھے۔ انسان دوستی ان کا مسلک، صلح و آشتی ان کا عقیدہ اور محبت ان کا مشرب تھا۔ وہ پہلے ہندوستانی شاعر تھے جنہوں نے آج سے کئی سو سال قبل تہذیبی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے تصورات اپنی شاعری

کے ذریعہ پیش کیے۔ جب کہ ہندوستان تو کیا دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی یہ تصور موجود نہ تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔ امیر خسرو بڑے ہی جامع کمالات تھے۔ اور بعض روایتوں کے بموجب انھوں نے بہت سے نئے راگ ایجاد کیے۔ موسیقی میں انھیں بڑا دخل تھا۔ راگ درپن کے مولف فقیر اللہ نے امیر خسرو کی ایجادات اور اختراعات موسیقی کی تفصیل بیان کی ہے۔ راگ درپن دراصل مانک سوہل، کا فارسی ترجمہ ہے جسے عالمگیری دور کے ایک عالم و ماہر موسیقی فقیر اللہ نے ترجمہ کیا تھا۔ اور ترجمہ کے ضمن میں مفید اضافے بھی کیے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نائک کا خطاب امیر خسرو کے بعد کسی اور کو نہیں ملا۔

سلطان محمود شاہ ابن محمد شاہ کے عہد میں ظہیر دہلوی نے شاعری میں بڑی شہرت حاصل کی۔

ملا بدایونی لکھتے ہیں:

"واقعی بعد از قاضی ظہیر شاعری کہ شعر گرامی خوانداں کند در ہندوستان برنخاست"

وہ ایک قصیدہ کی تشبیب میں موسم کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ماہ دی آمد و شد سرد بداں گونہ ہوا
کہ نمی جنبد جز باد خنک کس از جا

ایک دوسرے قصیدہ کی تشبیب ملاحظہ ہو

بوسہ گل جنبد سوی گلستان خیز ای ندیم
بادہ کہنہ طلب، یاد آر از آن یار قدیم

سکندر لودی کا عہد حکومت ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی ترقی کے لیے نمایاں ہے۔ خود سکندر بڑا ہی علم دوست عالموں، فاضلوں اور شاعروں کا مربی تھا۔ شعر و شاعری سے بھی وہ شغف رکھتا اور گل رخی تخلص کرتا تھا۔ اس کی غزلوں کی رومانی فضا کا اندازہ درج ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

ہر گاہ کہ بچمن پیرہن در گل بہ نشستش
ہمہ گویند بہ حسن کہ در آید پیر بنشستش

مشک ختنی چیست کہ صد مملکت چین
در حلقۂ آن زلف شکن در شکستش
گل رخ چو کند جو ہر دندان ترا وصف
یکجا شدہ در سیراب سخن در دہن نشستش

سکندر کے عہد حکومت میں ایک برہمن علوم متداولہ کا بڑا ماہر استاد مانا جاتا تھا۔ بدایونی نے اس کی شاعری کا بھی ذکر کیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

دل خون نہ شدی چشم تو خنجر نہ شدی گر
رہ گم نشدی، زلف تو ابتر نشدی گر

سکندر لودی ہی کے عہد حکومت میں ملتان کی تباہی کے بعد دو بھائی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ دہلی اور سنبھل میں مقیم ہو گئے۔ انھیں فاضلوں نے اس ملک میں علم منطق و کلام رائج کیا۔ ان علماء میں عبداللہ کی مسند درس دہلی میں تھی۔ جہاں اکثر اکابر علماء اس کے حلقۂ درس میں شرکت کرتے تھے۔ اور خود بادشاہ بھی خاموشی سے آ کر درس میں شامل ہو جاتا تھا تاکہ اس کی آمد کے اظہار سے درس میں خلل نہ پڑے۔

سکندر کا عہد اپنی علمی ترقیوں کے لیے تاریخ ہند کا ایک زرین دور سمجھا جاتا ہے۔ اسی عہد میں حاتم سنبھلی اور شیخ الہ دیہ جونپوری جیسے اساتذہ گزرے ہیں۔ موخر الذکر نے فقہ اسلامی کی مشہور کتاب ہدایہ کی بڑی مفصل شرح کئی جلدوں میں لکھی تھی اور حاتم سنبھلی نے معقول کے درس و تدریس میں کمال حاصل کیا تھا۔

لودی عہد حکومت کے ممتاز ترین شعراء میں شیخ جمالی دہلوی متوفی ۹۴۲ ہجری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سکندر لودی بھی ان کو اپنے اشعار بغرض اصلاح دکھاتا تھا۔ انھوں نے بکثرت ممالک کی سیر و سیاحت بھی کی تھی اور حضرت جامی سے بھی ملے تھے اور ان کو اپنے اشعار سنائے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

ما را ز خاک کویت پیراہنی ست بر تن وآن ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

عشق را طرفہ لسانی ست کہ صد سالہ سخن
دوست با دوست بیک چشم زدن می گوید

طال شوقی الی منا سکم
ایها النا ئیون عن نظری

روز و شب مونس جان خیال شماست
فاسئلوا عن خیالکم خبری

جامی صاحب دیوان تھے اور ان کے دیوان میں نو ہزار اشعار ہیں۔ انھوں نے سیر العارفین کے نام سے مشائخ کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔

ہندستان میں فارسی زبان و ادب کی ترقی تاریخ علوم و فنون کا ایک اہم باب ہے اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہندستان میں فارسی زبان و ادب کی ترقی ایران سے کم نہیں ہوئی تو بیجا نہ ہوگا۔ مغلوں کے دورِ حکومت سے پہلے یہ سرزمین اس نئے پودے کے لیے تیار کی جا چکی تھی۔ چمن بندیوں کا سلسلہ جاری تھا اور فارسی اب اس ملک کے لیے کوئی نئی زبان نہ تھی۔

مغلوں کی حکومت بابر کے ہاتھوں قائم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑے سے عرصہ میں ہر طرف فارسی زبان و ادب کا فروغ ہو گیا۔

بابر بڑا علم دوست حکمران تھا۔ ترکی اور فارسی میں شعر بھی کہتا تھا۔ تزکِ بابری ترکی زبان میں اس کی اہم تصنیف ہے۔ جس سے اس کے عہد حکومت کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نے ایک خاص قسم کا خط بھی ایجاد کیا تھا جو خطِ بابری کے نام سے موسوم ہے۔

ہمایوں کو اگرچہ زیادہ مدت تک حکومت کرنا نہیں نصیب ہوا لیکن اس نے بھی شعرا کی سرپرستی میں کمی نہیں کی۔ بدایونی رقمطراز ہیں:

"شعرای بسیار نادرۂ روزگار از دامن او برخاستہ اند"

ابوالفضل نے اس کی شعرگوئی اور ذوقِ شاعری کی تعریف کی۔

دربارِ ہمایوں سے وابستہ شعرا میں فضلا میں بیرم خاں، قاسم کاہی، طاہر دکنی، مولانا نادری، وحید الدین فارغی، شہاب الدین معمائی، قاسم خان موجی، حکیم یوسفی، اور خواند امیر جیسے لوگوں کے نام ملتے ہیں۔

حکیم یوسفی نے فارسی زبان میں جامع الفوائد، فوائد الاخیار اور علاج الامراض نامی کتابیں لکھی ہیں۔ اور خواند امیر نے "حبیب السیر" کے نام سے اپنے زمانہ تک کی ایک اہم تاریخ فارسی زبان میں تالیف کی تھی۔ انھوں نے روضۃ الصفا کی ساتویں جلد بھی مرتب کی تھی۔ اس کے علاوہ خلاصۃ الاخبار فی تلخیص روضۃ الصفا، اخبار الاخیار، غرایب الاسرار اور قانونِ ہمایونی بھی انھیں کی تصانیف ہیں۔

اکبر اگرچہ خود ناخواندہ تھا لیکن اپنی علم دوستی اور ادب پروری کے لیے اپنے پیشروؤں سے بھی ممتاز تھا۔ اس کا عہد اپنی علمی و تہذیبی ترقیوں کے لیے ہندستان کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ فارسی سرکاری زبان تھی۔ لیکن فارسی کے دوش بدوش سنسکرت اور مقامی زبانوں کے لیے بھی ترقی کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اس کا دربار ایک طرح کی "اکیڈمی" تھا جہاں مختلف علوم و فنون کے یگانۂ روزگار فاضل جمع تھے۔ تحقیق، تصنیف و تالیف اور ترجمہ پر بکثرت علما و اہلِ فن مامور تھے۔ خود اکبر ان کی نگرانی کرتا تھا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے داد و دہش کے دروازے کھول رکھے تھے۔

اکبر کے زمانہ میں بہت سی فارسی کتابوں کے ترجمے مقامی زبانوں میں اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں کیے گئے۔ جن میں سے چند اہم کتابوں کا ذکر سطور ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی، فیضی اور حاجی ابراہیم سرہندی پر مشتمل علما کے ایک بورڈ نے سنسکرت سے ویدِ مقدس کا

فارسی میں ترجمہ کیا۔ فیضی نے بھگوت گیتا کو سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے تزک بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے والمیک جی کی رامائن کو سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا۔ علماء و ماہرین السنہ کے ایک بورڈ نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس بورڈ میں ملا بدایونی اور فیضی بھی شامل تھے۔ ملا شیری نے ہری بنس کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ سنگھاسن بتیسی کا فارسی ترجمہ ملا بدایونی نے نامۂ خرد افزا کے نام سے کیا۔ ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے سنسکرت کی مشہور کتاب کا ترجمہ کیا۔ فیضی نے نل اور دمن کی کہانی فارسی مثنوی میں نظم کی۔ عبدالستار بن قاسم نے فلسفہ کی ایک کتاب سنسکرت سے فارسی میں ثمرۃ الفلاسفہ کے نام سے ترجمہ کی۔ فیضی نے علم حساب میں لیلاوتی کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے علم جوتش میں ایک فارسی مثنوی نظم کی اور ہندی شاعری کے ارتقاء میں نمایاں حصہ لیا۔ فیضی نے قرآن مجید کی ایک بے نقط تفسیر عربی زبان میں سواطع الالہام کے نام سے تیار کی۔ شیخ مبارک نے عربی کی کتاب "حیوۃ الحیوان" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ متعدد علماء کے ایک بورڈ نے عربی زبان میں علم جغرافیہ کی اہم ترین کتاب معجم البلدان کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ابوالفضل نے مہیش مہانند اور کشن جوتشی کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ نقیب خاں، ملا شاہ اور ابوالفضل نے جوگ بششٹ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ علماء کے ایک بورڈ نے سنسکرت سے سری کرشن کی سوانح کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

تراجم کے علاوہ فلسفہ و حکمت، انشاء و لغت، تاریخ و سوانح مذاہب و اخلاق پر فارسی میں متعدد تصنیفات بھی عہد اکبری کے نامور علماء کے قلم سے نکلیں جن میں انشاء فیضی، انشاء ابوالفضل، جامع اللغات، چار باغ، قتاوی، قیاسیہ، بحر الاسماء، اکبرنامہ، آئین اکبری، منتخب التواریخ، طبقات اکبری، تاریخ کشمیر، ہمایوں نامہ، تاریخ الفی، مرکز ادوار، معارد الکلم، نجات الرشید، کتاب الاحادیث وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ بے شمار مثنویاں، قصائد، دیوان غزلیات ہیں جن کی تفصیل بیان کرنا آسان نہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری کے بیان کے بموجب عہد اکبری کے نامور و ممتاز علماء و حکما کی تعداد تقریباً سو اور شعراء کی تعداد اکیاسی ہے۔ ملا بدایونی نے ۹۵ علماء اور ۱۶۶ شعراء کا ذکر اپنی کتاب منتخب التواریخ کی جلد سوم میں کیا ہے۔

عہد اکبری میں دوسرے فنون کے ماہرین بھی بکثرت تھے۔ بہت سے غیر مسلموں کے نام بے مثل خطاطوں کی فہرست میں ملتے ہیں۔ جیسے رای منوہر پسر رای لون کرن، تخلص بہ توسنی فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر ہی نہیں بلند مرتبہ خطاط بھی تھے۔ اس کا درج ذیل شعر بہت مشہور ہے۔

شیخ مستغنی بہ دین و برہمن مغرور کفر
مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

رای چوہان، رام داس کچھواہہ اور رائے پتر داس اکبری امراء میں سے تھے۔ اپنی علمی صلاحیتوں اور تصانیف کے لیے بھی مشہور تھے۔

میر دوری نہ صرف شاعر تھے بلکہ اس وقت ان سے بہتر خط نستعلیق لکھنے والا ہندوستان میں کوئی دوسرا نہ تھا اور کاتب الملک کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ اسی طرح میر سید علی جدائی اپنے وقت کا بہترین مصور تھا اور اسے بلاشبہ "مانی ثانی" کہا جانا درست تھا۔

دیش گوالیاری عہد اکبری کے ممتاز علماء میں شمار کیا جاتا تھا اور عام طور پر "ملا دیش" کہلاتا تھا۔ نجوم، حکمت اور ریاضی میں اسے بڑی دست گاہ حاصل تھی۔

پیروی نہ صرف صاحب دیوان شاعر تھا بلکہ اپنے زمانے کے ایک ممتاز مصور کی حیثیت سے بھی مشہور تھا۔ التقی یزدی نے ریاضی میں کمال حاصل کیا تھا۔ اشرف خاں ہفت قلم کا استاد اور دربار اکبری کا میر منشی تھا۔ شریف فارسی ولد خواجہ عبدالصمد شاعر، خطاط اور بے مثل مصور تھا۔ خشخاش کے ایک دانہ پر اس کے

والپسنہ سونے کو اخلاص لکھی گئی تھی۔ اور اس کی فنکاری کا یہ عالم کہ اس نے دانۂ خشخاش میں آٹھ باریک سوراخ کر کے ان میں سے باریک تار نکالے تھے۔ چاول کے ایک دانہ پر ایک مسلح سوار کی تصویر بنائی تھی جس کے ساتھ تلوار، سپر، چوگان وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ قوسی شاعر، نکار، نگینہ اور خلال سازی کی صنعت میں بے مثل تھا۔ ملا محمد حسین کشمیری خط نستعلیق کے بلند پایہ استاد تھے۔ ابوالفضل ان کو جادو رقم کے لقب سے یاد کرتا تھا اور اکبر نے "زریں رقم" کا خطاب دیا تھا۔ حسین بن احمد چشتی خط نسخ کا باکمال خطاط تھا۔ فتح پور سیکری کے بلند دروازہ پر آج بھی اس کی خطاطی کے کمال کا نمونہ موجود ہے۔ خواجہ عبدالصمد، میر سید علی تبریزی، میر معصوم قندھاری، نور اللہ قاسم، امین مشہدی، تحسین کلنگی، مولانا عبدالحی، مولانا عبدالرحیم، عبداللہ نظامی، علی چمن کشمیری دوسرے باکمال خطاط تھے جن کی خطاطی اور مصوری کے بکثرت نمونے کتاب خانوں کی زینت ہیں اور جن کو فنکاری کے قابل قدر نمونوں کی حیثیت سے دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

تہذیبی اور علمی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں ہندوستانی فن تعمیر میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک تہذیب کے نقوش نمایاں ہیں۔ ایک نے دوسرے کے اثرات قبول کیے اور ایک نئے ہندوستانی فن تعمیر کو فروغ ہوا۔ قرون مابعد میں اس کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ قطب مینار، لال قلعہ دہلی، جامع مسجد دہلی، تاج محل آگرہ، فتح پور سیکری کی شاہی عمارات ہی نہیں بلکہ عوامی تعمیرات پر بھی مشترکہ تہذیب کے نقوش نمایاں ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے مختلف رسوم اخذ کیں۔ آج بھی دونوں فرقوں کی شادی بیاہ، ذات پات، خوشی و غم میں بہت سی رسوم مشترک ہیں۔

غرض کہ قرون وسطیٰ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی علمی و تہذیبی روابط کے زیر اثر قرون مابعد میں ایک ایسی ہندوستانی نسل پروان چڑھی جو اپنے اسلاف کی صحیح جانشین کہی جانے کی مستحق تھی۔

حواشی

١ MACDONELL: HISTORY of SANSKRIT LITERATURE. P. No 50, 53

٢ تاریخ تمدن ہند صفحہ ٢٧٩۔

٣ بزم مملوکیہ صفحہ ٢٤

٤ 〃 〃 〃 ٣١۔٣٤

٥ لباب الالباب ٣٢١ ٦ مقدمہ لباب الالباب۔ از پروفیسر براؤن صفحہ ١١ ٧ شعر العجم شبلی جلد دوم۔ ص ١٣٤

٨ بدایونی: منتخب التواریخ جلد اول۔ ص ٢٨٣۔

٩ ایضاً 〃 〃 〃 〃 ٣٢٣۔

١٠ ایضاً 〃 〃 〃 〃 ٣٢٣

١١ ایضاً 〃 〃 〃 〃 ٣٢٤

١٢ ایضاً 〃 〃 〃 〃 ٣٢٤

١٣ ایضاً 〃 〃 〃 〃 ٣٢٥، ٣٢٦

١٤ ایضاً 〃 〃 〃 〃 ٣٤٣

(باقی صفحہ ٦٤ پر)

غزلیں

شاکر جرولی
اونچا مکان۔ قصبہ جرول
ضلع بہرائچ

پھر درد کی آغوش میں آرام چلا ہے
یا صیدِ زبوں ہے کہ تہِ دام چلا ہے

جس بزم میں ساغر نہ کوئی جام چلا ہے
تشنہ جگری تجھ سے وہاں کام چلا ہے

افواہوں کے شانوں پہ یہ ہر گام چلا ہے
آپ اپنے ہی پیروں سے کب الزام چلا ہے

سر تن سے اتر جائے جو لو نام وفا کا
اس شہر میں کب سے یہی انعام چلا ہے

ڈھلتے ہوئے سورج میں کہاں شوخیٔ رفتار
چلنے کو تو ہر مہرِ لبِ بام چلا ہے

اے صبح کہاں ہے کہ تجھے اسکی خبر دوں
تیری ہی طرف قافلۂ شام چلا ہے

جب تھک کے کسی پیڑ تلے جادۂ فن پر
میں بیٹھ گیا ہوں تو مرا نام چلا ہے

جانیں قدم اسکے روشِ گل کی کسک کیا
تلواروں کے سائے میں جو دو گام چلا ہے

ہر تیز خرامی کے طلبگار سے کہہ دو
مانگے ہوئے پیروں سے کہیں کام چلا ہے

روئیگا کوئی شاکرؔ کو سرِ انجام ہے غافل
شاید طرفِ کوچۂ بدنام چلا ہے

واحد پریمی
مکان نمبر ۲۲ گنتوری بھوپال

بھٹکے صنم کدہ کبھی سوئے حرم ملا
مجھ کو کہاں کہاں ترا نقشِ قدم ملا

راہِ طلب کی لاکھ مسافت گراں سہی
دنیا کو میں جہاں بھی ملا تازہ دم ملا

پہنچے جو بادہ خانے میں ہم تشنگانِ شوق
جام و سبو پہ نام ہمارا رقم ملا

تیرہ شبی تو خیر مسلّم رہی تھی مگر
ایسا ہی اک اندھیرا مجھے صبحدم ملا

لکھتا رہا ہوں شکلِ غزل شرحِ زندگی
ہو شاید اسی لیے مجھے واحدؔ قلم ملا

ڈاکٹر نسیم شہنوی
۱۴۳ - بی - ٹی - آئی کیمپس سیہور
(ایم پی) ۴۶۶۰۰۱

ڈاکٹر عبدالودود کا فکری آہنگ

ڈاکٹر عبدالودود نئی نسل کے اہم نقاد تھے۔ ان کا تعلق یوپی کے مشرقی علاقے سے تھا۔ جہاں سے کئی اہم اور شہرت یافتہ ادبی شخصیات جنم لے چکی ہیں۔ فیض آباد، اعظم گڑھ اور جونپور کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان میں اعظم گڑھ کی اہمیت شبلی کی وجہ سے ہے کیوں کہ انھوں نے "دارالمصنفین" کی شکل میں ایک ایسا چراغ روشن کیا جو اپنی ضیا پاشیوں سے ایوان علم و ادب کو منور کرتا رہے گا۔ اس کے علاوہ سجاد ظہیر، پروفیسر احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی اور کیفی اعظمی وغیرہ کا رشتہ بھی اسی خطے سے رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے میدان میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالودود بھی اسی مردم خیز علاقے میں ۱۱ جنوری ۱۹۳۹ء کو جے گھاٹ (جونپور) میں پیدا ہوئے تھے۔ سینٹ تھامس کالج شاہ گنج (جونپور) سے انٹرمیڈیٹ کر کے بھوپال چلے آئے۔ گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال سے بی۔ اے پھر اردو ادب میں ایم۔ اے کے امتحانات دیئے۔ تعلیم کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد گورنمنٹ کالج دھار (مدھیہ پردیش) میں اردو کے استاد کی حیثیت سے ان کی تقرری عمل میں آئی۔ دھار کے قیام کے دوران انھوں نے تحقیقی کام کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور مشہور محقق ڈاکٹر گیان چند جین کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ "اردو نثر میں ادب لطیف" مکمل کر کے ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران آئین اور سیہور کے پوسٹ گریجویٹ کالج میں صدر شعبۂ اردو رہے۔ سیہور میں ہی ان کے ساتھ المناک حادثہ پیش آیا۔ ۳ جنوری ۱۹۸۱ء کی درمیانی رات کو نامعلوم افراد ان کے بنگلے میں گھس آئے اور انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ان کی اس ناگہانی موت سے اردو ادب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔

ڈاکٹر عبدالودود کی صرف دو کتابیں "اردو نثر میں ادب لطیف" اور "اردو سے ہندی تک" شائع ہوئی ہیں۔ مختلف موضوعات پر تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں جو موقر ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ "مداری لال کی اندر سبھا" اور "اردو اور ہندی کی قومی شاعری کا تقابلی مطالعہ" پر کام مکمل کر چکے تھے لیکن ابھی یہ منظر عام پر نہیں آ سکے ہیں۔ ان تنقیدی و تحقیقی مضامین کی مدد سے ان کے فکری انداز و آہنگ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو ان کے ادبی نقطۂ نظر کے غماز ہیں۔

غزل ہمیشہ سے اردو شاعری کی اہم صنف رہی ہے اور ہر دور میں اسے مقبولیت حاصل رہی ہے۔ عہد قدیم سے عہد حاضر تک اسے پسند کرنے والے موجود رہے ہیں۔ اگر چہ غزل پر نکتہ چینی بھی ہوتی رہی ہے۔ اسے جاگیردارانہ ماحول کی پروردہ سمجھ کر تخریج کرنے کے مشورے بھی دیئے گئے۔ کبھی اسے نیم وحشی صنف کہا گیا تو کبھی اردو شاعری کی

"آبرو" تسلیم کیا گیا ہے لیکن غزل اس مخالفت و موافقت کے ماحول میں بھی پروان چڑھتی رہی۔ چنانچہ جب سے غزل میں عصری مسائل کو جگہ دی جانے لگی اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوا ہے۔ غزل کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالودود کا خیال ہے :-

"زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ بہت سی روایات ختم ہوئیں اور نئی روایات نے جنم لیا۔ کچھ نیا پن آیا اور پرانے نے رخصت لی۔ لیکن غزل کو ہمیشہ ایک نئی زندگی اور نیا موڑ ملتا گیا۔"

[اردو غزل میں عصریات۔ ڈاکٹر عبدالودود، ماہنامہ آندھرا پردیش جنوری و فروری ۱۹۶۹ء ص ۳۰]

شعر و ادب میں چند نام اپنی خصوصیات اور انفرادیت کی وجہ سے نمائندہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مختلف اصناف میں متعدد ہستیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً جب مثنوی زیر بحث ہوگی تو میر حسن اور دیا شنکر نسیم کا نام لینا ضروری ہے۔ اسی طرح مرثیہ کا ذکر کرتے وقت میر انیس اور مرزا دبیر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن غزل کے سلسلے میں بے شمار نام لیے جا سکتے ہیں۔ حسرت کو جدید غزل کا امام کہا جاتا ہے۔ مگر حسرت کو یہ عزت ان کی شاعرانہ عظمت سے نہیں بلکہ ان کی ناقدانہ صلاحیت کی وجہ سے نصیب ہوئی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر عبدالودود لکھتے ہیں :-

"ہمارا خیال ہے کہ حسرت کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ انھوں نے اردوئے معلیٰ کے ذریعہ اردو شعرا کے انتخابات شائع کرکے اس غلط فہمی کو دور کیا جو غزل اور غزل گو شاعروں کی طرف پیدا ہو گئی تھی۔ حسرت جدید غزل کے امام اپنی غزلوں سے نہیں بلکہ ناقدانہ شعور سے ہیں"

(شاد عارف۔ چند شناخت۔ ماہنامہ بانو ۔۔۔ شمارہ ۸ اگست ۱۹۷۳ء)

اردو غزل میں اشاروں اور کنایوں سے ہمیشہ کام لیا جاتا رہا ہے۔ مختلف قسم کی ادبی و سیاسی تحریکات و رجحانات سے فن کار اثر قبول کرتے ہیں اور ان کی جھلکیاں تخلیقات میں دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ تحریک آزادی کے دوران غزل گو شعراء کا لب و لہجہ تیکھا اور انقلابی ہو گیا۔ اس دور کی غزلوں میں ظلم و استبداد اور دار و رسن کی باتیں کہی گئیں جن کا مقصد عیش و عشرت کی دنیا میں کھوئے افراد کو بیدار کرنا تھا۔ ترقی پسند غزل میں سیاسی و سماجی مسائل کھل کر پیش کیے گئے ہیں۔ آزادی کے کچھ عرصے بعد کئی اور نئے مسائل سامنے آئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا اثر بھی کچھ کم ہونے لگا اسی دوران یعنی ۱۹۶۰ء کے آس پاس ادب میں نیا نظریہ ابھرا جو ترقی پسند تحریک کا رد عمل سمجھا جاتا ہے۔

اس نئے نظریے سے شاعری سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ نئی شاعری میں فرسودہ روایات سے بغاوت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس نظریے کے حامی فن کار بھی غزل سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ نئی غزل یا جدید تر غزل میں بھی اشاروں اور کنایوں کو نئے معنی و مفہوم کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر عبدالودود تحریر کرتے ہیں :-

"نئی شاعری" ۔ میں اشاروں نے اور زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ نئے اشارے وجود میں آ رہے ہیں اور انھیں نئے معنی اور مفہوم دیے جا رہے ہیں۔ نئی شاعری میں جہاں قدیم روایات سے سخت انحراف کا رجحان ملتا ہے، وہیں نئے شاعر غزل سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ آج یہ پھر ثابت ہو چکا ہے کہ غزل اردو شاعری کی "آبرو" ہے۔ نئے فن کتنے ہی تراشے جائیں غزل کی دیوی کا اعزاز کم نہ ہوگا۔"

[اردو غزل میں عصریات۔ ڈاکٹر عبدالودود۔ آندھرا پردیش ۔ جنوری و فروری ۱۹۶۹ء ص ۳۴]

اردو ادب میں علمی و ادبی کتابوں کی کمی نہیں ہے پھر

بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ تمام اصناف پر مربوط اور معیاری تصانیف بکثرت موجود ہیں۔ خصوصاً تنقید اور تحقیق کے میدان میں یہ کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آزادی کے بعد سے اردو میں بہت تیزی سے تحقیق و تنقید پر کام کیا گیا ہے اور گراں قدر کام ہوئے ہیں۔ اب اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق کے میدان میں کام کرنے والے دیدہ ور محققین اور ناقدین کے کارناموں کا جائزہ بھی لیا جائے۔ اکثر ان موضوعات پر مضامین لکھ کر ہی اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ان کی نظر میں :-

"اردو تنقید کے سرمائے میں سب سے زیادہ جس کمی کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی تصانیف کی تعداد بہت کم ہے جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہوں۔ ہمارے مشہور ناقدین نے مضمون نگاری پر زیادہ توجہ دی۔ اردو میں غالب و اقبال پر ہی سب سے زیادہ تنقیدی تصانیف بھی شائع ہوئی ہیں۔ ادھر چند سالوں میں ایسی تصانیف بھی شائع ہوئی ہیں جن کا موضوع پرانے اور نئے فنکار و اصناف ادب ہیں لیکن ان کی تعداد بھی حوصلہ افزا نہیں کہی جا سکتی۔ کسی موضوع پر مکمل جائزے کی کمی کسی حد تک رسائل کے خاص نمبر پورا کرتے ہیں یا ایسی تالیف جن میں کسی ایک موضوع پر مختلف اہل قلم کے مضامین مرتب کر دیے جاتے ہیں۔"

[نذر سجاد — شعبۂ اردو کے تحقیقی مقالات ایک جائزہ ص ۱۷۸ ڈاکٹر عبدالودود]

ایک زمانے میں اردو نثر میں ادب لطیف کو مستحسن نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ادب لطیف کے پرستار اور فنکار ادب برائے ادب کے نظریے کو عزیز سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ ادب میں مقصدیت کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے یہاں رومانیت اور جمالیت کا غلبہ رہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود نے تحقیق کے لیے اس موضوع کو منتخب کیا۔ انھوں نے تحقیق کی ذمہ داری کو بڑی ایمانداری اور غیر جانب داری سے نبھایا ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ اردو میں ادب لطیف کی روایت پر ٹیگور کی تخلیقات کے اثرات پڑے ہیں۔ کیونکہ گیتانجلی کے اردو ترجمہ کا اسلوب متعدد دیگر تخلیقات میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو نثر میں ادب لطیف کا رواج انیسویں صدی کے آخر میں ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"ادب لطیف کا زمانہ انیسویں صدی کی آخری ایک دہائی اور بیسویں صدی کی ابتدائی چار دہائیوں میں قرار دیا جا سکتا ہے۔"

[اردو نثر میں ادب لطیف ۔ ڈاکٹر عبدالودود
دوسرا ایڈیشن ص ۱۴۱]

ادب لطیف کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :-

"یہ ممکن نہیں کہ ایک ایسا ادبی رجحان جو ایک طویل مدت تک کسی نہ کسی طرح زبان و ادب پر چھایا رہا ہو اور اس سے زبان کو کوئی فائدہ نہ پہنچا ہو۔ ادب لطیف میں آج کے نقاد کو بہت سے عیوب نظر آتے ہیں۔ یقیناً ہی آج ایسی نثر اور تحریر پسند نہیں کی جا سکتی لیکن ادب لطیف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے زبان و ادب کو بہت کچھ فائدہ پہنچا اور کافی حد تک مطالعہ کرنے والوں کو بھی۔ اس زمانے میں جب لوگ احساس کمتری کا شکار تھے اپنی زبان اور اپنے ادب کو کمتر اور قومی میراث کو حقیر سمجھتے تھے ان مصنفین نے زبان و ادب اور قومی ورثہ کی قدر و قیمت کا احساس پیدا کیا۔"

[اردو نثر میں ادب لطیف ۔ ڈاکٹر عبدالودود
دوسرا ایڈیشن ص ۳۴۲]

انھوں نے ایک ایماندار محقق کی ذمہ داری نبھاتے

بجائے ادب لطیف کی اہمیت اور روایت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہو لیکن بحیثیت ایک نقاد اس کی کمزوریوں کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔ وہ ادب لطیف کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ادب لطیف کے مصنفین کے یہاں ایسا جذبہ ہے جہاں شعور نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ فن کار جذبات کا غلام نظر آتا ہے۔ جذبہ صحیح ہے یا غلط، مناسب ہے یا نامناسب اس کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ جذبہ اور شعور کا تعلق ضروری ہے۔ جذبے اور شعور کے تعلق سے جذبہ کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس میں زیادہ تر ازاد کی دلچسپی کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔ جذبہ اور تخیل کا شعور سے گہرا تعلق ہے۔ اگر شعور خام ہے تو جذبہ بھی غلط ہوگا۔ جذبہ اور شعور کے اس تعلق پر ادب لطیف کے مصنفین نے غور نہیں کیا۔ ان کے یہاں جذبے کی شدت ہے۔ ادب برائے زندگی کے نظریے پر یقین رکھنے والوں کے خیال میں "جذباتی ہیجان" ناقابل معافی ہے"

[اردو نثر میں ادب لطیف۔ ڈاکٹر عبدالودود]
دوسرا ایڈیشن ص ۴۰۰

ڈاکٹر عبدالودود اردو ادب کے ساتھ ساتھ ہندی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندی فن کاروں کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اردو ادب کی طرح ہندی ادب میں بھی دو طرح کے ادبی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ زندگی کے رشتوں کو ادب میں دیکھنا پسند کرتا ہے جس کی نمائندگی بھارتیندو سے لے کر بال کرشن شرما نوین تک کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا طبقہ چھایا وادیوں کا ہے جن کے یہاں ادب برائے ادب کے نظریے کو اولیت دی گئی ہے۔ شاعری میں ان کی ترجمانی نرالا، پنت اور مہادیوی ورما کرتے ہیں۔ یہ فن کار جمالیت اور رومانیت کے دلدادہ ہیں۔ ہندی نے دو اہم رجحانات پرگتی شیل اور پرگتی وادیتا کے درمیان ایک آواز دنکر کی ہے۔ رام ادھاری سنگھ دنکر ترقی پسند شاعر تو نہ تھے لیکن انھوں نے غریبوں، مظلوموں اور پسماندہ عوام کی حمایت میں انقلابی طرز اختیار کیا۔ دنکر کو ہندی شاعری میں وہی مقام دیا جاتا ہے جو اردو میں جوش اور بنگال کے نذر الاسلام کو۔ ڈاکٹر عبدالودود نے بھی رام ادھاری سنگھ دنکر کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے:۔

"جوش کی طرح دنکر کو بھی انقلابی رومانیت کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں جذباتیت زیادہ ہے۔ وہ انقلاب، ظلم و ستم، نا انصافی اور استحصال کے خلاف مقابلہ آرا ہونے کا پیغام دیتے ہیں اور مقصد کے حصول کے لیے تشدد کا سہارا لینا معیوب نہیں سمجھتے۔ وہ ایسی فضا کو جو گناہ آلود ہے جس میں ظلم و ستم کا بول بالا ہے۔ خاکستر دیکھنا چاہتے ہیں"

[آج کل نئی دہلی شمارہ مارچ ۱۹۷۰ء ص]

آج کل ہندی شاعری میں غزل کی مقبولیت بڑھ رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہندی کے نوجوان شعراء میں غزل گوئی کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح اردو میں گیت لکھنے کا رواج بھی عام ہوا ہے۔ یقیناً اس طرح کا رجحان دونوں زبانوں کے ادب کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندی کے شعراء اردو غزلوں سے متاثر ہوئے ہیں اگرچہ انھیں اردو غزل کے ارتقاء کی تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کی نظر سے اردو کی وہی غزلیں گذری ہیں جو دیوناگری میں شائع ہو کر مقبول ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہندی غزل میں ابھی وہ خوبی نہیں پیدا ہو سکی ہے جو اردو غزلوں میں پائی جاتی ہے لیکن جنگ بہادر سنگھ اور دشینت کمار تیاگی کو ہندی شاعری میں شہرت محض ان کی غزلوں کی وجہ سے ملی ہے۔ دشینت کمار تیاگی کی غزلیں فن اور موضوعات کے لحاظ سے بھی معیاری ہیں۔ ڈاکٹر عبدالودود نے دشینت کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

"وہ ہندی کے شاعر تھے اس لیے خالص ہندی میں غزل لکھنا بھی ضروری سمجھتے رہے ہوں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ انھیں ذہنی سکون ایسی غزلوں سے ملتا رہا ہوگا جو اردو کی غزلیں ہیں یا جن میں ہندی اور اردو کی آمیزش ہے۔ خالص اردو کی غزلوں میں زبان و بیان کا لطف بھی ہے اور فکر و احساس کا موثر اظہار بھی۔"

(شمشیر کی یاد میں۔ ڈاکٹر عبدالودود
سنڈے ایڈیشن آفتاب جدید۔ بھوپال)

اردو اور ہندی کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد اپنی تخلیقات میں عوامی زبان کو اہمیت دیتی ہے۔ نتیجتاً اردو اور ہندی ادب میں ایک دوسرے کے الفاظ کے استعمال کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ لیکن دونوں زبانوں کے ادب میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اپنی تخلیقات میں دوسری زبان کے الفاظ سے گریز کی دانستہ کوشش کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر ڈاکٹر عبدالودود کا نظریہ ملاحظہ فرمایئے۔

"اردو اور ہندی کے شاعروں اور ادیبوں کا ایسا طبقہ بھی رہا ہے جو اپنی زبان کے دامن کو دوسری زبان سے بچائے رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہو۔ آزادی کے بعد جو نئی نسل وجود میں آئی۔ اس میں بہت سے ایسے فنکار نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی زبان کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہندی شاعروں اور ادیبوں کا ایک طبقہ اردو الفاظ کا بکثرت استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح اردو کے نئے ادیب ہندی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔"

(اردو زبان میں ہندی کے نرم و شیریں الفاظ
ڈاکٹر عبدالودود۔ ہفت روزہ ہماری زبان۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء)

قومی یکجہتی کے مسئلے پر ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ اپنے جذبات، احساسات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ جب بھی ایسا محسوس ہوا کہ قومی یکجہتی کی بنیاد کمزور ہو رہی ہے تو ہمارے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے اسے پائدار بنانے کی کوشش کی۔ قومی یکجہتی کا مسئلہ آزادی سے قبل بھی مرکز توجہ رہا ہے۔ اس زمانے میں سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ ادیبوں اور شاعروں نے بھی معاونت کی۔ سرسید تحریک کے اہم رکن شبلی نے اپنی شاعری میں قومی اتحاد کا پیغام دیا۔ شبلی ایک وسیع النظر انسان تھے۔ وہ تمام ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو ہر سطح پر بیدار کرنا چاہتے تھے۔ شبلی کے قومی یکجہتی کے تصور پر ڈاکٹر عبدالودود کی رائے ہے:۔

"شبلی اعتدال پسند تھے۔ ان کی سرشت باغیانہ، ان کا مزاج تیز و طرار اور ان کی طبیعت میں جوش و خروش تھا۔ لیکن ان میں اعتدال پسندی کی خوبیاں نمایاں تھیں۔ وہ سرسید کی قومی خدمات کے معترف تھے۔ لیکن ان کے سیاسی عقائد کے حامی نہ تھے۔"

(شبلی کی قومی شاعری۔ ڈاکٹر عبدالودود
شیرازہ۔ دو ماہی جلد ۱۲)

اس مضمون میں وہ شبلی کے سیاسی نظریے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"شبلی نے سیاست میں مسلمانوں کی شمولیت یا عدم شمولیت پر اپنی رائے دینا ہی کافی نہ سمجھا بلکہ اپنا نقطہ نظر مدلل انداز میں پیش کیا اور ان لوگوں پر سخت گرفت کی جو مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل کر کے انھیں ملک کے اکثریتی فرقے سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں میں حقیقی احساس کی کمی ہے۔"

(شبلی کی قومی شاعری۔ ڈاکٹر عبدالودود
شیرازہ۔ دو ماہی۔ جلد ۱۲ ص ۲۹)

اکثر و بیشتر تنگ نظر و فرقہ پرست طاقتیں اپنے متعصبانہ نظریات سے ایسا ماحول بنا دیتی ہیں کہ قومی یکجہتی کے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں۔ یہ عناصر ایسے واقعات اور مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے ماحول کو کشیدہ و پراگندہ کر دیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالودود اپنے ایک مضمون قومی یکجہتی

زخمی تنہائی" میں ان اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے قومی یک جہتی کا رشتہ متاثر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ان اقدام کا بھی ذکر کرتے ہیں جن سے دوستی کا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں ان کا موقف ملاحظہ فرمائیے :۔

" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی حادثہ سے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں غیر ذمہ دار اشخاص کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ایک کی غلطی یا حماقت کا ذمہ دار پوری اقلیت یا اکثریت کو قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ احساس ہر ایک میں پیدا ہو جائے کہ ہر شخص متعصب نہیں بلکہ ایک مخصوص طبقہ جس کا مقصد ہی فرقہ وارانہ اختلافات بڑھانا ہے وہی یہ کام انجام دیتا ہے تو کسی حد تک اختلافات کم ہو سکتے ہیں۔ ہر انسانیت نواز کا فرض ہے کہ ایسے عناصر کو سماج سے ختم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے اور حد درجہ خطرناک افراد کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائے۔ حقیقتاً یہ کام قانون کے سہارے اچھی طرح انجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ ایسی تدابیر کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے جن کی بنیاد خلوص و محبت ہمدردی و مساوات ہے "

[قومی یک جہتی۔ فرضی زندگی۔ ڈاکٹر عبدالودود
تعمیر سری نگر۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۵

دو عالمی جنگوں نے جہاں دنیا کو تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا کر دیا وہیں لوگوں کے انداز فکر و نظر میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ قوم اور قومیت کا جدید تصور سامنے آیا۔ ترقی پسند نظریے کے تحت تمام عالمی برادری کو ایک اکائی تسلیم کیا گیا۔ قومیت کے اس جدید تصور میں مذہب کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ کسی مذہب پر ایمان لانا اور اس کی پیروی کرنا لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ اسے قومیت کے تصور سے نہیں جوڑنا چاہیے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالودود لکھتے ہیں :۔

" انتہا پسند نظریات تعمیری نہیں ہوتے۔ ان سے تنفر بڑھتا ہے۔ مذہب کو قومی احساس کی تشکیل کا اہم عنصر نہیں ماننا چاہئیے۔ خاص حالات میں مذہب معاون و مددگار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے "

[قوم و قومیت کا تصور اور ہم۔ ڈاکٹر عبدالودود]
آندھرا پردیش۔ مارچ ۱۹۷۰ء ص ۴۱

اسی مضمون میں ایک جگہ اور تحریر کرتے ہیں کہ " دراصل قوم ایک ہونے کے احساس کا نام ہے " کبھی کبھی قومی اتحاد اور سالمیت کے مسئلے کو لسانی اختلافات کی وجہ سے بھی ہوا ملتی ہے۔ اردو والے ملک کی دوسری زبانوں یا ہندی کے کبھی مخالف نہیں رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسری زبانوں کی واقفیت حاصل کرنے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جب اردو کو اس کے جائز مقام دینے کی بات کہی جاتی ہے تو اس کا غلط مطلب نکالا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود نے اس نازک مسئلہ پر بھی تبادلۂ خیال کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں :۔

" اردو زبان و ادب پر متعصبانہ حملہ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ایسے دور میں جب کہ قومی یکجہتی کے جذبے کی شدید ضرورت ہے۔ متعصبانہ ذہنیت رکھنے والوں کے حملے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ ہم آنکھ اور کان بند کر کے اس منزل سے گزر سکتے ہیں لیکن کب تک؟ اس کے تدارک کی تدبیر سوچنی ہو گی "

[ہمارے شعراء پر فرض ناشناسی کا الزام —
ڈاکٹر عبدالودود]

ہماری زبان ۸ جنوری ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر عبدالودود ادب اور زندگی کے رشتے پر ہمیشہ سائنٹفک انداز سے غور و فکر کرتے رہے۔ چنانچہ ان کے یہاں سلجھی ہوئی تنقید پائی جاتی ہے بہت کم لکھنے کے باوجود وہ بحیثیت ایک نقاد یاد کیے جائیں گے۔

★

غزلیں

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ نزد اسپتال
لکھنؤ ۳ — ۲۲۶

بظاہر مسکراتے ہیں مگر رنجیدہ رہتے ہیں
چمن میں کھلنے والے پھول سب رنجیدہ رہتے ہیں

مزہ آتا ہے بار رنج جب تھامے نہیں تھمتا
سنبھل کر کتنا ہی چلیے قدم لغزیدہ رہتے ہیں

سجے اے زندگی آئینہ بن کر ہم نے دیکھا ہے
سنور جانے پہ بھی گیسو ترے پیچیدہ رہتے ہیں

نظر کو پانیوں کی تہہ سے شناسا کرو یارو
کچھ ایسے پھول بھی کھلتے ہیں جو نادیدہ رہتے ہیں

ہمارے دل میں سچ کی روشنی کچھ کم نہیں لیکن
ہوائیں جیسے تو ہم اس طرح خوابیدہ رہتے ہیں

ٹپکتے ہیں جب آنسو رات کے دامن پہ گل بن کر
تو ہم پہروں کسی کی یاد میں رنجیدہ رہتے ہیں

اجالا ہو اگر موقع نہ پائیں سر اٹھانے کا
اندھیرے روشنی کی اوٹ میں پوشیدہ رہتے ہیں

ہمیں چونکا کے کھو جاتی ہیں سیاحوں کی آوازیں
مگر ہم ہیں کہ کھنڈروں کی طرح خوابیدہ رہتے ہیں

بدلتے جاتے ہیں تسنیم چہرے آرزوؤں کے
مسرت کے لیے ہم عمر بھر رنجیدہ رہتے ہیں

تبسم قادری
مکان ۵ مولوی گنج لکھنؤ

میں زندگی کا ذریعہ تلاش کرتا رہا
تمام عمر ہی فکر معاش کرتا رہا

یہ بات سچ ہے کہ میں بے صدا رہا لیکن
مرا سکوت مرے راز فاش کرتا رہا

یہ خوف تھا کہ نہ کھل جائے مفلسی کا بھرم
میں دست جہد سے سنگ اپنی لاش کرتا رہا

وہی ہوا کہ ملامت گلے پڑی اسکے
جو ہمیردی دل بد قماش کرتا رہا

کہیں کوئی نہ غریب الدیار کہہ پایا
میں شہر شہر یونہی بود و باش کرتا رہا

وہ ہمکلام نہ مجھ سے ہوا کبھی لیکن
مری طرف سخن دلخراش کرتا رہا

اجڑ گیا تو پھر آباد ہو سکا نہ کبھی
تمام شہر میں میں گھر تلاش کرتا رہا

سکون دل نہ میسر ہوا کبھی تبسم
بس سنگ فکر سے سر پاش پاش کرتا رہا

محسن ملیح آبادی
۲۴ کینٹ روڈ، لکھنؤ

(افسانہ)

ایک بوڑھا آدمی

بس آہستہ آہستہ رکی ـــــ ہیلپر نے گیٹ کھولا، سامنے ایک بوڑھا اور لاغر آدمی کھڑا تھا، اس کے سر پر ایک پگڑ بندھا ہوا تھا جو سخت گرمی کے باوجود ماتھے تک اپنا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر نہایت بوسیدہ عینک تھی جو ڈورے سے اس کے کانوں میں بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں مٹی کا ہانڈا۔ ہانڈے پر ایک کاغذ ڈھکا ہوا تھا اور اس کا اوپری حصہ سُتلی سے بندھا ہوا تھا۔ ہانڈے کو وہ بہت احتیاط سے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تھا۔ اس نے باہر ہی سے لاٹھی کو بس میں ڈال دیا اور راڈ پکڑ کر بس میں چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت کوشش کے بعد بھی جب وہ اوپر نہ چڑھ سکا تو ہیلپر نے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا اور گھنٹی بجا دی، اندر آ کر بوڑھے نے ہاتھ میں لیے ہوئے ہانڈے کو اپنی آنکھوں کے قریب لا کر بڑے انہماک سے دیکھا اور اس کے چہرے پر افسردگی کی دھوپ چھا گئی۔ ہانڈا بس کے راڈ سے ٹکرا کر چٹخ گیا تھا اور اس میں سے سفید سفید دودھ جیسی کوئی چیز رسنے لگی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے بدستور اُسے دیکھے جا رہا تھا جو بس کے ہچکولوں سے ہل رہا تھا۔

"سیٹ پر بیٹھ جاؤ،" ہیلپر نے بڈھے سے مخاطب ہو کر قریب خالی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ بڈھے نے چونک کر ہیلپر کی طرف پھر سیٹ کی طرف دیکھا۔

"سیٹ پر بیٹھ جاؤ" ہیلپر نے پھر کہا۔ بڈھا راڈ چھوڑ کر سیٹ پر تقریباً گر گیا۔ جھٹکا لگنے سے ہانڈا ایک بار پھر چھلکا تو اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ہانڈے کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا ہو اور اس میں خون چھلک آیا ہو۔ کچھ دیر تک بغیر پلک جھپکائے وہ ہانڈے کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بہت احتیاط سے رانوں کے بیچ میں رکھ لیا۔ سر سے بندھے ہوئے پگڑ کو کھینچ کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر اس پگڑ کو جو کھل کر ڈھیلا ہو گیا تھا کاندھے پر ڈال لیا اور سر جھکا کر کسی فکر میں ڈوب گیا۔

اس کے چہرے پر فکر کی گہری لکیریں نمایاں تھیں، آنکھیں ایک نکتہ پر مرکوز تھیں، پلکیں ساکت تھیں۔ اس کی عینک جو ڈورے سے اس کے کانوں میں بندھی ہوئی تھی، اور جس کے شیشے اس کے چہرے کی کھال کی طرح بے رنگ، آنکھوں کی طرح بے رونق اور کنارے زنگ آلود ہو چکے تھے، کھسک کر ناک پر آگئی تھی۔ پسینہ پیشانی اور کنپٹیوں سے بہہ بہہ کر ٹھوڑی سے ٹپک رہا تھا اور وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" کنڈکٹر کی آواز پر چونک کر اس نے اپنے چہرے کو کنڈکٹر کا چہرے سے کچھ اوپر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتا رہا۔

"پیسے نکالو" کنڈکٹر پھر بولا تب وہ ہنڈیا کو ایک ہاتھ سے تھام کر، دوسرے ہاتھ سے جلدی جلدی نیفہ ٹٹولنے لگا جب بڈھا دیر تک نیفہ ٹٹولتا رہا اور کچھ برآمد نہ ہو سکا تو کنڈکٹر سے نہ رہا گیا۔

"جلدی نکالو" کنڈکٹر منکر نکیر کی طرح اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اور بڈھے کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے کہ جیسے وہ نیفہ

ٹٹول رہا ہو کوئی زخم کرید رہا ہو۔

"پانچ کا نوٹ تھا، جانے کدھر گیا۔ کانی تو تھک کے بعد بڈھا بہت گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے کی گھبراہٹ آہستہ آہستہ افسردگی میں بدلتی جا رہی تھی۔

"ابھی چلتے وقت۔ میں نے اس نوٹ کو نیفے میں باندھ لیا تھا۔" وہ بے خیالی کے سے انداز میں بولا۔ اور کچھ سوچنے لگا۔ جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ نوٹ نیفے میں باندھا بھی تھا یا نہیں سوچتے سوچتے ایک دم چونک کر اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی کو جس میں ہانڈے کی ڈوری پکڑے ہوئے تھا کھول کر مڑا تڑا نوٹ نکالا اور کنڈکٹر کو تھما دیا۔

"یہ نوٹ نہیں چلے گا۔" کنڈکٹر نے نوٹ کی تہوں کو کھولتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں چلے گا؟" بڈھے نے لرزتی ہوئی آواز میں بہت افسردگی سے پوچھا۔

"یہ بالکل بھیگا ہوا ہے اور جگہ جگہ سے پھٹا بھی ہے۔" کنڈکٹر نے نوٹ کا ایک کونا پکڑ کر بڈھے کے آنکھوں کے قریب لے جا کر اسے دکھایا۔ بڈھا آنکھیں پھاڑ کر نوٹ کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ نوٹ نہ ہو اس کے جسم کا کوئی عضو ہو جو ناکارہ ہو گیا ہو۔ پھر کچھ سوچ کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "مگر ـــــ ہمارے پاس تو یہی ایک نوٹ ہے" اور رحم طلب نظروں سے کنڈکٹر کے چہرے کو تکنے لگا۔

"تو پھر دوسری گاڑی سے آنا۔" کنڈکٹر نے تیز لہجے میں بڑی بے پروائی سے کہا۔ بڈھا اور بھی افسردہ ہو گیا ـــــ گڑگڑاتے ہوئے بولا "ہمیں بارہ بجے سے پہلے اسپتال پہنچنا ہے کیونکہ بارہ بجے تک اسپتال بند ہو جاتا ہے۔"

کنڈکٹر خاموش ہو گیا، پھر بولا۔ "تمہارا یہ نوٹ چار روپے پر چل سکتا ہے۔ میں شہر میں اسے بدل لوں گا۔" بڈھے نے خالی نظروں سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔ غالباً وہ کنڈکٹر کی بات نہ سمجھ سکا تھا۔

"کیا سمجھے ـــــ! تمہارا یہ نوٹ چار روپے پر چلے گا۔" اس بار کنڈکٹر نے ذرا جھک کر پہلے سے کچھ بلند آواز میں کہا۔ بڈھا اسی طرح چونکا جیسے سوتے سے جاگا ہو۔

"چار روپے کر۔ نہیں جی۔ زیادہ کاٹ لو میں بہت غریب ہوں کنڈکٹر صاحب۔ میرے پاس صرف یہی ایک نوٹ ہے۔" بڈھے نے بہت منت سے کہا۔

"جی نہیں۔ میں اٹھنی کاٹوں گا۔" کنڈکٹر نے ٹکٹ بناتے ہوئے کہا۔ اور بڈھا خالی نظروں سے کنڈکٹر کا چہرہ تکتا رہا۔ کنڈکٹر نے ٹکٹ بنا کر بڈھے کو تھما دیا۔ بڈھا ٹکٹ کو آنکھوں کے قریب لا کر غور سے دیکھنے لگا جیسے بدلے میں ٹکٹ کو پرکھ رہا ہو۔ پھر تہہ کر کے مٹھی میں دبا لیا اور نظریں اوپر اٹھا کر کنڈکٹر سے مخاطب ہوا۔

"اور پیسے؟" "پیسے اگلے اسٹاپ پر ملیں گے۔" کنڈکٹر نے کاپی پر لکھتے ہوئے کہا۔

اور بڈھے نے سر جھکا لیا۔

بس کے ہچکولوں سے سرک کر بڈھا بالکل میرے قریب آ گیا تھا۔ اس کی دھوتی جو بوسیدہ اور نہایت میلی تھی میری پتلون پر پھیل گئی تھی۔ کندھا بھی میرے کندھے سے جڑ گیا تھا اس کی قمیص بھی دھوتی ہی کی طرح چیکٹ تھی۔ کندھے اور کالر پر تیل کے دھبے سے تھے جن پر گرد جم گئی تھی میں نے کھڑکی کی طرف کھسکتے ہوئے بڈھے کے چہرے کی طرف دیکھا فکر کے ساتھ بڈھے کے چہرے پر تھکن کے آثار بھی نمایاں تھے اس کے ننگے پیر دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ ممکن رہا تھا وہ کچی سڑک پر کہیں دور سے پیدل چل کر آیا تھا۔

بس کے ہچکولوں میں ہانڈا مستقل چھلک رہا تھا اور اس میں سے سفید سفید دودھ جیسی کوئی چیز اس کی دھوتی پر گر رہی تھی لیکن وہ اپنے وجود سے بے خبر۔ فکر کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ عینک ایک بار پھر کھسک کر ناک پر آ گئی تھی اور پسینہ تھا کہ بہے جا رہا تھا۔

کھواہش (خواہش) کی، شہر میں کھیر کہاں ملتی ؟ اس نے تائید چاہی۔

"اور کیا —" میں نے کہا۔

"میں اسی سے گھر چلا آیا — یہ کھیر میں نے خود اپنے ہاتھ سے بنائی ہے اس کے لیے —" اس نے میری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں اپنے بیٹے کے لیے بے پناہ محبت کا جذبہ تھا۔

"اچھا —" میں نے لہجے کو کھینچ کر گویا تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں، ہاں اسی کے پاس ہے" اس نے نظریں جھکا لیں اور خاموش ہو گیا پھر بولا۔ "صاحب ہم دونوں بڑھیا بڈھے کا سہارا ہے"

"کیا عمر ہے اس کی؟" میں نے پوچھا۔ اس نے میرا جائزہ لیا اور کچھ مسرت سے بولا۔ "بس آپ جیسا ہے صاحب اکیس سال کا ہے"

بس پھر چل پڑی تھی۔ اب بس میں پہلے سے زیادہ بھیڑ ہو گئی تھی۔ سیٹوں کے درمیان پسنجر کھڑے تھے گرمی کی حدت نے پسنجروں کو بے کل کر دیا تھا۔ داہنی طرف کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے پسنجر کچھ زیادہ ہی بے کل تھے دوپہر کی سخت دھوپ شیشوں سے چھن چھن کر چہروں کو تمتا رہی تھی چہرے جھلس سے گئے تھے۔

میں نے اپنی سیٹ کے قریب والے شیشے کو اوپر چڑھایا تو ہوا کے جھونکے پسینے سے بھیگے جسم میں فرحت پیدا کرنے لگے مگر شیشہ کھلنے سے دھوپ کی تمازت اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے اس اخبار کو جس کے اشتہارات تک کئی کئی مرتبہ پڑھ چکا تھا چہرے پر ڈھک لیا تو کچھ سکون محسوس ہوا۔

بس ایک بار پھر رک گئی۔ ریلوے کراسنگ آ گیا تھا، شاید کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ جب لوگ بس سے نیچے اترنے لگے تو بڈھے نے اترتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا پھر پیچھے بیٹھے ہیلپر سے مخاطب ہوا "کنڈکٹر کدھر ہے؟"

"خاموش۔ بیٹھو۔ نیچے گئے ہیں ابھی آتے ہیں" ہیلپر نے بڈھے کو تنبیہہ کی۔

بڈھا پھر خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ دھوپ سے اس کا چہرہ تمتا گیا تھا اور وہ کہیں دور تصور کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔

جب ٹرین گزر گئی تو پسنجر جلدی جلدی بس میں چڑھنے لگے تو بڈھے نے تشویش بھری نظروں سے سامنے دیکھا اور بہت آہستہ سے کچھ بولا۔ اس کی آواز بس کی آواز میں دب گئی۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی رواں دواں تھی۔ کھڑکیوں سے گرم ہوا کے جھونکے اندر داخل ہو رہے تھے جو پسینے سے بھیگے ہوئے جسموں کو کسی حد تک فرحت بخش رہے تھے مگر دھوپ کی تمازت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے بڈھے کی طرف دیکھا۔ پسینے سے اس کی قمیص تر ہو گئی تھی مگر وہ اپنے وجود سے بے خبر جیسے ذہن میں قید تھا۔

جب کوتیشور میں گاڑی رکی اور پسنجر اترنے لگے تو بڈھا اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک سامنے دیکھتا رہا۔

کنڈکٹر بڈھے کے قریب آیا اور بڈھے کو تیز تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ذرا جھنجھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ لو پیسے"

بڈھا چونک اٹھا اور کنڈکٹر کی طرف اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا دیا۔

بڈھا پیسے لیکر سیٹ پر بیٹھ گیا اور مٹھی کھول کر ہاتھ پر پھیلی ہوئی ریزگاری کو آنکھوں کے قریب لاکر بڑے غور سے دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتا رہا جیسے پیسے نہ گن رہا ہو، ہاتھ کی لکیریں پڑھ رہا ہو۔ پھر مٹھی بند کر لی، سر اٹھایا عینک درست کی اور بہت ہی ضعیف آواز میں کنڈکٹر سے بولا "یہ تو کم ہیں کنڈکٹر"

"کم کیوں ہیں؟ پورے تو ہیں دو روپے کٹوائے گئے"

بچاس پیسے میٹے نوٹ کے ڈھائی روپے ہی تو کاٹتے ہیں؟" کنڈکٹر جیسے منہ چڑاتے ہوئے بولا۔

"بچاس پیسے!" جیبیں کنڈکٹر بچیس پیسے کاٹ لو۔ میں بہت غریب آدمی ہوں، ابھی مجھے ....."

"مجھے دن رات جریب ملا کرتے ہیں" کنڈکٹر بڈھے کی بات کاٹتے ہوئے بڑی بیزاری سے بولا۔

بڈھا کچھ دیر تک یاس بھری نظروں سے کنڈکٹر کو تکتا رہا۔ پھر سر جھکا لیا اور مٹھی کھول کر ایک بار پھر پیسوں کو دیکھنے لگا جیسے اس کی اس منت سماجت سے پیسوں میں کچھ اضافہ ہو گیا ہو۔ پھر کچھ سوچ کر کنڈکٹر سے مخاطب ہوا۔

"ابھی مجھے اپنے بیٹے کے لیے پھل خریدنا ہیں کنڈکٹر" نے بڈھے کی طرف دی توجہ نہیں دی تو بڈھا خاموش ہو گیا۔

"بلرام پور اسپتال والا گیٹ پر آ جاؤ" ہیلپر نے آواز لگائی، بڈھا جو اس وقت نصف زمین کھویا ہوا تھا، یک بیک بڑا جلدی جلدی سے پانڈے کو سنبھالا سیٹ کے نیچے جھک کر لاٹھی کھینچی اور سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی دیر تک رک گئی تھی اور پیسنجر اتر رہے تھے۔

سنبھلتے سنبھلتے بڈھے نے ایک بار پھر کنڈکٹر کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا اور اکھڑتے اکھڑتے لہجے میں بولا۔

"کنڈکٹر! ہمارا لڑکا اسپتال میں بھرتی ہے"

کنڈکٹر اس وقت نوٹ گننے میں محو تھا۔ بڈھے کی اس طرف سے اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ بڈھے نے عینک درست کی، سر جھکایا اور آہستہ آہستہ بس سے نیچے اتر گیا۔

★

حواشی صفحہ ۲۸ کا بقیہ

۱۵ ایضاً " " " " ۴۶۹

۱۶ ابوالفضل، اکبرنامہ جلد اوّل " ۲۲۱

۱۷ بزم تیموریہ " " ۸۰، ۸۶

۱۸ اکبرنامہ۔ آئین اکبری، طبقات اکبری وغیرہ

۱۹ طبقات اکبری جلد دوم صفحہ ۴۵۲ و بدایونی سوم ص ۲۰۱

۲۰ " " " ۴۵۲۔ ۴۵۴

۲۱ بدایونی۔ منتخبات سوم " ۲۲۷

۲۲ " " " " ۲۱۱

۲۳ ۔ طبقات اکبری دوم " ۴۶۴

۲۴ ۔ بدایونی سوم " ۱۹۵

۲۵ " " " " ۱۸۹

۲۶ " " " " ۳۱۰

۲۷ " " " " ۳۱۵

۲۸ ابوالفضل، آئینِ اکبری اوّل ، ۷۵

سیلانی سیوتے

غزل

اپنے انجام سے بے خبر زندگی
رات، دن کر رہی ہے سفر زندگی

موند کر اپنی پلکیں چھپا لوں تجھے
لگ نہ جائے کسی کی نظر زندگی

ان دہکتی چتاؤں کی آغوش میں
کس طرح ہو سکے گی بسر زندگی

بھاگتے جاتے ہوئے منظروں کی طرح
گھٹتی جاتی ہے شام و سحر زندگی

موت تیرا بہت ہم پہ احسان ہے
تجھ سے پہلے نہ تھی معتبر زندگی

وقت گزرا ہوا پھر نہیں آئے گا
دیکھ ابھی مڑ کر اگر زندگی

ہم بھی سیلانی بھٹکا کیے عمر بھر
لے گئی جب اِدھر سے اُدھر زندگی

آغا حبیب کاشمیری
سی کے ۱۴۲ ناریل بازار وارانسی

جگنو

تخلیقِ بہار جگمگائی
قدرت کی نگار مسکرائی
چھوٹی ہے جبینِ شب پہ افشاں
زر ریز، نظر نواز، رقصاں
ٹوٹے ہیں فلک سے ماہ پارے
لرزاں ہیں ہوا میں کچھ شرارے

جگنو سے چمک رہی ہوا ہے
زر پاش سی باغ کی فضا ہے
افسردہ نور کے ہیں قطرے
پگھلے ہوئے طور کے ہیں قطرے
ننھی سی جان چمک رہی ہے
ہیرے کی کنی دمک رہی ہے

تاریکیٔ شب کا غم نہیں ہے
ماحول کا کچھ الم نہیں ہے
تاروں کی طرح بکھر رہے ہیں
جو کام ملا ہے کر رہے ہیں

جگدیش ناتھ پرتاب بریلوی
ڈویژنل پوسٹ آفس گنگاوری بریلی

غزل

دن بجھے دل کا داغ بجھتا ہے
گو ہر شب چراغ بجھتا ہے
داغِ دل کو ہوا نہیں لگتی
کیا ہوا سے چراغ بجھتا ہے
لوگ کھو کر اداس ہوتے ہیں
دل تو پا کر سراغ بجھتا ہے
زندگی کی ہوا بندھی نہ بندھے
جلتے جلتے چراغ بجھتا ہے
اک تماشہ ہوا چراغ جلے
دل جلوں کا چراغ بجھتا ہے
دل کی صورت اگر کلی نہ کھلے
صورتِ شمع باغ بجھتا ہے
بھید کی بات تو خدا جانے
مور ناچے تو زاغ بجھتا ہے
دل جلا کر چراغ جلتے ہیں
دل بجھے تو چراغ بجھتا ہے
شمع رو کر پگھل گئی لیکن
ہنستے ہنستے چراغ بجھتا ہے
وہ جہاں ہیں چراغ جلتے ہیں
کیوں دلِ بد دماغ بجھتا ہے
اب چراغوں میں روشنی نہ رہی
حسرتوں کا چراغ بجھتا ہے
سوگوارِ نصیب تنہائی
بھرتے بھرتے ایاغ بجھتا ہے
بات تجھ سے کوئی ٹھکانے کی
دم زدن میں چراغ بجھتا ہے

افسانہ

ڈاکٹر صبیحہ انور

آزادی کا قیدی

فورتھ پیریڈ شروع ہوا۔ گھنٹی بجنے کے تھوڑی دیر بعد تک فضا میں ایک جھنجھناہٹ گونجتی رہی۔ برآمدوں میں گھسٹتی چپلیں، دبی دبی ہنسی اور جلدی جلدی کرسیوں کے کھینچے جانے کی آوازیں چاروں طرف سے ایک ساتھ آئیں اور ایک ساتھ ہی ختم ہوگئیں۔ کلاس شروع ہو گیا اور چاروں طرف ایک معروف سناٹا چھا گیا۔ آفس کے سامنے والا گل مہر کا پیڑ پھولوں سے اس طرح لد گیا تھا کہ دُور سے شبہ ہوتا آگ لگی ہے۔ مالی حوض میں پائپ لگا کر شاید بھول گیا تھا۔ پانی حوض کے چاروں طرف گر رہا تھا۔

اُوشا کا دل چاہا کہ اٹھ کر مالی کو آواز دے کر نل بند کرنے کے لیے کہے۔ وہ ضرور یہیں کہیں آس پاس اپنی نئی دُلہن سے عشق کر رہے ہوں گے، مگر پھر کچھ سوچ کر آنکھوں سے چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور خود کرسی سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کرلیں جیسے اگر آنکھیں نہ بند کرلیتی تو ڈر تھا کہ آنکھوں کے بند سوتے پھر اس سے روکے نہ رکیں گے۔ اتنی کمزوری کا تو اس نے کبھی بھی محسوس نہ کی تھی۔ ۔ آج تو وہ بالکل بے بس تھی ـــــ کمزور بانہہ پر لپٹتے باندھتے پُورا جسم شل ہو چکا تھا۔ کیا کروں ـــ؟ بے بسی کے عالم میں اس نے سوچا اور دونوں پیروں کو چپل سے نکال کر اس طرح کھینچا کہ پورے جسم کی رگیں کھنچ گئیں۔ ہاتھ کی انگلیوں کو چٹخایا۔ اور اکتا کر اپنا سر میز پر رکھ دیا۔

کالج ختم ہونے میں ابھی پورے تین گھنٹے باقی تھے جیسے تین صدیاں۔ کہیں تین صدیوں کے بعد اس ٹائپ رائٹر کی مستقل کھٹ پٹ سے نجات ملے گی ـــــ سامنے ہاسٹل کے اندراجات کا رجسٹر کھلا پڑا تھا، جسے کلرک ابھی اس کے سامنے چیک کرنے کے لیے رکھ گیا تھا ـــــ ایک بیباک حقیقت کنڈلی مارے ناگ کی طرح رجسٹر کے ان صفحات کی لکیروں میں سمٹی اسے ڈسنے کی منتظر تھی ـــــ صبح سے اس کا موڈ بے حد خراب تھا ـــــ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اپنے کو خیالات کی رو سے آزاد نہ کرا سکی تھی ـــ اوشا نے ہمت کرکے رجسٹر کو اپنی جانب گھسیٹا، اور چشمے کو ناک پر جاتی ہوئی پڑھنے لگی۔

"رشمی مہتہ" نام کے خانے میں میٹرن کی مخصوص رائٹنگ میں لکھا تھا۔ باپ کا نام۔ اجے کمار مہتہ۔ ایگزیکیٹو انجینیر۔ الہ آباد۔ اس نے ایک بار پھر زیر لب پورا پتہ دُہرایا۔ اجے کا نام زبان پر لاتے ہوئے اسے بڑا عجیب لگا۔ اجے آج خیال کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں میں قید اس کے سامنے ہے۔ ایک ایسا نام، جس میں ایک ساتھ اتنی تصویریں دل اٹھیں کہ ان کا سامنا کرنے کی تاب اوشا کے اندر نہیں تھی۔ اجے سے الگ ہو کر اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بیس سال سے بھی زیادہ گذر چکے تھے۔ بیس سال میں بیس ساون آئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پھواریں پڑیں۔ برہا کی چنگاری چمکی اور جیٹھ بیساکھ کی تپتی دوپہریں بتا گئیں کہ ہجر کی تڑپ اور گھٹن کیسا کیسا جلاتی ہے۔

گذرے ہوئے برہا کے دنوں میں انٹر کالج میں پڑھنے والی اوشا جوان دنوں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ تیز تیز سائیکل چلاتی تھی دو چوٹیاں گوندھتی تھی ـــــ اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد لندن سے اکنامکس میں ایک خصوصی ڈگری لے آئی تھی ـــ دھیرے دھیرے اس کی یہ ڈگریاں اور اس کے گذرتے ہوئے ماہ و سال اس کے بیچ میں ایک ایک

معین اعجاز
اردو مجلس آل انڈیا ریڈیو
نئی دہلی

(خاکہ)

ٹیلی ویژن چاچی

ٹیلی ویژن چاچی گاؤں میں ٹیلی ویژن آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ویسے تو مرنے کے بعد سبھی اللہ کو پیارے ہوتے ہیں لیکن ٹیلی ویژن چاچی کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ وہ جب زندہ تھیں تو اللہ کے بندوں کی پیاری تھیں۔ گاؤں کے لوگ ہمیشہ ان کی گالیاں کھاتے لیکن کبھی بے مزہ نہیں ہوتے تھے۔

ان کا نام ٹیلی ویژن چاچی اس لیے پڑا تھا کہ وہ اچھی خاصی چلتی پھرتی خبر رساں ایجنسی تھیں۔ ہر روز ادھر ادھر سے خبریں اکٹھا کر کے لاتیں اور گھر گھر جا کر اس طرح بیان کرتیں جیسے وہ ہر واقعہ کی چشم دید گواہ ہوں۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے ہم نے سنا ہے کہ جس دن وہ بیاہ کر آئیں اسی دن سے گاؤں کا اطلاعات و نشریات کا شعبہ انھوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ہاں گاؤں کے لوگوں کو ان کے لیے ایک مناسب نام کی تلاش تھی۔ لوگ انھیں پہلے صرف چاچی کہتے تھے لیکن جب ملک میں ٹیلی ویژن آ گیا اور ہر طرف اس کے چرچے ہوئے تو لڑکوں نے ان کا نام ٹیلی ویژن چاچی رکھ دیا۔ پھر مرتے دم تک وہ گاؤں والوں کے لیے ٹیلی ویژن چاچی ہی رہیں ویسے ٹیلی ویژن کا ذکر بھی گاؤں کے لوگوں نے سب سے [illegible] انھیں کی زبان سے سنا تھا۔

ان کی زندگی دراصل کبیر داس کے اس دوہے کی آئینہ دار تھی۔

کبیرا کھڑا بازار میں مانگے سب کی خیر
نہ کاہو سے دوستی نا کاہو سے بیر

ان کا مذہب اور مسلک کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ وہ ان پڑھ تھیں۔ جمہوریت اور سیکولرزم پر نہ کبھی انھوں نے موٹی موٹی کتابیں پڑھی تھیں اور نہ کبھی بھاشن سنے تھے۔ انھیں پیار کرنے والے اور انھیں چھیڑنے والے ہر مذہب اور ہر ذات کے بچے اور جوان ہوتے تھے۔ عید ہو یا دیوالی شب برات ہو یا ہولی۔ ہر گھر میں وہ تھوڑی دیر کے لیے حاضری ضرور دیتیں ورنہ تیوہار پھیکا رہتا۔

ہولی کے موقع پر تو ان کے دروازے پر خوب رونق رہتی نوجوانوں کی ٹولیاں اکثر ان کے دروازے پر ڈیرا جماتیں۔ لڑکے ان کی بولی اور چال ڈھال کی نقل کرتے۔ ٹیلی ویژن چاچی خوب گالیاں دیتیں ہر لڑکے کو دھمکی دیتیں "موئے! میں تیرے باپ سے شکایت کر کے تجھے خوب پٹواؤں گی۔" لیکن لڑکے ان کی باتوں کا کوئی نوٹس نہ لیتے اور بدستور انھیں چھیڑتے اور ان کی گالیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ ویسے ٹیلی ویژن چاچی کبھی لڑکے یا لڑکی کی شکایت اس کے ماں باپ سے نہیں کرتی تھیں کبھی کسی بات پر کوئی اپنے لڑکوں کو مارتا یا ڈانٹتا تو وہ ہمیشہ مداخلت کر کے بیچ بچاؤ کرا دیتیں۔ ان

جانے پہچانے شاعر و ادیب تھے۔ پیشِ نظر خاکوں میں شامل حضرت مولانا ابو محمد امام اثر، شاد عظیم آبادی، اور ان کے والد خان بہادر محمد ضمیر حسن خاں مرحوم سے ظاہر ہے کہ یہ سب مشفق ہستیاں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے انداز و اطوار سے ادب اور فکر کو بہت کچھ دیا ہے۔ آج ان کی نجی زندگی کی معمولی جھلکیاں یا ان سے متعلق تحریروں کی بہت معلومات بھی مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

ایسے سوانحی خاکوں میں تناسب، رنگ آمیزی اور دلچسپی دراصل خاکہ نگار کی شخصیت اور اس کی فن کارانہ تحریر کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ پروفیسر آزاد نے جس خلوص، انکساری اور ادب سے اپنے بزرگوں اور اساتذہ کو اور جس محبت سے اپنے دوستوں کو یاد کیا ہے اس نے ان کے قلم میں روانی اور شگفتہ بیانی اور اسٹائل میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ اس لیے بلاشبہ ان یادوں کو سوانحی خاکہ نگاری میں ایک قابلِ قدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ارضِ پاک خطۂ پنجاب کے ان سربرآوردہ ادیبوں کے سوانحی خاکے جن کے متعلق ہماری معلومات کافی نہیں ہیں یا "سرحد پار کی" قائم ہو جانے کے باعث ہم جن سرحد پار کے زعمائے ادب اردو کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہیں کر پاتے۔

——— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: بوند بوند اُجالے (شعری مجموعہ)

شاعر: تسنیم فاروقی

ملنے کا پتہ: سی ۱۸۴۔ تلسی داس مارگ، نزد اسپتال، لکھنؤ ۳

تسنیم صاحب کے کلام میں دلوں کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے، حالاتِ حاضرہ کی تصویر کشی بھی ہے اور حقیقت نگاری بھی۔

"بوند بوند اُجالے" میں اگر ایک جانب سوز و گداز ہے تو دوسری جانب طنز و مزاح کا رنگ بھی جھلکتا ہے مگر ایسا طنز و مزاح جو کسی کو گراں نہ گزرے۔ وہ بڑے فنکارانہ انداز میں جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے قطعات اور رباعیوں میں نفسیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

ذیل میں ان کی چند رباعیات اور قطعات پیش کر رہی ہوں انہیں پڑھیے اور ان کے ندرتِ تخیل کی داد دیجیے۔

بجھ گئی دل کی رہگذر مسلسل
تیرے غم نے دل میں کچھ لیٹا
زندگی کی سیاہ وادی میں
تو نے مجھ سے چراغ چھین لیا

دل پہ ہوتا ہے گردشِ غم کا اثر
لگتی ہے آئینے کو دھڑکن کی چوٹ
جس کا احساس کچھ مہذب ہو
اس کو کافی ہے ایک پھول کی چوٹ

جو آپ دے سکیں وہ زمانے کو دیجیے
دنیا جو دے سکے وہی دنیا سے لیجیے
سب دوست سب عزیز ہیں سب جاں نثار ہیں
لیکن کبھی کسی سے توقع نہ کیجیے

آرزو کی اداس وادی میں
غم کے سارے اصول چبھتے ہیں
صرف کانٹوں کو کیوں کرو رسوا
دل دکھا ہو تو پھول چبھتے ہیں

اے گل انعام بجا ہے کہ میں سلطان نہیں
دے نہیں سکتا میں افلاس کی آہوں کا بدل
کیا کروں میں کہ میں تعمیر نہیں کر سکتا
خاک اور خون پہ ہنستا ہوا اک تاج محل

——— مجتبیٰ مصطفیٰ
آغا محمد حسن

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب :- لمس اوّل، شاعر :- علیم صبا نویدی،
صفحات :- ۹۶، قیمت - ۵ روپے ۸۵ پیسے۔
ناشر :- تامل ناڈو اردو پبلیکیشنز۔ مدراس۔

لمس اوّل تامل ناڈو کے ممتاز شاعر علیم صبا نویدی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کو انھوں نے "ٹیپ بند نظمیں" کہا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ کی نظمیں مربع کی شکل میں ہیں یعنی ابتدائی بند کے تین اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ، دوسرے بند کے تین مصرعے ہم قافیہ اور چوتھا مصرعہ پہلے بند کے قافیے کے ساتھ۔ اردو شاعری میں یہ صنف اردو بیشتر قدیم ہے اور شعرا نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن آج کے دور میں جبکہ ہر پرانی اور روایتی نشانی ناقابلِ اعتنا بن چکی ہے علیم صبا نویدی نے لمس اوّل پیش کر کے اپنی جرأت اور صلاحیت کا اعتراف کرایا ہے۔

کل ۴۹ نظموں پر مشتمل یہ مجموعہ صبا صاحب کی بھرپور فکری صلاحیتوں کا غماز ہے۔ خاص طور پر جمع تخلیق، بیت جمر کا نوحہ، رنگوں کی بھیڑ، بولتی انگلیاں، شعور کا طواف، بچی خوشبو، اور ادھ کھلے مکان کے دُکھ ایسی نظمیں ہیں جن میں ان کا فن ابھر کر سامنے آیا ہے۔

مجموعے کی ابتدا میں جناب راز، امتیاز، ڈاکٹر وحید مرزا اور ڈاکٹر گیان چند کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند کے "صبا صاحب نے ایک راہ دکھائی ہے کہ نئی زندگی اور نئے انسان کے نفسیاتی مسائل کو ابہام کے بغیر بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔"

کتابت طباعت اور کاغذ اچھا ہے۔ سرورق بہت ہی دیدہ زیب ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ تامل ناڈو جیسی جگہ سے اردو کی یہ خدمت انتہائی ستائش کے قابل ہے۔ جناب علیم صبا نویدی کا یہ مجموعہ ـــ ادبی حلقوں میں نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا بلکہ ـــ شرفِ قبولیت بھی حاصل کرے گا۔

صاحو لکھنوی

نام کتاب (شعری مجموعہ) :- برگِ سرسبز۔ نام شاعر :- نامی انصاری
صفحات :- ۱۴۴۔ قیمت :- دس روپیہ۔
ملنے کے پتے :- (۱) دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ
(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دلی، بمبئی، علیگڑھ

برگِ سرسبز نامی انصاری کا اگرچہ پہلا شعری مجموعہ ہے مگر اخبارات و رسائل کے توسط سے اردو دنیا ان کے نام اور کلام سے بخوبی آشنا ہے۔ برگِ سرسبز میں نامی انصاری کی ستر غزلیں شامل ہیں اور ان کے سرسری مطالعے سے بھی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غزل کے کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ عصری حسیت اور زندگی کے مظاہر کی بوقلمونی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی غزلوں میں لفظیات کا ایسا نظام ملتا ہے جس میں تازگی اور ندرت کے ساتھ موسیقیت اور شعریت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

نامی انصاری صاحب تخلص کے اعتبار سے نامی ضرور ہیں مگر اردو غزل کے شائقین ان کے مجموعہ غزلیات "برگِ سرسبز" کے ذریعہ پہلی بار ان سے متعارف ہوں گے۔ اس اجنبیت کے باوجود ان کا یہ مجموعہ کلام چونکا دینے والا خاص طور پر اس لیے ہے کہ وہ سراسر جدید غزل گو شاعر اس وجہ سے نہیں ہیں کہ انھوں نے قدیم شعری روایات سے کنارہ کشی نہیں کی ہے۔ اگر جدید شعرا میں وہ فیض سے فیضیاب ہوتے ہیں تو دوسری طرف غالب سے اپنی وابستگی اور عقیدت کو نہ صرف انھوں نے اپنے مختلف شعروں میں ظاہر کیا ہے بلکہ غالب کی بعض مشہور اور مرصع غزلوں کی ہم طرح متعدد غزلیں بھی کہی ہیں اور یہ غزلیں ان روائتی غزلوں کے انداز کی نہیں ہیں جو عام طور پر طرحی مشاعروں میں سننے میں آتی ہیں۔

جدید غزل اپنے ساتھ مخصوص الفاظ، تراکیب، اشارے کنائے اور علامتیں لائی۔ کچھ جدید غزل گو شعرا ان کے استعمال میں حدود سے تجاوز کر گئے، اور ایسا اندازِ بیان انھوں نے اپنایا جس کی غزل متحمل نہیں ہوتی۔ لیکن نامی انصاری کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل کے بنیادی رنگ اور آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے تاثرات کو پیش کیا ہے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں پر ان کی گہری نظر ہے اور اظہارِ خیال کے لیے وہ اعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور عام طور پر ایسی علامتیں اور

اشارے کنائے استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں جن کا بوجھ غزل کا کاندھا نہیں سنبھال سکتا۔ آج کے دور میں حساس انسان جس طرح تنہائی کے کرب میں مبتلا ہے اور اسے اپنے جانے پہچانے چہروں پر خلوص کی ہلکی سی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہ احساس ایک شاعر کے لیے کس قدر جاں گداز ہوتا ہے اس کو نامی صاحب نے اپنے مجموعہ میں متعدد جگہ مناسب فنکارانہ انداز میں اپنا موضوع بنایا ہے مجموعہ کے اوراق پر بکھرے ہوئے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔ ؎

بچھی تھی برف کی چادر تمام راہوں پر
چلے تو نقشِ قدم کا حساب تک نہ ملا

پھر جاں سے گزرنے کی توفیق بھی ارزاں ہو
جب طرزِ تغافل ہی یاروں کی ادا ٹھہرے

زندگی کے میلے میں اجنبی ہیں سب چہرے
کس سے کیا کہا جائے کس سے کیا سنا جائے

اک آرزوئے خام کے جلوے ہزار رہا
پردہ اٹھے تو اپنا ہی پیکر دکھائی دے

اب خونِ رگِ جاں بھی قاصر ہے چمکنے سے
اربابِ جنوں کس سے جینے کی ادا مانگیں

ہزار رنگ تھے لیکن کوئی نہ اپنا تھا
ہجومِ شہرِ تمنا میں بھی، میں تنہا تھا

سر گیا چہرہ، مرے خوابوں کے آئینے بھی
داستانِ سنگِ حقیقت کی سنانے والے

بوئے گل، جنسِ وفا، نقدِ ہنر کچھ بھی نہیں
گرد ہی گرد ہے، اب شہر کے بازاروں میں

گزر گیا تھا کبھی کوئی مثلِ بادِ صبا
مہک رہے ہیں مگر راہ گزار برسوں سے

افسانہ یہ افسانہ اک سعیِ مسلسل ہے
خاموشیِ ساحل سے ہنگامۂ طوفاں تک

غالبؔ نامی انصاری نے اپنی عقیدت کا اظہار متعدد اشعار میں کیا ہے۔ اس مجموعہ میں چند اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں اتنی ہی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے جتنی غالبؔ کے بعض اشعار سمجھنے میں۔ مجموعی طور پر رنگِ سوز سبز پر خود نامی انصاری صاحب کا قول صادق آتا ہے۔ ؎

نثر نائی میں یہ شائستگی
امتزاجِ فکر و فن سے آئی ہے

رنگِ سوز سبز کی کتابت اور طباعت صاف ستھری اور سرورق سادہ مگر خوشنما ہے اس کتاب پر یو۔ پی اردو اکاڈمی نے مصنف کو ایک ہزار کے انعام سے بھی نوازا ہے۔

مشیر حسن خاں

نام کتاب :۔ روشنی کا سفر، شاعر :۔ حیات وارثی
صفحات ۹۶۔ قیمت : ۱۲ روپے۔
ملنے کا پتہ :۔ آل انڈیا ہندی اردو سنگم، باغ انوار لکھنؤ ۲۔

شاعری شعورِ حیات کی امین رہی ہے۔ اس نے فنونِ لطیفہ میں برگزیدگی اسی لیے حاصل کی ہے کہ یہ حیات و کائنات کے مختلف مسائل کو سلیقہ سے پیش کرنے کا سب سے بہتر راز جانتی ہے۔ بہت سی نیم و سنجیدہ کتابیں خواہ وہ کسی بھی صنفِ سخن اور ادب سے متعلق ہوں۔ ایک اچھے شعر کے سامنے اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہیں — اور اکثر شعر کے کسی جز کو عنوان بنا کر مصنف اپنی تصنیف میں جاذبیت پیدا کر دیتا ہے — لیکن اس کے لیے شاعر کا باشعور ہونا بھی لازمی ہے۔ خوشی ہے کہ زیرِ نظر تبصرہ مجموعۂ کلام کے شاعر جناب حیات وارثیؔ، شاعری کی غرض و غایت اور شعر کے تخلیقی عمل کے رازدار ہیں اور آج بھی دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کو اپنے فن سے حیات بخش رہے ہیں۔ بھلے قدیم و جدید کا بہت حسین سنگم "روشنی کا سفر" میں نظر آتا ہے۔ حیات وارثیؔ نے اس مجموعۂ کلام میں اپنی شاعری کے ارتقائی سفر کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری سے ابھی مزید امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اسی لیے کہ ان کا فن شاعری

جذبہ رنج ارتقا پذیر ہے اور یہ ارتقائی کیفیات فن و ادب کے لیے مثبت اقدار حیات و روایات کی حامل ہے۔

اس مجموعہ کلام کی سب سے بڑی صفت زبان و بیان ہے جہاں کہیں روزمرہ محاورہ نظم ہوئے ہیں بڑی خوبی اور دلکشی سے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ و یہ دبستان لکھنؤ کی بنیادی صفت رہی ہے جس میں ناسخ اور خلیق کا خون جگر بھی شامل ہے۔

کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ امید ہے کہ مجموعۂ کلام کی بے تحاشہ بھیڑ میں حیات وارثی کا یہ مجموعۂ کلام روشنی کا سفر جاذبیت اور افادیت کا حامل ثابت ہوگا۔ —— ڈاکٹر افضل امام

نام کتاب :- نوابی عہد کے ہندوؤں کی فارسی ادبی سرگرمیاں

نام مصنف :- ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستوا، ایم اے، پی ایچ ڈی

قیمت : ۲۵ روپے، ملنے کا پتہ : دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

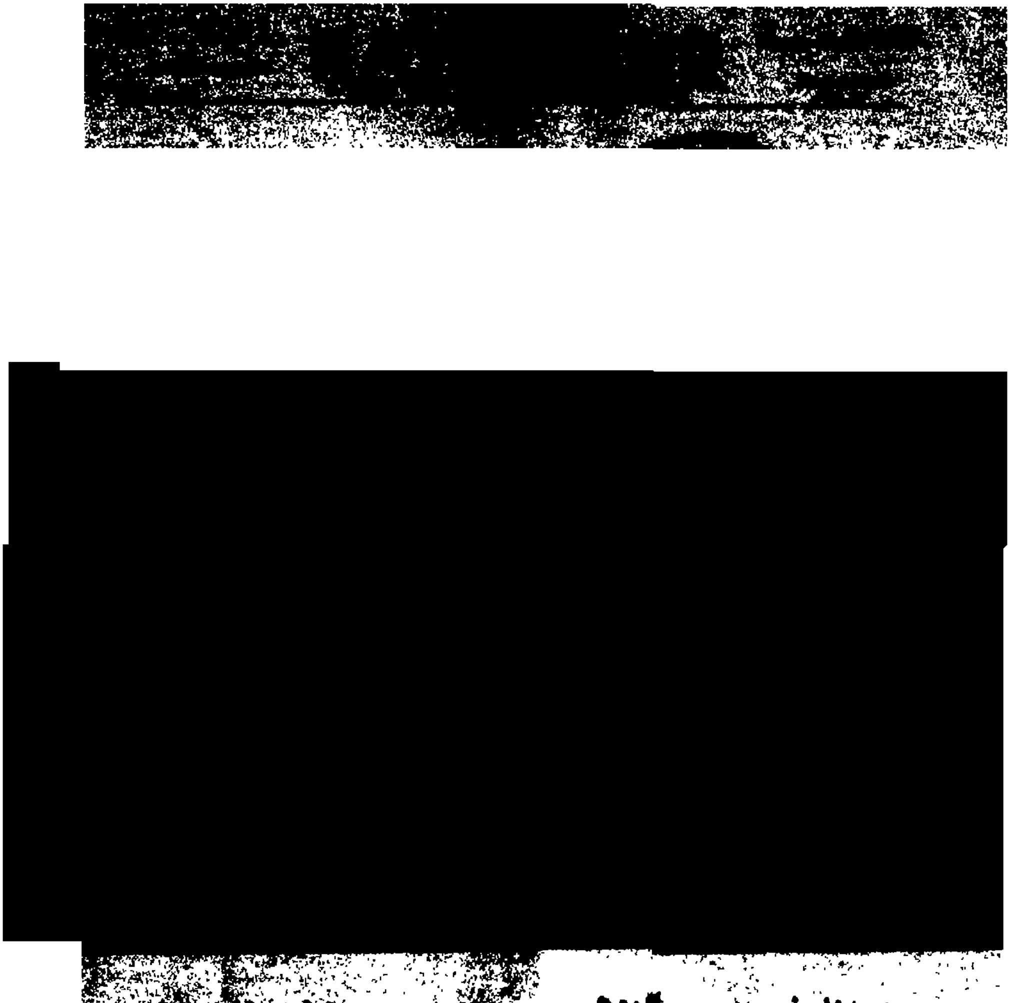
ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں فارسی یہاں کی سرکاری زبان تھی اس لیے مسلمانوں کے ساتھ اسے غیر مسلم برادران وطن بھی نہ صرف سیکھتے تھے بلکہ اس میں ادبی و تصنیفی کمال بھی پیدا کرتے تھے اور فارسی شعر و ادب کے سرمائے میں بیش قیمت اضافے کرتے تھے۔ مصنف نے نوابین اودھ کے دور کے ہندوؤں کی فارسی خدمات کا تحقیقی تعارف کرایا ہے اور ان کے مختصر تعارف کے ساتھ نمونۂ کلام بھی دے دیا ہے۔ شروع میں انھوں نے مغل دور سے پہلے کے فارسی ادب میں ہندوؤں کی خدمات کا بھی سرسری جائزہ لیا ہے جسے دیکھ کر خواہش ہوتی ہے کہ مصنف موصوف اگر اسی طرح بعد مغلیہ کثیر پیمانے پر ہندوؤں کے فارسی ادب کا جائزہ بھی مرتب کر دیں تو ایک اچھا کام انجام پا جائے۔ کتاب میں سنین کے مکمل تذکرے اور مزید تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کی تلافی آئندہ اڈیشنوں میں ہو جانی چاہیے۔ بہرحال کتاب بڑی محنت و تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے اور ایک ضروری موضوع سے تعلق رکھتی ہے نیز تاریخ و تبصرے اور سیر و سوانح سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید و معلوماتی حیثیت رکھتی ہے۔ —— شمس تبریز خاں

ٹیلی ویژن چاچی صفحہ ۴۵ کا بقیہ

ہو گیا اس دن ٹیلی ویژن چاچی بہت روئیں۔ سارے گاؤں کے لوگ ان کے گھر اکٹھا ہو گئے تھے۔ ٹیلی ویژن چاچی کا دکھ سارے گاؤں کا دکھ بن گیا تھا۔ "بابا" کی موت کے بعد ٹیلی ویژن چاچی اکثر اداس رہنے لگی — گاؤں کے لوگ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے لیکن ان کی صحت دن بدن گرتی گئی۔ پھر ایک دن وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ ٹیلی ویژن دیکھنے کی حسرت حسرت ہی رہ گئی۔

شہر کی بھیڑ بھاڑ میں جب میں نے ان کی موت کی اطلاع پائی تو چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں جمہوریت، سیکولرزم اور قومی یک جہتی پر پڑھے ہوئے مضامین ٹیلی ویژن چاچی کی زندگی کے سامنے بے معنی سے لگ رہے تھے۔ ایک خوف نے آ گھیرا۔ نہ جانے شہروں کا "سیکولرزم" کب ہمارے گاؤں کے سیکولرزم کو آلودہ کر دے؛ اب تو ٹیلی ویژن چاچی بھی نہیں رہیں۔

میں سوچ رہا ہوں کہ جب گاؤں میں ٹیلی ویژن آ جائے گا۔ تو نئی نسل کے پڑھے لکھے لڑکے اس موقع پر کیا ٹیلی ویژن چاچی کو یاد کریں گے



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۳۰ [illegible] ۱۹۸۲ء کو نئی دہلی میں
ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو کی پارلیمنٹ کے صدر ڈاکٹر واحد علی
سے محو گفتگو ہیں۔



نیا دور
اگست ۱۹۸۲ء

عنوانات

جلد ۳۷ نمبر ۵

اگست ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

پرنٹر: اشوک ورما

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

اپنی بات

ہمارے ملک کو غیر ملکی تسلط سے آزادی ملے اس سال ۳۵ برس ہو گئے۔ آزادی کی اس ۳۵ ویں سالگرہ کے موقع پر اترپردیش کے نئے وزیر اعلیٰ شری شری پت مشرا نے عوام کو یوم آزادی کی مبارکباد دیتے ہوئے بجا طور پر کہا کہ یوم آزادی کا تہوار ایک عظیم تہوار ہے۔ اس موقع پر اپنی کامیابیوں اور ملک و عوام کی توقعات کا صحیح طور پر جائزہ لے کر اپنے ملک کو طاقت ور اور خوش حال بنانے کے مقصد کی تکمیل کے لیے ہمیں خود کو وقف کر دینے کا عہد کرنا چاہیے۔

یوم آزادی کے موقع پر جاری کیے گئے اپنے پیغام میں وزیر اعلیٰ شری پت مشرا نے مزید کہا کہ ہمارا نصب العین بہت واضح اور روشن ہے اور ہماری جو پالیسیاں ہیں وہ بھی اسی کے مطابق ہیں۔ ہمیں اپنے پردیش اور اپنے ملک میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں سب کو یقینی طور سے سماجی و معاشی انصاف مل سکے۔ انھوں نے کہا کہ پردیش میں اس وقت جو معاشی نابرابری ہے اسے ختم کر کے سب کو ترقی کے مساوی مواقع مہیا کرنا آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں ہے لیکن تعاون و ایثار کے جذبے کے تحت ہمیں اس کے لیے خود کو وقف کرنا ہوگا۔ تبھی یہ کام ممکن ہو سکے گا۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وہ اس کام کی تکمیل کے لیے کمربستہ اور سرگرم عمل ہے۔ لیکن عوام کا تعاون بھی اس کے لیے نہایت ضروری ہے۔ عوام کے سرگرم تعاون کے بغیر یہ کام کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔

وزیر اعلیٰ نے یہ بھی اعلان کیا کہ ترقیاتی پروگراموں اور اسکیموں کو صحیح طور پر اور موثر ڈھنگ سے بروئے کار لانے کے لیے ترقیاتی بلاک کی سطح پر گاؤں پردھانوں، افسران اور ضلع کے دیگر عوامی نمائندوں کے سہ ماہی جلسے منعقد کیے جائیں گے۔ ان جلسوں میں عوامی نمائندے اور افسران باہمی طور پر ان پروگراموں اور اسکیموں کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا کریں گے اور ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے فوری فیصلے کریں گے جو ان کی عمل آوری کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک عوام میں تحفظ کا احساس نہ ہو، تب تک سماجی بہبود اور معاشی ترقی کے پروگراموں کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ چنانچہ عوام کو تحفظ فراہم کرنا اور ان میں تحفظ کا احساس پیدا کرنا کسی بھی حکومت کی اولین ذمے داری ہے۔ اترپردیش کی موجودہ حکومت اپنی اس ذمے داری کے تئیں نہ صرف یہ کہ حساس ہے بلکہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرگرم بھی ہے اور سماجی تحفظ کا ماحول تیار کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں سفید پوش مجرموں اور دیگر سماج دشمن عناصر کے خلاف سخت کارروائی کی جا رہی ہے اور ہمارے معاشرے کو شرپسند عناصر اور ڈاکوؤں سے پاک و صاف کرنے کے لیے پولیس نظم و نسق کو مزید مستحکم اور چاق و چوبند بنایا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انتظامی مشینری کو بھی چست بنانے کے لیے مثبت اقدام کیے جا رہے ہیں، تاکہ معاشی ترقی کے پروگراموں کو مقررہ مدت کے اندر ہی مکمل کر لیا جائے جس سے عوام تک ان پروگراموں کا فائدہ جلد سے جلد پہنچ سکے۔ اس کے علاوہ افسران کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے فرائض غیر جانبداری کے ساتھ انجام دیں، عوام کے تئیں حسن اخلاق کا مظاہرہ کریں اور ان کے مسائل قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے فوری طور پر حل کریں۔

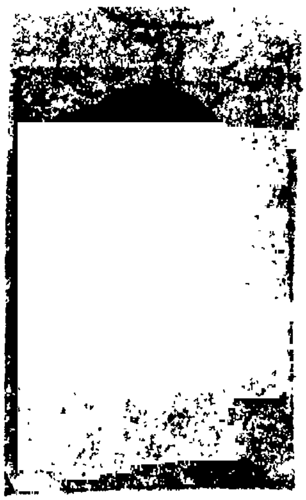
وزیر اعلیٰ شری شری پت مشرا نے کہا کہ نظم و نسق کا مقصد محض طور پر قانون کی حکمرانی قائم کرنا ہے اور جہاں کہیں بھی قانون کی وضاحت کی ضرورت پیش آئے گی، یہ وضاحت غریبوں کے مفاد میں ہی کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ غریبوں کا مفاد ہی موجودہ حکومت کا اہم مقصد ہے اور حکومت یہ بھی چاہتی ہے کہ عوام کا دکھ درد، پریشانیاں اور شکایتیں مقامی سطح پر ہی دور کر دی جائیں، تاکہ عوام کو اس سلسلے میں اپنے گھر سے دور جا کر بھٹکنا نہ پڑے۔ تمام ضروری اشیا عوام کو مسلسل دستیاب رہیں اس کے لیے موجودہ ریاستی حکومت نے تہیہ کر لیا ہے اور ضروری اشیا کی مسلسل دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے موثر اقدامات کیے جا رہے ہیں اور چور بازاری نیز ذخیرہ اندوزی کرنے والوں اور بدعنوان لوگوں کے خلاف سخت کارروائی بھی کی جا رہی ہے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ غریبوں، دبے کچلے اور کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانے، ان کا معیار زندگی بلند کرنے اور ان کی فلاح و ترقی سے متعلق تمام پروگرام اولیت کی بنیاد پر پورے کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس کا یقینی بندوبست بھی کیا جا رہا ہے کہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے نئے ۲۰ نکاتی پروگرام کے دائرۂ عمل میں شامل تمام اسکیموں کو مقررہ مدت کے اندر مکمل کر لیا جائے تاکہ غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی سماجی اور معاشی حالت کو جلد سے جلد بہتر بنایا جا سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہر زمرے میں پیداوار بڑھا کر وزیر اعظم کے اعلان کردہ اس پیداواری سال کے مقصد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

آئیے اپنی آزادی کی اس ۳۵ ویں سالگرہ کے موقع پر یہ عہد کریں کہ ہم ہر شعبۂ حیات میں ہر سطح پر باہمی اتحاد و اتفاق اور جذباتی ہم آہنگی کا ماحول قائم رکھیں گے اور فرقہ واریت، ذات پات، رنگ و نسل اور زبان کی تفریق سے بالاتر ہو کر اپنے پردیش اور دیش کی فلاح و ترقی اور خوشحالی کے لیے پورے جوش و خروش سے مل جل کر کام کریں گے۔ اور ترقیاتی اسکیموں نیز سرگرمیوں میں عملی طور پر بھرپور تعاون دیں گے۔ اسی اتحاد و اتفاق اور اشتراک و تعاون کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ہماری آزادی محفوظ رہے گی بلکہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔

—— ایڈیٹر

ہمارے نئے وزیر اعلا

شری شری پت مشرا



شری شری پت مشرا ۲۰ جون ۱۹۲۴ء کو موضع شیش پور، ضلع سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ شری مشرا نے سلطان پور، وارانسی اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد انھوں نے وکالت شروع کی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔

انھوں نے ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ اسکول، سلطان پور میں طلبا کے مسائل کے سلسلہ میں ۱۴ سال کی عمر میں بھوک ہڑتال کی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں پہلی بار سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انھوں نے لوک سبھا کے لیے الکشن لڑا۔

شری مشرا ۱۹۵۴ء میں جوڈیشیل مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور ۱۹۵۸ء تک سرکاری ملازمت میں رہے۔ اس کے بعد استعفیٰ دے کر کانگریس میں شامل ہو گئے اور دوبارہ وکالت شروع کر دی۔ کانگریس کے ٹکٹ پر وہ ۱۹۶۲ء میں ضلع سلطان پور کے کادی پور حلقہ انتخاب سے ودھان سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں سلطان پور کے جے سنگھ پور حلقہ انتخاب سے کانگریس کے ٹکٹ پر دوبارہ ریاستی ودھان سبھا کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اسی سال انھوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا اور بھارتیہ کرانتی دل میں شامل ہو گئے۔ شری مشرا جون ۱۹۶۷ء میں اتر پردیش ودھان سبھا کے ڈپٹی اسپیکر منتخب ہوئے۔ مئی ۱۹۶۹ء میں سلطان پور کے لوک سبھا حلقہ انتخاب سے ضمنی الکشن میں بھارتیہ کرانتی دل کے ٹکٹ پر لوک سبھا کے ممبر منتخب ہو گئے۔

شری مشرا ۱۸ فروری ۱۹۷۰ء کو کانگریس۔ بھارتیہ کرانتی دل کی مخلوط حکومت میں کابینہ کی سطح کے وزیر ہوئے اور اسی سال اتر پردیش ودھان پریشد کے ممبر منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۷۱ء میں بھارتیہ کرانتی دل سے استعفیٰ دے کر شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت والی کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء میں اتر پردیش ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیرمین مقرر ہوئے اور جون ۱۹۸۰ء میں ضلع سلطان پور کے اسولی حلقہ انتخاب سے کانگریس (آئی) کے ٹکٹ پر دوبارہ ودھان سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۷ جولائی ۱۹۸۰ء کو شری مشرا اتر پردیش ودھان سبھا کے بلا مقابلہ اسپیکر منتخب ہو گئے۔

ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں انھوں نے لوساکا (زامبیا) میں منعقدہ ۲۶ ویں دولت مشترکہ پارلیمانی کانفرنس میں شرکت کی اور اسی سال نیروبی، ماریشس، سیشلس اور کولمبو کا بھی دورہ کیا۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں انھوں نے سوا (فجی) میں منعقدہ دولت مشترکہ کی سطح کی ۲۷ ویں کانفرنس میں شرکت کی اور سنگاپور، آسٹریلیا، فجی، منیلا، ٹوکیو، ہانگ کانگ اور بنکاک کا دورہ کیا۔

نازش پرتاب گڈھی
بیگم وارڈ، پرتاب گڑھ

یومِ آزادی کا پیغام

گنگا کے دھارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو
رستے پر گھور اندھیرا ہے   پگ پگ سانپوں کا ڈیرا ہے
دشمن ٹھہرا پتہ پتہ   ڈال ڈال سے کھٹکا ہے
ہر پیڑ سے پھندا لٹکا ہے
دکھ درد کے بادل چھائے ہیں   گھٹاؤں کی بوچھار میں ہے
بھارت گرداب منجدھار میں ہے
اے کھیون ہارو! ایک رہو

یہ رات بڑی پاپن ہی سہی   بے درد سہی، بیرن ہی سہی
ہر جانب دشمن ہی دشمن   ہر سو تیر و نشتر ہی سہی
ہر ہاتھ میں اک خنجر ہی سہی
ساتھی ٹھہرے گمراہ مگر   اپنے بھی ہوئے بدخواہ مگر
کانٹوں سے بھری ہے راہ مگر
کیوں ہمت ہارو۔ ایک رہو

ایک لے پر باہیں بھی اٹھیں   اک ساتھ نگاہیں بھی اٹھیں
اپناؤ اک من موہن کو   اک الجھی زلف کو سلجھاؤ
اک مرکز پر سب آجاؤ
اور اک ذرا بھرپور کرو   یہ فرقہ پرستی دور کرو
ہر جانب نور ہی نور کرو
اے چاند ستارو! ایک رہو
تم اک دیش کے باسی ہو   اور اک دھرتی کے نواسی ہو
اشعار ہو ایک غزل کے تم   اک گیت کے بکھرے ٹکڑے ہو
سب ایک جگر کے ٹکڑے ہو

تم ایک گگن کے تارے ہو   اور اک ساگر کے دھارے ہو
اک مشعل کے اجیالے ہو
رستے کو سنوارو! ایک رہو

محفل میں رنگا رنگ رہو   میدان میں ایک آہنگ رہو
بکھرے ہو تو سچے موتی ہو   گندھ جاؤ تو سندر مالا ہو
دھرتی پہ پریم شوالا ہو
اک منزل ہو اک جادہ ہو   اک ساغر ہو اک بادہ ہو
تم سب کا ایک ارادہ ہو
نوکا پتوارو! ایک رہو

ہر منہ میں ایک زبان رہے   ہر جسم میں ایک ہی جان رہے
للکار بھی تم — جھنکار بھی تم   شعلہ بھی تمہیں تم ہی شبنم
اونچا رکھو اپنا پرچم
اک جانب اور اک ساتھ چلو   ڈالے ہاتھوں میں ہاتھ چلو
تم لے کر نورِ حیات چلو
اے راج دلارو! ایک رہو

تم کرشن کی مرلی کی دھن ہو   نانک اور چشتی کے گن ہو
سینوں میں پریم سجائے ہوئے   ہاتھوں میں لیے الفت کے دیے
ایک ایک بشر کو ساتھ لیے
جگ جیون کی سچے کار بنو   یکتا کے علم بردار بنو
یک جہتی کے اوتار بنو
لازم ہے کہ یارو! ایک رہو
گنگا کے دھارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو

جمیل مہدی
روزنامہ عزائم امین آباد
لکھنؤ

۱۸۵۷ء کی

جنگِ آزادی میں اترپردیش کا حصہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، دہلی کی مغل سلطنت کے نام پر لڑی گئی اور مغل حکومت کے احیاء کا مقصد اس کا مشترکہ مقصد قرار پایا۔ یہ وقت وہ تھا کہ سلاطین مغلیہ کا دائرہ اقتدار گھٹتے گھٹتے صرف لال قلعہ اور صرف خاص کی کچھ زراعتی زمینوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" کی کہاوت بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی سے کوئی ۵۰ برس پہلے ضرب المثل بن گئی تھی، لیکن اس میں اتنا دم خم باقی تھا کہ غلام قادر روہیلہ نے لال قلعہ کے خاص محل میں، شاہ عالم کے سینے پر چڑھ کر ان کی آنکھیں نکال لیں تو مرہٹہ سلطنت کا سردار مادھوجی سندھیا جس کے اسلاف مغلیہ سلطنت کے خلاف سترھویں صدی سے صف آرا تھے، مغل حکمراں کی بے عزتی سے اتنا برافروختہ ہوا کہ اس نے دہلی آکر غلام قادر کو قیمہ قیمہ کر دیا اور اندھے شاہ عالم کو دوبارہ تخت شاہی پر بٹھا دیا۔ شاہ عالم نے اپنے خطوط اور شاعری میں سندھیا کو جس محبت اور وارفتگی کے ساتھ فرزند دلبند کے خطاب سے مخاطب کیا ہے، وہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ مغل بادشاہ کے نزدیک سندھیا کے احسان کی کتنی قدر و منزلت تھی۔

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے وقت تک پگھلتے پگھلتے مغلیہ سلطنت کی شمع خاتمہ کے اس مرحلے تک پہونچ گئی کہ اس میں پورے لال قلعہ میں بھی اجالا کرنے کی سکت باقی نہ رہی اور کمپنی کی طرف سے پنشن کا روپیہ ملنے میں دیر ہوتی تو ظل سبحانی کے محل میں یہاں تک کہ مطبخ کے خرچ میں بھی اتنی دقت ہو جاتی کہ دہلی شہر کے بنیوں کے ہاں سے ادھار رسد منگانا پڑتی تھی۔ بلاقی مل بنیا اسی لحاظ سے بھی تاریخ کی مشہور شخصیت ہے کہ وہ بادشاہ کو ادھار دیا کرتا تھا۔

دوسری طرف لارڈ ڈلہوزی کی ریاستوں کی ضبطی کی پالیسی کی بدولت ہندستان بھر میں جو اس وقت علاقائی طور پر خود مختار ریاستوں، گورنروں اور پشتینی حکومتوں میں بٹا ہوا تھا، یہ احساس — غالباً بہت بعد از وقت — ابھر آیا تھا اور عام ہو گیا تھا کہ مغل سلطنت کے مرکزی اقتدار سے کٹ کر انھوں نے غلطی کی ہے اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں اور ریاستوں میں، خود مختار گورنروں کی آزاد روی اور مرکز سے بے تعلقی کی غلطی کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہو سکا کہ کمپنی کی حکومت خود مختار ریاستوں کو بکھری ہوئی مالا کے دانوں کی طرح چن چن کر اپنے پنجے میں آسانی کے ساتھ بھرتی چلی گئی۔

اس احساس کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ایک ایسے برائے نام بادشاہ کی سربراہی اور مغل اقتدار

کے نام پر لڑی گئی جس کا قبضہ لال قلعہ سے بھی اس کی زندگی کے بعد ختم ہونے والا تھا اور جو اس زندگی اور برائے نام حکومت کے زمانے میں اختیار کے لحاظ سے اتنا لاچار تھا کہ اپنے درباری شاعر مرزا غالب کو جوے کے الزام میں گرفتاری کے بعد... قلعہ کے بالکل سامنے چاندنی چوک کے تھانہ کے کوتوال کو پیہم خطوط کے بعد بھی قید سے رہائی دلوانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

انگریزوں کی حکومت کے خاتمہ اور کمپنی کے غیر ملکی اقتدار کے بجائے ہندستان پر ایک مضبوط مرکزی حکومت کے قیام کی ضرورت کے احساس نے ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سورماؤں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس جنگ میں مغل سلطنت کے اس نیلے جھنڈے کو آگے آگے رکھیں جس پر ابھرتے ہوئے سنہری سورج کا نشان تھا اور مدت سے میدان جنگ میں لہرانے کی قوت سے محروم ہو چکا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا مرکز شمالی اور مشرقی ہندستان تھا اور شمالی ہندستان میں بھی پنجاب، سرحد اور سندھ کی ریاستیں چند گنی چنی اور ناکام مقامی شورشوں کے علاوہ مکمل طور پر آزادی کی اس جنگ میں نہ صرف بے تعلق رہیں بلکہ کمپنی کی حکومت اور غیر ملکی فوجوں کی سب سے بڑی مددگار کے طور پر جنگ آزادی کے سورماؤں کے مقابل آکر لڑیں، ان کے علاوہ راجستھان کی تقریباً سبھی پرانی اور نئی ریاستیں، جن میں ٹونک اور وسطی ہندستان کی بھوپال کی مسلم ریاستیں بھی شامل تھیں، شورش سے الگ رہیں بلکہ انھوں نے فوجوں اور مال و دولت سے اس بغاوت کو دبانے میں حصہ بھی لیا۔

اگر نظر غور سے جائزہ لیا جائے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، عملی طور پر اتر پردیش کی انگریزی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد تھی، جس میں بہادر شاہ ظفر کی قیادت کو اسی طرح برائے نام استعمال کیا گیا تھا، جس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے انھیں شہنشاہ ہندستان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

جنگ آزادی کے تقریباً سبھی نامور کمانڈر، والیان ریاست، تعلقہ دار اور سیاسی رہنما اتر پردیش سے تعلق رکھتے تھے۔ میرٹھ جس نے جنگ آزادی کا جھنڈا سب سے پہلے بلند کیا اور جہاں سے باغیوں کا وہ پہلا دستہ دہلی کے لال قلعہ میں آیا جس نے بہادر شاہ ظفر کو جنگ آزادی کی سرداری قبول کرنے پر مجبور کیا، اتر پردیش کا ہی شہر تھا۔

تانتیا ٹوپے، ناناصاحب دھوندو پنت، عظیم اللہ خاں، بخت خاں، جھانسی کی رانی، لکشمی بائی اور اودھ کی مشہور عالم بیگم حضرت محل اور شہزادہ برجیس قدر سب کے سب یوپی ہی سے تعلق رکھتے تھے جن کا نام اور جن کا کام تاریخ جنگ آزادی کے روشن ابواب میں مدت تک پائندہ و تابندہ رہے گا

باندہ کے نواب احمد بخش اور قاضی عنایت علی شاملی کی جنگ کے سورما مولانا ضامن علی شہید، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور شاہ عبدالغنی اور جنگ آزادی کی وہ سب سے بڑی اور متحرک شخصیت مولوی احمد اللہ مدراسی جو محض سیاسی مصلحت کی بنا پر مدراس کے نام سے منسوب ہوئے تھے اور دراصل گوپامئو ہردوئی کے رہنے والے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا فضل حق خیرآبادی جنھوں نے بعد میں انڈمان کی سیاسی تاریخ کو اپنے نام سے رونق بخشی مادر ہند کے ان فرزندوں میں سے تھے جن کی پیدائش کا فخر اتر پردیش ہی کو حاصل ہے، کانپور کی مزاحمت اور لکھنؤ ریزیڈنسی بیلی گارد کا محاصرہ جدید دور کی جنگی تاریخ کے ان واقعات میں شمار ہوتے ہیں، جو اہمیت کے اعتبار سے ناقابل فراموش سمجھے جاتے ہیں۔

بیلی گارد کے محاصرہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس برٹش امپائر میں، جس کی وسعت کا یہ

حال تھا کہ جس میں کبھی بھی وقت سورج غروب نہ ہوتا تھا، فقط بیلی گارد کی گنبد نما عمارت کو یہ امتیاز اور فخر حاصل تھا کہ برطانوی اقتدار کا نشان — یونین جیک — اس پر چوبیس گھنٹے لہراتا رہتا تھا جبکہ سبھی سرکاری عمارتوں اور فوجی مرکزوں سے برطانوی جھنڈے، صبح کو لہرا جاتے اور شام کو اتار لیے جاتے تھے۔

جنگ آزادی کے سلسلے میں دو ناقابل فراموش اور بے مثال انسانوں کے نام اور ان کی قائم کردہ روشن روایتیں ایسی ہیں جن کی ہمسری دنیا کی تاریخ حریت میں اونچے سے اونچے مقام پر فائز اور عظیم جاں بازان حریت سے بھی آج تک ممکن نہیں ہو سکی، ان میں ایک نام جنرل بخت خاں کا ہے جو دہلی کے معرکہ کا ہیرو اور مرکزی افواج حکومت کا کمانڈر انچیف تھا۔

جس وقت بہادر شاہ ظفر کے سمدھی مرزا الٰہی بخش اور وزیر اعظم حکیم احسن اللہ اور انگریزی فوج کے کمانڈر میجر ہڈسن کے درمیان مذاکرات کے بعد، ہمایوں کے مقبرہ میں منعقد آخری جنگی کونسل کے بعد — جہاں جنگ آزادی کے آخری لمحے میں بادشاہ لال قلعہ سے نکل کر پناہ گزیں ہو گئے تھے، بہادر شاہ ظفر نے اس تجویز پر منظوری دی کہ وہ اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے حوالے کر دیں، تو تنہا بخت خاں ایسا جاں باز اور حوصلہ مند ہندوستانی نکلا جس نے اس تجویز کی مخالفت کی — اور یقین و اعتماد کے ساتھ اس نے بادشاہ سے کہا —

"ظل الٰہی! دہلی جنگی لحاظ سے لڑائی کے لیے مناسب مقام نہیں تھا۔ پھر یہاں بہت سے اسباب ایسے تھے جو جنگی سرگرمیوں میں رکاوٹ بنے۔ اور اس حالت میں بھی کہ دہلی کی لڑائی ہم ہار گئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ جنگ کا پانسہ ہمارے حق میں پلٹا جا سکتا ہے۔ اور میں ظل الٰہی کو بھی یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے دہلی کی جنگ ہاری ہے۔ میدان نہیں ہارا ہے، بندگان عالی دہلی چھوڑ کر خادم کے ساتھ روہیل کھنڈ تشریف لے چلیں تو وہاں انگریزوں سے لڑائی کے لیے مناسب میدان موجود ہیں جو یقین ہے کہ ہم غیر ملکی بندروں کو مار کر ہندستان سے نکال دیں گے۔"

اس حقیقت کے پیش نظر کہ دنیا کی جنگی اور سیاسی تاریخ، بے شمار 'اگر' اور 'لیکن' —— الفاظ سے بھری ہوئی ہے ہمیں نہیں معلوم کہ بہادر شاہ ظفر اگر اس وقت جنرل بخت خاں کی تجویز منظور کر لیتے تو جنگ آزادی کا انجام کس صورت میں سامنے آتا، لیکن اس باحوصلہ اور جواں مرد اور باہمت انسان کی یہ ایک جھلک، اس کی عظمتوں کے نقش دلوں پر قائم کر دینے کے لیے یقیناً کافی ہے، جو بہادر شاہ ظفر کی طرف سے اس جواب کے بعد ——

"جواں مرد! تیرے حوصلہ اور وفاداری میں کوئی کلام نہیں لیکن ہم نے اب اپنے آپ کو تقدیر کے فیصلہ پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔"

بے بسی، مایوسی اور لاچاری کے عالم میں سر جھکا کر ہمایوں کے مقبرہ سے باہر نکلا تو گمنامی کے پردہ میں ایسا روپوش ہوا کہ کسی کو آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں گیا اور اس کی باقی ماندہ زندگی کس حال میں بسر ہوئی اور اس کا انجام کیا ہوا — انگریزوں نے بخت خاں کا پتہ لگانے کی بہت کوشش کی لیکن انھیں بھی بجز افواہوں اور جھوٹی خبروں کے اور کچھ ہاتھ نہ آسکا۔

بخت خاں کے علاوہ جنگ آزادی کے ممتاز سپہ سالار نانا صاحب دھوندو پنت اور عظیم اللہ خاں بھی شکست کے بعد ایسے روپوش ہوئے کہ ہزار جستجو کے باوجود ان کا پتہ نشان ہاتھ نہیں آسکا۔

دوسرا بے مثال واقعہ راجہ کنور سنگھ کا ہے، جو اودھ کے جنگی محاذ آرائی کے ایک اہم رکن اور ہردوئی کے تعلقہ دار تھے اور فوج کے ایک حصہ کی کمانداری ان کے ذمہ تھی۔ ہردوئی کے معرکہ میں اس کی فوج گھر گئی اور فتح کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنی فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا اور اس کے حکم کے تحت سفید جھنڈے بلند کر دیے گئے لیکن سفید جھنڈوں کے بلند ہونے کے بعد جب انگریز کمانڈر نے خود راجہ کنور سنگھ سے ہتھیار طلب کیے تو اس جواں مرد نے نہ صرف ہتھیار حوالے کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایک ایسا جواب دیا جو وفاداری، بہادری، بے خوفی اور حب الوطنی کی تاریخ میں رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ ہتھیار حوالے کرنے کے اصرار پر اس نے جرأت کے ساتھ کہا۔

"یہ فوجی میری ماتحتی میں تھے، ان کی حفاظت اور خیر خواہی کا فیصلہ کرنا میرے اختیار میں تھا، انھیں ہلاکت میں ڈالنے سے میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ان کے حاکم کی حیثیت سے انھیں حکم دیا کہ وہ ہلاکت میں نہ پڑیں اور ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن میرا معاملہ تو دوسرا ہے۔ میں ہتھیار کیسے ڈال سکتا ہوں، میں تو برجیس قدر کی ماتحتی اور ملکیت میں ہوں اور مجھے حکم دینے کے لیے وہ یہاں موجود نہیں۔"

یہ کہہ کر اس جواں مرد نے تلوار کھینچی اور تنہا انگریز فوج پر حملہ کیا اور سیکڑوں گولیوں کی باڑھ میں آ کر فانا فانا مارا گیا۔

جنرل بخت خاں کی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی اور راجہ کنور سنگھ کی جاں نثاری، وفاداری اور بہادری ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سبق آموز اور بے مثال و روشن ابواب ہیں، اور یہ دونوں اتر پردیش سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ان جیالوں، جنگ آزادی کے نامور سورماؤں، کمانڈروں اور اہم سیاسی تنظیموں کے ناموں کی فہرست بہت طویل ہے جو زیادہ تر اتر پردیش کے جانباز فرزندوں کے نام رہتے ہیں۔

بہار اور بنگال کے جانباز ان حریت کا بھی حصہ جنگ آزادی میں کچھ کم نہیں۔ مثال کے طور پر علاقہ صادق پور جو صرف مملکت علم کے صدر نشین ہی نہیں دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے بھی متمول ترین جاگیرداروں میں شمار ہوتے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں ایسی تباہی اور برطانوی ظلم وستم کے اس بری طرح شکار ہوئے کہ ان کے مکانات اور املاک تک کھدوا کر زمین کے برابر کر دی گئیں۔ اور بنگال کی حریت پسند تحریک اور جنگی فنڈ، جس کا سلسلہ سید احمد شہید کی تحریک کے زمانے سے چل رہا تھا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے محاذ کے برابر کے شریک تھے لیکن ان کی حصہ داری اور شرکت منانی جیسے آگے نہ بڑھ سکی جبکہ جنگی محاذ کی قیادت اور رہنمائی کے اجتماعی کام میں اتر پردیش نے ہی والیان ریاست، حب الوطن جاگیرداروں، کمانڈروں اور سیاسی رہنماؤں نے ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اور یہ ان کی ہی فکر و دانش کا نتیجہ تھا کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جنگ آزادی کی تحریک میں ایک متحد ملک اور مرکزی اقتدار کے تصور نے پہلے درجہ کی اہمیت حاصل کی اور یہ اتر پردیش کے ہی جاں بازان حریت تھے، جنھوں نے یک جہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رفاقت اور اتحاد کا ایسا نمونہ اور ایسی مثال ملک کے سامنے پیش کی جو ہمیشہ قابل تقلید اور سبق آموز رہے گی۔

پھوٹ اور نفاق سے پارہ پارہ ہندستان کو فتنوں سے، زر اور مذہب کی تنگ خیالی سے بالاتر مرکزی قیادت کے تحت ایک مضبوط اور متحد ملک میں تبدیل کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ آگے چل کر قومی تحریک کے لیے نمونہ بنی۔ اور یہ ان ہی کے مقدس خون کا طفیل ہے کہ آج ہندستان میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قائم ہو اور دنیا کی سیاست میں آبرومندانہ کردار انجام دے رہی ہے۔

غلام ربانی تاباں
۲۲۰- ذاکر نگر نئی دہلی
۲۵-۱۱

غزل

لبوں کی جہد نوا در خورِ اثر نہ سہی
حدیثِ شوق بھی کیا کم ہے کارگر نہ سہی

نہ جانے کس کا لہو سنگ و خشت میں ہوگا
کسی کا گھر تو ہے آخر خدا کا گھر نہ سہی

قدم قدم پہ چمن پھر بھی کھل گئے ہوں گے
جنوں کی راہ بہاروں کی رہگذر نہ سہی

عجیب بات کوئی کہہ گیا ہے دیوانہ
کہیں تو شمع جلے بامِ طور پر نہ سہی

وہی حیات کی شورش، نمو کا ہنگامہ
گلوں کی بزم تو ہے ایک مشتِ پر نہ سہی

کہے ہیں جس کو فسوں سازیٔ غزل تاباںؔ
کسی کا خوابِ پریشاں سہی، ہنر نہ سہی

سلیم تمنائی
۵۰۰۵ پیر مکان عیدگاہ میسور

ڈاکٹر اقبال
مزار ٹیپو پر

سلطان ٹیپو کا وطن اور اقبال کا ترنم

گنبدِ سلطانی

گیارہ جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح گھڑی نے گیارہ بجائے اور ڈاکٹر اقبال جیسے بلند نظر اور سخن دلنواز اور جاں پرسوز کے حامل میر کارواں نے اپنے کاروانِ خاص کے ساتھ، میسور سے نکل برنداون کی سیر کی اور اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کی خاطر سری رنگ پٹن کی طرف قدم بڑھائے۔

دوپہر کو ایک بجے کا عمل ہوگا کہ کاروان منزلِ مقصود پر پہنچا، احاطۂ گنبدِ سلطانی کے صدر دروازے پر معزز مہمانوں کے موٹر رکے، نوبت بج رہی تھی۔ ع

نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

چپہ چپہ پر ایک عجیب جلال و دبدبہ طاری تھا۔ ڈاکٹر اقبالؒ نہایت ادب و احترام سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے دونوں طرف سرو کے پیڑ تھے۔ گویا کہ معزز مہمان کے اعزاز میں سلطان ٹیپوؒ کے سپاہی ہری وردی میں ملبوس جلال و جمال کا مظہر بنے کھڑے تھے۔

آخر کار وہ مقامِ آرزو آ ہی گیا جہاں اقبال کا دل کسی کی عظمت کے اعتراف کی خاطر دھڑکا۔ اشتیاق و عقیدت نے آنکھوں میں نمی پیدا کردی۔ چبوترے کی سیڑھیوں پر سب نے اپنے اپنے جوتے اتارے اور آگے بڑھ کر سنگِ سیاہ کے چمکدار ستونوں کے سہارے سنگ مرمر کا سفید گنبد دیکھا۔ دائیں جانب مغرب کی سمت مسجدِ اقصیٰ پر نظر پڑی۔ پھر گنبد کے جنوبی مشرقی برآمدوں میں سلطان شہیدؒ کے اہل خاندان اور دیگر افراد کے مزارات دیکھے۔ نواب رضا علی خاں شہیدؒ (نواب حیدر علی خاں کے ماموں زاد بھائیؒ) کے مزار کے کتبے کو غور سے دیکھا:۔

نام میں جا دۂ تاریخ حضرت ٹیپو سلطان مغفور
سو کہ رضائے رب۔
۱۲۱۳ھ

اس مادۂ تاریخ پر اظہار مسرت فرمایا۔

اب معزز مہمان روضۂ سلطانی کے مغربی دروازے کی طرف بڑھا۔ شیشم کا خوبصورت، منقش دروازہ اور اس کے اوپر دائیں، بائیں میر حسین علی کرمانی کے تاریخی مادے پڑھے اور جسے علامہ اقبال کے ایما پر چودھری محمد حسین نے سارے کتبے نقل کر لیے۔

اب روضۂ سلطانی میں اقبالؒ اپنے کارواں کے ساتھ با ادب داخل ہوا۔ اقبال نے دیکھا کہ دیواروں پر شیر ببر کے نشان ہیں انھیں شیر میسور کا وہ قول یاد آگیا جو آج بھی چار دانگ عالم میں مشہور ہے:۔

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

عود کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اور کسی کی یاد بھی چٹکیاں

لے رہی تھی۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے دیکھا کہ گنبد میں سنگِ سیاہ کے تین مزار ہیں۔ درمیان میں نواب حیدر علی خاں اور ان کے دائیں بائیں سلطان ٹیپوؒ اور ان کی ماں کے مزار ہیں، سلطان ٹیپوؒ کے مزار پر سرخ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ علامہ اقبالؔ مزار کے سرھانے بڑے ادب سے کھڑے رہے۔ فاتحہ پڑھا اور مدیر الکلام سید غوث محی الدین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"سید صاحب! میں روضۂ سلطانی میں مراقبہ کرنے والا ہوں۔ جب تک میں خود لوٹ نہ آؤں، مجھے کوئی نہ بلائے۔"

"بہتر ڈاکٹر صاحب!" مدیر الکلام نے جواب دیا۔

علامہ اقبالؔ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

کوئی ڈھائی بجے سہ پہر، روضۂ سلطانی کا منقش دروازہ کسی خوبصورت پرندے کے شاہ پروں کی طرح کھلا۔ عقیدت مندوں اور قدردانوں کی مشتاق نگاہوں نے دیکھا کہ علامہ اقبال، نڈھال نڈھال سے گنبد کے سنگِ سیاہ کے ستون کا سہارا لیے کھڑے ہیں۔ اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیپ سے آنسوؤں کی شکل میں موتی مچل مچل کر نکل رہے ہیں۔ ان خوبصورت موتیوں کی حقیقت کو جاننے کے لیے عوام و خواص بالکل آنسوؤں کی طرح مچل رہے تھے۔

گنبدِ سلطانی اور مسجد اقصیٰ کے درمیان صحن میں ڈاکٹر اقبالؔ کی نشست کا انتظام تھا۔ علامہ اقبالؔ اپنے جلال و جمال کے ساتھ اپنی نشست پر جلوہ فرما ہوئے۔ مطربِ خوشنوا علی جان صاحب شانؔ (درباری گویّے) نے اپنا بوٹا سا حسین و متناسب قد لیے آرکسٹرا کے ساتھ علامہ اقبالؔ کا استقبال کیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں جیسے چل نہیں رہی تھیں بلکہ آپس میں ہنستی مسکراتی شریر نٹ کھٹ سکھیوں کی طرح چہلیں کرتی، چٹکیاں لیتی اپنے محبوب، اپنے اقبالؔ کی آمد کا مژدۂ جانفزا پتے پتے، بوٹے بوٹے کو دے کر خوشی سے کھلکھلا رہی تھیں۔ ہنوا کی ڈال پر کوئل کوک کر سب کو زندگی کا شیریں احساس دلا رہی تھی۔ خوشنوا مغنّی نے راگ چھیڑا، دل کے تار جھنجھنا اٹھے۔ اب کوئل بھی ہمہ تن گوش تھی۔ یہ راگ سلطان ٹیپوؒ کی تعریف و توصیف اور کارناموں کے بیان سے پُر فضا میں گونج رہا تھا۔ اس سماع نے ایک عجیب سماں باندھا۔ ڈاکٹر اقبالؔ پر رقت طاری ہو گئی۔ کبھی آپ کا چہرہ سُرخ ہو جاتا اور آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سُرخ ہو جاتیں اور کبھی آنکھوں کا گنگا جمنی سیلاب جاری ہو جاتا تھا۔

راگ نے دم لیا۔ اور نواب غلام احمد کلامی نے فرمایا، علی جان صاحب شانؔ، آپ کے شایانِ شان کچھ اور کچھ ـــ اور

گویا وہ کہہ رہے ہوں کہ ساقیا ایک جام، اور ایک جام

اور، اس پر علی جان شانؔ نے نہایت ہی سوز و گداز سے علامہ اقبالؔ کا نغمہ ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

چھیڑا۔ نغمہ ہی نہیں سازِ دل کے تار چھیڑ دیئے اور ایک تصویرِ درد کھینچ گئی۔

سامعین کے جذبات پہلے ہی سے برانگیختہ تھے اور دلوں میں یاس و حسرت اور درد و غم کا طوفان بپا تھا۔ اس نظم نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ سامعین کی حالت متغیر ہو گئی۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ خوشنوا مطرب کی یہ راگنی کچھ دیر اور قائم رہی کہ سامعین نے اپنا گریباں چاک کیا۔ یہ دیکھ کر نغمہ سرا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

ہر کوئی خاموش تھا کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ بول ہی بول لیتا۔ محسن الملک محمد ابا سیٹھ بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ اللہ رے جگر ان کے جگر کا۔ علامہ اقبالؔ کے قریب ہو بیٹھے۔ اور نہایت ادب و احترام سے بولنے کی جسارت کی۔

"ڈاکٹر صاحب! فرمایئے اتنی دیر روضۂ سلطانی میں مراقبہ رہا۔ یقیناً کوئی پیغام ملا ہو گا، کیا ملا بھلا؟"

"پیغام"! ڈاکٹر اقبالؔ کے ہونٹ دھیرے دھیرے وا ہوئے۔ ہر کسی کے کان تیز ہوئے۔ آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔ کیونکہ

جب بھی جنکھڑیوں نے انگڑائی لی۔ پھول مسکایا اور مہکا، دل و دماغ کو زندگی عطا کر گیا۔

پھول جھڑنے کی متوقع و منتظر آنکھیں اس امید پر بھی شاد تھیں کہ ابر نیساں سے گرا قطرہ سیپ میں سما' موتی بن کر ہی نکلتا ہے۔ در شہوار کی منتظر تھی نگاہیں۔

"پیغام؟ سیپ نے اقبال کا روپ اختیار کر لیا۔ ہاں بھی ملا ہے؟"

"بھلا کیا؟" محمد ابا سیٹھ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ اور ان کی آنکھیں پیغام کے کوہ نور کی خاطر پلکیں جھپکانا بھول گئیں۔

"پیغام تو بہت سے ملے ہیں۔" ڈاکٹر اقبال کے شیدائیوں نے تصور میں موتیوں کا ہمالہ دیکھا اور در شہوار کی آس لگائے بیٹھے رہے۔

لیکن علامہ اقبال نے "منیاں مٹر جرے اپنے جھکاتے ہوئے کہا۔ ایک پیغام شعر کی صورت میں عالم طواف میں ڈھل گیا ہے۔ سہ

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

جناب صادق شاہ سکریٹری مہاراجہ میسور اب آگے بڑھے تو مدیر اسلام سید غوث محی الدین نے ڈاکٹر اقبال سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! جناب صادق شاہ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو مطلع کر دوں کہ دریا دولت باغ میں سرکاری طور پر ڈاکٹر صاحب اور معزز ساتھیوں کے لیے لنچ کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ پکوان ٹھنڈے ہو رہے ہیں لیکن میں نے شاہ صاحب سے معذرت چاہی اور آپ کو اطلاع دینے کی جرأت بھی نہ کی کیوں کہ آپ نے منع فرمایا تھا۔

ہاں جی! ڈاکٹر اقبال نے فرمایا۔ اچھا کیا آپ نے سید صاحب!"

اب کارواں، میر کارواں کے ساتھ دریا دولت باغ کی طرف بڑھا۔

دریا دولت باغ

دریا دولت باغ، سلطان کا دیوان عام تھا۔ عدل و انصاف اور سلطنت کے انتظامی امور کا فیصلہ سلطان اسی دیوان میں بیٹھ کر فرماتا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے اور اس کے چپے چپے پر نقش و نگار کا فن بام عروج پر ہے۔ اس عمارت کی دیواروں پر ڈاکٹر اقبال نے معنی خیز اور فن مصوری کے لاجواب نمونے، تصاویر کی صورت میں دیکھے۔ ان میں بعض سلطان کے حکم سے بنائی گئی تھیں۔ اور شہادت سلطانی کے بعد باقی تصاویر کرنل آرتھر ولزلی نے کھنچوائیں۔

"اس محل میں ڈیوک آف ولنگٹن دو سال رہا" کسی نے ڈاکٹر اقبال کو بتایا۔ "وہ لکھتا ہے کہ "جنت ارضی یہیں ہے۔ اور سیاح رئیس کو دریا دولت باغ دیکھ کر اصفہان کے محل یاد آگئے۔ اس کی نظر میں اس قدر منقش و دل فریب عمارت عام ہندستان میں اور کہیں نہیں ہے۔"

"اللہ کی شان عجیب مرد حق بیں تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے محل سے نکلتے ہوئے کہا۔ "حیدر علی خاں" اور سلطان شہید کے جنگی مرقعے بہت خوب ہیں۔"

"ڈاکٹر اقبال نے دریائے کاویری کی طرف دیکھا۔ جو پاس ہی رواں دواں تھا۔ اس میں موجیں اٹھتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ دریائے کاویری معزز مہمان کو دیکھنے کیلئے اچھل رہا ہے۔ جیسے شائقین اکثر جلسوں میں اپنی اپنی کرسی سے اٹھ اٹھ کر پاؤں کے پنجوں کے بل حضرت اقبال کو دیکھنے کی کوشش کرتے تھے

علامہ اقبال کچھ دیر دریا کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ دریا جو سلطان ٹیپو کو جیحون و فرات سے زیادہ پیارا تھا۔

"ہمارا خیال تھا۔" ڈاکٹر اقبال نے اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اورنگ زیب ہی ایک ایسا مسلم شہنشاہ تھا جس پر

[illegible] ہیں کہاں [illegible]
[illegible] ایک بہت بڑی بلند پایہ
اور اسلام دوست [illegible] کے سامنے شہنشاہ
اورنگ زیب کے کارنامے ہیچ ہیں۔

جناب صادق بختا۔ کا امداد بھر ٹھنڈی ہوا سے یہ ڈر
تھا کہ سارا اچھا کیا یا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ اور اس طرح مزا
کرکرا ہو۔ میزبان کو خفت و ندامت ہو۔ جینے اور حرکت کے
لیے کھانا ضروری تھا۔ جب پارٹی حرکت میں آگئی تو جماعت
میں برکت آگئی۔

مسجدِ اعلیٰ

معزز مہمان "مسجدِ اعلیٰ" پہنچا۔ مقدس میناروں نے حضرت
اقبال کا استقبال کیا اور اپنی بلندی کی دید کی پہنایاں
خوشی التجا کی۔ چکردار تنگ تنگ سیڑھیوں نے بلندی پہنچایا۔

علامہ اقبال نے محراب مسجد پر بنائے ہوئی مسجد کا تاریخی
کتبہ ملاحظہ کیا۔ دوسرے کتبے کو اسمائے حسنیٰ اور تیسرے کو
رسول مقبول کے ننانوے نام سے مزین پایا۔ کتبے نقل
کرواتے ہوئے سلطان کے حضور میں یوں خراجِ تحسین
ادا کیا۔

"عجیب آزاد مرد تھا سلطان ٹیپو۔ ہندوستان کا آخری
سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس قدر جلد
فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی
ہندوستان میں اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر
ہم جیسے بظاہر زندہ لوگوں کی بہ نسبت زیادہ تازگی رکھتی
ہے۔ مجھے نہایت خوشی ہو گی اگر ٹیپو سلطان شہید کے نام سے
ایک اعلیٰ اور بڑے کا [illegible] تربیتی مرکز قائم کیا جائے۔"

یہ تاثر سمیٹے آگے بڑھا تو قلعہ، صدر دروازہ اور
[illegible] دروازہ دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور اس جگہ پہنچا جہاں سب
کو [illegible] کیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سلطان ٹیپو نے آخری

[illegible] سے [illegible] کی [illegible] جائے [illegible] دشمن [illegible]
[illegible] آزادی کی پھر [illegible] پڑی [illegible] ہیں [illegible] کو
[illegible] میں یہ آزادی کا سودا سستا [illegible] تھا۔ یہاں اس کے [illegible] کی
بھرنگ گئی ہندوستان کے ماتھے پر۔

کرنل ہارس ہاتھ میں مشعل لیے شیر کی لاش کو ڈھونڈ رہا ہے جب
لاش پائی تو آنکھیں نیم وا تھیں اور جسم گرم۔ وہ ایک منٹ کے لیے
سہم گیا کہ شیر اب جاگا کہ تب۔ لیکن جب اس بات کا یقین ہو گیا
کہ شیر گیدڑ کی صد سالہ زندگی کے مقابلے میں ایک دن کی زندگی کو
گلے لگا چکا ہے۔ تو وہ فرطِ طرب سے چیخ پڑا۔ ناچ اٹھا کہ "آج
ہندوستان ہمارا ہے"۔

ڈاکٹر اقبال نے سلطان کا شکستہ محل دیکھا۔ اس کے عین
مقابل رنگا سوامی کا مندر تھا۔ دو چار اور مندر بھی۔ اذان کے ساتھ
ناقوس کی آواز بھی کانوں میں آتی تھی۔ مگر اس پاک طینت انسان
اور مردِ مومن کی کشادہ پیشانی پر کبھی بل نہ آئے۔ سلطان کی عطا
کردہ چیزیں آج بھی مندروں میں استعمال ہوتی ہیں۔

اپنے تو اپنے غیروں کے ساتھ بھی سلطان کا طرزِ عمل عین
اسلامی و انسانی رہا۔ سلطان کے اس آفاق گیر انسانیت نوازی
کے تصور نے اقبال کی آنکھوں میں عقیدت کے مہینے مسکراتے آنسو
بھر دیئے۔ وہ سلطان کی زندۂ جاوید ہستی کے بارے میں سوچنے لگا۔
ایسے انسان مرتے کہاں ہیں، آنکھوں سے اوجھل ہو کر دلوں میں
بس جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نے ایک عجیب و غریب قید خانہ دیکھا جس میں
ایک بڑی سی توپ چھت پھاڑ کر زمین پر پڑی تھی۔ انگریزوں نے
ایک بیہودہ روایت گڑھ رکھی تھی کہ اس قید خانہ میں مشہور ڈاکو
ڈونڈیا واگیہ سلطان کے ہاتھوں قید تھا جس نے سلطان کی
شہادت کے بعد پورے پانچ سال انگریزوں کو ناک چنے
چبوائے۔

اقبال نے آگے بڑھ کر ایک اور گارے کی ایک عجیب و
غریب کمان دیکھی جس پر چڑھنے سے پہلے نکلتی تھی۔ گویا کہ اسپرنگ

[illegible] سلطان [illegible]
[illegible]
[illegible] ماحول کی [illegible] سلطنت سلطانی کے اس
[illegible] فرانسیسی ہیز منڈ ۱۸۰۰ء میں اپنا ساڈھیز اس
مکان کی صورت میں [illegible] گیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" مدیر الکلام نے بتایا۔ "یہ شہر بڑا آباد شاد تھا۔ میجر ڈیرام رقمطراز ہیں کہ :-

"ہندوستان کا عروس البلاد اس زمانے میں سب سے متمول، سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ سکون بخش خطۂ زمین ہے۔"

یہ قافلہ جب سلطان ٹیپو کے جان نثار سپہ سالار سید غفار شہید کے مزار پر پہنچا تو فاتحہ خوانی کے بعد علامہ اقبال نے مدیر الکلام[سلہ] کلیم الملک سید غوث محی الدین سے کہا۔

"سید صاحب! آپ اس شہید نامور کی یادگار (پوتے) ہیں۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ آپ کے ہاتھ میں قلم ہے اس سے کام لیجئے۔"

حضرت اقبال سید غوث محی الدین سے بغل گیر ہو گئے۔
ڈاکٹر اقبال کی اکثر خموش بد دیش اور چھلکتی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی اپنے میکے سے لوٹ رہی ہے۔ بابل کا گھر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ بڑی اور روشن آنکھوں کا معاملہ

[illegible]

ماخذات :- روزنامہ الکلام [illegible] روزنامہ [illegible] نیا دور لاہور (۱۹۳۹)، علامہ اقبال کی [illegible] میں چند روز، مدیر الکلام + انوارِ اقبال، ذکرِ اقبال، سلطنتِ خداداد، روزگارِ فقیر، کلیاتِ اقبال، [illegible] نامہ، علامہ اقبال کے سفر کے دل چسپ حالات، از ممتاز حسین لستن، ۱۹۲۹ء: میسور گزیٹیئر [illegible]۔

خطوط بنام راقم :- مولانا غلام رسول مہر، فقیر سید وحید الدین، عابد رضا بیدار۔

راقم کے مضامین :- (۱) خطوط کے آئینے۔ مطبوعہ نقوش خطوط نمبر (۲) اقبال خطوط کے آئینے میں، مطبوعہ شیرازہ اقبال نمبر، (۳) دانائے راز، دیارِ ٹیپو میں۔ مطبوعہ شاعر، اقبال بارگاہِ ٹیپو میں۔ (۴) مطبوعہ ادبی دنیا لاہور۔ نشیمن اقبال نمبر

شخصیات :- محسن الملک محمد ابا سیٹھ، کلیم الملک سید غوث محی الدین، مدیر روزنامہ الکلام، صادق زرگر شاہ، سکریٹری مہاراجہ میسور، علی جاوید خاں، محمود خاں محمود، مصنف سلطنتِ خداداد۔

سلہ پیسمدھان پروفیسر عبداللہ چغتائی، چودھری محمد حسین، نواب غلام احمد کلامی، کلیم الملک سید غوث محی الدین مدیر الکلام، محسن الملک محمد ابا سیٹھ، جیسے افراد پر مشتمل تھا۔
سلہ کرشنا راج ساگر باندھ کے باغات۔
سلہ میر حسین علی کرمانی ولد عبدالقادر کرمانی متخلص حاکم مصنف نشانِ حیدری (فارسی) تذکرۃ البلاد والاحکام (فارسی) مرثیہ سلطان شہید (اردو) نیز فقرات قلمی (اردو) تجنیس اللغات (قلمی اردو) مصنف نواب حیدر علی خاں اور سلطان ٹیپو کا میر منشی اور واقعہ نگار تھا۔
سلہ لاہور پہنچنے کے بعد علامہ اقبال نے مزید چار شعر کہے اور ۱۲ مارچ ۱۹۲۹ء کے انقلاب لاہور میں شائع فرمائے۔ [illegible] مدیر الکلام [illegible] ابا سیٹھ کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے۔
علامہ اقبال مرحوم نے چند اشعار مرحمت فرمائے تھے۔ جن میں پہلا شعر وہی تھا جو آپ نے نقل کیا ہے [illegible]

وہ جب سلطان شہید کا ایک قول نظم کر دیا تھا۔ اس پر شہید سعید نے مجاہدانہ انداز میں عمل کیا تھا
اشعار ملاحظہ ہوں

آتشے در سینہ دل گیرے کردہ ام — داستانے باز دکن آوردہ ام
در کنارم خنجرِ آئینہ فام — کہ کشم او را بتدریج از نیام
نکتہ گویم ز سلطانِ شہیدؒ — ترسم کہ تلخ گردد روزِ عید
پیشِ او رفتم کہ بوسم خاکِ رہ — تا شنیدم از مزارِ پاک رہ

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

(ترجمہ:۔ میں دکن سے ایک داستان لے آیا ہوں جس نے میرے دل میں ایک آگ لگا دی ہے۔ حرارت پیدا کر دی ہے۔ میرے پہلو میں آئینے کا سا خنجر ہے جسے میں آہستہ آہستہ نیام سے نکال رہا ہوں۔ سلطان شہید کا بیان کیا ہوا ایک نکتہ عرض کیے دیتا ہوں۔ مجھے خوف اس بات کا ہے کہ کہیں عید کی خوشیوں اور مسرتوں میں تلخی کا رنگ نہ بھر جائے۔ جب میں شہید کے مزار اقدس کو بوسہ دینے کی خاطر وہاں تک پہنچا تو شہید کے مزار پاک سے آواز آئی کہ "زندگی دنیا میں مردوں کی طرح جینے کا نام ہے۔ ایسا ممکن نہ ہو تو مردانہ وار جان قربان کر دینا ہی زندگی ہے۔)

نوٹ:۔ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں یہ نظم نہیں، انوارِ اقبال میں اس نظم کا فوٹو چھپا ہے۔

۱؎ جنگی مرقعوں کو اقبال نے خصوصیت کے ساتھ دیکھا اور ان کی بہت تعریف کی۔ (روزنامہ الکلام ص ۳۹)

۲؎ اس کے راوی کلیم الملک سید غوث محی الدین مدیر الکلام ہیں جو اس سفر میں اقبال کے ساتھ رہے۔

۳؎ علامہ سر محمد اقبال کی رفاقت میں چند روز : از مدیر الکلام۔

نوٹ: اقبال نامہ دوم میں ڈاکٹر اقبال کا ایک خط جو سیرت اقبال سے نقل ہے درج کیا گیا ہے جو کسی میجر کے نام ہے۔ آپ کے نام منسوب ایک فوجی اسکول قائم کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے میجر کو لکھا:۔

"ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو موسوم کرنا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی اسکول کا نام ٹیپو فوجی اسکول رکھیں۔ ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں چلتے ہوئے میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔"

۴؎ چونکہ ٹیپو سلطان وہ دوست پسند کا حامی ہے اس کا ہم عصر دوست نپولین ہمیشہ ہوتا۔ (اعجاز صنعت میسور گزیٹیر بحوالہ سلطنت خداداد)

۵؎ صاحب موصوف نے راقم کو ایک نظم عطا کی جس میں اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے۔

شاہ اقبال نے جب چاہا کہ دیکھے ٹیپو — جس کو حاصل ہے جہاں میں جو سیادت کا تاج
آ کے تربت پہ یہ فرمایا — میں ہوں تیرا سا شجاع جس نے جہاد کو چھیڑا

[illegible]
شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں
جموں و کشمیر

ماتمِ یک شہرِ آرزو

بیاضِ جاں ہے فسردہ فضائے دل ہے خموش　　اٹھاؤ جام رفیقو! بنامِ حضرتِ جوشؔ
گیا وہ شعلہ و شبنم کا امتزاجِ لطیف　　فنا پذیر ہوئی محفلِ سرود و خروش
وہ "آج کل" کی مجھے بزم یاد آتی ہے　　چہکتی بولتی محفل کہ ہو چکی ہے خموش
ترا سخن مرے کانوں میں گونجتا ہے ابھی　　وہ نغمگی، وہ حلاوت، وہ طنطنہ، وہ خروش

کبھی کبھی یہی لے تھی مثالِ موجِ نسیم
کبھی کبھی یہی لے جیسے بادۂ سرجوش

گئے فراق بھی، احساں بھی ہوئے رخصت　　تمام ساز بہ یک وقت ہو گئے ہیں خموش
تڑپ جو برق میں پنہاں تھی سو گئی آخر　　اجل نے کتنی محبت سے وا کیا آغوش
زمانہ تو بھی عجب شے ہے کیا کہیں تجھ سے　　اِدھر تو جام بدست اور اُدھر جنازہ بدوش
ترے مزاج کا اب تک پتہ چلا نہ مجھے　　ترا مزاج بشر کے لیے ہے نیش کہ نوش
کچھ اس کی بھی ہے خبر میکدے پہ کیا گزری　　چلے گئے ہیں جو اُٹھ اُٹھ کے مستِ بادہ دوش
وہ لوگ آج نگاہوں سے چھپ گئے ہیں تو کیوں　　کہاں ہوئے ہیں وہ روپوش کیوں ہوئے روپوش
بیان جن کا مثالِ بیانِ حسنِ ازل　　نوائے شوق کچھ ایسی کہ جو نوائے سروش
تمام عمر رہے گا مزن جو کانٹوں پر　　مگر تھیں جن کے تصور میں وادیاں گل پوش
بہشتِ عقل میں تازہ چمن کی طرح تھے جو　　مگر ہجومِ معانی سے [illegible]

چراغِ انجمنِ حیرتِ نظر تھے وہ لوگ
جو آج پردۂ دل میں ہیں مثلِ داغ خموش

اگست [illegible]

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں اپنی معارف پروری، ادب نوازی اور علم دوستی نیز اعلیٰ قابلیت کے باعث علمی حلقوں میں کافی مشہور و ممتاز ہیں۔ مومنؔ، غالبؔ، مفتی صدرالدین آزردہؔ، ذوقؔ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا امام بخش صہبائی ان کے ہم عصروں میں شامل ہیں۔ سرسید مرحوم ان کے اوصاف حمیدہ کے متعلق فرماتے ہیں:

"سخن شناس و سخن داں، نکتہ سنج و نکتہ داں، اخلاق و خصائل میں بہت افزائے سعادت اور حاتم کرم، ادراک مراتب علمی و قابلیت میں بدر منیر و ماہ تاباں، تقویٰ و طہارت اور عبادت میں زاہد شب زندہ دار ہیں۔"

ان کے والد محترم نواب مرتضیٰ خاں بہادر فرخ سیر کے عہد حکومت میں افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ شیفتہؔ اور مظفر جنگ نواب محمد خاں بنگش والئی فرخ آباد ہم جد تھے۔ نواب مرتضیٰ خاں نے مہاراجہ ہلکر، نواب امیر خاں فرمانروائے ٹونک اور جنرل لارڈ لیک کے ساتھ بڑے بڑے معرکوں میں شرکت کی۔ ان کی جنگی خدمات کا صلہ انھیں تین لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر کی صورت میں عطا ہوا۔ جہانگیر آباد کا علاقہ شیفتہؔ کے والد ماجد نے ان کے نام سے ۱۸۰۲ء میں خرید کیا تھا۔ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں شامل ہے۔

شیفتہؔ ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم پائی۔ امرا کی زندگی میں حسن پرستی اور شراب و کباب کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ شیفتہؔ بھی ان چیزوں سے محفوظ نہیں رہے لیکن جوانی ختم ہوتے ہی انھوں نے توبہ کر لی اور ۱۸۳۹ء میں مقامات مقدسہ کی زیارت کو گئے۔ حج کے بعد انھوں نے پاک و صاف زندگی بسر کی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

اے شیفتہؔ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

سرسید نے جس تقویٰ و طہارت . اور خدا پرستی کا ذکر کیا ہے وہ زیارت کے بعد کے زمانہ ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شیفتہؔ نے بڑی بے جگری سے حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں انھیں سات سال کی سزائے قید دی گئی۔ سید اسحاق حسینی بریلوی نے ترجمہ گلشن بیخار کے تعارف میں لکھا ہے کہ انھوں نے سات برس تک قید فرنگ کی تکالیف برداشت کیں ان کے سارے سرکاری وظائف بند کر دیے گئے اور آدھی جاگیر بھی ضبط ہو گئی۔ وہ احتیاط کے طور پر اپنے دوست عبداللطیف خاں [illegible] کے یہاں چلے گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ...... نے جہانگیر آباد کو لوٹ کر محلات میں آگ لگا دی تھی جس میں ان کا کتب خانہ بھی نذر آتش ہو گیا۔ [illegible] کی فوج نے جو تگ و دو سرگرمی کے لیے کیا ہی تھی ...... [illegible] کر مصطفیٰ خاں کو دوبارہ قبضہ دلایا

یہ مشہور تھا کہ شیفتہ قید فرنگ کی حمایت سے بچ گئے تھے انھیں اپنی جان پیاری کہا گیا تھا۔

غالب اور شیفتہ کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔ غالب کو ان کے خلوص پر فخر تھا جب غالب گرفتار ہو کر جیل گئے تو شیفتہ ان کی خبرگیری کرتے رہے، غالب نے ایک نظم میں اس کا اعتراف کیا ہے۔
شیفتہ نے ۶۳ برس کی عمر میں بہ عارضۂ فالج ۱۸۶۹ء میں وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان میں، جو درگاہِ نظام الدین میں واقع ہے دفن ہوئے۔

غالب شیفتہ کی انتقادی صلاحیتوں کے معترف ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

انھوں نے ایک طویل نظم بھی لکھی ہے جس میں شیفتہ کی قابلیت اور دوسرے اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔

دست رد بر تاج قیصر می نہم
پشت پا بر تخت خاقاں می زنم
ذرہ می گردید بر من قدسیاں
گر نفس در مدح سلطاں می زنم
آں ہمائے تیز پروازم کہ جاں
در ہوائے مصطفیٰ خاں می زنم
عرفی و خاقانیش فرماں پذیر
سکہ در شیراز و شروان می زنم
از تو آمد مست و من جا کش دار
بانگ بر احرام داراں می زنم
گلشن کویش گزرگاہ من است
دوش دور رفتن بہ رضواں می زنم
خوبیٔ خویش بہ آئینہ می بستہ
دم زیارت کہ می زنم پیماں می زنم

ہر روزی بین کہ باستم ہم قفس
من کہ زنہ از چینی در بیاں می زنم
بشنو دے اہل کہ باد آں روح پرور
تا زگرد در کنج زنداں می زنم
میگر دے آں کہ کلک آں کند
نقش گوہر صفحۂ جاں می زنم

شیفتہ نے شعر گوئی کے ذوق کو سنوارنے اور بلند کرنے میں قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں وہ نہایت نکتہ سنج اور شعر فہم تھے۔ ان کی تحسین سے شعرا کا حوصلہ بڑھ جاتا تھا اور خاموشی سے ان کے اشعار خود ان کی نگاہ سے گر جاتے تھے۔ مولانا حالی یادگار غالب میں رقمطراز ہیں:

"شعر کا جیسا مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا مذاق جانتے تھے ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود ان کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی، یہی اوصاف تھے جن کے پیش نظر غالب نے انھیں سراہا ہے۔ یہ کہنا کہ وہ شیفتہ کی تعریف اس لیے کرتے تھے کہ شیفتہ نواب تھے اور غالب کو ان سے مالی منفعت کی توقعات تھیں درست نہیں ہے۔ مرحوم ارشد کاکوی کا مجلہ ماہ جون ۱۹۵۵ء میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے شیفتہ کو غالب و مومن کی صف میں کھڑا کرنے سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ جن حضرات نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے انھوں نے انتقادی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ تاہم انھوں نے شیفتہ کے بیس پچیس اشعار کی عظمت تسلیم کی ہے:
میری رائے میں کسی بڑے سے بڑے شاعر کا دیوان بھی [illegible] ایسے اشعار پر مشتمل نہیں ہوا کرتا [illegible] شیفتہ کو بڑا شاعر سمجھا جائے [illegible] سے انکار ممکن نہیں، غالب کی دستسن والے [illegible]

کہا جا سکتا ہے

غالب ز حسرتی چہ سرایی کہ در غزل
چوں او تلاش معنی و مضمون نہ کردہ کسے

غالب کو اخلاقی جرأت سے محروم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں کیریکٹر ہو یا مزاج تحسین لیکن وہ تنقید کے سلسلہ میں ان کو نمایاں نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے زمانۂ حیات میں اور تحلیل ریخ بھی تھے وہ ان پر نکتہ چینی کر سکتے تھے، پھر شیفتہ کی شاعری کا کہ تنہا غالب ہی معترف نہیں دوسرے شعراء اور دانشوروں نے بھی انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

سر سید مرحوم کی رائے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ جناب احسان الحق فاروقی ایم۔اے ترجمہ گلشن بیخار کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"شیفتہ جس قدر سنجیدہ اور متین رئیس تھے اتنے ہی وہ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے وہ ایک بلند پایہ شاعر اعلیٰ نقاد اور بہترین نثار تھے۔"

مولانا حالی یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں:

"نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انھیں سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے رہے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل ان کی غزل سے لگا نہیں کھاتی اور شعر کا جیسا مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا۔ ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔"

اس کے آگے لکھتے ہیں:

"حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحب ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب کی صحبت سے ہوا۔ شیفتہ صرف غزل کے شاعر تھے۔ دوسری اصناف شعر پر انھوں نے توجہ نہیں کی۔ ان کا دیوان تقریباً پونے دو سو غزلیات پر مشتمل ہے۔"

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں:

"ان کے نامی شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرۂ گلشن بیخار خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں مظفر جنگ بہادر رئیس دہلی ہیں۔" صاحب جدوت نے شیفتہ کو مومن کے نامی شاگردوں میں شمار کیا ہے یہ شہرت کچھ کم نہیں ہو شیفتہ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی نئی عمارت تعمیر کی وہ اردو شاعری میں اس تحریک کے روح رواں سمجھے جاتے ہیں۔ جن نے اردو اور فارسی شاعری کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا۔ ان کے بعد کوئی شاعر ایک ہی وقت میں فارسی اور اردو کا صاحب دیوان نہیں ہوا۔ ان کا یہ کارنامہ اردو شاعری میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیفتہ کو بڑا شاعر نہ سمجھا جائے مگر اس حقیقت سے روگردانی نہیں کی جا سکتی کہ اردو شاعری کے اس زریں دور نے بھی شیفتہ جیسا شاعر پیدا نہیں کیا۔ وہ اس وقت مسند شعر پر جلوہ افروز ہوئے جب دہلی میں تہذیب و تمدن کا آفتاب غروب ہونے کے قریب تھا۔ جب تک وہ دہلی میں رہے ان کے دولت خانے پر شعر و سخن کی مجالس منعقد ہوتی رہیں۔ جن میں شعر خوانی کے علاوہ علمی و ادبی مباحث بھی ہوا کرتے تھے۔ ان میں شہر کے تمام نامور شعراء شرکت کیا کرتے تھے۔ ان شعراء میں مفتی صدر الدین آزردہ، مومن، اور ضیاء الدین احمد نیر کا نام نمایاں ہے۔ شیفتہ نے گلشن بیخار کے نام سے ایک تذکرۂ شعراء بھی لکھا ہے جس پر مومن خاں نے منظوم تقریظ لکھی تھی۔

تذکرہ شیفتہ نے لکھا
ہے شیفتہ جس کی جانِ معنیٰ

یوں نکتہ شناس ہیں پر ایسا
کوئی نہیں قدردانِ معنیٰ

ہر فقرہ نثر جانِ مضموں
ہر شعر روحِ روانِ معنیٰ

کیا بات ہے منتخب کی تیرے
اے منتخبِ جہانِ معنیٰ

ہر نقطہ انتخاب تیرا
خالِ رخِ دلبرانِ معنیٰ

مومن جب اس میں دیر تک کی
سیرِ گل و گلستانِ معنیٰ

غنچہ کی طرح سے سرخرو تھا
یک چند وہم زبانِ معنیٰ

مؤلف نے کہا ہے اس کی تاریخ
گلدستۂ گلستانِ معنیٰ

یہ تذکرہ شیفتہ نے جوانی ہی میں مکمل کر لیا تھا انھوں نے نہایت بے تعصبی اور حقیقت پسندی سے شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ ان کا دیوان بھی ۲۱ سال کی عمر میں مرتب ہو گیا تھا جو ان کے بیٹے نواب محمد اسحاق خاں کی نگرانی میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ اس تذکرے کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا ہے۔ جس کا پہلا ایڈیشن نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ کراچی نمبر ۱ سے دسمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اصل فارسی تذکرہ ۱۲۵۰ء میں مرتب ہوا تھا اور ۱۲۵۲ھ میں دہلی سے چھپا تھا۔ دیوانِ شیفتہ کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۵۴ء میں اکاڈمی پنجاب ادبی دنیا منزل لاہور سے شائع ہوا تھا۔

شیفتہ کے چند اشعار گلشنِ بیخار سے نقل کیے جا رہے ہیں ان سے ان کے اسلوبِ شعر گوئی کا اندازہ ہو گا۔

کوئی بے جان جہاں میں نہیں جیتا لیکن
ترے رنجور کو جیتے ہوئے بے جاں دیکھا

کیا ہووے شامِ روزِ جزا ڈھب نجات کا
باقی ہے انتقام ابھی عشرت کی رات کا

اے مرگ آ کہ میری بھی رہ جائے آبرو
دکھلا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا

اس سے نہیں شکوہ کی جا شکرِ ستم کر آیا
کیا کروں تھا جو میرے دل میں زباں پر آیا

کیا دوں جواب دادرِ روزِ شمار کا
ہے اب تلک خیال اسی غفلت شعار کا

....

شب طالعِ خفتہ نے دیا خواب میں آنے
وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

پروانہ وار جلنا دستور ہے ہمارا
اس شمع رو پہ مرنا مشہور ہے ہمارا

حسب ذیل اشعار دیوانِ شیفتہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔

جذبۂ شوق کی تاثیر اسے کہتے ہیں
سن کے قاصد کی خبر آپ وہ در پہ آیا

کون کہتا ہے کہ ظلمت میں کم آتا ہے نظر
جو نہ دیکھا تھا سو ہم نے شبِ ہجراں دیکھا

جفا و جور کا اس بت سے گلا کیا
جو پوچھے مہربانی کیا، وفا کیا

شیفتہ ہجر میں تو نالۂ شبگیر نہ کھینچ
صبح ہونے کی نہیں خجلتِ تاثیر نہ کھینچ

شاطر باغ پامال کو طرح بیٹھے قرار ہے
میں ان کے پاس گیا ہوں کہ گلچیں گیا نہیں

[illegible] ہے
[illegible] کبھی سبب ہے
[illegible] کو تاب ہے
جو بھی دل کو اضطراب رہے
[illegible] کام کر چکی اپنا
[illegible] نقاب رہے
کیا ذکر اس کے آگے مری آہ کا چلے
جب گل کی شمع بزم سے بچ کر صبا چلے
ایام ہجر میں جو اجل کا خیال ہے

یہ شکستہ دماغ میں اک فکر احتمال ہے
عجیب ہوا شہر ہے دلّی میں [illegible]
یہ روم و شام نہ لوٹا اس کو [illegible]
ہر چند کہ ہے آپ سے ملنے کی تمنا
پر آپ سے ملنے کی تمنا نہیں رکھتے
منہ تو دیکھو تشنہ کام شوق مجھ کو جان کر
قتل کرتا ہے ستمگر خنجر بے آب سے
اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہشِ صہبا نہیں رکھتے

مضمون لکھتے وقت حسب ذیل کتب پیش نظر رہی ہیں۔

۱۔ آب حیات، ۲۔ یادگار حالی، ۳۔ گلشن بے خار، مع ترجمہ و حواشی، ۴۔ تلامذہ غالب، ۵۔ دیوان شیفتہ، ۶۔ اردو ترجمہ گلشن بے خار مطبوعہ نفیس اکیڈمی بلاسس روڈ کراچی، ۷۔ انتخاب الکلام نواب شیفتہ مصطفےٰ خاں، ۸۔ نگار، ماہ جون ۱۹۵۵ء

*

نغمۂ آزادی

مختار ٹونکی
کالی پلٹن روڈ پل محمد خاں
(ٹونک راجستھان)

آزادیوں کی دیوی تم پر کرم کیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
آکاش چھو رہا ہے قومی نشان ہمارا
یہ ہے زمین ہماری آب آسمان ہمارا
ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا
جو خیر تھے یہاں پر ان کو بھگا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
[illegible] ہم ہوئے ہیں
[illegible] سے آزاد ہم ہوئے ہیں
[illegible] ہم ہوئے ہیں
[illegible] دیا ہے

آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
آزاد ہیں ارادے، آزاد زندگی ہے
آزاد ہے تصور، آزاد بندگی ہے
آزاد ہے مسرت، آزاد ہر خوشی ہے
آزادیوں کا تو نے جادو جگایا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
تعمیر ہو رہی ہے، تقدیر بن رہی ہے
اب آنے والے کل کی تصویر بن رہی ہے
بالو کے خواب کی یہ تعبیر بن رہی ہے
تو نے ترقیوں کا رستہ دکھا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

من کی خوشبو

حرمت الاکرام
لال باغ۔ مرزاپور

میرا من صندل کا بن ہے
پھوٹ رہی ہے چھن چھن خوشبو
یہ خوشبو ہی پونجی تن کی
یہ خوشبو ہی پونجی من کی
لیکن نخلوں کا سوناپن
کیوں آزردۂ ذوقِ بصر ہے؟
صدیوں کی یہ وردِ روایت
صدیوں کی یہ رسم، حقیقت
کیوں آزردۂ نطق و نظر ہے؟
نکہت و زہر کی ہم آغوشی
لگتی ہے محرومِ صداقت
ٹھہری ہے بیگانۂ معنی
راز یہ کیا ہے؟ کیوں خالی ہے
صندل کا یہ بن ناگوں سے؟
شاعر کے ہونٹوں کا تبسم
ایک کلی کی صورت چٹکا
ہے یہ راز کہ من کی خوشبو
صندل کے اس بن کی خوشبو
جو اک خاک نشیں کا دھن ہے
کالے ناگوں کی دشمن ہے

مصوّری
اور
پوسٹر کا سفر

جنابہ مقبول فدا حسین مضمون نگار کے ساتھ

حقائد نے مصوری کو جنم دیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ فن تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ مغرب میں آسودہ اور بے فکر ماحول کے سبب گزشتہ صدی کے وسط تک رومانی عکاسی پر شباب رہا۔ سائنس اور صنعتی انقلاب نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح مصوروں کی فکر اور فن کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے روایتی طریقۂ اظہار میں تبدیلی کے ساتھ ہی ہمعصر موضوعات کی اہمیت کو بھی پہچانا۔ اس زمانہ کی مصوری پر جملہ تبدیلیوں کے اثرات نمایاں رہے۔

فنی انقلابی تحریک کے بانی کوربے کا خیال تھا کہ "مصور کو چاہیئے کہ وہ عوام کی روزمرہ کی زندگی کو مرقع کرے۔ اسے وہی مصور کرنا چاہیئے جو حقیقتاً نظر آتا ہے نہ کہ جو اس کے ذہن کی آنکھ سے دکھائی دیتا ہے۔" گو کہ کوربے نے تکنیکی اعتبار سے مصوری کو نئی راہ نہیں دی تھی پھر بھی اس نے مرقع کشی میں جس سادگی کو جگہ دی وہی جدید مصوری کی ابتدا کہلائی۔ کوربے کے بعد مانے نے اس کا ہمخیال تو رہا لیکن اس نے اس فن کو مزید وسعت دینے کے خیال سے کہا کہ "مصور کو موضوع سے زیادہ تصویر کی ساخت پر اہمیت دینی چاہیے کیونکہ کینوس کی ایک علاحدہ دنیا ہوتی ہے اور اس کی تخلیق میں مصور کا ہر عمل تعمیری عنصر لیے ہونا چاہیئے نہ کہ تقلید۔" مانے کی مرقع کشی اس کے شخصی خیالات کا آئینہ بنی۔ اس نے مصوری کی تکنیک کو قطعی نظر انداز کر دیا اور بغیر کسی امتزاج کے صرف مختلف رنگوں کے ذریعہ احساسات جگانے میں کامیابی حاصل کی۔ سیزان نے مانے کے اجتہاد کو آگے بڑھایا۔ اس نے اشکال کی ہیئت خاکہ آرائی کو اہمیت دے کر ڈھانچے پر زور دیا۔ پکاسو کو سیزان کے بنیادی تعمیری عنصر سے تحریک ملی اور اس نے دبستان مکعب کی بنا ڈالی۔ یوں مصوری کا پورا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ اس عظیم تبدیلی نے مرقع کشی کو آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں سے اگلی راہ کا تعین بھی دشوار نظر آتا ہے۔

تاریخ مصوری قلمبند کرنے والوں کا خیال ہے کہ ہندستان میں جدیدیت کی تحریک کو فروغ دینے کا سہرا ابنیندرناتھ ٹیگور کے سر ہے۔ ۱۹۰۷ء میں کلکتہ اورینٹل سوسائٹی آف آرٹ کی بنیاد پڑنے کے ساتھ ہی فن مصوری کا اسکول وجود میں آیا۔ اس اسکول کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے قومی اور روایتی بنیاد کے پس منظر میں ہندستان کو موضوع قرار دیا۔ جن مصوروں نے بنگال اسکول کے اسلوب میں اہمیت حاصل کی ان میں ابنیندرناتھ ٹیگور، گگنیندرناتھ ٹیگور، نندلال بوس، کشتیندرناتھ مجمدار، آسیت کمار ہلدار کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ رابندرناتھ ٹیگور نے اپنے دورۂ یورپ میں مغربی مصوری کی تبدیلیوں کا بہ نظر غائر جائزہ لیا اور ہندستان آنے کے بعد بنگال اسکول سے نااتفاقی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فن کی زبان بین الاقوامی ہونا چاہیے۔ اور تمام ایسے عناصر جو کسی طرح کی حد بندی پیدا

[illegible]

[illegible] ہیں۔

[illegible] فنس [illegible] میں [illegible] کی بنیاد ڈالی۔ اس [illegible] رضا [illegible] اور [illegible] نے [illegible] کیا۔ ان [illegible] نے سوشل ریلوزم ([illegible]) کا نام دیا تھا۔ اس بارے [illegible] میں [illegible] مقبول فدا حسین کا نام ہے۔ گزشتہ [illegible] مصوری کو بہت کچھ دیا ہے اور بعد [illegible] [illegible] رہی۔

مقبول فدا حسین [illegible] موضوع میں دلچسپی سائنس کو لے کر [illegible] خیالات کا اظہار کیا۔ اپنے فن میں انہوں نے [illegible] زیادہ کام لیا اور پہلی نظر میں ان کی تصاویر پر [illegible] [illegible] عورت اور گھوڑے کو [illegible] [illegible] کا گویا نتے ہیں اور گھوڑے کو وقت کی برق رفتاری کا سمبل۔ ان کے اس اختراع کو تمام حلقوں نے سراہا۔ حسین نے اپنے موضوعات ہندستانی سماج سے [illegible]۔ انہوں نے [illegible] کتب پیش کیا۔ بقول [illegible] "حسین ہندو دیومالا اور [illegible] [illegible] بناتے ہیں!"

[illegible] کو کسی ایک عنوان میں [illegible] اگر ایک [illegible] نظر ڈالی جائے تو [illegible] رہا ہوں، [illegible] وہاں [illegible] کے سبب انہوں نے بہت ہی [illegible] [illegible] سکول [illegible]۔ [illegible] میں انہوں نے بمبئی میں سکونت اختیار کی [illegible] [illegible] قیام بمبئی [illegible] اور [illegible]

[illegible] کے [illegible] ۱۹۲۰ء اور [illegible] ان کی پہلی [illegible] ۔ [illegible] میں پہلی مرتبہ ان کی [illegible] ہوئی [illegible] پینٹنگ نمائش کا انعقاد [illegible] ۱۹۵۳ء میں کیا، اور وہاں کی [illegible] آرٹ گیلری میں تنہا ان کی تصاویر کی نمائش ہوئی۔ [illegible] دہلی کی [illegible] اکیڈمی [illegible] میں انہیں پہلا انعام ملا۔ اسی سال وینس بینالے میں ان کی پینٹنگز کی نمائش ہوئی۔ اس کے دوسرے برس دہلی میں ہونے والی آٹھ مصوروں کی نمائش میں بھی انہوں نے شرکت کی اور [illegible] گیلری [illegible] اور پراگ کی گیلری [illegible] میں ان کی انفرادی نمائش کا اہتمام ہوا۔ [illegible] [illegible] میں حسین نے [illegible] [illegible] بنائی۔ ۱۹۶۷ء کو حسین کی [illegible] اور کامیابیوں کا سال کہہ سکتے ہیں۔ اس سال [illegible] بینالے، برازیل میں نمائش ہوئی۔ [illegible] میں پہلا انعام ملا اور وہ [illegible] [illegible] [illegible] میں [illegible] ساتھ [illegible] اور [illegible] منعقد کی گئی نمائش میں شرکت کی۔ وہاں سے واپس آکر [illegible] میں [illegible] کی [illegible] گیلری میں صرف ان کی تصاویر کی نمائش لگی پھر [illegible] اور [illegible] انہوں نے انفرادی نمائشوں کا انعقاد کیا۔ [illegible] میں بمبئی اور دہلی میں صرف ان کی تصاویر کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔

[illegible] کی طرح ۱۹۶۳ء [illegible] [illegible] سال رہا۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] میں صرف اپنی تصاویر کی نمائش [illegible] [illegible] کی دعوت پر کنا ڈا کا سفر کیا [illegible]

شری گیانی ذیل سنگھ کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شری چندر چوڑ ۲۵ جولائی ۱۹۸۲ کو راشٹرپتی بھون
کے دربار ہال میں صدر جمہوریہ ہند کے عہدے کا حلف دلاتے ہوئے۔ تصویر میں سابق صدر جمہوریہ شری نیلم سنجیوا ریڈی
بھی نظر آرہے ہیں۔

اتر پردیش کے نئے وزیر اعلیٰ شری شری پت مشرا کو گورنر اتر پردیش شری سی پی این سنگھ ایک تقریب میں
لکھنؤ میں ان کے عہدے کا حلف دلاتے ہوئے۔

وزیر اعلیٰ [illegible] صاحب کی [illegible] کے بعد [illegible]
[illegible] نے اپنی رہائش گاہ پر ایک افطار پارٹی کا اہتمام کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر افطار کے بعد نماز مغرب کا ایک منظر

وزیر تعلیم اترپردیش شریمتی سروپ کماری بخشی لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں امتحانات کے دوران اچانک معائنہ کرتے ہوئے۔

شعبۂ قانون کے امتحان کا ایک منظر



[illegible] وزیر صنعت شری نرائن دت تیواری ۱۲ر جولائی ۱۹۸۰ کو محمود آباد ضلع سیتاپور میں [illegible] کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔ تصویر میں اترپردیش کے وزیر صنعت شری [illegible] سنگھ اور ریاستی وزیر شری محمد امین انصاری بھی نظر آرہے ہیں۔

وزیراعلیٰ شری وی پی سنگھ نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں منعقدہ عید ملن کی تقریب میں شرکت کی۔ تصویر میں وزیر تعلیم [illegible] شری [illegible] وائس چانسلر، صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر محمد رضوان علوی اور [illegible] کے حلقۂ انتخاب کے ممبر اسمبلی شری محمد [illegible] صدیقی بھی نظر آرہے ہیں۔

[illegible]

[illegible] ہیں [illegible] اور [illegible]

[illegible] نے [illegible] اندر [illegible]

[illegible] رنگی [illegible] ہے [illegible] برلن [illegible]

[illegible] ہوا [illegible] نمائش [illegible]

[illegible] نیویارک

[illegible] ہوا [illegible] ان کی تصاویر کی نمائشوں کا اہتمام

[illegible] میں حسین کو [illegible] قربانی ظاہر کرنے کے لیے

[illegible] کے عنوان سے انہوں

[illegible] میں ایک نمائش بھی لگائی۔

[illegible] آرٹ گیلری [illegible] میں حسین کے کام

[illegible] ایک بہت بڑی نمائش کا اہتمام ہوا۔ اس کے

[illegible] کے اعزاز میں [illegible]

[illegible] نمائش منعقد ہوئی۔ دو سال بعد [illegible]

[illegible] اور پنڈول آرٹ گیلری کے زیر اہتمام [illegible]

[illegible] ان کی انفرادی نمائش لگی۔ پیرس [illegible]

[illegible] کی پچاس رنگین اور [illegible] سو سیاہ و سفید تصاویر

شائع کی۔

[illegible] نے مقبول فدا حسین کو [illegible]

[illegible] ان کی [illegible]

[illegible] سال کا [illegible] آرٹ سینٹر

[illegible] انفرادی نمائش کا انعقاد ہوا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] کی نمائش [illegible] میں ان کی [illegible] کا اہتمام

[illegible] ان کی تصاویر کی [illegible] ہیں۔ ان کی [illegible]

[illegible] ان کی نمائش [illegible] منعقد کی گئی۔

جدید ہندوستانی مصوروں کو جس پیمانے اور [illegible]

جاسکتا ہے — [illegible] اعلیٰ [illegible]

[illegible] اس [illegible] نہیں کہا جاسکتا [illegible]

[illegible] جذبات کی عکاسی [illegible]

[illegible] ہوں۔ [illegible]

مقبول فدا حسین کی [illegible] میں ضروری عناصر موجود [illegible]

[illegible] نے خود اپنی مصوری کا تجزیہ ایک نظم

میں کیا ہے:

میں

دیہاں کی تصویروں کے رنگوں سے

خوب واقف ہوں

جن کے گہرے رنگ

میرے اندر [illegible] ہیں

میں نہیں [illegible]

انگلیوں

گرد آلود جوتے

زمین پر دھتے جس سے میں

لیکن

دریا میں بہتا ہوا [illegible]

[illegible] انعام کر دیتا ہے

حیات وارثی
[illegible]، لکھنؤ

پیداواری سال

دیش میں پیداوار بڑھے گی جاگے ہیں مزدور

تالا بندی اور ہڑتالیں بیتے جگ کی بات
سکھ کا اُجیارا پھیلا ہے گزری غم کی رات
بھارت ماں کی مانگ میں چمکا محنت کا سیندور
دیش میں پیداوار بڑھے گی جاگے ہیں مزدور

مالک ہیں مزدور بھی مل کے اب اپنا ہے کام
جس کی جتنی محنت ہوگی اس کے اتنے دام
اب بیکاری اور غریبی ہو جائے گی دور

دیش میں پیداوار بڑھے گی جاگے ہیں مزدور
جتنے خالی پیمانے ہیں اب ان کو بھرنا ہے
اُتپادن کو اور بڑھا کر قیمت کم کرنا ہے
جامِ عمل سے ہر محنت کش ہے مست و مخمور
دیش میں پیداوار بڑھے گی جاگے ہیں مزدور

اہلِ وطن میں بیداری کی اب کرنیں پھوٹی ہیں
لاپرواہی اور سستی کی زنجیریں ٹوٹی ہیں
انوشاسن اور ذمہ داری کا پھیلا ہے نور
دیش میں پیداوار بڑھے گی جاگے ہیں مزدور

ظہما شادانی
راجندر مارگ، دھار (ایم پی)

آزادی

وہ صبحِ نو، وہ آزادی کا دن، وہ نور کا عالم
وطن کے ذرہ ذرہ پہ ہے طاری نور کا عالم

محبانِ وطن کے خواب کی تعبیر آزادی
شہیدانِ وطن کے خون کی تصویر آزادی

جب اس کی روشنی سے ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا
تو پھر مزدور بھی انگڑائی لے کر مسکرا اٹھا

جہاں میں حشر اٹھا زندگی میں انقلاب آیا
اندھیروں کو شکستِ فاش دینے کو آفتاب آیا

وطن میں روح پھونکی، قوم کو اک زندگی بخشی
گلوں کو تازگی، ظلمت کدوں کو روشنی بخشی

وطن کی سرزمیں کو گم شدہ دولت عطا کر دی
زمانے کو جگایا جس نے وہ قوت عطا کر دی

یہ آزادی خدا کی دین ہے بارانِ رحمت ہے
کئی اظہار ہوں قربان جس پر یہ وہ نعمت ہے
سرور و کیف رنگ و نور برساتی چلی آئی
بہارِ ہند کو آئینہ دکھلاتے ہوئے آئی

[illegible]

جوہرِ ہندوستان ـــــــــ مولانا محمد علی جوہر

مانۂ شراب غمِ جاوداں تھا وہ — یعنی جوابِ گردشِ کون و مکاں تھا وہ

ثم تھی جس کے فیض سے تنظیمِ میکدہ — ہر رند کہہ رہا ہے کہ پیرِ مغاں تھا وہ

چھ گزر رہی تھی کسی کو خبر نہ تھی — دنیا سمجھ رہی تھی بہت شادماں تھا وہ

یداسی کا نام ہے معراجِ بیخودی — جلوے وہیں ہیں یہ عیاں تھے جہاں تھا وہ

نق اسی کے دم سے ہر اک انجمن میں تھی — کتنا حسین مآلِ غمِ دو جہاں تھا وہ

من سلگ اٹھے نہ کہیں سامراج کا — انگریز جانتا تھا کہ برقِ تپاں تھا وہ

س وقت اس زمیں پہ غلامی کی رات تھی — ہندوستانیوں کیلئے کہکشاں تھا وہ

نے وطن کی آن پہ قربان ہوگیا — آزادیٔ چمن کا عجب پاسباں تھا وہ

مین گلستاں کی فضا سوگوار ہے — ہر پھول کہہ رہا ہے مرا پاسباں تھا وہ

رخص اس کی یاد میں رئے گا عمر بھر — نایاب ایک جوہرِ ہندوستاں تھا وہ

خاکِ یروشلم سے ہے یہ راز آشکار

آزادیٔ وطن کا عجب رازداں تھا وہ

مسلم سلیم
ایچ ۱۳۰۔ شاستری نگر
بھوپال:

غزل

کس قدر بے خوف ہیں ہم دشمنوں کے درمیاں
ناز شوروں میں بکھر گئے ہیں دوستوں کے درمیاں

حسن کی مستی کا باعث خواب آور ہے سکوں
ذہن بھٹکتا ہے جب آنکھ حادثوں کے درمیاں

پربتوں سے کس جہاں میں ہم بھی آباد ہیں
ہم اکیلے ہی نہیں ہیں فاصلوں کے درمیاں

غیر کے منسوب تھیں ساری پسند و ناپسند
چند لمحے تھے بس اپنے پربتوں کے درمیاں

ہے یہ اک مٹتی ہوئی تہذیب کا [illegible] عشق
وہ جو دو آنکھیں ہیں روشن جالیوں کے درمیاں

سیاسی آزادی سے معاشی آزادی تک

اس سال ہم اپنی آزادی کی ۳۵ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ یہ آزادی ہم نے ایک طویل جدوجہد اور زبردست قربانیوں کے بعد حاصل کی تھی۔ اس کے لیے ہم چند قائدوں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکر لی اور مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم رہنماؤں کی قیادت میں ہم نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو شکست دی۔ یہ جنگ ہم نے عدم تشدد کے ذریعہ لڑی اور عدم تشدد کی اس عظیم المثال کامیابی پر دنیا دنگ رہ گئی۔ عدم تشدد پر مبنی ہماری یہ جنگ دنیا کے لیے ایک قابل تقلید مثال بن گئی۔ اس جنگ نے دنیا کو ایک راستہ دکھایا کہ سچائی کی خاطر اور اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے، جس میں زبردست اخلاقی قوت بھی نہاں ہے۔

آزادی کے بعد ہم نے اپنے ملک میں جمہوری اور سیکولر نظام قائم کیا اور منصوبہ بند ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ گذشتہ ۳۵ برسوں کے دوران ہم نے اپنے ملک کے جمہوری اور سیکولر نظام کی جڑیں کتنی گہری اور مستحکم کی ہیں۔ نیز منصوبہ بند ترقی اور مکمل خوشحالی کی منزل کی جانب ہم نے کتنی پیش رفت کی ہے؟ اس کا اگر ہم جائزہ لیں تو جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ بڑی امید افزا ہے۔ ہم نے اپنے ملک میں صنعتوں کا ایک جال بچھا دیا۔ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ملک کے اندر ہی تیار ہونے لگے اور اب تو ہم اپنے مصنوعی سیاروں کے ذریعے خلائی سائنس کے دور میں بھی داخل ہو گئے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔

ماضی قریب میں ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اور جو ہمہ گیر ترقی کی ہے، وہ شریمتی اندرا گاندھی کی فعال اور حوصلہ مندانہ قیادت کی دین ہے۔ ابھی پچھلے سال [illegible] شریمتی گاندھی نے ملک کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے لیے ایک بیس نکاتی پروگرام کا اعلان کیا تھا۔ یہ بیس نکاتی پروگرام نہ صرف یہ کہ اس ملک سے غریبی اور استحصال کو ختم کرنے [illegible] معاشی آزادی کی منزل کی جانب ہماری پیش رفت کو تیز تر کرنے [illegible] ہے، وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

آبپاشی صلاحیت اور زرعی پیداوار میں مزید اضافہ کرنا [illegible]

کو مستحکم اور وسیع تر بنانا، قابل کاشت آراضی کی حد بندی اور مقررہ حد سے زیادہ آراضی کی بے زمینوں میں تقسیم، زرعی مزدوروں کی اجرت سے متعلق قوانین کا موثر طریقے سے نفاذ، پابند مزدوروں کی باز آباد کاری، اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی ترقی سے متعلق کاموں میں تیز رفتاری، دور افتادہ علاقوں کے تمام دیہاتوں میں پینے کے پانی کا بندوبست، دیہی علاقوں کے لوگوں کے لیے مکان بنانے کے سلسلہ میں امداد سے متعلق پروگراموں کی توسیع، جھگی جھونپڑی والی بستیوں کا ماحول بہتر بنانا اور معاشی طور پر کمزور طبقوں کے لیے تعمیر مکانات پروگرام کی تیز رفتار عمل آوری، بجلی کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ اور تمام مواضعات کی بجلی کاری، شجر کاری پروگرام کی عمل آوری اور خاندانی منصوبہ بندی پروگرام پر رضاکارانہ طور سے عمل در آمد اور اسے عوامی مہم کی شکل دینے پر زور، صحت خدمات سے متعلق سہولتوں میں مزید توسیع، خواتین اور بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق پروگرام میں تیز رفتاری، چھ سال سے ۱۴ سال تک کے سبھی بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم کا وسیع پیمانے پر بندوبست، اسی کے ساتھ ساتھ بالغ افراد کو حرف شناس بنانے کی کوششیں، سستی اشیا کی دکانوں کی تعداد بڑھا کر اور دور دراز علاقوں میں گشتی دکانوں کا بندوبست کرکے نیز صنعتی علاقوں اور بستیوں کے لیے نئی دکانیں قائم کرکے عوامی نظام تقسیم کے دائرۂ عمل کی توسیع، نصابی کتابوں اور کاپیوں کی ضرورت کو اولیت، صارفین کی ضروریات پوری کرنے کے لیے موثر اقدامات، سرمایہ کاری کے طریقہ کار میں نرمی اور آسان صنعتی پالیسی، دستکاری، ہتھ کرگھا اور دیگر دیہی صنعتوں نیز پیشوں کو ہر طرح کی سہولتوں کی فراہمی، اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور ٹیکس چوروں کے خلاف سخت کارروائی نیز سرکاری زمرہ کے اداروں کی کارکردگی، صلاحیت کے استعمال اور ملکی وسائل کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے پر زور۔

وزیر اعظم کا یہ نیا بیس نکاتی پروگرام تعمیر و ترقی سے متعلق تمام تکنیکی پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور تمام طبقوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ یہ پروگرام یقیناً معاشی آزادی کی اس منزل تک لے جائے گا، جس کے بغیر سیاسی آزادی ادھوری ہوتی ہے۔

*

[illegible]
[illegible]
[illegible] بہاولپور

ترنگا علم

ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے
ہر چند گام گام پہ ہوتے رہے قلم
لیکن نہ ہو سکے کبھی پائے ستم پہ خم
راہِ وفا میں بڑھتے رہے سر اٹھائے ہم
سینوں میں داغِ زخمِ غلامی کا غم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

ہونٹوں پہ انقلاب کے نغمے رواں دواں
آنکھوں میں سرخ شعلوں کا وہ بحرِ بیکراں
جس سے ہوا تھا ظلم کا چہرہ دھواں دھواں
ایوانِ جبر لرزے وہ شورِ قدم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

اٹھل ہائے منتشر کو پروتے ہوئے بڑھے
ہر داغِ امتیاز کو دھوتے ہوئے بڑھے
ذہنوں میں انقلاب کو بوتے ہوئے بڑھے
ہر رنگ و نسل و دیں کو لڑی میں بہم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

تاریخ اپنے خون سے کرتے رہے رقم
سر پر ہمارے ہوتی رہی بارشِ ستم
جوشِ جنوں ہوا نہ کسی طور پھر بھی کم
میدانِ جنگ میں تھے غزالوں کا رم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

اٹھے تھے رسمِ جبر مٹانے کا دم لیے
پنجاب کے شباب سے زورِ شباب تھا
کشمیر کی فضاؤں سے رنگِ گلاب تھا
آسام و بنگ و سندھ کا بس اک جواب تھا
آئے ہیں انقلاب کی لب پر قسم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

سر آخرش وہ معرکہ بھی خوب ہو گیا
دشمن ہمارے عزم سے مغلوب ہو گیا
تاریخ کی صلیب پہ مصلوب ہو گیا
بھاگا وہ یاں سے سطوت و جاہ و حشم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

باطل پہ حق کی فتح کا دن پندرہ اگست
اہلِ وطن کی مدح کا دن پندرہ اگست
قصرِ وفا کی طرح کا دن پندرہ اگست
دوشیں ہوا پہ مژدہ ایک کرم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

عنوانِ انقلاب بنا پندرہ اگست
ہر جام کی شراب بنا پندرہ اگست
وا سب پہ ہو وہ باب بنا پندرہ اگست
اک مرکزِ کلیسا و دیر و حرم لیے
ہاتھوں میں اپنے پیارا ترنگا علم لیے

یادوں کے جھونکے

تم آج آ ہی گئی ہو تو پھر کھڑی کیوں ہو
تکلفات کے ہیجان میں پڑی کیوں ہو
سب کہ آ ہی گئی ہو تو آؤ بیٹھ بھی جاؤ
[illegible] بات کریں
وہ [illegible] کو کم کر لیں
[illegible] کی بات کریں

تم آ گئی ہو تو یادوں نے لی ہے انگڑائی
کہ جیسے قوسِ قزح رنگ لے کے آتی ہے
کہ جیسے وادیِ خوباں میں کوئی عروسِ بہار
نئے ترنّم نئے [illegible] لے کے آتی ہے

تم آ گئی ہو تو یادوں کی اک [illegible]
تصورات کی کرنوں سے پھیلتی جاتی ہے
کچھ اس طرح رخِ ماضی نکھرتا جاتا ہے
کہ جیسے وقت کی رو واپس پلٹتی جاتی ہے

بہت سے نقش ابھر آئے ہیں خیالوں میں
[illegible] بہاروں کی یاد آئی ہے
[illegible] ذوقِ آبلہ پائی
[illegible] بہاروں کی یاد آئی ہے
[illegible] کتنے ہی زخم ابھرے ہیں
[illegible] کی یاد آئی ہے
[illegible]
[illegible] ستاروں کی یاد آئی ہے

تمہارے شہر کی گلیاں تمہارے شہر کے لوگ
تمہارے شہر کی برسات یاد آئی ہے
ذرا رکو۔ کہ یکایک یہ دھیان کیا آیا
ارے سنو تو۔ وہ اک بات یاد آئی ہے

تمہیں تو اچھی طرح یاد ہوگی وہ لڑکی
ابھی بتاتا ہوں اچھا سا نام تھا اس کا
شگفتہ تھا۔ نہیں۔ شانتی تھا۔ یہ بھی نہیں
ابھی تو ذہن میں تھا اور ابھی ہی بھول گیا

وہی جو اگلی سڑک پر مڑو تو بائیں طرف
کنویں کے سامنے والی گلی میں رہتی تھی
تمہارے ساتھ جو پڑھتی تھی گرلز کالج میں
وہی جو تم کو مجسم شراب کہتی تھی

یہی یہی ہے۔ ارے ہاں یہی ہے نام اس کا
تمہیں کہو۔ کوئی آشا کو بھول سکتا ہے!

کچھ اور سوچو۔ یونیورسٹی کے عرصے میں
اک اور نام بھی آشا کے ساتھ آتا تھا
وہی جوان۔ کہ [illegible] نام تھا جس کا
وہی۔ جو ریڈیو سنگر تھا گیت گاتا تھا

تصورات میں ماضی کا سرد لاشا ہے
تخیلات میں پرکاش اور آشا ہے

تم آ گئی ہو تو وہ بات یاد آئی ہے
کہ دونوں ہونٹوں کی اک [illegible]

نگاہ ملتی تھی ان کی تو کھو سے جاتے تھے
نگاہِ نازکِ کیوپڈ کے دونوں تھے زخمی
مگر زمانے سے مجبور ہو سے جاتے تھے

تصورات میں اکثر وہ اس سے کہتا تھا
سوادِ عشق میں اک پیکرِ جمال ہو تم
حدودِ عقل میں مبہم سا اک سوال ہو تم
تمہارے حسن کی رفعت ہے کہکشاں کے پرے
نگاہِ عشق کی اک شوخیٔ خیال ہو تم
جمالِ وادیٔ کشمیر کا تصور ہو
صدائے نغمہ ہو تم شوخیٔ غزال ہو تم

تصورات میں اکثر وہ اس سے کہتا تھا
یہ کمسنی کی حدوں سے گزر رہا ہے شباب
کہ نرم نرم دھندلکوں میں کھل رہے ہیں کنول
یہ ناز و غمزہ یہ عشوہ یہ شوخیٔ گفتار
ردائے شعر میں لپٹی ہوئی ہو جیسے غزل
تمہاری شعلہ بھری انگڑائیوں کا جادو
وہ پتھروں کی طرح دم بخود ہو تکتا تھا

تم آگئی ہو تو وہ بات یاد آئی ہے
کہ اپنا ملک کسی اجنبی کی خواہش پر
گھسٹ رہا تھا غلامی کا بار اٹھائے ہوئے
کہ جیسے شہر کے غنڈوں کے بیچ اک لڑکی
کھڑی ہو خوف زدہ اپنا سر جھکائے ہوئے
ہمالیہ کی بلندی کو جیسے سکتہ تھا
شفق یہ کون اڑا لے ہے پاسبانی کی
اداس اداس سی جھیلیں ہوں جیسے خشک دہن
"یہاں تو چوٹی ہے تو بھی نغمہ خوانی کی"
زمین سوچتی تھی دل میں غم کی آگ لیے
"کوئی اٹھائے تو تحریک زندگانی کی"

پہن کے طوقِ غلامی سسک رہا تھا وطن
وطن کہ جس کا کبھی احترام کرتا تھا چمن
پڑی تھی خاک پہ تقدیسِ گیسوئے سنبل
عجیب طنز سے فاتح سلام کرتے تھے
وفورِ درد سے بیتاب تھا دلِ کشمیر
لہو کا داغ تھا یہ زعفران زار نہ تھا
صدائے نوری صنم جیسے گریۂ بیتاب
کہ سیلِ اشکِ مسلسل تھا آبشار نہ تھا
اسیرِ ظلمِ فرنگی تھا کاروانِ بہار
کوئی نشاط نہ تھا کوئی شالیمار نہ تھا
قدم قدم پہ وہی قصہ ہائے محرومی
نظر میں حسن نہیں تھا، دلوں میں پیار نہ تھا
نہ کوئی ہیر نہ رانجھا نہ سوہنی مہیوال
دبے پڑے تھے کتابوں میں پیار کے قصے
قلم تھا دار پہ اور غنچہ ہائے لب تھے اسیر
سناتا کون نمودِ بہار کے قصے
کسے نصیب تھی فرصت کہ ذکرِ لالہ کرے
بکھر رہے تھے دلِ داغدار کے قصے
صدائے دار و رسن تیز تھی سناتا کون
حدیثِ زلفِ سیہ۔ گلعذار کے قصے
فسونِ چشم کی باتیں، لبوں کے افسانے
عروسِ نو کی پھبن۔ نوبہار کے قصے

تم آگئی ہو تو وہ بات یاد آئی ہے
طلوعِ مہر میں شامل چتا کی آگ بھی تھی
نمودِ ماہ نے پہنا تھا چاندنی کا کفن
اداس اداس تھا ہر اک صنم اجنتا کا
ڈری ڈری سی بھٹکتی تھی آبروئے وطن
اسیر ہو کے مچل ہی رہا تھا تاج محل
سیاہ پڑنے لگا اس کا چاندنی سا بدن

لگا بہت اداس سا لگتا تھا حسنِ لال قلعہ
عجیب سوچ میں تھی سرخ پتھروں کی دلھن
قطب مینار مگر پھر بھی سرنگوں نہ ہوا
کہ اس نے دیکھے تھے لاکھوں نشیب و فراز
اسے یقیں تھا اٹھیں گے ہزاروں دیوانے
سمجھ چکے ہیں جو افسونِ شہریار کے راز
تم آگئی ہو تو وہ بات یاد آئی ہے
کہ جب اٹھے تھے وطن میں ہزاروں دیوانے
قفس کو پھونکنے اور بیڑیوں کو پگھلانے
کسی نے جنگ کے نعرے لگائے میرٹھ سے
تو پہلا کوئی دلی سے تلملا کے اٹھا
کسی کے واسطے نازاں ہے لکھنؤ کی زمیں
کوئی بجنور کی گلیوں سے مسکرا کے اٹھا
کوئی دیارِ بریلی سے کوئی باندہ سے
بدایوں سے کوئی شمعِ عمل جلا کے اٹھا
ہر ایک پھول کا چہرہ تھا تمتمایا ہوا
ہر ایک پودا اٹھا اور لہلہا کے اٹھا
یہاں سے لے کے وہاں تک جو سر پھرا بھی اٹھا
وہ اپنے خون سے حسنِ چمن بڑھا کے اٹھا
غرض افق سے افق تک لہو کی رنگت تھی
کہ اک سہاگ کو سندور کی ضرورت تھی

(وقفہ)

اسی زمیں سے صدیوں کے قافلے گزرے
مگر فنا نہ ہوا سیل و بہار مٹ نہ سکا
دلوں کو چیر گئیں اجنبی کی سنگینیں
مگر وہ جذبۂ بے اختیار مر نہ سکا
وہ جذبہ مقتلِ بلیا کے روپ لے کے اٹھا
وہ جذبہ قصۂ جلیان والا باغ بنا
وہ جذبہ بن گیا اک روز خواہشِ جمہور
وہ جذبہ [illegible] کے لیے چراغ تھا

تم آگئی ہو تو وہ بات یاد آئی ہے
یہی وہ جذبۂ بے تاب تھا کہ جس کے طفیل
دلِ عوام میں اک عزم سا ابھر آیا
یہی وہ جذبۂ بیدار تھا جو وقت کے ساتھ
بشکلِ زندگی پرکاش میں بھی در آیا
وہ اپنے دیش کو آزاد دیکھنے کے لیے
بنامِ ہند حکومت سے جنگ کرنے لگا
وہ اپنے ملک کو بیدار دیکھنے کے لیے
دلوں میں خفتہ نحوست سے جنگ کرنے لگا
وہ لڑ رہا تھا چمن کی شگفتگی کے لیے
وہ لڑ رہا تھا اجنتا کی دلکشی کے لیے
وہ لڑ رہا تھا ہمالہ کی برتری کے لیے
وہ لڑ رہا تھا کسانوں کی بہتری کے لیے
وہ لڑ رہا تھا سکون اور شانتی کے لیے
وہ لڑ رہا تھا اک آزاد زندگی کے لیے
وہ جنگ کرتا تھا پنگھٹ کی راگنی کے لیے
وہ جنگ کرتا تھا پائل کی نغمگی کے لیے
وہ لڑ رہا تھا کہ ہر گلعذار بچ جائے
وہ لڑ رہا تھا کہ خود اس کا پیار بچ جائے
مگر وہ شام کہ جب سامراج کی گولی
اسے شہیدوں کی صف میں جگہ دلا کے گئی
وہ شام جب تھی کہ آشا کا پیار ٹوٹ گیا
وہ رات خوش تھی کہ دیپک نئے جلا کے گئی
ارے یہ تم کہ ابھی تک کھڑی ہو چوکھٹ پر
وہ دیکھو سامنے کرسی ہے آؤ بیٹھ بھی جاؤ
تکلفات کے ہیجان سے نکل بھی چکو
بہت اداس ہوں دیکھو خوشامدیں نہ کراؤ
طویل بات تھی اکتا گئی ہو تم شاید
مرے خیال بھی کتنے بھٹک گئے دیکھو

اداس ہو سی گئی ہو عجیب بات ہے یہ
تمھاری آنکھ میں آنسو چھلک گئے دیکھو
یہ جانتی ہی ہو کہ پندرہ اگست ہے آج
اسی سے ذہن میں یادوں کا ایک طوفاں تھا

اسی لیے مجھے پرکاش یاد آیا تھا
کہ وہ شہید بھی جمہوریت کا خواہاں تھا
میں سوچتا ہوں مگر انجام اس کا کیا ہوگا
دلِ شکستہ میں آشا کے پیار باقی ہے
یہ جذبۂ دلِ بے تاب، یہ فریبِ امید
وہ مر چکا ہے مگر انتظار باقی ہے

سراج مرزا [illegible]
۲۴ دائرہ شاہ اجمل
الہ آباد

غزل

درد ہے غم ہے الم ہے فکرِ دامن گیر ہے
زندگی تو ہی بتا کیا یہ تری تصویر ہے

ذہن کے رقصِ تصور میں جو یہ تصویر ہے
خواب کی پرچھائیوں میں خواب کی تعبیر ہے

آدمی نازاں ہے جس پر وہ بساطِ زندگی
چند سانسوں کے لیے بخشی ہوئی جاگیر ہے

دیکھیے یہ بھی عروسِ زندگی کا بانکپن
رقص میں ہیں پاؤں میرے پاؤں میں زنجیر ہے

یہ جہانِ رنگ و بو اور اس پہ الزامِ ہوس
چھوڑیئے یہ بھی کوئی تعمیر میں تقصیر ہے

یہ شکن ہے گردشِ حالات کی بخشی ہوئی
یا مری لوحِ جبیں پر آپ کی تحریر ہے

اس طرح مایوسیوں میں ہے امیدوں کی کرن
شام کے پردے میں جیسے صبح کی تنویر ہے

آؤ پھر آؤ کہاں ہو راہ کی دشواریو!
کیا ہمارا حوصلہ ناقابلِ تسخیر ہے

کیوں کسی خوفِ تغیر سے دہل جائے سراج
آدمی تو انقلابِ وقت کی تصویر ہے

عبدالمتین نیاز
موتیا پارک، بھوپال

مجاہدینِ فضائیہ کے نام

وطن کے محافظ
چمن کے محافظ
ہوا کے دلارے
گگن کے محافظ

بھریں یہ اڑانیں
لٹائیں یہ جانیں
اجل بھی ڈرا کرے
مگر یہ نہ مانیں

گگن ان کا گھر ہے
زمیں پر نظر ہے
کہ محفوظ ان سے
ہمارا یہ گھر ہے

صدی نصف گزری
شجاعت میں ان کی
بڑھی اور ہمت
اڑان اور سنوری

یہ ہیں وہ جیالے
ہواؤں کے پالے
یہ سارا ہی بھارت
ہے جن کے حوالے

بیگم حضرت محل

ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں میں اگر ایک طرف نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، مولوی احمد اللہ شاہ اور بخت خاں کے نام آتے ہیں تو دوسری طرف جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف آزادی کے متوالوں کو ایک پرچم تلے جمع کرکے ان کی رہنمائی کی تھی۔

ہندستان کی سرزمین کا یہ وصف رہا ہے کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ ہر میدان میں سرگرم کار رہی ہیں۔ وہ شمشیر و قلم، جوش و ایثار و قربانی، زہد و تقویٰ غرض کہ ہر میدان میں نظر آتی ہیں۔ بین اقوامی شہرت و اہمیت کی حامل خواتین کے مقابلے میں سیتا، میرا بائی، چاند بی بی، رضیہ سلطانہ، رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل کے نام بغیر کسی پس و پیش کے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

امرت لال ناگر اپنی کتاب "غدر کے پھول" میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت محل کے بچپن کے حالات نہیں ملتے ہیں۔ مولوی نجم الغنی اپنی کتاب "تاریخ اودھ" میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت محل کا اصلی نام "امراؤ جان ادا" تھا۔ لیکن محمد ہادی رسوا اپنے ناول "امراؤ جان ادا" میں کسی جگہ یہ اقرار نہیں کرتے کہ ان کے ناول کی ہیروئن امراؤ اور حضرت محل میں کسی قسم کا کوئی تعلق تھا۔ اگرچہ وہ بھی فیض آباد کی [illegible] اٹھا لے گیا تھا اور اسے [illegible] کی [illegible] "جنم" سے کے [illegible] ہو چکی تھی۔ کچھ ظاہری حالتوں کی بنا پر یہ شک ضرور ہوتا ہے، لیکن اردو ادب کی تاریخ اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے۔

نجم الغنی مزید تحریر کرتے ہیں کہ وہ لکھنؤ کے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئیں، اور انھوں نے واجد علی شاہ کے حرم میں داخل ہو کر صرف عزت و توقیر ہی حاصل نہ کی بلکہ وہ بادشاہ کی بیگمات میں سب سے زیادہ اہمیت بھی اختیار کر گئیں۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر واجد علی شاہ کی اتنی منظور نظر ہو گئیں کہ حضرت محل کے خطاب سے نوازی گئیں، اور دو ہزار روپیہ ماہانہ ذاتی مصارف کے لیے بھی مقرر کیے گئے۔

بیگم حضرت محل کا ابتدائی نام یا گھریلو نام "امراؤ" تھا اور وہ حالات سے مجبور ہو کر اپنی مرضی کے بجائے دوسروں کے ذریعہ واجد علی شاہ کے قریب لائی گئی تھیں۔ لیکن انھوں نے اپنی آن بان کو کہیں بھی بگڑنے نہیں دیا۔ بچپن کی مفلوک الحال "امراؤ" نے اپنے بیٹے برجیس قدر کو تخت نشین کرا کے زوال سے عروج تک کا سفر محض اپنی خوش قسمتی کے سہارے طے نہیں کیا تھا۔

امرت لال ناگر کا یہ خیال درست ہے کہ عورت کے اندر بغاوت کا یہ پوشیدہ جذبہ ہی مادرانہ قوت لے کر اپنے بیٹے کا تخت بچانے کے لیے اس طرح پروان چڑھا کہ قومیت کا حق ادا کرنے کے ہمیشہ کے لیے قابل تقلید آدرش بن گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر واجد علی شاہ کے تخت کی وراثت بیگم حضرت محل کے بطن سے پیدا ہونے والے برجیس قدر کے حصہ میں دی گئی ہوتی تو شاید انھیں اودھ کے تخت کو محفوظ رکھنے کے لیے تلوار نہ اٹھانا پڑتی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ محض اپنے لڑکے کے اقتدار کی واپسی کے لیے میدانِ جنگ میں اتری تھیں کیونکہ میکلوڈ اینس ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے سلسلے میں تحریر کرتا ہے کہ اہلِ اودھ کی جد و جہد کو کم از کم جنگِ آزادی کہنا ہی پڑے گا۔

دراصل بیگم حضرت محل میں اودھ کی دوسری معزز خواتین کے مقابلے میں بادِ مخالف میں بھی چراغِ عزم و عمل روشن رکھنے کی صلاحیت کہیں زیادہ تھی۔ ان میں ناسازگار حالات میں بھی زندہ رہنے کا حوصلہ موجود تھا۔

بیگم حضرت محل کو دراصل شروع سے ہی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ جانِ عالم (واجد علی شاہ) کی دوسری بیگمات کے علاوہ شاہی خاندان کی مستورات بھی برجیس قدر کی بادشاہت اور اس کے نتیجے میں حضرت محل کو حاصل ہونے والے اقتدار سے ناخوش تھیں۔ اس لیے بیگم کو اس وقت اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا توڑ کرنا پڑا تھا۔

پنڈت دیوی دت شکل نے لکھا ہے کہ یہ سچ ہے کہ اس وقت لکھنؤ میں ایسے بلند حوصلہ رکھنے والے لوگ موجود نہ تھے جو اودھ میں نوابی کو دوبارہ واپس لانے کی ہمت کرتے۔ ولیم رسل بیگم سے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کرتا ہے کہ بیگم میں بڑی قابلیت، اہلیت، شجاعت دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے ہمارے ساتھ فیصلہ کن جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ ولیم آگے چل کر لکھتا ہے کہ ان رانیوں اور بیگموں کے کردار کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زنان خانوں اور حرم میں رہنے کے باوجود انھوں نے باعمل ذہنی طاقت پیدا کر لی تھی۔

بیگم حضرت محل بھرپور صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ ایک مشرقی خاندان کے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود جس سلیقے سے انھوں نے اپنے [illegible] ماحول میں [illegible] حضرت [illegible] جس کامیابی سے طے کیا۔ ان کی ذاتی سوجھ بوجھ [illegible] مظہر تھا۔ اسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ انھوں نے اس وقت بھی کیا جب واجد علی شاہ کو معزول کر کے مٹیابرج (کلکتہ) میں نظربند کر دیا گیا تھا اور وہ ان کے ساتھ کلکتہ جانے کے بجائے لکھنؤ میں ہی مقیم رہیں۔ اگرچہ نجم الغنی کے مطابق ان کا شاہیہ دو ہزار سے گھٹ کر پانچ سو روپیہ ماہوار ہو گیا تھا۔ ان کے شوہر کی معزولی اور انگریزی اقتدار کے سبب شاہی شان و شوکت پر زوال آ گیا تھا۔ انھوں نے اپنے بیٹے شہزادہ رمضان علی "برجیس قدر" کو کم عمری میں اودھ کا تاجدار بنانے کی حمایت کر کے ایک زبردست ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ کیونکہ برجیس قدر کی تخت نشینی ان کے سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہو گئی تھی اور اس ضمن میں حضرت محل کو مشیر بنایا گیا تھا۔

بیگم حضرت محل نے اس موقع پر بھی اپنی سوجھ بوجھ، حکمت عملی اور حسنِ انتظام سے کام لے کر اس نئی ذمہ داری کو بھی بڑے سلیقے سے نبھایا۔ بیگم حضرت محل کو ہر طرح کے ماحول میں اپنے کو ڈھال لینے کا فن آتا تھا۔ چنانچہ محل کی چہار دیواری سے لے کر میدانِ کارزار تک، طاؤس و رباب سے شمشیر و سناں تک، دھنک سے ابو ترنگ تک غرضیکہ ہر جگہ انھوں نے اپنی صلاحیت، تحمل اور انفرادیت کا مظاہرہ کیا۔

بیگم حضرت محل ناکامیوں سے دل شکستہ ہونا نہیں جانتی تھیں۔ جب سترہ جنوری کو مولانا احمد اللہ شاہ زخمی ہو گئے اور تقریباً ایک ہفتہ تک جنگ سے علیحدہ رہے اس وقت بھی بیگم حضرت محل بہادری سے اپنی جگہ جمی رہیں۔

رسل کا خیال ہے کہ بیگم نے جنگی مورچے پر بڑی طاقت اور اہلیت کا مظاہرہ کیا۔ ناگر لکھتے ہیں کہ بیگم حضرت محل نے بھی رانی لکشمی بائی کی طرح عورتوں کا ایک فوجی گروہ [illegible] تیار کیا تھا۔ محلوں کی باندیاں ان کی نگرانی میں قواعد کرتی تھیں۔ انھیں عورتوں نے جاسوس عورتوں کا ایک گروہ بھی تیار کیا تھا

اس طرح آپسی نفاق کے مایوس کن حالات میں بھی ایک ایک فرد کے دل میں بغاوت کا جذبہ تقریباً پونے دو برس تک اودھ میں برقرار رکھنا بیگم کا ہی کام تھا[۱۱]

سندر لال اپنی کتاب "بھارت میں انگریزی راج" میں لکھتے ہیں کہ اہلِ اودھ کی اس جنگِ آزادی میں بیگم حضرت محل کے ماتحت اودھ کی بہت سی عورتیں تک مردانے لباس پہن کر اور اسلحہ سے لیس ہو کر جنگ کر رہی تھیں۔ بیگم حضرت محل کی فوجی صلاحیت اور جنگی حکمت عملی پر روشنی ڈالتے ہوئے امرت لال ناگر تحریر کرتے ہیں کہ اگر بیگم کو فوجی ٹریننگ مل گئی ہوتی تو بلا شبہ مرد کمانڈروں سے بہتر ثابت ہوتیں[۱۲]

غدر کے دوران بیگم حضرت محل کی شخصیت میں کچھ عجیب و غریب کشش پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ آپسی اختلافات کے باوجود ان کے گرد جمع ہو کر ان سے قوت حاصل کرتے تھے۔ جب احمد اللہ شاہ تقریباً ایک ہفتے کے بعد صحت یاب ہوئے اور انھوں نے کولن کیمبل کی کمک پہنچنے سے قبل اوٹرم سے دو دو ہاتھ کرلینا چاہے اور انقلابی سپاہیوں کی بزدلی اور مایوسی کے باوجود احمد اللہ شاہ کے عزم و استقلال میں کوئی کمی نہیں آئی تو ۲۵ فروری کو بیگم حضرت محل برجیس قدر کو اپنے ہمراہ لے کر اپنی شکست خوردہ فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے میدانِ جنگ میں آئیں۔ ان کی موجودگی سے کم حوصلہ لوگوں میں جوش و ولولہ پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں انگریزی فوجوں سے ہونے والی فیصلہ کن جنگ میں جب شہر کا چپہ چپہ ان انقلابیوں کے خون سے لالہ زار ہو رہا تھا اور دلکشا باغ، قدم رسول، شاہ نجف، بیگم کوٹھی وغیرہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی بیگم حضرت محل ہاتھی پر سوار برسرپیکار تھیں۔ عیش باغ میں ہونے والی آخری جنگ میں جب محل کا محاصرہ ہو گیا تو بیگم اپنی دو ساتھی عورتوں اور برجیس قدر کے ہمراہ محل کے عقبی دروازے سے نکل کر دوسرے محفوظ علاقے میں گئیں اور تقریباً تین دن تک اپنی بچی کھچی فوج جمع کر کے مقابلے کے لیے تیاری کرتی رہیں

مارٹن مین لکھنؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ لکھنؤ میں باغیوں کا جوش بیگم اودھ کی موجودگی کی وجہ سے بڑھا ہوا تھا جو غیر معمولی طور پر مستعد اور سرگرم عورت تھیں۔ حقیقتاً وہی تمام بغاوت کی روحِ رواں تھیں۔ دراصل بیگم حضرت محل نے عام فوجیوں کے ساتھ شانہ بشانہ جنگ کے مختلف موقعوں پر شریک ہو کر ادنا و اعلا اور شاہ و گدا کی تفریق کو ختم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر جان یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ دوسری جگہوں پر جنگ کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو لیکن اودھ میں ہماری حکومت کو عوامی بغاوت سے دو چار ہونا پڑا تھا، اس جنگ میں راجہ بینی مادھو سنگھ، میر محمد حسن، نانا صاحب، خان بہادر خاں، دیوی بخش، امر سنگھ، مہدی حسن، اور بیگم حضرت محل شامل تھیں۔ بیگم حضرت محل جنگ کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ اگرچہ ان سب کو ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے جاں بخشی اور جائداد کی واپسی کا یقین دلایا گیا تھا لیکن بیگم حضرت محل نے یہ اعلان کیا کہ کسی کو وکٹوریہ کی بات سے دھوکے میں نہ آنا چاہئے اس اعلان کے بعد اپنے تمام وفادار انقلابیوں کے ساتھ یہ بہادر عورت اپنی تلوار بے نیام کیے گھوڑے پر سوار فوجوں کی قیادت کرتی ہوئی ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار ہو کر میدانِ جنگ میں کود پڑی تھی[۱۳] لیکن قسمت نے یاوری نہ کی اور جب شکست و ریخت ہی انقلابیوں کی قسمت ہو گئی ہو تو وہ بیچاری کیا کرتی ہر طرف سے ناکامی اور نامرادی نے آگھیرا۔ جنگ آزادی کی تحریک تقریباً کچلی جا چکی تھی۔ اس لیے حضرت محل نے حالات سے مجبور ہو کر جنگ ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور آخرکار وہ نیپال جانے پر مجبور ہو گئیں۔ مارٹن مین تحریر کرتا ہے کہ اس کا تعاقب ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہونے لگا، وہ دریائے راپتی کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور ایک لاکھ ساتھیوں کے ساتھ نیپال کی سرحد تک جا پہنچیں اور کوہ بٹول پر واقع نواب آصف الدولہ کی بارہ دری میں قیام پذیر ہوئیں لیکن وہاں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ نیپال کے رانا جنگ بہادر نے نرکھو ماکھی کی معرفت کہلایا کہ انگریزوں سے صلح کرلیں یا مستقل اقامت

اختیار کرلیں۔ ہم سے مدد کی توقع نہ رکھیں۔[۹]

اس طرح وہ اپنے بیٹے برجیس قدر کے ساتھ راجہ نیپال کی پناہ میں بقیہ زندگی کے دن گزارنے لگیں۔ اگرچہ بیگم کو نیپال میں پناہ مل گئی مگر ان کے ہمراہیوں کو نیپال میں داخلے کی اجازت نہ ملی اور وہ سب تتر بتر ہوگئے۔ ایک وقت وہ آیا جب حضرت محل کو اپنا قیمتی سامان اور اپنے جواہرات در بدر تنگ آکر بیچنے پڑے اور وہاں سے گزر بسر کے لیے ایک حقیر رقم مقرر ہوگئی۔ بالآخر اپریل ۱۸۷۹ء میں کھٹمنڈو میں بیگم حضرت محل کی شمع زیست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہوگئی۔ اور اس طرح ایک ناکام بغاوت کی امین دیارِ غیر میں سپردِ خاک ہوئی۔

حواشی

[۱] غدر کے پھول ص۲۲۵، [۲] بحوالہ غدر کے پھول ص۲۲۶، [۳] تاریخ اودھ ص۲۸، [۴] ایضاً، غدر کے پھول۔ ناگر ص۲۲، [۵] بحوالہ ساورکر کی کتاب "INCIDENTS OF THE SEPOYWAR" ص۲۹ سے لیا گیا ہے۔ [۶] بحوالہ حسین عباس عابدی۔ نیا دور اگست ۱۹۷۲ء ص۲۱ [۷] یہ قول امرت لال ناگر نے "غدر کے پھول" نامی کتاب میں "اودھ کے غدر کا اتہاس" سے نقل کیا ہے۔ ص۲۲ [۸] ایضاً [۹] رسل کی مراد غدر کی دو اہم اور نمایاں شخصیتوں بیگم حضرت محل اور رہارانی جھانسی سے ہے۔ [۱۰] "غدر کے پھول"۔ [۱۱] تاریخ اودھ ص۲۸ [۱۲] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص۲۹ [۱۳] "غدر کے پھول"، ناگر ص۲۲۶ / جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ خورشید مصطفےٰ رضوی [۱۴] غدر کے پھول ص۲۶ [۱۵] ایضاً [۱۶] جنگ آزادی، اٹھارہ سو ستاون خورشید مصطفےٰ رضوی ص۳۲۹ [۱۷] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص۹

★

نسیم اختر صدیقی
صاحب گنج نگریا، لکھنؤ

ترانۂ آزادی

آج کا دن ہے کتنا پیارا! آؤ گلے لگ جائیں
دوری پیدا کرنے والی سب دیواریں ڈھائیں
منزل کھنچ کر خود آجائے ایسی روش اپنائیں
پیار کی دھارت سے ٹھکرادیں، نفرت کی ہر ریت
آؤ ہم سب مل کر گائیں، آزادی کے گیت

نفرت ہم کو کیا دیتی ہے؟ کچھ آنسو کچھ آگ
نفرت کے سینے میں پلتے ہیں زہریلے ناگ
پیار کا امرت جو پیتا ہے کھل جاتے ہیں بھاگ
رنگ بدلتی اس دنیا میں کون کسی کا میت
آؤ، ہم سب مل کر گائیں، آزادی کے گیت

پیار جانکی، پیار یشودا، پیار سنت اوتار
پیار اہنسا، پیار شانتی، پیار کا سب سنسار
گل جاتی ہے پیار کی مدھم آنچ میں ہر تلوار
نفرت کے شعلوں کو شبنم کر دیتی ہے پریت
آؤ، ہم سب مل کر گائیں آزادی کے گیت

بیداری کے نغمے چھیڑیں جاگیں احساسات
جادو بھر دیں فنکاروں میں فنکاروں کے ہات
روشن کر دیں مستقبل کے سارے امکانات
جس پتھر میں ہاتھ لگائیں پھوٹ پڑے سنگیت
آؤ، ہم سب مل کر گائیں آزادی کے گیت

غزلیں

پیرزادہ شفقت چشتی
نزد سنہری مسجد، نادان محل، لکھنؤ

دلہن کی طرح ہر شاخِ گل سنوار چلے
چلے چمن میں تو یوں بادِ نو بہار چلے

ہم اب تو راہِ جنوں کی تھکن سے ہار چلے
کوئی ہو طنز کہ وحشت کا، کاروبار چلے

مزہ تو جب ہے کہ جب بادِ نو بہار چلے
کھلائے پھول، تو، کانٹوں کو بھی سنوار چلے

جسے ہو ہم سے خلوص آئے سوئے دار چلے
ہم اک سرے سے، جنوں دوستو، پکار چلے

طلب ہے کیسی، سفر ختم ہی نہیں ہوتا
سحر ہوئی کہ گدایانِ کوئے یار چلے

ب آئیں وہ، تو، ہمارا سلام کہہ دینا
ملیں گے حشر میں اے شامِ انتظار چلے

اب آپ بھی وہ ہمیں دیکھنے، تو کیا آئے
گزارنا تھے جو لمحے وہ ہم گزار چلے

تجلیوں نے پکارا ہی تھا سرِ منزل
نیاز مند لیے دل میں یادِ یار چلے

یہی ہے مست نگاہی کا احترام شفقت
کہ دورِ جام چلے اور بار بار چلے

طاہر جرولی
کتب خانہ ناصریہ شاستری نگر لکھنؤ

دیدۂ خشک میں دیکھی تپشِ دل میں نے
بخش دی بحر کو خودداریِ ساحل میں نے

دفترِ کن میں جو تھا نقطۂ اسرارِ وجود
آہ برباد کیا آج وہی دل میں نے

مجھ کو بہتے ہوئے دریا سے نہ پہنچا کچھ فیض
جان دی تشنہ لبی میں لبِ ساحل میں نے

میری دشوار پسندی نے کیا مجھ کو ہلاک
کسی مشکل کو نہ سمجھا کبھی مشکل میں نے

ذرہ ذرہ میں عیاں مدرسۂ عبرت تھا
عمر بھر کچھ نہ کیا دہر سے حاصل میں نے

میں نے دنیا سے تعلق ہی نہ باقی رکھا
کر دیا دور یہ اندیشۂ باطل میں نے

اک جھلک ان کی دکھائی دی مجھے تہِ تیغ
ڈوبتے میں کیا نظارۂ ساحل میں نے

آگیا ان کو وفاؤں کا یقیں اے طاہر
آج سر کر لی رہِ عشق کی منزل میں نے

غزلیں

سلطان احمد نادمؔ
محلہ گھسیٹی گیٹ باسی کی مسجد
لکھنؤ

مرے دل میں دردِ نہاں اور بھی ہیں
فسانے بہ طرزِ فغاں اور بھی ہیں

نہیں صرف موسیٰ رہینِ تجلی
ترے حسن کے رازداں اور بھی ہیں

نہ کر اتنا ذکرِ فریبِ محبت
ہزاروں فریبِ جہاں اور بھی ہیں

نہیں صرف نرگس کی بیدار آنکھیں
زمانے میں دیدہ وراں اور بھی ہیں

نہیں ختم بیداد دار و رسن پر
مرے ظرف کے امتحاں اور بھی ہیں

نکل ہی چلیں گے کبھی سوئے صحرا
جنوں کے یہاں کارواں اور بھی ہیں

چھپانے کو نادمؔ وہ اپنی جفائیں
مرے حال پر مہرباں اور بھی ہیں

قمرؔ کسبوانی
معرفت منزل بسواں
ضلع سیتاپور

حسن میں خوئے وفا ہو یہ ضروری تو نہیں
پھول خوشبو میں بسا ہو یہ ضروری تو نہیں

کافرِ دیں کا بُرا ہو یہ ضروری تو نہیں
صرف مسلم کا خدا ہو یہ ضروری تو نہیں

تیری مرضی ہے کرم جس پہ ترا ہو جائے
میری مقبول دعا ہو یہ ضروری تو نہیں

عشق انسان کا خوددار بھی ہو سکتا ہے
حسن کے در کا گدا ہو یہ ضروری تو نہیں

کچھ فرشتوں کو بھی دیکھا ہے گنہگاروں میں
آدمی سے ہی خطا ہو یہ ضروری تو نہیں

تیرے ہونٹوں کے حسین، نرم تبسم کی قسم
غم محبت کا صلہ ہو یہ ضروری تو نہیں

یہ حسیں قتل نگاہوں سے بھی کر دیتے ہیں
خون ہاتھوں میں لگا ہو یہ ضروری تو نہیں

چاند کے داغ جو دیکھے تو قمرؔ یاد آیا
حسن میں حسنِ ادا ہو یہ ضروری تو نہیں

غزلیں

فاطمہ وصلیہ جائسی
۳۴- ساتویں لائن نشاط گنج لکھنؤ

تنہائیوں میں بات ہوئی ہے کبھی کبھی
آنکھوں میں ساری رات کٹی ہے کبھی کبھی

طولِ شبِ فراق کا انداز دیکھیے
وقتِ سحر بھی رات ملی ہے کبھی کبھی

جھونکے ہوا کے آئے تو فانوس بن گئے
یوں شمعِ حیات جلی ہے کبھی کبھی

خود مسکرائے ہونٹ پیے اشک پی لیے
یوں بھی کسی سے بات ہوئی ہے کبھی کبھی

جامِ جہاں نما کی ضرورت نہ رہ گئی
یوں دولتِ حیات ملی ہے کبھی کبھی

شاید رہِ وفا ہے وصلیہ کے واسطے
الجھی ہوئی حیات ملی ہے کبھی کبھی

کے- بی تیواری مکل سیتا پوری

فہم و ادراک کا جس روز سے در کھولا ہے
دستِ قدرت نے مصائب ہی کا گھر کھولا ہے

تیری خاموش نگاہوں نے دیا اذنِ کلام
منہ جو کھولا ہے ترے زیرِ اثر کھولا ہے

بارہا آپ کے دیدار کی خاطر ہم نے
دیدۂ شوق بصد ذوقِ نظر کھولا ہے

آپ کے حسن کی صرف ایک جھلک نے اکثر
رازِ خود بینیِ اربابِ نظر کھولا ہے

پاس اپنے نہیں جز دولتِ اشعار کے سوا
یہی ہم نے درِ گنجینۂ زر کھولا ہے

عادل سجاد
معرفت محی الدین عادل
پرانی بستی روڈ، جگسلائی
جمشید پور

زہر کی ہلاکت آفرینیاں

زہر ایک ایسی معمولی اور خطرناک شے ہے جو رازدرانہ ڈھنگ سے، پوشیدہ طریقے سے اور بغیر کسی قوت کے استعمال کے زندگی کا خاتمہ کمنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہے۔ انسان ازل سے اس کے حاصل کرنے کی سعی میں مبتلا رہا ہے اور ہلاکت کا یہ طریقہ اختیار کرنے کے در پے رہا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ طرح طرح کے زہروں نے موقع و محل کے مطابق عشق اور دشمنی کے سلسلہ میں جرائم کے ارتکاب میں اہم رول ادا کیا ہے اور اپنی ہلاکت آفرینی کا بین ثبوت دیا ہے۔

موت دو طرح کی ہوا کرتی ہے۔ ایک طبعی۔ دوسری غیر طبعی۔ طبعی موت تو یقینی طور سے ہونی ہی ہے مگر اس سے قبل کہ طبعی موت آئے غیر طبعی موت انسان کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے اس کی ہزاروں مثالیں اس دنیا میں موجود ہیں۔ قیاس ہے کہ رہتی دنیا تک انسان اپنی حیوانی جبلت کا مظاہرہ کرتا رہے گا اور مارنے کا طریقہ بدل بدل کر طرح طرح سے انسان کو اذیت پہنچاتا رہے گا۔ اور روح بھٹکتی رہ جائے گی۔

غیر طبعی موت میں حصہ لینے والے عناصر میں زہر کا اہم مقام ہے یہ زہر مختلف طرح کے ہوتے ہیں ان کی بعض اقسام کو جاننا محال اور مزہ چکھنا مضر ہے۔ کیونکہ دنیا کے مختلف مقامات پر مختلف اقسام کے زہر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ مگر زہر کے ذریعہ ہلاک کیے گئے چند افراد کی موت ایک یادگار نقش چھوڑ گئی ہے۔

بوسے میں زہر:۔ امریکہ میں ایک مجرم جواہرات چرانے کے جرم میں جیل کی کوٹھری میں بند تھا۔ ایک دن اس سے ایک انجان عورت ملاقات کی غرض سے آئی جس نے خود کو مجرم کا رشتہ دار بتایا، لمبے، چھریرے جسم والی وہ عورت قیمتی اور دیدہ زیب لباس پہنے ہوئے تھی۔ جس بڑی چمکیلی کار سے وہ جیل کے احاطے میں اتری اسے شوفر چلا رہا تھا۔ عورت کے پاس اونچے عہدیدار کا قرطاس تھا۔ چمکیلے رنگوں والے ریشمی کپڑے میں پوری طرح ڈھکے ہونے کے سبب اس کا چہرہ قطعی نہیں دکھائی پڑ رہا تھا۔ ایک سپاہی نے اسے مجرم کی کوٹھری کے نزدیک لاکر سلاخوں کے باہر کھڑا کر دیا۔ دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتے رہے۔ جسے سپاہی سن نہ سکا۔ اگرچہ وہ ان سے تھوڑی دور پر ہی کھڑا ہوا تھا۔

واپس جانے سے تھوڑی دیر پہلے اس عورت نے اپنا گھونگھٹ اٹھایا اور اچانک اس مجرم کے ہونٹوں پر سلاخوں کے بیچ سے کافی دیر تک ایک گہرا بوسہ دیا۔ کچھ لمحوں ہی میں وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بینچ پر گر پڑا۔ ٹھیک اسی وقت وہ عورت اسی طرح اپنے چہرے کو پوری طرح ڈھکے سسکیاں لیتی ہوئی جلدی سے باہر آئی اور کار میں بیٹھ کر

چلی گئی۔ سپاہی لوٹ کر مجرم کی کوٹھری کے نزدیک آیا اور اسے بینچ پر پڑے ہوئے دیکھا۔ جانچ کرنے کے بعد وہ مردہ پایا گیا۔ اس قیدی کے ہونٹوں کے بیچ میں ایک مسلا ہوا سگریٹ کا پتلا کاغذ تھا جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ فوراً جیل کا ڈاکٹر بلایا گیا اور سگریٹ کے کاغذ کی باقاعدہ جانچ کرنے پر معلوم ہوا کہ کاغذ میں پوٹاشیم سائنائیڈ زہر لگا ہوا تھا۔

سپاہی کے قول سے اس بات کی شہادت ملی کہ سگریٹ کا کاغذ عورت کے ہونٹوں کے بیچ دبا ہوا تھا جسے اس نے بوسہ کے دوران مجرم کے منھ میں ٹھونس دیا تھا۔ قیدی نے سائنائیڈ زہر کو تھوک کے ساتھ نگل لیا تھا۔ پھر بھی اس عورت کا پتہ نہیں چلا۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اور مجرم کو اس طرح سزا دینے کی وجہ کیا تھی؟

چیونگم میں زہر۔ ایک دوسرا واقعہ امریکہ کے میری لینڈ میں پیش آیا تھا۔ کرسمس کے دن کی پہلی رات کو مسٹر ٹرگ اور میری لوشرین سے میری لینڈ کے تقریباً سبھی لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ میری لوسر کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر سیدھے تنے ہوئے بیٹھے پائے گئے۔ دونوں موت سے ہم آغوش تھے۔ ایک گھنٹہ قبل مس میری لوسر اور مسٹر ٹرگ کو میری لوسر کی ماں نے اسی طرح پاس بیٹھے ہوئے زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس وقت دونوں کرسمس کے دن ہونے والی اپنی شادی اور مستقبل کے سنہرے خوابوں کے متعلق محبت بھری باتیں کرنے میں محو تھے ایک گھنٹہ بعد جب ماں پھر کمرے میں آئی تب اس نے ٹرگ اور اپنی بیٹی کو اسی حالت میں بیٹھے ہوئے پایا۔ لیکن مردہ۔ بہت جستجو کرنے پر بھی کمرے میں ایسی کوئی شے نہیں ملی جس سے غیر فطری موت کے متعلق کوئی رائے ظاہر کی جا سکے۔

اس اچانک اور بھیانک موت سے پہلے ماں نے دونوں کو ہنسی اور محبت بھرے لہجے میں گفتگو کرتے سنا تھا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی اور اس نے اپنی بیٹی کو اپنی سہیلی سے اگلے دن کی شادی کے بارے میں بڑے پرجوش انداز میں پیغام دیتے سنا تھا۔

ڈاکٹروں نے جانچ کی۔ جانچ کرنے کے بعد دونوں کے ہونٹوں کو جلا ہوا پایا گیا۔ مسٹر ٹرگ کے منھ میں چیونگم کا ٹکڑا بھی ملا جس میں ڈاکٹر کے مطابق زہر تھا۔

لاش کا جائزہ لینے کے بعد دونوں کے جسم میں قلیل مقدار میں پوٹاشیم سائنائیڈ پایا گیا لیکن دونوں کے جسم میں زہر گیا کیسے، اس کا علم جستجو کے بعد بھی نہیں ہوا۔ صرف دونوں کی زبان اور ہونٹ جلا ہوا پایا گیا۔ مسٹر ٹرگ کے پیٹ میں بہت زیادہ مقدار میں زہر ملا۔

امریکہ میں چیونگم کا چبانا ایک عام بات ہے اس کی ایک ڈبیا زمین پر پڑے ہوئے پتلے کاغذ کے ساتھ مسٹر ٹرگ کے بستر پر ملی۔ ڈبیا میں چیونگم تھا۔ سوال معنی خیز تھا کہ کیا چیونگم موت کا سبب ہے، نئی ڈبیا سے نکلا ہوا ایک ہی چیونگم دونوں نے آدھا آدھا کھایا تھا۔

لڑکی کی ماں نے خودکشی کو غیر ممکن قرار دیا کیونکہ دونوں میں بے حد محبت تھی اور ان میں کبھی کسی وجہ سے من مٹاؤ نہیں ہوا تھا۔ مس لوسر کی ایک چھوٹی بہن تھی جو بہت ہی خوبصورت تھی۔ مسٹر ٹرگ بڑی بہن سے پہلے اسی پر عاشق ہوئے تھے۔ اس نے بتلایا کہ اس پر بھی سائنائیڈ بہت کم مقدار میں استعمال کیا گیا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ خطرناک ثابت نہیں ہوا۔

خاص کر ڈاکٹر نے بتلایا کہ "جب میں ڈرائنگ روم میں آیا تب میں نے دونوں کو صوفے پر سیدھے تنے ہوئے پاس پاس بیٹھے دیکھا۔ لڑکی کے اوپر اور نیچے کے دانت آپس میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی سانس بند ہونے کو ہی تھی ہونٹ کے دونوں کناروں پر جھاگ نکل رہا تھا۔ جو پوٹاشیم سائنائیڈ یا ہائیڈروجن کے اثر ہی سے ممکن ہو سکتا تھا۔ چھوٹی بہن کے کمرے میں جانے پر گیس کی تیز بو ملی۔

ان تمام امور کی روشنی میں یہ بات واضح ہوئی کہ مسٹر ٹرگ آخری مراحل میں کسی وجہ سے بڑی بہن سے شادی کے خلاف

ہوگیا اس لیے اس نے چیونگم میں زہر ملا کر اسے کھلا دیا ہوگا اور خود بھی چیونگم کا چھوٹا ٹکڑا یہ سمجھ کر کھا لیا ہوگا کہ اس کا اثر اس پر بہت کم ہوگا۔ پھر بھی ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق چیونگم میں نہ تو پوٹاشیم سائنائڈ ملا۔ مگر پوٹاشیم سائنائڈ ملایا کیسے گیا۔ اس کا علم نہ ہو سکا۔

زہریلی پالش:۔ کچھ عرصہ قبل جوتوں کی پالش کے ذریعہ بھی زہر کا استعمال محیر العقل طریقہ سے کیا جاتا تھا اور لوگ ایسے حادثات سے پریشان ہوگئے تھے۔ ایک نوجوان بال ڈانس میں گیا تھا۔ ناچتے ناچتے وہ اچانک بیہوش ہوگیا اور چار گھنٹے کے اندر ہی اس کی موت ہوگئی۔ پولیس موت کی وجہ نہ سمجھ سکی اور یہ حادثہ جنعق ایک معمہ بنا رہا۔ اس کے کمرے کی تلاشی لینے کے دوران کالی بوٹ پالش کی شیشی ملی۔ اس پالش کا استعمال اس نے رات ڈانس کلب جانے سے پہلے کیا تھا۔ پالش جوتے کے چمڑے میں سوراخ کر کے اس کے موزے کے باریک سوراخوں سے پیر تک آگئی۔ پیروں پر اس کا کالا رنگ لگ گیا تھا۔ پالش کی جب جانچ ہوئی تو پتہ چلا کہ اس میں خطرناک زہر نائٹرو بنزین ڈائی ہائیڈرو کافی مقدار میں ملا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ناچتے ناچتے اس کے گرم پیروں کے پسینہ کے ساتھ یہ زہر پوری طرح تحلیل ہوگیا جو اس کی موت کا سبب بن گیا۔

کھانے میں زہر:۔ کھانے میں زہر ایک عام بات ہے۔ اس سلسلے میں سب سے حیرت انگیز واقعہ جنوبی امریکہ کا ہے۔ جہاں ایک دوست نے پھل کے ذریعہ اپنے دوست کی جان لے لی۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ دوست نے اپنے دشمن نما دوست کو کھانے میں سیب کی طرح کا پھل پیش کیا۔ وہ پھل اس قدر سریع الاثر تھا کہ اس کی موت کھانے کے فوراً بعد ہوگئی۔

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ جمشید پور میں شوہر اور بیوی کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث پیش آیا۔ عورت اپنے شوہر سے زیادہ تعلیم یافتہ تھی۔ ایک دن اس کی بیوی اپنے شوہر کو دکھ اپنے میکے گئی اور وہ بے کھانے میں زہر کا استعمال کیا۔ جس کا ایسا اثر ہوا کہ جسم پر پھوڑے جیسی چیز نمایاں ہونے لگی۔ اس گھاؤ سے بعض اوقات پانی بھی نکلتا تھا مگر پھوٹتا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوگیا۔ اس کا سارا جسم سوجا ہوا نظر آتا تھا۔

ڈاکٹروں نے اس کا علاج کیا۔ مگر لاحاصل۔ انھوں نے بتایا کہ پارہ سے ملی جلی کوئی چیز اسے کھلا دی گئی تھی۔ بالآخر اس کی موت ہوگئی۔

★

غزل

آصف لکھنوی
احاطہ مبارک، مفتی گنج لکھنؤ

ہر ایک سیلِ غم کا مقدر ہے آدمی
اس دور میں غموں کا سمندر ہے آدمی
دعویٰ تو یہ کہ شیشے سے نازک ہے دل مگر
شیشہ جو سامنے ہو تو پتھر ہے آدمی
چلتا رہے تو زیرِ قدم ہیں مہ و نجوم
بیٹھے جو تھک کے راہ کی ٹھوکر ہے آدمی

در اصل ہے عطیۂ قدرت گداز دل
سرمایۂ الم سے تونگر ہے آدمی
غم اور صرف غم ہی ملے جس کے سائے میں
اوڑھے ہوئے خوشی کی وہ چادر ہے آدمی
ہر زاویے سے ہم جسے انسان کہہ سکیں
دنیا کو اب کہاں وہ میسر ہے آدمی

آصف یہ اور بات کہ بونے لگا ہے زہر
ورنہ محبتوں کا پیمبر ہے آدمی

اقبال جرولی
دیوان قاضی۔ جرول۔ بہرائچ

غزل

جس کی ہر بات سے ڈوبی ہوئی دانائی میں
یہ صفت پائی گئی بس ترے سودائی میں

شبِ ہجراں کی قسم تیرے تصور کے سوا
اور کوئی نہیں آیا شبِ تنہائی میں

اور ہم لفظِ محبت کی کریں کیا تشریح
یہ سمجھ لیجئے پربت ہے چھپا رائی میں

دلِ شکستہ کو یہاں دعوتِ نغمہ دے کر
سُر بکھرے جاتے ہیں ٹوٹی ہوئی شہنائی میں

جب بھی گل چینوں نے صحراؤں میں چھاپے مارے
پھول ہی پھول ملے دامنِ صحرائی میں

زخمِ دل اور بھی ہو جاتا ہے ساون میں ہرا
اتنی اعضا شکنی ہوتی ہے پروائی میں

بن گئے مرکزِ اخلاقِ تمدن وہ لوگ
سب سے آگے جو نظر آتے ہیں رسوائی میں

ظفر شہیدی
احاطہ کمال جمال - تہجو کماس
رکاب گنج - لکھنؤ

جشنِ آزادی

جشنِ آزادی ہمیں ایسے منانا چاہیے
دور ہیں جو بھی انھیں نزدیک لانا چاہیے
جو بھی ہے تفریق باہم سب مٹانا چاہیے
زندگی کو زندگی کے پاس آنا چاہیے
الفتِ ارضِ وطن کی پاؤں میں زنجیر ہو
تو یہی یکجہتی ہی اپنے خواب کی تعبیر ہو

دوستو آؤ جہالت کی یہ باتیں چھوڑ دیں
درمیاں میں جتنی دیواریں بھی آئیں، توڑ دیں
جب ہواؤں کے مخالف رخ ہوں ان کو موڑ دیں
پیار اور اخلاص سے سب پیارے ناطے جوڑ دیں
ایک ہو کر ہم رہے تو زندگی بن جائے گی
ہر کرن خود آفتابِ روشنی بن جائے گی

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب: برگِ غزل، شاعر: ابو محمد سحر، قیمت: پندرہ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ ادب، ۳۹۔ مالویہ نگر بھوپال ۴۶۲۰۰۳

کئی کتابوں کے مصنف ابو محمد سحر کی شعری صلاحیتوں کا مظہر یہ مجموعہ ان کے سلسلۂ افکار کی ایک اہم کڑی ہے۔

غزل کی حیثیت اردو کے شعری ادب میں وہی ہے جو کسی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ ادب کے پیکر میں یہ اسی طرح دھڑکتی اور زندگی کا ثبوت دیتی ہے جس طرح بدن کے ایوان میں کوئی جیتا جاگتا اور حیات کے رنگ بکھیرتا ہوا قلب ہوتا ہے۔ ابو محمد سحر کی غزلیات کا گلدستہ جس کو بجا طور پر برگِ غزل کا نام دیا گیا ہے ایک ایسا "تحفۂ درویش" ہے جو نہ صرف اپنے آب و رنگ میں بلکہ معنویت کے حسن میں بھی خاصے کی چیز ہے۔ خوبصورت سرورق، حسن کتابت اور عمدہ کاغذ سے آراستہ یہ مجموعہ جس میں ۵۰ سے زیادہ غزلیں شامل ہیں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۰ء تک کی تخلیقات پر مشتمل ہے اور سحر صاحب کے فنی ارتقا کا آئینہ دار ہے۔

ابتدائی غزلیں کم و بیش سب کی سب روایتی اندازِ غزل گوئی کی نقیب مگر صاف ستھری شاعری کی ترجمان ہیں تاہم جیسے جیسے مصنف کا فن نکھرتا جاتا ہے لب و لہجہ میں تیکھا پن، اسلوب میں پختگی اور اندازِ بیان میں حقیقت پسندی کا رنگ تیز ہوتا جاتا ہے:

راہِ وفا میں قطرۂ شبنم بھی ہے بہت
جس سے بجھے گی پیاس وہ دریا نہ آسکا

ہو جائیں آپ بھی کہیں پتھر نہ دیکھئے
جادوگروں کا شہر ہے مڑ کر نہ دیکھئے

ترکِ الفت میں بھی الفت کے نشاں باقی ہیں
قافلہ لٹ کے تری سمت رواں آج بھی ہے

کس منہ سے اس کو دشمنِ ہوش و خرد کہیں
دیوانہ جس کے نام پہ ہشیار ہو گیا

صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے آراستہ پیراستہ ابو محمد سحر کا یہ مجموعہ ہر طرح لائق پذیرائی اور ان کی دوسری بہت سی تصنیفات کی طرح ادبی حلقوں میں خیر مقدم کا مستحق ہے۔ — شاکر مجید دلی

نام کتاب:۔ فسانۂ عجائب۔ نام مرتب: ڈاکٹر سلیمان حسین قیمت مجلد: ۱۸ روپے۔ پیپر بیک ۱۶ روپے ۵۰ پیسے۔ شائع کردہ:۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔

رجب علی بیگ سرور کی تالیف فسانۂ عجائب اردو نثر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ یہ کتاب کہاں کہاں، کب کب اور کتنی بار چھپی ہے اس کے بارے میں اعداد و شمار پیش کرنا بھی دشوار ہے۔ ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے دورِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ مرتب نے خاصی چھان بین کے بعد اس کتاب پر ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے جو کتاب کے مطالعے میں معاون ثابت ہوگا۔ آخر میں حواشی و تعلیقات، آثار و اماکن کا اشاریہ نیز فرہنگ بھی شامل ہے۔ یہ تمام پہلو اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ آخر میں ۱۲۰ مصادر پر مشتمل خاصی مرعوب کن فہرستِ ماخذ دی گئی ہے جو اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کی رہنمائی کر سکے گی۔ مقدمہ، حواشی و تعلیقات، اشاریہ آثار و اماکن اور فرہنگ میں جگہ جگہ مرتب کی محنت اور وسعتِ مطالعہ کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن مرتب نے ان امور کے علاوہ کتاب کے اصل متن کو بھی محنت سے پیش کیا ہے۔ متن میں جگہ جگہ شامل اشعار اور عربی عبارتوں پر توضیحی فٹ نوٹ لکھے گئے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ زیرِ تبصرہ ایڈیشن میں فسانۂ عجائب کے منثور متن میں جگہ جگہ ایسے متعدد اضافے ملتے ہیں جن سے کتاب کی عام اشاعتیں محروم ہیں۔ متن کی یہ فاضل عبارتیں فسانۂ عجائب کی ان دو کیاب معتبر اشاعتوں پر مبنی ہیں جو رجب علی بیگ سرور کی زندگی میں ۱۸۶۶ء نیز فروری ۱۸۵۱ء میں منظر عام پر آئی تھیں۔ ان اشاعتوں کے متن میں بعض ایسی عبارتیں محفوظ ملتی ہیں جو بعد کو کتاب سے خارج کر دی گئی تھیں۔ ان حالات میں زیرِ تبصرہ ایڈیشن فسانۂ عجائب کا ایک معتبر اور مفید مطلب متن پیش کرتا ہے۔

کتاب کے مقدمے (ص ۱۰) میں رجب علی بیگ سرور اور غالب کی ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غالب اور رجب علی بیگ سرور کے درمیان اس مکاتبت کا ذکر نہیں ملتا ہے جس کی تفصیل اب روشنی میں آچکی ہے [ملاحظہ ہو مضمون راقم الحروف " غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور " مشمولہ ہماری زبان دہلی شمارہ ۸ ر ستمبر ۱۹۸۰ء نیز ۱۵ ر ستمبر ۱۹۸۰ء]

کتاب کے حواشی (ص ۳۱۹) میں دیوانِ خواجہ میر درد کے متعلق لکھا گیا ہے کہ " دیوان کے نسخے بہت ملتے ہیں، لیکن کوئی بھی نسخہ عہدِ مصنف کا اب تک دریافت نہ ہو سکا " فسانۂ عجائب کے زیرِ تبصرہ ایڈیشن میں مرتب کا یہ بیان محلِ نظر قرار دیا جائے گا کیونکہ ڈاکٹر فضل امام کی کتاب دیوانِ درد کا نقشِ اوّلین طبع ۱۹۷۹ء میں دیوان میر درد [متوفی ۱۱۹۹ھ] کے جس قلمی نسخے کو پیش کیا گیا ہے وہ خواجہ میر درد کی زندگی میں ہی ۱۶ ربیع الآخر ۱۱۹۳ھ کو مکمل ہوا تھا [ملاحظہ ہو دیوانِ درد کا نقشِ اول ص ۱۰]

—— کاظم علی خاں

——٭——

نام کتاب :- لالہ زار ، نام شاعر : بدری پرشاد شنگلو ،
صفحات : ۲۰۸ ، قیمت : ۱۵ روپے ۔
ملنے کا پتہ :- راج بھون ٹیلی فون ایکسچینج روڈ ۔ لکھنؤ ۔

اردو شاعروں اور بالخصوص غزل گو شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ہمارے نقادوں نے اکثر ان کی زمانی اور مکانی حد بندی کی یعنی زبان کے تدریجی ارتقار کے پیشِ نظر متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا کی صفیں قائم کی گئیں یا زبان کے اختلافات کی بنا پر ایک گروہ لکھنوی شعرا کا رہا، دوسرا دہلوی شعرا کا ہر دو مقامات کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات نے جس حد تک متعلقہ مقامات کے شعرا کو متاثر کیا۔ اس کا بھی ان کے کلام میں جائزہ لیا گیا یا پھر مختلف اساتذہ کی پیروی اور ان کے رنگ میں شعر کہنے کی بنا پر شاعروں کے کلام کی جانچ کی گئی ۔ یہ سلسلہ شعرا کے کلام کی خصوصیات متعین کرنے میں اب بھی برتا جاتا ہے ۔ غالب، حسرت، اور اقبال کے اسلوب سے کون شاعر کتنا متاثر ہوا ہے اس کی نشان دہی تنقیدی جائزوں میں برابر ہوتی رہتی ہے لیکن کس شاعر نے اپنے علاقہ کی خصوصیات ، اس کے ماحول ، اس کے مناظر اور اس کے مزاج کو اپنی غزلوں اور نظموں میں کس حد تک اپنایا ہے اور اپنے علاقہ کی خصوصیات کی کتنی نمائندگی کی ہے ۔ اس پہلو پر کم توجہ دی گئی در اصل غزل گوئی کا جو انداز زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے اس نے غزل کے موضوع بڑی حد تک متعین کر دیئے تھے ۔ صرف اسلوب بیان کا فرق ، ایک شاعر کو دوسرے سے ممتاز کرتا تھا۔ غزل گو شعرا کے علاوہ نظم گو شعرا کی تعداد بھی محدود ہے ۔ جنھوں نے کسی مخصوص علاقہ سے اپنی وابستگی کا اظہار اپنی منظومات میں کیا ہے ۔ اور وہ اپنے نگارشات کی بنا پر اپنے علاقہ کے نمائندے متصور ہوں ۔

ان حالات میں جب جناب بدری پرشاد شنگلو کا مجموعہ کلام لالہ زار سامنے آیا تو اس کا ہر ورق اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ مصنف کا تعلق ایسے علاقہ سے ہے جو گل، ریحان ، لالہ و نرگس ، نسرین و نسترن سبزہ زار ، آبشار و جوئے بار برف و سنگ کا علاقہ ہے ۔

شنگلو صاحب کشمیری پنڈت ہیں اور کشمیر کی حیثیت صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ ہمارے برعظیم کا ایک خطہ ہے، کشمیر کے ساتھ ہماری روحانی ، ادبی ، سیاسی ، رومانی اور جمالیاتی وابستگیاں ہیں ۔

اگر ہم کشمیر کے صرف پنڈت شعرا کی تعداد اور ان کے ادبی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس بات سے فخر محسوس ہوتا ہے کہ دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں وہ اردو ادب و شاعری پر چھائے ہوئے ہیں ۔ اب سے لگ بھگ پچاس سال پیشتر کشمیر کے پنڈت شعرا کا تذکرہ موسومہ " بہارِ گلشنِ کشمیر کئی جلدوں میں پنڈت برج کشن کول و پنڈت جگ موہن ناتھ رینا شوق صاحبان نے کئی جلدوں پر ترتیب دے کر شائع کیا تھا ۔ اس تذکرہ میں جن شعرا سے ہم متعارف ہوتے ہیں ان کی تعداد تین چار سو سے کم نہیں اور ان میں اکثر ایسے نام ہیں جو آج بھی صف اول کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں پنڈتوں کے علاوہ دوسرے ہندو شعرا کتنے ہوں گے اور پچھلے پچاس سال میں کتنا اضافہ اس تعداد میں ہوا ہوگا اس کا اندازہ مشکل ہے

شگفتہ صاحب کا کشمیر سے جو تعلق ہے اس کا اظہار زیر نظر مجموعہ کے ہر ورق سے ہوتا ہے اس لیے شگفتہ صاحب کی یہ تصنیف بطور خاص قابل قدر اور قابل تقلید ہے کہ ہمارے شعرا کو یہ احساس ہو کہ ہمارے ملک کا ہر علاقہ اپنے مخصوص مقامی رنگ، اپنے الگ صبح و شام، اپنے جداگانہ موسم رکھتا ہے یا انھیں مقامی کیفیات اور ان سے پیدا ہونے والے تاثرات کی ترجمانی اگر ہم اپنی غزلوں اور نظموں میں کرنے لگیں تو ہماری شاعری فطری شاعری بن جائے۔

شگفتہ صاحب نے اپنے مجموعہ کلام میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ اور ہر جگہ گل و ریحان، نرگس و یاسمن، آبشار و جوئے بار کی بہاریں کسی نہ کسی علامت کے طور پر نظر آئیں گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو شاعری میں ایک مخصوص علاقہ کے پس منظر سے ایسی بھرپور ([illegible]) چند شعرا نے حاصل کی ہوگی۔ مسلسل غزلوں اور نظموں کے علاوہ متفرق اشعار میں بھی ایسی علامتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو شگفتہ صاحب کی کشمیر سے وابستگی کو واضح کرتی ہیں۔ ؎

چٹانوں سے الجھتا جا رہا ہوں
ہتھیلی پر لیے آبگینہ

جوئے مترنم کی طرح زمزمہ برلب
رنج و غم ہستی کے بیاباں سے گزر جا

ہیں نمازیں تری یخ بستہ پندار ہنوز
سوز حاصل نہیں شاید ترے سجدوں کو ابھی

بلاشبہ شگفتہ صاحب نے اپنے اجداد کی سرزمین سے اپنے مادی اور روحانی وابستگی کے اظہار کا پورا حق اپنے زیر نظر مجموعۂ کلام کے ذریعہ ادا کر دیا ہے اور اگر ان کے کلام کی صرف اسی خصوصیت کو سامنے رکھا جائے تب بھی ان کی مساعی قابل تحسین ہیں

—— شبیر حسن خاں

نام کتاب: وادیٔ شاعر، شجاع خاور، قیمت: چھ روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

زیر نظر مجموعہ شجاع خاور کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ شجاع خاور نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں اور اپنے مخصوص لب و لہجہ کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ جدیدیت کے قائل بھی ہیں اور بے معنی جدیدیت کی فیشن پرستی کے مخالف بھی۔ ان کو روایات کی فرسودگی کا احساس بھی ہے اور جدتوں کی تلاش بھی۔ ان جدتوں کی تلاش میں ان کے شعور نے کتنے اجالے اور کتنے اندھیرے دیکھے ہیں اس کا احساس ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کا کلام نوجوان نسل کی ذہنی کشمکش کا آئینہ دار ہے جس میں آج کی زندگی اس کی نفسیات اور کیفیات کا عرفان بعض اوقات چونکا دیتا ہے۔ اور بعض اوقات مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس مختصر مجموعے کے ایک سرسری مطالعہ میں جو اشعار اپنے مخصوص تیوروں سے روکتے اور ٹوکتے ملے نذر قارئین ہیں:۔

ہم صوفیوں کا دونوں طرف سے زیاں ہوا
عرفان ذات بھی نہ ہوا رات بھی گئی

اپنے گھر کی تلاش میں اکثر — دوسروں کے بھی گھر گئے کچھ لوگ
آپ کی تنہائی سے کھیلیں گے ہم — رات کچھ نیچے مرے سر ہو گئے
میں نے پوچھا تھا خوشی کا فلسفہ — آپ تو آپے سے باہر ہو گئے
ضبط سے ٹوٹ گیا سارا جسم — پاؤں چادر سے نہ باہر نکلا
وہ شہر تو آباد تھا لوگوں سے ہمیشہ — یاں لوگ ہی ایسے تھے کہ آباد نہیں تھے
مجھ کو دکھا دی سمت اجالے کے شہر کی — اندھا جہان پھر بھی مرے ساتھ کر دیا

امید ہے کہ شجاع خاور کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ فکر و فن اور زندگی کی جولانیاں بڑھتی جائیں گی۔

—— ذکی کاکوروی

*



فلسطینی تنظیم آزادی کے سربراہ جناب یاسر عرفات ۲۱ر مئی ۱۹۸۲ء کو ہندستان کے دورے پر تشریف لائے تو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور وزیر خارجہ شری نرسمہا راؤ نے دہلی ہوائی اڈے پر ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔



نیا دور
جلد ۳۷ نمبر ۶
ستمبر ۱۹۸۲ء
ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش
پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر بنام ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ
دفتر: ایڈیٹر نیا دور ... ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ہماری ریاست اترپردیش کے بیشتر اضلاع سیلاب کی تباہ کاریوں سے دوچار ہیں۔ گزشتہ چند برسوں کے اعداد و شمار شاہد ہیں کہ ڈیڑھ کروڑ سے لے کر ڈھائی کروڑ تک کی آبادی سیلاب کی زد میں آجاتی ہے۔ اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر جان و مال کا اتلاف ہمارا مقدر بن گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم سیلاب کی ان قیامت خیز تباہ کاریوں سے بڑی حد تک نجات پا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا یہ قول ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے کہ "درختوں کی اندھا دھند کٹائی اور اس کے نتیجہ میں بڑے پیمانے پر زمین کے کٹاؤ سے ہر سال سیلاب یا خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قدرت کے ساتھ یہ کھلواڑ بند ہونا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ شجرکاری کر کے ہی سیلاب اور خشک سالی سے بچا جا سکتا ہے۔ قدرتی ماحول کا توازن برقرار رکھ کر ہی ہمارا مستقبل محفوظ رہ سکے گا۔" درحقیقت قدرت کی یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ اترپردیش کے سیلاب کی زد میں آنے والے ۴۱ اضلاع میں سے بیشتر خشک سالی سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ریاست میں ۱۹۷۰ء کے دوران سب سے زیادہ یعنی ۵۵ اضلاع سیلاب کا شکار رہے۔ یوں بالعموم ہر سال ۴۰ سے ۴۵ ضلعوں کو سیلاب اور خشک سالی کا ایک آدھ سال کے وقفے سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سال بھی ۴۰ ضلعوں کو سیلاب کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑا جبکہ یہی اضلاع دو ماہ قبل خشک سالی کا شکار تھے۔ اس سال جون میں ۶۰ ملی میٹر بارش ہوئی جو اس ماہ میں ریاست کے اوسط سے ۹۰ ملی میٹر کم تھی۔ ساون کا پورا مہینہ اور بھادوں کا پہلا پندرہواڑہ زمین کی پیاس بجھائے بغیر یونہی گزر گیا لیکن اس کے بعد ریاست میں ہونے والی زبردست بارش نے قیامت برپا کر دی۔ سیلاب سے متاثرہ تقریباً ایک کروڑ سے زیادہ افراد میں سے اب تک متاثرہ مواضعات کے ڈھائی لاکھ اشخاص نیز اس سے کہیں زیادہ تعداد میں مویشیوں کو ریاستی حکومت نے محفوظ مقامات پر پہنچانے کا بندوبست کیا ہے۔ بچاؤ اور امدادی کاموں کے لیے تقریباً ساڑھے تین ہزار کشتیوں کا نیز ڈیڑھ ہزار سیلابی چوکیوں اور امدادی مرکزوں کا بندوبست کیا گیا۔ اس کے علاوہ مویشیوں کے چارے کا بھی بندوبست کیا گیا۔ ریاست کے وزیر اعلا شری وی پی سنگھ نے ریاست کے دولت مند افراد اور مختلف رضاکار تنظیموں سے اپیل کی ہے کہ مصیبت کی اس گھڑی میں وہ حکومت کی کوششوں میں تن من دھن سے ہاتھ بٹانے کے لیے آگے بڑھیں۔ یہ امداد وزیر اعلا امدادی فنڈ میں جمع کی جا سکتی ہے یا ضلع حکام کے پاس بھیجی جا سکتی ہے۔ سیلاب سے ہونے والی تباہ کاریوں کا سامنا کرنے کے لیے ریاستی حکومت جنگی پیمانہ پر اقدامات کر رہی ہے۔ تحفظ اور راحت رسانی کے کاموں میں تربیت یافتہ جوانوں کے علاوہ فوج کی بھی مدد لی گئی ہے۔ ریاست کے سیلاب زدہ علاقوں میں آلودگی سے پھیلنے والی بیماریوں کی روک تھام کے لیے محکمۂ علاج و صحت کے ملازمین کو جنگی پیمانہ پر کام کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ تمام چیف میڈیکل افسروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حسب ضرورت دوائیں اور جراثیم کش دواؤں کی فراہمی کا یقینی بندوبست کریں۔ ریاست کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لیے باندھوں اور نہروں کی تعمیر کی اسکیمیں تیزی کے ساتھ بروئے کار لائی جا رہی ہیں جن کے یقیناً دوررس اور مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ سیلاب کے مسئلہ سے مستقل طور پر نپٹنے کے لیے ریاستی حکومت نے ایک وسیع اسکیم مرتب کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کارعظیم کی تکمیل میں وقت لگے گا۔

● گزشتہ دو تین مہینے سے بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر نیا دور کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے جس کے لیے ادارۂ نیا دور اپنے قارئین سے انتہائی معذرت خواہ ہے۔ امید ہے آئندہ مہینے سے اس کی اشاعت معمول پر آجائے گی۔ بہرحال نیا دور کی طباعت کو بہتر سے بہتر بنانے نیز اس کی اشاعت کو معمول پر لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

——— ایڈیٹر

غزل

فضا ابنِ فیضی
مئو ناتھ بھنجن، یوپی

زندگی ہر چند ہے اک سانحہ، زندہ رہو
میں تمھارے حق میں ہوں حرفِ دعا، زندہ رہو

یہ گزارہ کب تلک آب و ہوا کی بھیک پر
کچھ دنوں بے منتِ آب و ہوا، زندہ رہو

یونہی طے ہوتا ہے دشتِ بے اماں کا یہ سفر
سخت ہے گو حلقۂ زنجیرِ پا، زندہ رہو

خوشۂ بالیدگی ہے، نشۂ ذوقِ فنا
رزقِ جاں ہے رنجِ آشوبِ فنا، زندہ رہو

کون ہے اس شہرِ ناپرساں میں کس کا دستگیر
بے نشاطِ کاروبارِ مدعا، زندہ رہو

نوش ہوں یا نیش پیتے ہیں یہ جرعاتِ نفس
جھیلنا ہر طور سے ہے یہ سزا، زندہ رہو

کھینچ لو، ماحول کی تیرہ نگی میں اپنے گرد
اک حصارِ شعلۂ حرف و نوا، زندہ رہو

یہ سنہری دھوپ تو پل بھر کی ہے ڈھل جائے گی
کل کے رخ پر اپنی ہی خاکِ انا، زندہ رہو

لفظ و معنی کے پرندے ہو جواں رکھو اڑان
نازک اتنی بھی نہیں شاخِ صدا، زندہ رہو

نوکِ خامہ سے تراشو، لے کوئی بالیدہ تر
یہ قلم ہے سازِ دہلیزِ نوا، زندہ رہو

تم ہو سر سے پاؤں تک دانش کا ابلاغِ تمام
دلبرا! پیرایہ بخشِ ماجرا! زندہ رہو

ناز کرتی ہے فضا تم پہ زمینِ لکھنؤ
تم سے جاں پرور ہے دلّی کی فضا، زندہ رہو

سنہ ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر حنیف نقوی
شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی

مرزا کلب حسین خاں نادر

مرزا کلب حسین خاں نادر[۱] ناسخ کے ممتاز شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اساتذۂ لکھنؤ میں ناسخ کو زبان کی صحت اور اصلاح کے سلسلے میں اپنے معمولات و مختارات کی بنا پر درجۂ امتیاز حاصل ہے ان کے بعد ان کے جن شاگردوں نے لسانی معیار بندی کے اس عمل کو جاری رکھا، ان میں نادر کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا نادر، بنارس میں سکونت پذیر ایک معزز اصفہانی گھرانے کے رکن رکین تھے۔ وہ تحصیلدار کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور ترقی پاکر مدتوں یو۔پی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری کی خدمات انجام دیتے رہے۔ انیسویں صدی کے برطانوی ہندستان میں یہ منصب کسی ہندستانی کے اعزاز کی معراج تصور کیا جاتا تھا، شاعرانہ ذوق کے فروغ اور مذاق و معیار کی تربیت و اصلاح میں انھیں اپنے فطری رجحانِ طبیعت کے علاوہ اس منصبی حیثیت سے بھی کافی مدد ملی۔ وہ جہاں بھی رہے، اربابِ ذوق پروانہ وار ان کے گرد جمع ہوتے رہے اور ان کی دلچسپی کی بنا پر شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہیں۔ مخمسات کے مجموعے "دیوانِ غریب" میں جو زمانۂ قیام فرخ آباد ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶-۶۷ء) میں مرتب ہوا، لکھتے ہیں:

"زیادہ ایک قرن سے عرصہ گزرا ہوگا کہ خاکسار جس جس شہر میں رہا، ہمیشہ بزم شعر خوانی مرتب ہوتی رہی۔ کہیں ایک مہینے کے بعد، کہیں پندرہ دن کے بعد بلکہ قصبات کے قیام میں بھی یہ شغل ترک نہ ہوا۔ ضلع فرخ آباد میں جو قریب چودہ برس کے گزارے ہیں تو یہ شغل بہ مقام کمپ فتح گڑھ میں کوئی جاری تھا۔ غدر سے پہلے کئی برس مشاعرہ ہوتا رہا اور بعد غدر بھی سات آٹھ برس سے کہ ہر مہینے کے تو چند سے اتوار کو بزم شعر خوانی غریب خانے میں آراستہ ہوتی ہے۔ اکثر حضرات شہر اور کمپ کے جو اس فن سے علاقہ رکھتے ہیں، و نیز اکثر سامعین رؤسا سے شریک ہوتے ہیں۔ ظہر سے مغرب تک غزل خوانی ہوتی ہے، عجب لطف ہوتا ہے، قابل دیکھنے اور سننے کے۔ اکثر حضراتِ دہلی و لکھنؤ جو شریک ہوئے تو محظوظ ہو کر مدّاح لطفِ صحبت کے ہوئے"[۲]

مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ نادر کے دادا مرزا محمد تقی خاں اور ان کے بھائی مرزا محمد شفیع خاں دونوں ایران میں نادر شاہ کے مصاحب تھے۔ جب شاہ مذکور نے کسی بات پر ناراض ہو کر محمد شفیع خاں کو جلتی ہوئی آگ میں ڈلوا دیا تو محمد تقی خاں دل برداشتہ ہو کر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں صفدر جنگ (متوفی ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء) نے انھیں اودھ کے علاقہ میں دس ہزار روپے کی جاگیر عطا کر کے ان کی دست گیری و قدر افزائی کی اور انھوں نے شیخ علی حزیں (متوفی ۱۷۶۶ء) سے نسبت ہم وطنی و علاقۂ دوستی کی بنا پر بنارس میں قیام فرمایا[۳]۔ یہیں ۲۷ رشوال ۱۱۷۵ھ (۲۱ رمئی ۱۷۶۲ء) کو ان کا انتقال ہوا۔ شیخ علی حزیں نے درگاہ فاطمان میں اپنے لیے جو سردابہ بنوایا تھا، اس کے پہلو میں دفن کر کے حق رفاقت ادا کیا[۴]۔ نادر کے والد مرزا کلب علی خاں غالباً مرزا محمد تقی کی تنہا اولاد تھے یا کم از کم وہ ان کی اولاد میں تنہا فرد تھے جنھوں نے سرکار انگریزی میں غیر معمولی رسوخ حاصل کر کے خاندان کا نام روشن کیا[۵]۔ مہاراجہ بنارس راجہ مہیپ نرائن سنگھ کی کمسنی کے زمانے میں ان کی ریاست

[illegible] باعتبار اردو [illegible] سے ان کی سماجی حیثیت اور سرکاری ملازمت [illegible] کیا جا سکتا ہے۔

[illegible] کی جائے ولادت اور سالِ ولادت کے بارے میں کوئی مستند روایت موجود نہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے مطابق وہ بنارس میں پیدا ہوئے تھے لیکن موصوف کا یہ بیان کسی معتبر شہادت کی بجائے صرف قیاس پر مبنی ہے۔ تاریخ ولادت کے سلسلے میں بھی قیاس کے علاوہ دریافت کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ دیوانِ اول میں موجود ایک قطعہ تاریخ کی رو سے [illegible] (۱۸۰۸-۰۹ء) میں الہ آباد کی تحصیل سراؤں میں ان کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اس سے قبل سرکاری ملازمت میں داخل ہو چکے تھے۔ اگر اس زمانے میں ان کی عمر بیس پچیس سال کے درمیان فرض کر لی جائے تو ان کی ولادت کا زمانہ [illegible] اور [illegible] (۱۷۸۸-۸۹ء) کے درمیان متعین کیا جا سکتا ہے۔

جناب اکبر حیدری کا بیان ہے کہ ناسخ بسلسلۂ ملازمت کئی کئی برس مختلف شہروں مثلاً الہ آباد، [illegible] گڑھ، فرخ آباد اور غازی پور میں مقیم رہے۔ ان مقامات میں سے الہ آباد، غازی پور اور فرخ آباد میں ان کے قیام کے متعدد ثبوت موجود ہیں لیکن [illegible] گڑھ میں قیام کا کوئی ثبوت ہماری نظر سے نہیں گزرا [illegible] سب سے پہلا تقرر ضلع الہ آباد میں ہوا [illegible] اپنے استاد شیخ امام بخش ناسخ [illegible]

[illegible] ناسخ [illegible]

[illegible] کے [illegible] اور [illegible] الہ آباد [illegible] کے علاوہ شہر کے [illegible] ناسخ [illegible] کی دوستی کر [illegible] ان کے شاگرد ان کے قریب [illegible] نہ ہوتا ایک قابلِ ذکر واقعہ بن گیا۔ پہلے شعر میں تاریخ کی [illegible] سے الہ آباد کا بیانا اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسرے شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناسخ کے قیام الہ آباد کے دوران ہی [illegible] کا الہ آباد سے کسی دوسری جگہ تبادلہ ہو گیا تھا اور اس طرح وہ [illegible] کے شرفِ ملاقات سے محروم ہو گئے تھے۔ تاریخ [illegible] کے وسط (نومبر ۱۸۲۱ء) میں الہ آباد سے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ اس سے چودہ سال قبل یعنی ۱۲۲۳ھ میں ناسخ کی الہ آباد میں موجودگی کا ثبوت [illegible] کا تذکرہ "شورشِ ناسخ" ہے جو بیان [illegible] ساکن [illegible] الہ آباد [illegible] آثار [illegible] (۱۸۲۱-۲۲ء) میں لکھا گیا ہے۔ ان شواہد کی بنیاد پر [illegible] غلط نہ ہوگا کہ وہ [illegible] کے اواخر یا [illegible] کے اوائل میں الہ آباد سے منتقل ہوئے ہوں گے۔

[illegible] کے بعد [illegible] میں منشی آنند سروپ [illegible] اجنبی [illegible] اور مرزا غلام محی الدین صاحب وکیل عدالت دیوانی ضلع غازی پور کے صاحبزادگان کی ولادت کے قطعاتِ تاریخ ان کی غازی پور میں موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔ [illegible] کا ایک اور قطعۂ تاریخ سید مہدی صاحب رئیس جونپور کی شادی کی تہنیت سے متعلق ہے۔ اس کے بعد [illegible] کا ایک قطعۂ تاریخ [illegible] جو ان کے فرزند کی ولادت سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک اور قطعۂ تاریخ اسی سلسلے میں [illegible] بمقام [illegible] ضلع [illegible] [illegible] میں [illegible] الہ آباد [illegible] غازی پور [illegible] قطعات [illegible] غازی پور [illegible]

۱۲۵۰ھ اور ۱۲۵۵ھ کے درمیان تقریباً پانچ برس کی مدت نادر نے کہاں گزاری، اس کے قطعی شواہد مفقود ہیں تاہم بعض قرائن اس زمانے میں ان کے دوسری بار غازی پور سے الہ آباد تبادلے پر دلالت کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحلیم نصر اللہ خاں خویشگی نے اپنے تذکرے "گلشنِ ہمیشہ بہار" میں ذاتی واقفیت کے انداز میں ان کا تعارف سپردِ قلم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الہ آباد میں ان کی چند غزلیں سنی تھیں۔ ایک دوسرے بیان کے مطابق وہ جمادی الاوّل ۱۲۵۴ھ مطابق اگست ۱۸۳۸ء میں "پیشکار حاکم صدر" سے طلبی پر گورکھپور سے الہ آباد گئے تھے اور اس سے قبل ان کے الہ آباد جانے کا کوئی ثبوت موجود نہیں، اس لیے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں نادر دوبارہ الہ آباد پہنچ چکے تھے۔ اسی سنہ میں سید مختار علی متخلص بہ دل، رئیس، کمشنر ضلع الہ آباد کے انتقال کا قطعۂ تاریخ بھی ان کے دیوانِ اول میں موجود ہے۔ اس کے دو سال بعد ۱۲۵۶ھ میں مصحفی کے ایک ممتاز الہ آبادی شاگرد مظلوم شاہ مظلوم کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔ نادر نے اس موقع پر بھی ایک قطعۂ تاریخ کہا۔ ممکن ہے کہ وہ اس حادثے کے وقت بھی الہ آباد میں موجود ہوں۔ ضمناً یہاں ایک مختلف فیہ امکان کی طرف اشارہ کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا۔ "گلشنِ ہمیشہ بہار" کے مولف کی حاکم صدر کی طرف سے الہ آباد میں طلبی تحصیلداری سے ڈپٹی کلکٹری کے منصب پر ان کی ترقی کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ نادر بھی اسی تقریب سے انہی ایام میں الہ آباد طلب کیے گئے ہوں اور تحصیل داری کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دہی کے بعد اسی زمانے میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر ان کا تقرر عمل میں آیا ہو۔ بہر صورت وہ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں یا اس سے کچھ پہلے بحیثیت ڈپٹی کلکٹر اٹاوہ پہنچ چکے تھے جس کا ایک معتبر ثبوت "بنائے کوٹھی کچہری عدالت نظامت ضلع اٹاوہ" کا قطعۂ تاریخ ہے جس کے آخری مصرعے سے ۱۸۴۲ء برآمد ہوتا ہے۔ اسی سال (۱۲۵۸ھ میں) "دیوانِ نادر" کے مرتب سید اکرام علی عاجز نے اٹاوہ میں باغیچہ نصب کیا تو نادر نے اس کی تاریخ کہی۔ اگلے سال ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں وہ اٹاوہ سے لکھنؤ گئے اور وہاں علمِ طب سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کا قطعۂ تاریخ 'بعنوانِ ذیل' "دیوانِ نادر" میں موجود ہے:-

قطعۂ تاریخ تصنیفِ کتاب در علمِ طب در بلدۂ لکھنؤ

چوں بفضلِ خدائے عزّ و جل   یافت ترتیب ایں عجالۂ نو
خواست نادر چو سال تاریخش   گفت ہاتف 'خوش رسالۂ نو'

۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء سے ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء میں دوسرے دیوان موسوم بہ "نظمِ نادر" کی اشاعتِ اول کے زمانے تک ہم انھیں برابر اٹاوہ میں موجود پاتے ہیں۔ اس درمیانی مدت میں جو اہم ترین واقعہ رونما ہوا وہ ان کی رفیقۂ حیات کی وفات ہے۔ یہ حادثہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں پیش آیا تھا۔ نادر نے اس سے متاثر ہو کر دو قطعاتِ تاریخ کہے تھے جو دیوانِ اول سے سطورِ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:-

چوں آں مومنہ رفت سوئے جناں   کہ بخشد بہ لطفِ خودش کردگار
بو صوری و معنوی سالِ فوت   یکے الف باد و صد و شصت و چہار

ایضاً

حیف مرحومہ کہ فردوس بریں جائش باد   برد آرام دل (و) کرد جگر خونِ افسوس
نادرِ خستہ جگر بود بہ فکر تاریخ   ہاتفِ غم زدہ نالید کہ خاتونِ افسوس

اٹاوہ میں نادر کے قیام کی مدت کو بعض دستیاب شواہد کی بنیاد پر ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) سے کچھ آگے بڑھا کر ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) تک وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اسی سال ان کے دیوانِ اول کی طباعت عمل میں آئی اور غالباً اسی کے آس پاس ان کا تبادلہ اٹاوہ سے فرخ آباد ہو گیا۔ "دیوانِ غریب" میں جو ۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں مرتب ہوا تھا، انھوں نے اپنے قیامِ فرخ آباد کی مدت "چودہ سال کے قریب" بتائی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت علی کی منقبت میں ان کا ایک مخمس بھی جس کا تاریخی نام "خاتمۃ المناقب" اور عرف "چہل بند نادری" ہے، ۱۲۸۲ھ میں فرخ آباد میں ان کی موجودگی کی تصدیق کرتا ہے۔ دیباچے کے مطابق یہ مخمس انھوں نے اپنی انتہائی شدید اور طویل علالت کے دوران زندگی کی طرف سے حد درجہ مایوسی کے عالم میں نظم کیا تھا، اور اس زمانے میں وہ فرخ آباد میں قیام پذیر تھے۔

۱۲۸۳ھ کے بعد ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں نادر کی بیماری نے

ایک بار پھر تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔ اس دوسری طویل المیعاد علالت کے سلسلے میں انھوں نے بغرضِ علاج ایک اشتہار جاری کیا تھا جسے جناب اکبر حیدری نے اخبار "نور الانوار" کان پور مورخہ ۲۵؍ اپریل سنہ ۱۸۷۴ء کے حوالے سے اپنے مضمون "مرزا کلب حسین خاں نادر کی بعض نایاب تصنیفات" میں نقل فرمایا ہے[۱۵] اور اس مضمون سے سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

اشتہار از جناب مستطاب مرزا محمد کلب حسین خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر سابق و حال وارد کمپ فتح گڑھ، فرخ آباد۔

چونکہ میری طبیعت بہت دنوں سے بامراضِ مختلفہ مدود واما علیل ہے۔ صدہا دوائیں کیں۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ قبض رہتا ہے یا دست۔ کبھی متواتر اجابت رقیق اور کبھی دو دو تین تین روز قبض مفرط رہتا ہے۔ اب میں نے ایک قطعہ پرامیسری نوٹ تعدادی پانسو روپے کا سا ہوکار معتمد کی کوٹھی میں امانت رکھ کر اشتہار کیا ہے کہ بشرط علاج کامل و حصول صحت اس معالج کے نام پر نوٹ مذکورۃ الصدر فروخت کروں گا جب کہ فائدہ دوا کا کم سے کم سال بھر تک قائم و باقی رہے مگر شرط یہ ہے کہ قبلِ صحتِ کلی کچھ نقد و جنس جزوی نہ دیا جائے گا۔

بندہ آثم کلب حسین خاں۔ ساکن کمپ، فتح گڑھ"

اس اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ نادر کی اس بیماری کا سلسلہ کافی دنوں سے چل رہا تھا اور وہ ایک بار پھر ناامیدی کی اسی کیفیت سے دوچار تھے جس سے انھیں سنہ ۱۲۷۰ھ میں واسطہ پڑ چکا تھا بیس اکیس سال کی درمیانی مدت کے حالات کے سلسلے میں اگرچہ دستاویزی شہادتیں مفقود ہیں تاہم قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوائلِ ملازمت کے بعد ان کی صحت غالباً دوبارہ اعتدال پر نہیں آ سکی۔ پہلی بیماری کے سلسلے میں انھیں چھ مہینے کی چھٹی لینا پڑی تھی لیکن سنہ ۱۸۷۴ء میں وہ ملازمت کی قید و بند سے آزاد ہو چکے تھے۔ ممکن ہے کہ انھیں صحت کی مسلسل خرابی کی بنا پر ہی فرائضِ منصبی سے سبکدوشی حاصل کرنا پڑی ہو۔ اگر قیاس درست نہ ہو تب بھی ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ ۱۸۶۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے، کیونکہ "ریاضِ نادریہ" کے خاتمے میں جو ۸؍ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء (۲۲؍ ربیع الآخر سنہ ۱۲۸۳ھ) کو لکھا گیا ہے، ان کے نام کے ساتھ "ڈپٹی کلکٹر بہادر" کا لاحقہ موجود ہے جب کہ "دیوانِ غریب" کا خاتمہ مرقومہ ۱۱؍ شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۸؍ فروری ۱۸۶۸ء اس التزام سے خالی ہے۔

نادر مذکورہ بالا اشتہار کے اجرا کے بعد چار سال دو ماہ کے قریب زندہ رہے۔ قاضی عبد الودود اور ان کے بعض متبعین "غمِ نادر" کو مادۂ تاریخ قرار دے کر ان کا سال وفات ۱۲۹۵ھ لکھتے رہے ہیں[۱۶] "ارمغانِ گوکل پرشاد" میں اس واقعے کا سال عیسوی ۱۸۷۸ء بتایا گیا ہے[۱۷]۔ جناب اکبر حیدری نے اخبار "نور الانوار" کان پور مورخہ ۱۰؍ جولائی ۱۸۷۸ء کے حوالے سے پہلی بار ان کی صحیح تاریخِ رحلت کی نشان دہی کر کے اس معلومات پر ایک اہم اضافہ فرمایا ہے۔ اس سلسلے میں اخبار مذکور کی خبر کا مکمل متن حسب ذیل ہے :-

"غمِ نادر۔ ۱۲۹۵ ہجری"

"افسوس کہ شب ۹؍ جون ۱۸۷۸ء مطابق ۷؍ جمادی الآخری ۱۲۹۵ ہجری چہار شنبہ کو عمدۃ الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ متخلص بہ نادر، ڈپٹی کلکٹر سابق، حال پنشن یافتہ نے مقام کمپ فتح گڑھ، فرخ آباد میں دنیائے ناپائیدار سے انتقال فرمایا[۱۸]"

نادر نے نثر میں کئی مختلف الموضوع تصانیف کے علاوہ نظم میں پانچ دیوان اپنی یادگار چھوڑے ہیں، لیکن ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں سے جن لوگوں نے کسی قدر تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں وہ صرف چار دیوانوں کا ذکر کرتے ہیں، چنانچہ سعادت خاں ناصر لکھنوی نے انھیں "صاحبِ چار دیوان" بتایا ہے[۱۹] اور گوکل پرشاد کا بیان ہے کہ آپ کی

تذکرۂ معاصرین میں چار دیوان . . . . . مشتہر و مطبوع ہیں محسن
لکھنوی کے بیانات کی بھی بہ اختلافِ الفاظ تقریباً یہی کیفیت
ہے[12]۔ ان تذکرہ نگاروں کے برخلاف نواب سید محمد علی خاں
بہادر نور رئیس شمس آباد ضلع فرخ آباد اور منیر شکوہ آبادی
نے "نگارستانِ نادر" کی تقریظوں میں نادر کے کلام کی کیفیت و
کمیت پر زیادہ صحت اور تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان
دونوں تحریروں میں بھی منیر کا بیان زیادہ جامع اور مفصل ہے اس
کا اقتباس سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

"... (اول)... دیوانے کہ بست سال پیش ازیں
جلوۂ شیوع نمودہ بود، نمونہ ریاضِ دیدۂ ہر شہر و
دیار است . . . . . دوم دیوانِ حور رخ و ملمع بہ
نظم نادر مشتمل بر مراثی و سلام . . . . . سوم دیوان
قصائد نعت و منقبت کہ موسوم بہ حور رخ است بہ
ریاضِ نادریہ . . . . . چہارم دیوانِ منشائے رخ
و مخاطب بہ دیوانِ غریب . . . . . و این دیوان
پنجمین است کہ عروسانہ نقشِ ہر غزل لیلہ و دوشیزۂ
جہت بر ہمہ یکتائی مرابع نشستہ ہست،"

اسے سوئے اتفاق کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ
اب ان دیوانوں کے مطبوعہ نسخے بھی نایاب یا نادر کمیاب ہیں۔ ڈاکٹر
اکبر حیدری نے اپنے مضمون "مرزا کلب حسین خاں نادر کی بعض
نایاب تصنیفات" میں ان میں سے دوسرے، تیسرے اور پانچویں
دیوان کا تعارف کرایا ہے۔ پہلے اور چوتھے دیوان کا کوئی نسخہ
انھیں دستیاب نہیں ہو سکا، اس لئے ان سے شروع کیے ہوئے
اس سلسلے کو مکمل کرنے کی غرض سے آئندہ سطور میں آخر الذکر
دونوں دیوانوں کا مفصل تعارف پیش کیا جائے گا اور باقی
دواوین کے ذکر میں صرف ان پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھی جائے
گی جو مقالہ نگار موصوف کی نگاہ سے مخفی رہے ہیں یا جن کے
بارے میں ان کے بیانات کسی قسم کے اضافے یا نظرثانی کے متقاضی
ہیں۔

(۱) دیوانِ نادر:۔ اس دیوان کا ایک نسخہ بنارس
ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۹۲ صفحات
پر مشتمل ہے۔ سرورق کے اندراجات حسب ذیل ہیں۔

من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ،
یہ نسخۂ نادر مفرحِ قلوب و خواطر اغنیٰ
دیوانِ نادر
نتیجہ طبع رسائے جناب اعتصام الدولہ،
سحبان زمان امیرزا
کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ متخلص بہ نادر
مطبع اسعد الاخبار آگرہ میں منطبع ہوا ۱۲۶۹ھ

دیوان کی ابتدا سید اکرام علی عاجز (رئیس فتح پور ہنسوہ) کے
دیباچے سے ہوتی ہے جو صفحہ ۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۶ پر ختم ہوتا ہے
یہ دیباچہ صاحبِ دیوان اور دیباچہ نگار کے تعلقات، صاحب
دیوان کے کلام کی مجموعی مقدار، اس کی نمایاں خصوصیات اور
اس دیوان کی کیفیت اور زمانۂ ترتیب کے بارے میں کافی
مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس اہمیت اور دلچسپی
کے پیش نظر مختلف مقامات سے اس کے ضروری اقتباسات
سطور ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:۔

"..... خاطرِ دریا مقاطرِ اربابِ دانش اور ضمیر
خورشید نظیر اصحاب بینش پر مخفی اور محتجب نہ رہے
کہ فقیر حقیر نیاز مند ازلی بندہ سید اکرام علی عفی اللہ
عنہ آستانِ سحبان نشان، امیر ذی اقتدار، رئیس
نامدار، جناب معلی القاب اعتصام الدولہ سحبان
زماں امیرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ
متخلص بہ نادر ابن احترام الدولہ دبیر الملک
امیرزا کلب علی خاں بہادر ہیبت جنگ ابن امیرزا
محمد تقی خاں بہادر اصفہانی انار اللہ برہانہما
کا بیس برس سے باریاب ہے۔ اس زمانِ دراز
میں جو جو لطف شعر و شاعری کے بہ مقامات مختلفہ

مثلاً آبادو غازی پور و اٹاوہ وغیرہ اور بعض سے شرح ان کی حد سے زیادہ ہے. ہمیشہ سیر دواوین جدت آئین سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا رہا. ہرچند ایک ایک مصرع اوس فصیح زماں اور بلیغ دوراں کا ایک ایک دیوان ہے اور کچھ احتیاج انتخاب کی نہیں ہے مگر بہ نظر زیادتی ضخامت منطبع ہونا کل کلام باعث تفہیم کا کہ بچار دیوان مرتب ہو سکے میں عاجز طفیل تکلف سے نہ دیکھ کر چاروں دیوان سے ایک دیوان میں نے اپنی طبیعت اور پسند کے موافق انتخاب کیا. قریب پانچ سو کے غزلیں منتخب ہوئیں اور اسی طرح سے قصائد اور مخمس اور مسدس اور رباعیات اور قطعات سے بھی انتخاب کیا گیا، اور اوس انتخاب میں چند امور کی رعایت ملحوظ رہی. ایک تو یہ کہ اگر دو یا چار غزلیں ایک ردیف و قافیہ کی باوزانِ مختلف نظر آئیں تو اون کو ایک ہی جگہ لکھا اور رفع اشتباہ کے لیے نام بحور کے حاشیے پر لکھ دیئے. دوسرے یہ کہ ایک ردیف کی جتنی غزلیں پائیں. سب ایک جگہ لکھی گئیں مثلاً کا اور ہوا اور ہے اور ئے وغیرہ ردیفیں ایک جگہ جمع کی گئیں تاکہ تلاش میں دقت نہ ہو. تیسرے اگر کسی غزل میں کوئی صنعت مستلزم ہوئی تو حاشیہ پر لکھ دی گئی. چوتھے جن اشعار میں ازروے مضمون یا بندش یا تشبیہ میری رائے اور سماعت میں کسی طرح کی جدت یا لطافت معلوم ہوئی اون اشعار کے مقابل میں حرف جیم کا حاشیہ پر لکھ دیا گیا تاکہ ناظرین کو معلوم ہوئے کہ اس شعر میں کسی طرح کی جدت اور لطافت ہے. . . .
پانچویں ہر غزل پر ہندسہ شمار کا اور ہر مقطع پر ہندسہ تعدادِ شعر کا لکھا گیا ہے.

ہرچند شعراے حال لکھنؤ نے بہت سے اختراعات در تعیناتِ جدیدا اب جاری کئے ہیں مگر آپ نے چند امور کو اون میں سے جو مدلل اور موجہ اور بطور قاعدۂ کلیہ پایا ہے، اون میں سے بعض بعض کو اختیار کیا ہے. مثلاً پر کا لفظ باظہار راے مہملہ سب جگہ صرف کیا ہے حذفِ راے مہملہ جائز نہیں رکھا ہے اور جن الفاظ میں حرف نون سے ترکیب واقع ہے، بیشتر اوس کو باظہار تلفظ فرمایا ہے، اور طرح کا لفظ جو اکثر متحرک الاوسط آتا ہے، آپ نے تمام اپنے کلام میں برعایتِ لغت اوس کو ساکن الاوسط صرف کیا ہے، اور مقطع بغزل کا مضمونِ مناجات و نعت و منقبت و دعا موزوں کیا ہے الا چند غزلوں میں کسی ضرورتِ قوی سے مضمونِ عاشقانہ بھی موزوں ہوا ہے. اور یہاں اور وہاں کا لفظ جو باسقاطِ ہاے مہملہ جاری ہے جیسے کہ یاں اور واں اوس کو باظہارِ ہاے مہملہ سب جگہ صرف کیا ہے، سقوطِ ہاے ہوز جائز نہیں رکھا اور اسی طرح سے اور کے لفظ میں جو فائدہ عطف کا دیتا ہے حرفِ واو کو خوب ظاہر کر کے صرف کیا ہے، جیسا کہ بیشتر اس لفظ کے واو کو مخفف کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ جائز نہیں رکھا ہے. ناظرین سے امید یہ ہے کہ ہنگام مطالعہ اگر کسی شعر میں ان قاعدوں کے خلاف کوئی بات نظر آوے تو میرے اور کاتب کے سہو پر محمول فرمادیں اور فرزندانِ والا شان اور تلامذۂ خاص کی غزلوں کی تضمینیں بھی جو آپ نے بطور یادگار فرمائی ہیں، وہ بھی داخل اس منتخب کی ہیں. تو یقینا اس منتخب دواوین کی حد سے باہر ہے . . . .

. . . . خوش اوج بر فتوح اوس اوستاد نامی یعنی شیخ امام بخش ناسخ علیہ الرحمہ کی بدولت ایسے سرِ دفتر تلامذہ کے نامور ہے اور چند ابخت بلند شاگردانِ خاص کہ بدولت اصلاح ایسے شاعر

(نادر) الجیدان کے اکناف عالم میں مشتہر۔ شعر

خراب آبادِ عالم باز معمور   باولادِ کرامش تا دم صور

قطعۂ تاریخ کا خوزبانِ قلم گنج مخ بیاں سے سترشح ہوا ہے، وہ یہ ہے۔ قطعہ

چو از سرِ بہار دیوان منتخب شد   کتاب خوب با ترکیب نادر
ز ہاتف خواست تاریخش جو غالبؔ   ۱۲۶۰ھ آمد بگو "ترتیب نادر"

۱۲۶۰ھ (ص ۳ تا ۶)

دیباچے کے بعد ایک نعتیہ مثلث سے ابتدا ہوتی ہے جس میں مشہور فارسی مصرعے "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کو تضمین کیا گیا ہے۔ اس مثلث میں کل اکیس بند ہیں۔ اس کے بعد ایک شعر کسی کا منقبت میں جناب علی کی ہم پہنچا۔ بطورِ مسدس تضمین کیا گیا ہے اور عنوان قائم کر کے مندرجہ ذیل شعر کی تضمین کی گئی ہے جو پندرہ بندوں پر مشتمل ہے

علی کا نام بھی نام خدا کیا اثر رکھتا ہے   عصا کے ہیں بنے تیغ جواں ہو حرز طفلاں کے

اس مسدس کے بعد ایک "مخمس در منقبت حضرت علیؓ" ہے جو سولہویں صفحے کی پانچویں سطر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کے چوبیس صفحات (ص ۱۷ تا ص ۴۰) غائب ہیں۔ ممکن ہے کہ ان ضائع شدہ صفحات کے ابتدائی حصے میں کوئی مختصر مثنوی یا ایک سے زائد مثنویوں کے انتخابات ہوں لیکن صفحہ اکتالیس پر قصیدہ در مدحِ ناسخ کے باقی ماندہ اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آخری حصہ انتخابِ قصائد پر مشتمل تھا۔ اس حصے کے باقی ماندہ آخری صفحے پر کل پندرہ اشعار درج ہیں جن میں سے چند یہ ہیں ؎

توجو آیا بسا الہ آباد   لکھنؤ اب خراب ہے ناسخ
سلکِ گوہر ہے تیرا ہر مصرع   لفظ درِّ خوش آب ہے ناسخ
بطفیلِ تلمذ و تعلیم   اک جہاں کامیاب ہے ناسخ
از برائے تلامذہ تحقیق   مدح تیری ثواب ہے ناسخ
دور تجھ سے جو ہو گیا نادر   دل کو اک اضطراب ہے ناسخ
وصف کیا آگے ہو سکے تحریر   خاتمہ میں شتاب ہے ناسخ

صفحہ ۴۳ سے ردیف وار غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۲۸ اس سلسلے کا آخری صفحہ ہے جو ایک ناتمام غزل کے پانچویں شعر پر ختم ہوتا ہے۔ اندراج دیوان کے مطابق اس غزل کا نمبر ۲۲۶ ہے۔ لیکن اگلے دس صفحات (۳۲۹ تا ۳۳۸) ضائع ہو چکے ہیں۔ صفحہ ۳۳۹ کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

منفعل عذر یہ کہنے کو اب آیا ہے   کہہ کے واسوخت سنانے کے لیے یار ہے

یہ بند کرہ واسوخت کا آخری شعر ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ضائع شدہ صفحات میں حصۂ غزلیات کی تکمیل کے بعد ایک واسوخت یا اس کا انتخاب منقول تھا۔ اسی صفحے کی دوسری سطر سے مخمسات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن میں سرفہرست مرزا قتیل کی ایک فارسی غزل کی تضمین ہے۔ بعد ازاں "مخمساتِ دیگر" کے زیرِ عنوان صفحہ ۳۷۵ تک بترتیب ذیل اردو کے بیس شاعروں کی چھبیس غزلوں کی تخمیس شاملِ انتخاب ہیں:۔

مصحفی، آتش[۲]، مرزا حاتم علی مہر، ناسخ[۲]، مصحفی، آتش، تلمیذ علی حسین خاں اندوہ[۲]، مصحفی، مظلوم شاہ مظلوم[۲]، ناسخ شہید[۲]، مرزا محمد تقی ہوس، صاحبزادہ بلند ارادہ عالی شان، والا دودمان آغا کلب عابد خاں بہادر، ڈپٹی کلکٹر ضلع امرت سر متعلق لاہور متخلص بہ بشاش[۴]، منشی مادھو رام جوہر[۲]، دیبی پرشاد تسلیم[۲]، صاحبزادہ والا شان امیر زا کلب علی خاں عرف امیر مرزا متخلص بہ عیاش[۲]، تحصیل دار پرگنہ بھیوند ضلع اٹاوہ، صاحبزادہ والا دودمان امیر زا کلب سجاد خاں عرف مبارک میرزا متخلص بہ شاباش[۲]، وزیر ضلع اٹاوہ، مولوی فتح علی امید[۲] رئیس قصبہ سبولی ضلع غازی پور، سید اسرار علی جواد[۲]، رئیس قصبہ کڑا ضلع الہ آباد، شیخ محمد عسکری عرف حیدری انگر[۲] رئیس اٹاوہ، سید جعفر علی جواں[۲] رئیس الہ آباد، سید اکرام علی عاجز[۲] رئیس فتح پور ہنسوہ، شیخ بدلی کیواں[۲] رئیس بلگرام و معصوم علی ناصر[۲] رئیس بلدۂ غازی پور۔

صفحہ ۳۷۶ و ۳۷۷ پر بارہ رباعیاں درج ہیں۔ صفحہ ۳۷۸ سے بسم اللہ کے بعد "المقطعات" کے زیرِ عنوان قطعاتِ تاریخ کا آغاز ہوتا ہے، جن کی مجموعی تعداد اڑتیس[۳۸] ہے۔ ان میں سے خاص خاص قطعات کے عنوانات اور ان سے برآمد ہونے والے سنہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) تاریخ تعمیر مسجد معرہ شیخ مصطفےٰ قلی صاحب الہ آبادی،
تھانہ دار سورام (۱۲۴۴ھ)
(۲) تاریخ وفات شاہ محمد اعلیٰ صاحب رئیس الہ آباد (۱۲۴۶ھ)
(۳) تہنیت تولد فرزند سعید منشی آنند سروپ صاحب،
دیوان اجنٹی افیون، غازی پور (۱۲۵۱ھ)
(۴) تولید فرزند سعید مرزا غلام محی الدین صاحب وکیل
عدالت دیوانی ضلع غازی پور (۱۲۵۱ھ)
(۵) تہنیت شادی کدخدائی سید مہدی صاحب رئیس جونپور (۱۲۵۱ھ)
(۶) وفات حضرت شاہ ابوالمعالی (الہ آباد) (۱۲۵۲ھ)
(۷) ولادت فرزند شیخ عنایت حسین جونپوری (۱۲۵۲ھ)
(۸) تاریخ تعمیر بنگلہ کچہری بمقام بحری آباد، ضلع غازی پور (۱۲۵۲ھ)
(۹) ولادت سید اکبر فرزند سید محمد جان قدسی الہ آبادی
(۱۲۵۳ھ)
(۱۰) وفات مرزا مہدی لکھنوی خمار تخلص (۱۲۵۳ھ)
(۱۱) تاریخ فتح یابی مقدمہ شیوالہ بحری آباد (۱۲۵۳ھ)
(۱۲) تاریخ معزولی عوامل کلکٹری غازی پور (۱۲۵۳ھ)
(۱۳) تاریخ وفات سید مختار علی متخلص بہ دل رئیس کڑا ضلع
الہ آباد (۱۲۵۴ھ)
(۱۴) تاریخ وفات مظلوم شاہ مظلوم (۱۲۵۶ھ)
(۱۵) تاریخ بنائے کوٹھی کچہری عدالت و نظامت ضلع
اٹاوہ (۱۸۴۲ء)
(۱۶) تاریخ نصب باغچہ مولف بمقام اٹاوہ (۱۲۵۸ھ)
(۱۷) تاریخ تصنیف کتاب در علم طب در بلدۂ لکھنؤ
(۱۲۵۹ھ)
(۱۸) تاریخ وفات خواجہ حیدر علی آتش (۱۲۶۳ھ)
(۱۹) وفات زوجۂ مرحومہ صاحب ایں دیوان (دو قطعے)
(۱۲۶۴ھ)

ان قطعات تاریخ کے ساتھ صفحہ ۲۹۱ پر یہ دیوان مکمل ہو جاتا ہے۔ اگلے صفحے پر جو اس نسخے کا آخری صفحہ ہے، غلام محمد خاں رہا اکبرآبادی کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے جس سے اس کا سال طباعت معلوم ہوتا ہے ؎

کیا لطف سخن ہوا ہے حاصل — جس دم یہ چھپا فسانۂ عشق
دل نے کہا دہیں از سر ہوش — دیوان ہے یہ ایک خزانۂ عشق
۸ (۱۲۶۵)
۱۲۷۰ھ

جناب اکبر حیدری نے منیر شکوہ آبادی کے ۱۲۸۶ھ کے اس بیان کی روشنی میں کہ یہ دیوان اول تیئیس سال قبل شائع ہوا تھا، اس کا سال ترتیب ۱۲۶۳ھ قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید اکرام علی عاجز کے قطعۂ تاریخ کی رو سے اس دیوان کی ترتیب ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰-۵۱ء) میں عمل میں آئی تھی اور کتابت و طباعت کا کام سرورق کے اندراج کے مطابق ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲-۵۳ء) میں شروع ہو کر رہا اکبرآبادی کے مندرجۂ بالا قطعۂ تاریخ کے بموجب ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳-۵۴ء) میں مکمل ہوا تھا۔

نظم نادر:- اس دیوان کا ایک مطبوعہ نسخہ جس سے جناب اکبر حیدری نے استفادہ کیا ہے، پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ نادر کے مرثیوں اور سلاموں کا مجموعہ ہے۔ حیدری صاحب نے لکھا ہے کہ "شکرستان نادر کی تقریظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "نظم نادر" کلب حسین خاں نادر کے دیوان دوم کا تاریخی نام ہے ... جس سے ۱۲۶۷ کا سال ہجری نکلتا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ منیر شکوہ آبادی نے (کسی تقریظ نگاروں نے نہیں) "نظم نادر" کو اس مجموعے کا تاریخی نام قرار دیا ہے لیکن ان کے بیان سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کا سال ترتیب ۱۲۶۷ھ مانتے ہیں۔ یہ سنہ دراصل سید اکرام علی عاجز کے مستخرجہ مادۂ تاریخ سے حاصل ہوتا ہے جسے انھوں نے اپنے لکھے ہوئے دیباچے کے آخر میں شامل اس قطعۂ تاریخ میں نظم کیا ہے ؎

یہ مجموعۂ خوب و مرغوب احسن — تھا از بس کہ محبوب طبع و خاطر
ہوئی فکر تاریخ تالیف مجھ کو — تو آواز آئی "زہے نظم نادر"

اس قطعے سے صاف ظاہر ہے کہ اس مجموعے کا سال ترتیب (۱۲۶۷ھ) "نظم نادر" سے نہیں [illegible] "نظم نادر" سے نکلتا ہے، اس لیے منیر شکوہ آبادی کا اور ان کے اتباع میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا "نظم نادر" کو اس مجموعے کا تاریخی نام قرار دینا درست نہیں۔ اگر "نظم نادر" کو تاریخی نام تسلیم کر لیا جائے تو یہ مجموعہ دیوان دوم نہیں، دیوان اول قرار پائے گا۔

اس غلط فہمی کے ازالے کے ساتھ ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس دیوان کے جس نسخے سے ڈاکٹر اکبر حیدری نے استفادہ لیا ہے، وہ اس کی اشاعت اول نہیں، اشاعت ثانی ہے اور اس کے ساتھ اکرام علی عاجز کا جو دیباچہ شامل ہے وہ اصلاً اشاعت اول ہی کا دیباچہ ہے۔ خاتمۃ الطبع کے بموجب یہ نسخہ مطبع دلکشا واقع کمپ فتح گڑھ محلہ تلیا لین میں باہتمام منشی رام سروپ بتاریخ ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۷۸ ہجری مطابق ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کو چھپ کر شائع ہوا ہے۔ دیباچہ قطعۂ تاریخ کے مطابق اس سے گیارہ سال قبل ۱۲۶۷ھ میں لکھا گیا ہے اور اس کے مندرجہ ذیل اندراجات موجودہ صورت حال سے بالکل مختلف کیفیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نادر کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ

"ایک مجموعہ نثر موسوم بہ فضائل الشہدا مشعر بروایات صحیحہ و متواترہ اور دوسرا مجموعۂ نظم متضمن بہ قصائد و مراثی و سلام و تضمینات و رباعیات چکیدۂ قلم ندرت رقم از نتائج افکار بلاغت آثار سے صفحۂ قرطاس روزگار پر ایسا ثبت فرمایا ہے کہ سب ذاکر بار فکر و تلاش سے سبکدوش ہو گئے۔ ان میں سے مجموعۂ فضائل الشہدا مطبع اکبرآباد میں منطبع ہو کر اطراف و اکناف میں مشتہر و مروج ہو چکا ہے اور مجموعۂ مراثی و قصائد وغیرہ اسی مطبع مسبوق الذکر میں جو کہ مسمی بہ مطبع اسعد الاخبار ہے حلیۂ انطباع سے اب تحلی ہو کر (بہ رونق) از زمیدانِ رواج ہوا اور اغلب کہ قریب تر بحکم قضا جریان بادشاہ ۔۔۔۔ محمد واجد علی شاہ بادشاہ خلد اللہ ملکہ مطبع دار الحکومت لکھنؤ میں جلوۂ انطباع فرماوے[25]"

عاجز کے اس بیان سے دو اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۲۶۷ھ میں مطبع اسعد الاخبار آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا تھا، دوسرے یہ کہ اشاعت اول میں مرثیوں سلاموں، تضمینوں اور رباعیوں کے ساتھ قصیدے بھی شامل تھے۔ جب کہ دوسری اشاعت سے قصیدے یکسر خارج کر دیے گئے ہیں۔ "اسعد الاخبار" سے متعلق جناب عتیق صدیقی کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ "نظم نادر" کا یہ اول الذکر ایڈیشن ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا تھا نیز اس کی تعداد اشاعت دو سو پچاس اور قیمت فی جلد تین روپے تھی۔ "فضائل الشہدا" کی اشاعت اس سے ایک سال قبل ۱۸۵۰ء میں ہو چکی تھی۔ اس کی بھی ڈھائی سو جلدیں شائع ہوئی تھیں اور قیمت فی جلد دو روپے تھی[26]۔

ریاضِ نادریہ:۔ منیر شکوہ آبادی کی تقریظ کے مطابق یہ نادر کا تیسرا دیوان اور قصائد نعت و منقبت کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ سطور گزشتہ میں "نظم نادر" کے سلسلے میں وضاحت کی جا چکی ہے، یہ قصائد اولاً اس دیوان دوم میں شامل تھے۔ ۱۲۸۱ھ میں انھیں اس دیوان سے علیحدہ کر کے ایک مستقل مجموعے کی صورت میں مرتب کیا گیا اور "ریاض نادریہ" اس کا تاریخی نام قرار پایا۔ اس دیوان کا تا حال واحد معلوم نسخہ راقم السطور کو رضا لائبریری رام پور میں دستیاب ہوا۔ یہ اکیس سطری مسطر کے ایک سو چوہتر صفحات پر مشتمل ہے اور منشی رام سروپ کے مطبع (دل کشا) واقع کمپ فتح گڑھ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ سرورق کے اندراجات حسب ذیل ہیں:۔

"بفضل منشی کون و مکان و ناظم ارکان زمین و زمان تعالیٰ جل شانہٗ نظم آبدار اعنی قصائد

بمنقبت حضرت سید ابرار و ائمۂ اطہار موسوم

ریاض نادریہ

من تصنیف عمدۃ الفصحاء و قدوۃ البلغاء ممدوح غائب و حاضر مرزا کلب حسین خاں صاحب متخلص بنادر در مطبع منشی رام سروپ واقع کمپ فتح گڑھ زیورِ طبع پوشید"

اس "عنقا کی طرح نایاب" دیوان کے سلسلے میں غالب کی تقریظ کے حوالے سے دو باتیں بطورِ خاص کہی جاتی رہی ہیں۔ اول یہ کہ "اس (مجموعے) میں سو قصیدے زینتِ اوراق ہیں" دوسرے یہ کہ "تمام قصائد کسی دنیوی با اثر ہستی یا حاکم کی مدح کے بجائے دینی نوعیت کے حامل ہیں" ۔ پیشِ نظر نسخے کا مطالعہ ان دونوں دعووں کی تردید کرتا ہے۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت بیتہ تعداد کے نصف سے بھی کم یعنی کل سینتالیس قصائد پر مشتمل ہے اور ان میں سلطانِ عالم واجد علی شاہ اور شیخ امام بخش ناسخ کی مدح کے تین قصیدے بھی شامل ہیں۔ ان قصائد کی ممدوح وار تقسیم حسبِ ذیل ہے :-

(۱) سرورِ کائنات، فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلعم ۵ قصیدے
(۲) خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا = ۳ قصیدے
(۳) اسد اللہ الغالب حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ ۶ قصیدے
(۴) حضرت امام حسنؑ = ۳ قصیدے
(۵) حضرت امام حسینؑ = ۴ قصیدے
(۶) حضرت امام زین العابدینؑ = ۲ قصیدے
(۷) حضرت امام محمد باقرؑ = ۲ قصیدے
(۸) حضرت امام جعفر صادقؑ = ۲ قصیدے
(۹) حضرت امام موسیٰ کاظمؑ = ۲ قصیدے
(۱۰) حضرت امام موسیٰ رضاؑ = ۲ قصیدے
(۱۱) حضرت امام محمد تقیؑ = ۲ قصیدے
(۱۲) حضرت امام علی نقیؑ = ۲ قصیدے
(۱۳) حضرت امام حسن عسکریؑ = ۲ قصیدے
(۱۴) حضرت صاحب الزماں امام مہدی = ۲ قصیدے
(۱۵) حضرت ابی الفضل العباسؑ = ۲ قصیدے
(۱۶) حضرت علی اکبرؑ = ۱ قصیدہ
(۱۷) حضرت قاسمؑ = ۱ قصیدہ
(۱۸) سلطانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ = ۲ قصیدے
(۱۹) جنابِ شیخ امام بخش ناسخ = ۱ قصیدہ

قصائد کا یہ سلسلہ صفحہ ۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۶۲ پر ختم ہوتا ہے۔ اس صفحے کی آخری دو سطریں خاتمۃ الطبع پر مشتمل ہیں جو اس مجموعے کے زمانۂ طباعت کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ خاتمے کی مکمل عبارت یہ ہے :-

" الحمد للہ والمنۃ (کذا) کہ مجموعۂ قصائدِ منقبتِ حضرات چہاردہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام من تصنیفِ حضور، لامع النور، فہامی، علامی جناب امارت مآب اعتصام الدولہ میرزا کلب حسین خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر متخلص بہ نادر واقعہ ۸ ستمبر ۱۸۶۶ء در مطبع دل کشا بزیورِ طبع آراستہ شد "

خاتمۃ الطبع کے بعد صفحہ ۱۶۳ سے تقریظوں اور قطعاتِ تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ان میں سب سے پہلی تقریظ مرزا غالب کی ہے۔ چونکہ اس کا متن جا بجا متداول متن سے مختلف ہے اس لئے اسے من وعن ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

"تقریظ ریختہ کلک گوہر سلکِ فردوسی مرتبت، عنصری منزلت، انوری عصر، خاقانی دہر، نظامی پایہ، جامی سرمایہ، سعدیٔ زمانہ، استادِ یگانہ، دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب مد ظلہ العالی "

"بنام خدا شاہد سخن کمال میں لاثانی ہے، سچ تو یوں ہے کہ یہ یوسف کنعانِ معانی ہے۔ کنعان

ہو، کنواں ہو، کارواں ہو، کوئی جگہ، کوئی مقام کوئی مکاں ہو، زلف و پیشانی وغیرہ، مختصر عارض و دستور [illegible] لب [illegible] نقش [illegible] چشم اور [illegible] کا جمال تصور میں لاتے ہیں۔ [illegible] کتاب تابان کو حضرت یوسف کا آئینہ [illegible] قلم و سخن سے آئے [illegible] ایک نو پیدا [illegible] سمجھئے، ذرا دیکھو آئینے ہونے تو حجاب [illegible] مشتاق آدمی یاد کریں [illegible] لوگ نظر ہیں کہ یوسف [illegible] عنواں [illegible] دار اور زنداں سے نکل کر تخت زماں روانی [illegible] جلوہ افروز ہوا ہے، زلیخائے عشق کے گھر [illegible] ہے اور یوسفِ حسن [illegible] نور روز [illegible] غالب آشفتہ نوا سے اس ورق کے ناظر [illegible] تک رمز کو نہ جانیں گے، تیری بات کبھی نہ سمجھیں گے۔ کیوں نہیں کہتا کہ خالق نے نواب عالی جناب والا دودمان میرزا کلب حسین نادر کو کیا اچھی طبیعت دی ہے جو انھوں نے ان اوراق کو اپنے اشعار سے رونق اور اشعار کو نعت و منقبت سے زینت بخشی ہے۔ دیباچہ نگار نے اس مجموعۂ نظم کو مصر فرض کیا ہے اور شاعر (کذا۔ شاعر) حسن کو یوسف قرار دیا ہے۔ جس کتاب میں ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مدح کے قصیدے ہوں وہ اوراق ہوں، سواد ان اوراق کا کیوں کر سرمۂ چشم اہل دید نہ ہو، اور وہ اوراق کیوں نہ حرز بازو ہوں۔ میں آفاق ہوں۔ میں اپنے طور پر نیت پر ناز کرتا ہوں کہ اس کتاب کے مداح کا ستائش گر ہوں اور بذریعہ اس ستائش کے غالب [illegible]

یعنی آپ سے بہتر ہوں [illegible] فقط۔"

غالب کی اس تقریظ کے بعد (۱) سید محمود علی خاں بہادر عرف نواب دولہا رئیس شمس آباد (۲) نواب عبدالعزیز خاں متخلص بعزیز (۳) قبلہ و کعبہ جناب سید زین العابدین خاں متخلص بہ شورش (۴) منشی سید تفضل حسین تحصیلدار، شاد تخلص، رئیس ہیر ہ داور (۵) منشی کالی رائے متخلص بہ تمیز کی تقریظیں شامل کتاب ہیں۔ تقریظوں کے بعد (۱) منشی فرزند حسین سفدر (۲) مرزا حاتم علی مہر (۳) حافظ بہادر علی مبتلی، (۴) غلام محمد بیتاب زبیر (۵) شیخ محبوب بخش ادیب محبوب تخلص، گورکھپوری ثاقب (۶) طالب علی خاں طالب (۷) لالہ مادھو رام جوہر (۸) مولوی سید امراؤ علی خطیر (۹) مرزا غلام زین العابدین عابد، رئیس آگرہ اور (۱۱) خود مصنف، نواب میرزا کلب حسین خاں نادر کے قطعات تاریخ ترتیب و طباعت درج ہیں۔ ان کے بعد کے آخری دو صفحات (ص ۳۰۱ اور ۳۰۴) "غلط نامہ ریاض نادر" پر مشتمل ہیں۔

مذکورہ صدر قطعات تاریخ میں سے مرزا حاتم علی مہر، مولوی امراؤ علی خطیر، غلام زین العابدین عابد اور خود نادر کی تاریخیں سال ترتیب (۱۲۸۱ھ) سے متعلق ہیں اور باقی شعرا کے قطعات سال طباعت (۱۲۸۲ھ) کی نشاں دہی کرتے ہیں۔ مہر، نادر اور جوہر فرخ آبادی کے قطعات تاریخ بطور نمونہ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

قطعۂ تاریخ از مرزا حاتم علی مہر

میرزا کلب حسین نادر — بہ لیاقت چو در نظم بسفت
مہر تاریخ کلام لغزش — اوج فکر سخن نادر گفت

۱۲۸۱ھ

ایضاً از میرزا کلب حسین خاں نادر

فراہم شد چو ایں نادر قصائد — کہ از خوبی او خلق است واقف
چو فکر سال تاریخش نمودم — "ریاض نادر" یہ گفت ہاتف = ۱۲۸۱ھ

ایضاً از مادھو رام جوہر

واہ کیا ہیں قصائدِ نادر — وصف میں جن کے طبع قاصر ہے
یوں لکھا سالِ طبع جو بر نے — "دیکھو یہ دل پذیر و نادر ہے"
۱۲۸۲ھ

ان قطعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قصائد کا یہ مجموعہ ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں مرتب ہو گیا تھا اور منصوبے کے مطابق اگلے برس یعنی ۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں اس کے طبع ہو جانے کے قوی امکانات تھے لیکن کسی وجہ سے طباعت کا کام بر وقت مکمل نہ ہو سکا اور اس کی تکمیل آئندہ سال ہجری میں ربیع الآخر کی ستائیسویں تاریخ (۸ ستمبر ۱۸۶۶ء) کو ہوئی۔ اس مجموعے پر غالب کی تقریظ کے بارے میں جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا خیال ہے کہ یہ ۶۶-۱۸۶۵ء کے قریب لکھی گئی ہے[۴۲]، جناب کاظم علی خاں کے اندازے کے مطابق یہ ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء سے قبل لکھی جا چکی تھی[۴۳]۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ تقریظ ۱۸۶۴ء کے آخر یا ۱۸۶۵ء کے اوائل میں لکھی گئی ہوگی جب کہ نادر اس مجموعے کی ترتیب کے بعد اس کی طباعت کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

دیوانِ غریب:- یہ نادر کے ان مخمسات کا مجموعہ ہے جو دوسرے شعرا کی غزلوں پر تضمین کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔ کتاب کے نام اور مصنف کے قطعۂ تاریخ کی رو سے اس مجموعے کا سالِ ترتیب ۱۲۸۳ھ ہے لیکن خاتمۃ الطبع کے بموجب یہ مجموعہ ترتیب کے ایک سال بعد ۱۱ شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۸ فروری ۱۸۶۸ء کو منشی رام سروپ کے مطبع دل کشا واقع کمپ فتح گڑھ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک شکستہ و بوسیدہ نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانے میں موجود تھا جس کی بنیاد پر انھوں نے "تذکرۂ نادر" مرتب کر کے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔ جناب اکبر حیدری نے پروفیسر صاحب مرحوم کے کتب خانے سے استفادے کے باوجود اس نسخے کی موجودگی یا عدم موجودگی کا ذکر نہ کرتے ہوئے ندوۃ العلما کے کتب خانے میں ایک مکمل نسخے کی موجودگی کی نشاندہی فرمائی ہے۔ راقم السطور کی اطلاع کے مطابق اس دیوان کا ایک اور مکمل نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بھی موجود ہے۔ چند سال قبل ایک ناقص الطرفین نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی راقم السطور کی نظر سے گزرا تھا، مگر اب تلاش کرنے پر دستیاب نہ ہو سکا۔

شکرستانِ نادر:- یہ نادر کا پانچواں اور آخری مجموعۂ کلام ہے جس میں صرف غزلیات یکجا کی گئی ہیں۔۔۔۔ شکرستانِ نادر اس کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سالِ ترتیب ۱۲۸۶ھ حاصل ہوتا ہے۔ نادر کے کئی دوسرے دیوانوں کی طرح یہ دیوان بھی منشی رام سروپ کے مطبع دلکشا واقع کمپ فتح گڑھ میں چھپا ہے۔ خاتمۃ الطبع کے مطابق اس کی طباعت کا کام ۱۲۸۷ھ میں شروع ہوا تھا اور آئندہ سالِ ہجری میں ۱۰ ذی قعدہ مطابق ۲۲ جنوری ۱۸۷۲ء کو مکمل ہوا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کو اس دیوان کا ایک "مکمل اور اچھا نسخہ" ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں دستیاب ہوا تھا، ایسا ہی ایک اور نسخہ جو ہر اعتبار سے اچھی حالت میں ہے، بنارس ہندو یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

شکرستانِ نادر پندرہ سطری مسطر پر نہایت خوش خط، جلی قلم شائع ہوا ہے۔ یہ کل چار سو چھیاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ غزلیات جن کی مجموعی تعداد تین سو چھیانوے ہے، صفحہ ۴۷۰ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ باقی سولہ صفحات (۱) نواب سید محمد علی خاں بہادر نور رئیس شمس آباد (۲) مولوی عبد العزیز خاں عزیز بریلوی (۳) منیر شکوہ آبادی (۴) میر اطہر علی شاگرد صفیر فرخ آبادی (۵) مولوی عرفان علی اور (۶) منشی کالی رائے تمیز کی تقریظوں اور مختلف شعرا کے قطعات تاریخ پر مشتمل ہیں۔ آخری قطعہ منشی شنکر سروپ نجات کا ہے جو مطبع دل کشا کے منصرم اور نادر کے شاگرد تھے۔ نواب محمد علی خاں بہادر نور کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "دیوانِ فصاحت بیان" کی "ترتیب کا نام "شکرستانِ نادر" اور طبع کا نام "دیوانِ غبور" کہ دونوں نام تاریخی ہیں، قرار پایا" تھا۔ ترتیب و تدوینِ کلام کے سلسلے میں وہ تمام قاعدے اور رعایتیں

جن کا مفصل ذکر "دیوانِ نادر" کے دیباچے میں کیا جا چکا ہے، اس دیوان میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہیں۔

حواشی

۱؎ جناب کاظم علی خاں لکھتے ہیں کہ "نادر کا اصل نام میرزا کلب حسین تھا۔ بعض صاحبانِ قلم نے نادر کو کلب حسین خاں لکھا ہے جو راقم السطور کے نزدیک محلِ نظر ہے۔ "خاں" نادر کے نام کے بجائے "خان بہادر" خطاب کا جز ہے۔ نادر کو نظامی بدایونی نے مرزا کلب حسین خاں لکھا ہے۔ راقم کے نزدیک نادر کو میرزا کلب حسین لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔" (ہفتہ وار "ہماری زبان" دہلی شمارہ یکم ستمبر ۱۹۷۹ء ص ۱) محررِ سطور کے نزدیک کاظم صاحب کی یہ ساری بحث محلِ نظر ہے۔ کیوں کہ نادر کو "بعض صاحبانِ قلم" نے نہیں، بیشتر معتبر صاحبانِ قلم نے "مرزا کلب حسین خاں" یا "کلب حسین خاں" لکھا ہے۔ مثلاً "دیوانِ غریب" کے سرورق پر ان کا نام "مرزا کلب حسین خاں" اور "ریاضِ نادریہ" کے سرورق پر خاتمے کی تحریروں میں "مرزا کلب حسین خاں صاحب" لکھا گیا ہے۔ ان سے ذاتی واقفیت رکھنے والوں میں نصر اللہ خاں خویشگی نے "گلشنِ ہمیشہ بہار" میں انھیں "مرزا کلب حسین خاں" کے نام سے یاد کیا ہے اور نواب عبد العزیز خاں عزیز نے "شکرستانِ نادر" کی تقریظ میں "اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں نادر" لکھا ہے۔ ان تمام شواہد سے بڑھ کر نام کی اس روایت کی صحت کا حتمی ثبوت یہ ہے کہ خود نادر نے اپنے جاری کردہ ایک اشتہار مطبوعہ اخبار "نور الانوار" کان پور مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۴۱ء کے آخر میں اپنا نام "بندۂ آثم کلب حسین خاں" لکھا ہے۔

۲؎ دیوانِ غریب بحوالہ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ ۲۲ فروری ۱۹۸۱ء ص ۱

۳؎ آبِ حیات، شائع کردہ رام نرائن لال بینی مادھو، بک سیلر الہ آباد (طبع ۱۹۰۷ء) حاشیہ ص ۳۴۹

۴؎ مرزا محمد تقی کی قبر درگاہِ فاطمان میں شیخ علی حزیں کی قبر کے متصل داہنی جانب آج بھی بالکل صحیح حالت میں موجود ہے اور اس کے تعویذ کا یہ کتبہ بخوبی پڑھا جاتا ہے:۔

> "بتاریخ بست و ہفتم شوال سنہ ہزار و صد و ہفتاد و پنج ہجری آقا محمد تقی بیگ بن محمد حسین بیگ برحمت الٰہی پیوست"

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "شیخ (حزیں) نے ..... بہت سے اپنے شعر (مرزا محمد تقی) کی قبر پر لکھے جو اب تک قائم ہیں۔" بظاہر انھیں یہ اطلاع نادر کے صاحبزادے مرزا کلب عابد خاں ڈپٹی کلکٹر امرت سر سے ملی ہوگی لیکن یہ درست نہیں۔

۵؎ نصر اللہ خاں خویشگی نے نادر کے حالات میں انھیں "ابن کلب علی خاں گورکھپوری" لکھا ہے۔ چونکہ خویشگی تالیفِ تذکرہ سے کچھ دنوں پہلے دو برس تک گورکھپور میں تحصیل دار رہ چکے تھے اس لیے ان کے اس بیان کو سرسری طور پر سہو یا غلط فہمی پر محمول کر کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ کلب علی خاں اس زمانے میں گورکھپور میں کسی سرکاری منصب پر فائز ہوں۔ سرکارِ انگریزی اور بنارس کے راج گھرانے میں ان کے اثر و رسوخ کی کیفیت مولانا محمد حسین آزاد کے بیانات سے بخوبی ظاہر ہے۔ (آبِ حیات نسخہ محولہ بالا ص ۳۴۹)

۶؎ و ۷؎ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ ۲۲ فروری ۱۹۸۱ء ص ۱

۸؎ مولانا آزاد نے "آبِ حیات" میں نادر کے "سرحدِ نوابی پرسورام میں" تحصیل دار ہو کر آنے کا ذکر کیا ہے (ص ۳۴۸) اور نادر اپنے ایک قطعۂ تاریخ کے بموجب ۱۲۶۲ھ میں وہاں موجود تھے۔

۹؎ تاریخ۔ تجزیہ و تنقید ص ۱۶۱ و ۱۰۲۔

۱۰؎ بحوالہ "شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شائع کردہ مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور ص ۳۶۵

۱۱ گلشن ہمیشہ بہار مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی شائع کردہ انجمن ترقی اردو، پاکستان ص ۲۲۸ و ۲۲۹۔ (در الہ آباد غزل ہائے او شنیدہ شد)

۱۲ ایضاً صفحات ۲۶۲ و ۳۱۲۔ خویشگی نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ "در الہ آباد از پیش گاہ حاکم صدر طلب شدہ مامور بعہدۂ ڈپٹی کلکٹری گردید"۔ اس کے بعد تاریخ (متوفی پنجشنبہ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۸ء) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "در سنہ یکہزار و دو صد و پنجاہ و چہار ہجری چوں بالہ آباد رسیدم، خبر وفاتش شنیدم"۔ محرر سطور نے انہی دونوں بیانات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خویشگی حاکم صدر کے حسب الطلب اگست ۱۸۳۸ء میں الہ آباد پہنچے تھے۔

۱۳ الف و ۱۳ ب خویشگی نے "گلشن ہمیشہ بہار" میں جو انھوں نے ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان قیام بجنور کے زمانے میں مرتب کیا ہے، نادر کو اٹاوہ میں ڈپٹی کلکٹر بتایا ہے (ص ۳۲۸)۔ اسعد الاخبار میں ۱۸۵۰ء میں شائع ہونے والی ان کی دو کتابوں "فضائل الشہدار" اور "توصیف زراعت" کے اشتہارات سے بھی ان کا اٹاوہ میں ڈپٹی کلکٹری پر مامور ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ "دیوان نادر" اور "نظم نادر" دونوں کے دیباچے سید اکرام علی عاجز نے ۱۲۶۷ھ میں لکھے ہیں۔ ان میں سے "دیوانِ نادر" کا دیباچہ نادر کے قیام اٹاوہ کی توثیق کرتا ہے۔ اس سلسلے کی آخری شہادت "سراپا سخن" کی ہے جو ۱۲۶۹ھ میں مرتب ہوا اور جس میں ہر جگہ ان کے نام سے پہلے ڈپٹی کلکٹر اٹاوہ لکھا گیا ہے۔ ۱۴ بحوالہ "تذکرۂ نادر" ص ۱۱

۱۵ یہ مضمون ہفتہ وار "ہماری زبان" کے دو شماروں بابت ۲۲ فروری و یکم مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۶ تذکرۂ ابنِ طوفان ص ۴۹، "تذکرۂ نادر"، مقدمہ ص ۸، اردوئے معلّیٰ، صدی ایڈیشن، مرتبہ فاضل لکھنوی و شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور، جلد سوم ص ۸۰۳ و "مجموعۂ قصائد نادر پر غالب کا دیباچہ" مضمون از کاظم علی خاں مطبوعہ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ یکم ستمبر ۱۹۷۹ء ص ۱

۱۷ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے متذکرۂ صدر مضمون میں "ارمغان گوکل پرشاد" کے حوالے سے اس واقعے کا سنہ عیسوی ۱۸۷۰ء لکھا ہے لیکن فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" میں صفحہ ۵۸۲ پر اس تذکرے کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ نادر نے ۱۸۸۰ء میں رحلت فرمائی۔ اصل تذکرہ ہمارے پیش نظر نہیں۔

۱۸ "ہماری زبان" شمارہ ۲۲ فروری ۱۹۸۱ء ص ۲

۱۹ خوش معرکۂ زیبا بحوالہ ہماری زبان شمارہ مذکورہ صدر ص ۲

۲۰ ارمغان گوکل پرشاد ص ۱۴۲ بحوالہ "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" از فرمان فتح پوری ص ۵۸۳

۲۱ محسن نے نادر کو بیشتر مقامات پر "صاحب دیوان مع مثنوی و قصائد" لکھا ہے لیکن ایک جگہ (طبع ۱۸۷۵ء ص ۱۲۲) ان کی تصانیف میں "کئی دیوان" اور ایک جگہ (ص ۵۰) واضح طور پر "چار دیوان" بتائے ہیں۔

۲۲ شکرستان نادر ص ۴۷۶

۲۳ ہماری زبان شمارہ ۲۲ فروری ۱۹۸۱ء ص ۲

۲۴ و ۲۵ ہماری زبان شمارہ یکم مارچ ۱۹۸۱ء ص ۷

۲۶ بحوالہ سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ شمارہ نمبر ۱، ۱۹۶۲ء ص ۸۹

۲۷ اردوئے معلیٰ، صدی ایڈیشن حاشیہ ص ۸۰۳ و "مجموعۂ قصائد نادر پر غالب کا دیباچہ" مضمون از کاظم علی خاں مطبوعہ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ یکم ستمبر ۱۹۷۹ء ص ۲۔ حیرت ہوتی ہے کہ نواب سید محمد علی خاں نور رئیس شمس آباد نے بھی جن کی نظر سے یہ دیوان یقیناً گزرا ہوگا "شکرستانِ نادر" کی تقریظ میں اسے "گلدستہ ..... قریب ایک سو قصائد مدحیہ حضرات (معصومین صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کا" بتایا ہے۔ (ص ۴۷۲)

۲۸ عودِ ہندی، طبع اول مطبوعہ مطبع مجتبائی میرٹھ ص ۱۸۵: "سبحان اللہ شاہدِ سخن کمال حسن میں لاثانی ہے"

۲۹ع و ہندی" "ادلی" سے قبل "ایک" ندارد
۳۰ ایضاً : "نوید" سے قبل "ایک" ندارد
۳۱ ایضاً : "چپ ہو رہتے"
۳۲ ایضاً : "امید یہ کہ دانش مند آدمی یاد رکھیں اور دیدہ ور لوگ نظر کریں"
۳۳ ایضاً : بوسعتِ سخن ۳۴ ایضاً : نمائشگی (کذا = نمائیں گے) ۳۵ ایضاً : مرزا کلب حسین خاں ڈپٹی کلکٹر بہادر
۳۶ ایضاً : "طبیعت بخشی ہے" ۳۷ ایضاً : مرنج کے سو نصیدے زینتِ اوراق ہوں" ۳۸ ایضاً : "کیوں نہ سرمۂ چشم اہل دیں ہو"
۳۹ (الف) ایضاً : "فقط" ندارد اس کی بجائے "۱۲" (ب) اس تقریظ کی نقل کے لیے محرر سطور مکرمی اکبر علی خاں عرشی زادہ کا ممنون ہے۔
۴۰ عنوان میں اس قطعے کو "قطعہ تاریخ طبع" لکھا گیا ہے لیکن حقیقتاً یہ قطعہ "تاریخ ترتیب" ہے۔
۴۱ مصرع چہارم میں واو عطف "سخن" اور "نادر" کے درمیان چھپا ہے جو یقیناً کتابت کی غلطی ہے۔
۴۲ اردوئے معلیٰ صدی ایڈیشن حاشیہ ص ۸۷۴
۴۳ ہماری زبان شمارہ یکم ستمبر ۱۹۷۵ء ص ۲۔

★

علقمہ شبلی
۹ ریپن اسٹریٹ
کلکتہ-۷۰۰۰۱۶

کرشن بانی

لب کی کلیاں کھلیں
راستے جگ مگانے لگے
صبح چہرے کی صبحِ بنارس ہوئی
زلف کی شام شامِ اودھ ہو گئی
خیر سے اک کرشن آج پھر
نے بہ لب آگیا
چھیڑ دی اس نے وہ بانسری کی صدا
گوپیاں سُن سکیں
آنکھ ملتی ہوئی اٹھ گئیں
اور محفل میں رادھا بھی معنی کی رقصاں ہوئی
لب کی کلیاں کھلیں

راستے جگ مگانے لگے
صبح چہرے کی صبحِ بنارس ہوئی
زلف کی شام شامِ اودھ ہو گئی

برف زاروں میں شل ہو نہ جائے کہیں
سو نہ جائے کہیں

گوپیوں کا بدن
جسم رادھا کا بھی
اپنے جذبے کی گرمی سے یونہی تپاں تم کرشن ان کو رکھا کرو
یوں ہی بیدار کرتے رہو!

فکر تونسوی

(طنزیہ)

میری مُطالعہ گاہ

جب میں دنیا بھر کی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تو اپنی ایک مطالعہ گاہ بنائی۔

یہ مطالعہ گاہ مکان کی چوتھی منزل پر تعمیر کی گئی ہے۔ سنا ہے، خدا عرش پر رہتا ہے۔ اس نے عرش سے ادھر اپنا ایک مکان بنا لیا۔ خیال تھا کہ اس طرح خدا سے براہ راست گفتگو ہو سکے گی۔ دو چار مرتبہ میں نے مطالعہ گاہ کی چھت پر کھڑے ہو کر خدا کو آواز بھی دی لیکن جواب ایک بے جان خاموشی میں ملا۔ تو پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ مطالعے کی نہ خدا کو ضرورت ہے نہ مجھے ——— اور یوں بھی خدا سے میرے تعلقات ہمیشہ ناخوشگوار رہے ہیں۔ فیصلے کے لیے ہم دونوں کو روزِ حشر کا انتظار ہے۔

میرے ایک دوست ہیں، خورشید عالم۔ عمر کا پیٹا ساٹھ سال کیونکہ ساٹھ سال سے کم عمر کے لوگ مجھے اپنا دوست بنانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نے زندگی کے باقی سانس چوتھی منزل کی مطالعہ گاہ کو وقف کر دیئے ہیں تو وہ ایک دن میری خیر و عافیت پوچھنے کے لیے اوپری منزل پر آ پہنچے۔ اپنی خیر و عافیت جاننے کے بجائے۔ میں نے ان کی خیر و عافیت پوچھی۔ کیونکہ پانچ درجن سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ ہانپ رہے تھے۔ شربت کا ایک گلاس پیش کیا تو بولے۔

"میٹھی چیزیں مجھ پر ممنوع ہیں۔"

"کیوں؟ کیا شوگر کا عارضہ ہے؟"

انھوں نے ڈاکٹر کا نسخہ میرے سامنے پیش کر دیا۔ ایک مرتبہ مجھے بھی ڈاکٹر نے ایک چھوٹا سا نسخہ لکھ کر دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ سگریٹ پینا فوراً بند کر دیجئے ورنہ......؟ اور جب وہ یہ ہدایت دے رہے تھے تو خود بھی سگریٹ نوش فرما رہے تھے۔ آج کل اُن ڈاکٹر صاحب کی آخری قیام گاہ قبرستان ہے۔ کیونکہ قبر تلے آرام فرما رہے ہیں۔ البتہ ازراہِ عنایت وہ مجھے ایک طبی کتاب دے گئے تھے۔ جس میں سگریٹ نوشی ختم کرنے کے کئی نسخے درج تھے۔

آج کل وہ کتاب میری مطالعہ گاہ میں موجود ہے۔ میں اسے پڑھتا نہیں لیکن اس سے رشتہ قائم رکھنے کی خاطر سگریٹ کے کش اس کی طرف پھینکتا رہتا ہوں۔

میں نے خورشید عالم سے کہا۔ "آپ کی موت شوگر سے نہیں ہوگی۔ ہارٹ اٹیک سے ہوگی۔"

وہ بولے۔ "مگر ہارٹ اٹیک تو بلند پایہ خاندانوں میں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا مطالعہ ناقص اور قدیم ہے۔ فطرت کی جدید ترین پالیسی مختلف ہے کہ ہارٹ اٹیک کو طبقاتی نظام کا غلام نہیں بنانا چاہیے۔ یہ دیکھئے آج کا اخبار! اس میں چار نو بیاہتا دلہنوں کے مٹی کے تیل سے جل مرنے کی خبریں درج ہیں، اور پانچ خبریں، چپراسی سے لے کر کلرک تک کے ہارٹ اٹیک سے انتقال فرمانے کی ہیں ———"

مگر خورشید عالم بضد تھے کہ میری موت ہارٹ اٹیک سے ہرگز نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر دمے سے ہوگی۔ کیونکہ دنیا کے کئی بڑے بڑے آدمی چھیاسی چھیاسی برس تک جینے کے بعد دمے سے ہی مرے ہیں۔"

بولے۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"کتابوں کے مطالعے سے" اور میں نے الماری میں سجی ہوئی ایک کتاب کی طرف اشارہ کر دیا، جس کی پشت پر لکھا تھا۔ "انجام دنیا کے بڑے آدمیوں کا۔"

اور خورشید عالم صاحب وہ کتاب یہ وعدہ کرکے ہمراہ لے گئے کہ ہفتہ بھر میں لوٹا دوں گا۔ اور میں نے انھیں یہ کہہ کر شرمندہ کرنا تہذیب کے منافی سمجھا کہ یہ میری آٹھویں کتاب ہے، جو ایسا ہی وعدہ کرکے لے جائی گئی تھی۔ آج تک نہیں لوٹی۔

میری مطالعہ گاہ میں اعلیٰ اور ادنیٰ ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ ایک حسین شاعرہ کا مجموعۂ کلام بھی موجود ہے جس کے ہر صفحے پر وزن اور بحر سے خارج شعر درج ہیں۔ مگر میں اسے ادنیٰ کتاب نہیں سمجھا کیونکہ اس کے جشن اجرا میں ایک اعلیٰ لیڈر شامل ہوئے تھے (اگرچہ اکثر لیڈر وزن اور بحر سے خارج ہوتے ہیں۔)

اور مطالعہ گاہ میں ایک مختصر ترین مذہبی کتابچہ بھی موجود ہے۔ جسے میں نے ٹیگور کی گیتانجلی کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ یہ کتابچہ مجھے ایک مذہب پرست مداح نے عنایت کیا تھا... میں نے پوچھا۔ "یہ عنایت نامہ کس سلسلے میں؟"

بولے "جب بھی آپ کا سکون برباد ہونے لگے اس کتابچے کا مطالعہ شروع کر دیجیے۔ انشاء شانتی مل جائے گی۔"

"مگر میرا سکون تو ہمیشہ برباد رہتا ہے۔"

"تو ہمیشہ یہی کتابچہ پڑھتے رہیے۔"

میں نے سوچا، تو پھر اپنی مطالعہ گاہ میں یہی مختصر کتابچہ رہنے دوں۔ باقی کتابیں، خالی بوتلیں ردی ڈبے سمجھ کر بیچ دوں ـــ اس سے انشاء شانتی ملے گی۔

مگر میں ان دنوں برنارڈ شا کے ڈراموں کا ایک منتخب مجموعہ لے آیا تھا۔ چونکہ مہنگا بہت تھا، اس لیے لائبریری سے چرا کر لایا تھا۔ (کتابوں کے چور، چور نہیں کہلاتے، اہل ذوق کہلاتے ہیں) چنانچہ میں برنارڈ شا کی کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگیا اور وہ مذہبی کتابچہ اپنی بیوی کو دیدیا کہ ہر صبح غسل کرکے اس کا مطالعہ کیا کرو۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ جس دن بھی وہ مطالعہ کرتی اس دن کسی نہ کسی نامعقول مسئلے پر جنگ آزمائی ضرور کرتی۔ اور یوں میری شانتی بھنگ ہوجاتی۔

چنانچہ ایک دن میں نے بیوی سے کہا۔ "اب یہ کتابچہ مجھے واپس کر دو۔"

وہ بولی۔ "کیوں؟"

میں نے کہا۔ "یہ ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کا تجریدی افسانہ ہے۔"

"تجرید کیا ہوتی ہے۔"

"جیسے تم سالن میں مرچیں زیادہ ڈال دو۔ مگر میں کہوں کہ اس میں مرچیں کم اور نمک زیادہ ہے۔ یعنی مرچیں تمھاری سمجھ میں نہ آئیں اور نمک میری سمجھ میں۔ تو سبزی اس کنفیوژن میں کیسی ہو جائے گی۔ اسے کہتے ہیں تجریدیت ـــ یعنی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔"

یہ الجھی ہوئی فلاسفی بیوی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے ناسمجھی میں وہ کتابچہ میرے سپرد کر دیا اور اسے معجزہ ہی سمجھئے کہ دوسرے ہی دن سول وار ختم ہوگئی۔ اور میں نے وہ کتابچہ ٹیگور کی گیتانجلی کے اوپر رکھ دیا۔ آسانی اس میں یہ رہی کہ گیتانجلی اتنی گہری، اتنی دقیع اور اتنی خلائی پرواز والی شاعری ہے کہ میں نے اپنی ذکاوت کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ نچوڑ کر سینکڑوں مرتبہ اس پر ڈالا۔ مگر ہر مرتبہ وہ میرے لہو میں سے مچھلی کی طرح باہر نکل جاتی ہے اور پھر عمیق سمندر کے طوفان میں پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے میں نے اسے اس جنم میں پڑھنا ملتوی کر دیا ہے۔ کتابچہ اور گیتانجلی دونوں کے نام الگ ہیں، کام ایک ہی ہے۔ یعنی شانتی کے پردے میں اشانتی دینا۔

مگر دونوں میری مطالعہ گاہ میں بڑی شانتی سے پڑی رہتی ہیں اور سجے جا رہی ہیں۔

نہ جانے کیسے ـــ جھینگروں اور چوہوں کو معلوم ہو گیا کہ میں اب کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتا۔ اس لئے وہ میری کتابوں پر طبع آزمائی کرنے کے لیے نمودار ہو گئے۔ ایک مرتبہ ایک اسٹوڈنٹ میرے پاس آیا۔ وہ ایم۔ اے کی ڈگری کے لیے کوئی ریسرچ پیپر تیار کر رہا تھا۔ مجھ سے بولا۔ "جناب! کیا آپ کے پاس دیوان غالب موجود ہے۔؟"

"جی ہاں! نہ صرف دیوان غالب بلکہ شرح دیوان غالب بھی موجود ہے۔"

میں نے دیوان غالب اٹھایا۔ کیا دیکھا۔ کہ اس کا مطالعہ کوئی چوہا کرتا رہا ہے۔ شاید وہ بھی کوئی ریسرچ پیپر تیار کر رہا تھا۔ اور بہ سلسلۂ ریسرچ اس نے دیوان غالب کے کئی اشعار دانتوں سے کتر ڈالے تھے۔ وہ کمال کہ اہل ذوق تھا۔ کہ اس نے صرف وہی شعر کترے تھے جن میں شعریت کم اور ڈکشنری وافر تھی۔ مثلاً ؎

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا

اس شعر میں صرف "آیا" کا لفظ نہیں کترا گیا تھا۔

میں نے اسٹوڈنٹ سے کہا۔ "معذرت چاہتا ہوں۔ غالب پر ریسرچ تو آپ سے پہلے ایک صاحب کر چکے ہیں۔ اور ہم انسانوں سے بہتر کر گئے ہیں"

وہ بولے۔ "تو شرح دیوان غالب ہی عنایت کر دیجئے۔"

میں نے شرح نکالی ـــ تو دیکھا، کہ چوہے نے ہر شعر کی تشریح کو دانتوں سے کنڈم کر دیا تھا۔ صرف شرح کرنے والے کا نام جلد بازی میں یا رعایتاً چھوڑ گیا تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی ایک اور شاعر کی کتاب پڑی تھی۔ چوہے نے مجموعۂ کلام کا ایک بھی شعر نہیں کترا تھا۔ بلکہ صرف شاعر کا نام دانتوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس لیے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس شاعر کا کلام ہے۔ کیونکہ شاعر، اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔ مگر اسلوب پوری کتاب میں چونکہ غائب تھا اس لیے چوہے نے بے اسلوب شاعر کا نام ہی غائب کر دیا تھا۔

ایک چینی فلسفی کی ضخیم کتاب تھی جس کا مطالعہ دو تین مرتبہ کر چکا تھا۔ کتاب کا لب لباب یہ تھا۔ کہ انسان کو بہتر اور بے تکلف زندگی گزارنے کے لئے کون سے آداب اختیار کرنے چاہئیں میں نے کتاب سے متاثر ہو کر چند آداب اختیار کئے۔ تو طرز تپاک اہل دنیا نے وہ آداب ہی جلا ڈالے۔ کتابی آداب پر عمل کیا جائے تو انسان سوشل لائف سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ یا سوشل لائف ہی اسے کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔

میں چاہتا تھا وہ کتاب کسی لائبریری کو خیرات میں دے دوں۔ کیونکہ سنا ہے، خیرات دی جائے تو اگلے جنم میں خیرات بطور سند مل جاتی ہے۔ چنانچہ اس چینی فلسفی کی کتاب کھولی۔ تو اس کے ہر دوسرے تیسرے ورق میں جھینگر و استراحت تھے اور اپنے بول و براز سے کتاب کے پورے آداب کو غلیظ کر چکے تھے ـــ میں نے ان جھینگروں سے پوچھا۔

"آپ حضرات کون ذات شریف ہیں۔"

وہ بولے۔ "ہم چینی ہیں۔ چین میں سرخ آفتاب آیا تو ہم وہاں سے فرار ہو کر اس کتاب میں آ گئے۔"

"یہ کتاب تمھاری کیا لگتی ہے۔"

"یہ ہمارا رفیوجی کیمپ ہے۔"

چند کتابیں علامہ قسم کے نقادوں کی تھیں۔ دلآویز جلد، بیش قیمت کاغذ، قد و قامت میں وجیہہ۔ میں نے انھیں کبھی نہیں پڑھا تھا نہ صرف میں نے بلکہ جھینگروں اور چوہوں نے بھی انھیں نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ وہ اور میں، ہم سب جانتے تھے کہ ان میں زیادہ تر یورپ اور امریکہ کے انٹلکچولز کے جملوں کے پیچیدہ جوڑ توڑ اور حوالے شامل کئے گئے ہیں ـ نقاد خود موجود نہیں۔ اور اس کی اوریجنلٹی تو نہ صرف ناموجود بلکہ مفقود ہے۔

مگر مجھے اپنی مطالعہ گاہ میں رکھ کر وہ اعزاز حاصل تھا جو میرے ایک کروڑ پتی رئیس آشنا کو حاصل تھا۔ ایک مرتبہ میں اس کے امیر خانے پر تشریف لے گیا تو قیمتی اور رنگین کتابوں سے اس کا شوکیس شیلف بھرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا آپ ان کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں؟"

وہ بولے۔ "ابھی کہاں؟ فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"تو پھر یہ کتابیں خرید کیوں ڈالیں۔"

"ابھی میرے آرکیٹیکٹ نے کہا تھا کہ ماڈرن کمرے کی تکمیل میں ایک بک شیلف ضرور بنانا چاہئے۔ اس سے عزت بڑھتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تو کتنی عزت بڑھی۔؟"

"جی، کوئی ملاقاتی آجائے تو اس کے دل میں میری عزت کچھ تو بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں پڑھنے کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہوں۔"

میں نے اس سے یہ کہنا موزوں نہیں سمجھا کہ اگر آپ کے یہاں بک شلیف نہ ہوتا تو آپ کے اعلیٰ ذوق کا کافی برا حشر ہوتا۔

خود میرا ایک مرتبہ یہ حشر ہو چکا تھا کہ میرا ایک دوست نہایت پرتکلف قسم کی حسین وجمیل ہومیو پیتھک کی کتاب بھول گیا تھا۔ فراموش گاری میں اس نے دوبارہ مانگی نہیں اور اہل ذوق بننے کے لیے میں نے واپس نہیں کی۔ اور الماری میں یوں آراستہ کر دی جیسے کچھ لوگ شوکیس میں پلاسٹک کا مور سجا کر رکھ دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اینٹی پوئٹری (ناشاعری) کی طرح اپنے پلے نہیں پڑی۔ دوسری مرتبہ اس لیے پڑھنے سے باز رہا۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ شہر کا ہر تیسرا انسان یا تو ہومیو پیتھک کا ایکسپرٹ بن کر لوگوں کا علاج کر رہا ہے اور یا پان شاپ کھول کر بیٹھ گیا ہے۔

میری مطالعہ گاہ میں میری اپنی بھی کچھ تصانیف ہیں۔ باقی کتابوں کے برعکس انھیں کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں۔ کیونکہ ان پر اپنائیت کا شبہ ہوتا ہے۔ شبہ آہستہ آہستہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ کیونکہ اپنائیت میں ایک عجیب طلسم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں مشہور ادیب 'اپندر ناتھ اشک' کے یہاں ڈنر کی دعوت پر مدعو تھا۔ کھانا آیا تو [illegible] میں سالم تیرتے ہوئے بینگن تھے۔ مگر ان کی بیوی کوشلیا جی نے سب بینگن

پر سے تو اشک جی کی تھالی میں تین بینگن رکھ دیئے۔ مگر میری تھالی میں دو بینگن۔

میں نے تعریفاً کہا۔ "کوشلیا جی! بینگن بھی عجیب چیز ہیں۔ تھالی میں ہوں تو لڑھک جاتے ہیں۔ دو بانٹے جاتے ہیں تو تین [illegible]۔"

کوشلیا سمجھ گئیں۔ ایک اور بینگن لاکر میری تھالی میں دھر دیا۔ مگر میرے منہ سے نکلا۔ "آہ! آپ نے اپنائیت کا ستیاناس کرکے رکھ دیا۔"

گزشتہ دنوں میرا نواسہ میری مطالعہ گاہ میں تشریف لایا۔ پوچھنے لگا۔ "نانا جی! کیا آپ نے یہ مطالعہ گاہ پڑھنے لکھنے کے لیے بنائی ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

"کیا آپ سماج سے تنہا ہو کر یہاں رہنا چاہتے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔"

"آپ کے پاس یہ ڈھیر سی کتابیں کہاں سے آئی ہیں۔؟"

"معلوم نہیں۔"

"کیا آپ یہاں بیٹھ کر اپنی آپ بیتی لکھنا چاہتے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔"

"آپ بیتی لکھ کر آپ دنیا کو کیا بتانا چاہتے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔"

اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی مسلسل خاموشی پر میں نے کہا۔ "اور پوچھو بیٹا! اور پوچھو! بے وقوف! پوچھو گے نہیں۔ تو علم کیسے حاصل کرو گے؟ میری طرح عرش سے ادھر اپنی مطالعہ گاہ کیسے بنواؤ گے۔؟"

*

وقار خلیل
"ایوانِ اردو" پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد دکن

عصری کروٹ

روشنی پڑھتی رہی ایک ایک چہرے کی کتاب
ملگجی، بے ربط تحریریں تھیں بے چہرہ شباب
کیا طلب، کیا جستجو، کیا حقِ محنت، کیا حساب
یہ المیہ ہے ہمارے عہد کا میرے جناب

کچھ تو ہو انسانیت کی آبرو باقی رہے
سرفرازی ساغر و مینا کی اے ساقی رہے

دستِ محنت میں کہاں ہے اب وہ اگلا سا کمال
آزری بے تیشہ لگتی ہے، ادھورا ہر سوال
عشق کا مفہوم بھی غارت ہوا کیسا وصال
ہر جہت جیسے اداسی پھینکتی جاتی ہے جال

آرزو کے بام پر کوئی ستارا تو کھلے
شہر و صحرا سب مہک اٹھیں ہوا ایسی چلے

علم و دانش کے خزینے، فکر و فن کے مرحلے
شعر و نغمہ، رقص و موسیقی کے سارے سلسلے
موجِ مے کی طرح اتراتے ہوئے وہ منچلے
آتش و آہن کو شرماتے ہوئے وہ حوصلے

اب کچھ ایسا ہے کہ تخ بستہ نظر آتے ہیں سب
دھند میں لپٹے ہوئے جانے کدھر جاتے ہیں سب

کس دھندلکے میں بسر ہوتی رہی ہے زندگی
پھیلتی جاتی ہے ہر سو تیرگی ہی تیرگی
بے چراغی کو جہاں سجتے رہے تابندگی
تف ہے ایسی ذہنیت پر، خوب ہے یہ آگہی!

آدمی کی سربلندی اور جنوں کا بانکپن
کچھ بھی اب ممکن نہیں، تنہا بجھے ہے انجمن

ناامیدی کے خرابے میں کرن اندر کرن
ارتقا آثار اجالوں کی چمکتی انجمن
پھول کلیاں پھر کھلائے گی، سجے گا پھر چمن
لوگ کہتے ہیں نہ بجھے چہروں پہ آئے گی پھبن

کاش ایسا ہو کہ ویرانے میں رقصاں ہو بہار
نسلِ نو کے خواب کی تعبیر کا اک اقتدار

معین الدین حسن کاکوروی
شفیع منزل ۲۶ قندھاری لین
لال باغ لکھنؤ

ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل

تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

طویل العمری بھی بعض اوقات کلفت بن جاتی ہے اور یادداشت اگر حافظہ تیز ہو تو عذاب ہو جاتی ہے۔ ہم سفروں کا بچھڑنا، ہمدرد اور غمگسار دوستوں کی جدائی، فغانِ نیم شبی اور نالہ ہائے سحرگاہی اور سوز و تپش اور تب و تابِ قلب کا سامان فراہم کرتی ہے۔ نہ معلوم کتنے یارانِ باصفا داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ سراپا محبت ہستیاں جن سے لمحاتِ حیات میں حلاوت، قلب میں طراوت اور زندگی میں لذت میسر تھی۔

عبدالاحد خاں خلیل سے میرے بہت قریبی تعلقات تھے اور ہم دونوں مختلف رشتوں میں منسلک تھے۔ جب وہ کالون تعلقدار کالج میں لیکچرر تھے تو انھوں نے میرے حقیقی بھانجے کنور اعتقاد رسول مرحوم والیٔ ریاست رسول پور کو پڑھایا تھا جو خلیل صاحب کی تعریف میں ترزبان رہتے تھے۔ وہ ایک باوقار اور بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ سرخ و سفید رنگ، چوڑی پیشانی، ستواں ناک، بارعب چہرہ مہذب و شائستہ مزاج اور پاکیزہ طینت۔ ان کو دیکھ کر کوئی بھی انسان ان کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ ادبی جلسوں اور موقعوں میں ان سے اکثر ملاقات رہتی۔ جب بھی ملتے مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیلتی رہتی اور نہایت تپاک سے ملتے۔ یہ گرم جوشی تپاک اور تواضع رسمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں بے پناہ خلوص کا جذبہ کارفرما ہوتا۔ ایک رشتہ تو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا رشتہ یہ تھا کہ ان کے صاحبزادے اسلامیہ کالج لکھنؤ میں میرے طالب علم رہے۔ اور ضیاء میاں جو خلیل صاحب کے صاحبزادے ہیں انھوں نے میرے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا کہ انھوں نے اپنی صاحبزادی کے لیے مجھے ٹیوٹر کی حیثیت سے مقرر کیا اور میں نے نہایت خوشی سے یہ خوشگوار فریضہ کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ اپنی اولاد کی تربیت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے اور ہما شما اور انجان لوگوں سے اپنی صاحبزادی کو پڑھوانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مجھے ٹیوٹر مقرر کرنا اس بات کی دلیل تھا کہ مجھ پر کتنا اعتبار کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ میں حسبِ دل خواہ پڑھا سکوں گا۔ شکر ہے کہ میں ان کی توقعات پر پورا اترا اور میری محنت رائگاں نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر خلیل صاحب ایک خاموش طبیعت اور سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ سیاست کے تخریبی اختلافات سے ان کو سخت نفرت تھی۔ کالون کالج میں ناموری کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہ کر وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے۔ وہاں بھی انھوں نے اپنی قابلیت، اپنے مضمون سے لگن اور طلبا پر شفقت کا ایک

نہیں پایا تاثر چھوڑا تھا۔ آج بھی ان کے سابق طلبا ان کی بے پایاں محبت سے متاثر ہیں اور ان کی یاد میں دل غم سے مملو اور آنکھیں پُرنم ہیں۔ اپنے مضمون پر ان کو پوری قدرت تھی۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ بحیثیت ناقد وہ میانہ روی کے قائل تھے اور ہر مضمون پر ایک جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ اُن کے اندازِ تنقید میں کہیں افراط و تفریط نہیں پائی جاتی۔ اصول تنقید میں یہ بڑا سخت مرحلہ ہے کہ تنقید تقریظ اور قصیدہ خوانی نہ بن پائے اور نہ تمام تر تنقیص ہو جائے کہ معائب اتنی شدت سے بیان کیے جائیں کہ محاسن پس پشت ہو جائیں۔ ڈاکٹر خلیل صاحب کی یہ اعتدال پسندی ان کی کتاب "مقدمات اور مقالات" میں نمایاں ہے اور اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غزل کے کتنے مزاج شناس تھے۔ اس مجموعہ کے سب مضامین ان کے وسعت مطالعہ اور ادب سے گہرے لگاؤ کے آئینہ دار ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی کے پس منظر، اس کے محرکات اور اس کے انداز بیان کو نہایت وضاحت کے ساتھ دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ جملہ مقالات کی زبان نہایت سلیس اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے اس کتاب کا مطالعہ اردو کے ہر طالب علم کے لیے ناگزیر ہے ان کا مضمون "غزل اور اس کا فکر و فن" نہایت متوازن مضمون ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ صنف غزل پر ان کا مطالعہ کتنا گہرا اور وسیع ہے۔

اس مضمون کے متعلق دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"تیسرا مقالہ اپنی تصنیف اردو غزل کے پچاس سال سے ماخوذ ہے۔ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ صنف غزل ابتدا سے ہی فکر و فن کی حامل ہے اور دلفریبی و جاذبیت، واردات قلبی و نیرنگیٔ خیال۔ ایجاز و اختصار، رمز و ایما ہمیشہ سے اس کا جزو لاینفک رہے ہیں"

پورا مضمون ان کے مبلغ علم کا مظہر ہے۔ عبارت نہایت دل چسپ اور مدلل ہے اور یہی خوبی ایک اچھے و کامیاب تنقید نگار کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُن کی تنقید سے یہ گمان نہیں ہوتا کہ وہ بے جا طرف داری یا بیجا نکتہ چینی پر آمادہ ہیں اور یہی بے لاگ تنقید ان کے مضامین کو اہم اور معیاری بناتی ہے۔ اسی کتاب میں دوسرا مقالہ لوائح جامی پر ہے۔ اور مولینا جامی کے بنیادی خیالات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس مقالہ میں فاضل مصنف نے عارفانہ اصطلاحات سے دامن بچا کر عرفانی نکات کو اس طرح عام فہم انداز میں پیش کیا ہے جس سے ایک معمولی استعداد کا آدمی بھی فائدہ اٹھا سکے۔

پانچواں مقالہ امیر خسرو کی ہشت بہشت سے متعلق ہے۔ اس کے متعلق خلیل صاحب لکھتے ہیں :

"امیر خسرو نے جس طریقہ و سلیقہ سے ہفت منازل عرفانی کو پیش کیا ہے اور جس ترتیب اور تنظیم سے مدارج و منازل سماوی کو دنیاوی عیش و نشاط سے ہم آہنگ کر کے دکھایا ہے وہ ادب اور تصوف میں قابل داد ہے۔ ان کی تصانیف اور اس پر تبصرہ کے لیے ایک سیر حاصل مضمون ہونا چاہیے۔ اس وقت تو ان کی روح کی تجلی ان کی دنیوی زندگی کی افادیت اور ان کے حسن اخلاق کا ذکر مقصود ہے کہ اچھا لکھنا تو ضرور قابل تعریف ہے لیکن اس سے زیادہ قابل تحسین بات اچھا انسان ہونا ہے۔ تصنیف و تالیف میں بھی خلوصِ جذبات کے باعث زور بیان اور اثر و تاثر پیدا ہوتا ہے اور جس جوش اور شدت سے انسان حقائق ہستی پر غور کرتا ہے اور سلیقہ سے پیش کرتا ہے اس کی تصانیف اتنی ہی مقبولِ عام ہوتی ہیں اس کی ذات کا حسن آفاقی محسوسات اور عام انسانوں کے جذبات کا ترجمان بن جاتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف غالب نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

خلیل صاحب سبکدوش ہونے کے بعد تین برس تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی فیلو شپ پر پروفیسر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ تک انجمن ترقی اردو کی لغت پر کام کرتے رہے اور آخر میں اردو اکاڈمی کے قائم ہونے پر وہاں ایڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہے ان کے دور میں چند نہایت مفید کتابیں ان کی سفارش پر طبع ہوئیں۔

خصوصاً حسرت موہانی مرحوم کے فن اور حیات پر اسلم ہندی کانپوری کی کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس پر مصنف کو انعام بھی دیا گیا۔ وہ ہر کتاب کا ایک ایک لفظ بہت غور سے پڑھتے تھے اور ذاتی تعلق سے بلند ہو کر تصنیف کی خوبیوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے تھے، اور اسی کی روشنی میں اس کی اشاعت کی سفارش کرتے تھے۔ راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ طولانی مسودات کو بڑی محنت اور غور سے پڑھتے تھے اور اس سلسلے میں مصنف کو وہ مفید مشورے بھی دیتے تھے جس سے اس کی تصنیف میں چار چاند لگ جاتے تھے۔

خلیل صاحب نے اپنی زندگی کے اوقاتِ گزراں کے ایک ایک لمحہ کو مفید اور کارآمد بنایا۔ وہ ہمیشہ مشغول رہتے تھے۔ جس کے باعث وہ ہمیشہ صحت مند رہے۔

وہ اسلامیہ کالج کی مجلس انتظامیہ کے ایک رکن تھے اور بحیثیت ماہر تعلیم اساتذہ کی تقرری کی ذمہ داری انھیں کے سپرد تھی۔ ان کے دور میں جتنے اساتذہ کی تقرری ہوئی وہ سب نہایت کامیاب معلم ثابت ہوئے اور کبھی ان کی نگاہِ انتخاب پر حرف گیری نہ ہو سکی۔ مجھ پر ان کی خاص نظرِ عنایت تھی اور اکثر جب مجھے الجھن اور پریشانیاں ہوتیں تو ان کے مفید مشورے میرے دل کے زخموں پہ مرہم کا کام کرتے اور میں ان مشوروں کو ہمیشہ بسر و چشم قبول کرتا۔ وہ میرا اتنا خیال کرتے تھے کہ اگر کوئی ایسی بات جس سے میرے وقار کو ٹھیس پہونچتی تو وہ اسے اپنی ذاتی اہانت محسوس کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ایسا مشورہ دیتے جس سے مجھے بڑی مدد ملتی۔ میں اپنے نقائص اور کمزوریوں کو ان کے بزرگانہ مشوروں کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اس پر وہ نہایت مسرور و مطمئن ہوتے۔ مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں اکثر اختلافی مسائل زیر بحث آتے تھے۔ لیکن وہ ہر مسئلہ کو انصاف کے ترازو پہ تولا کرتے اور حقائق کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرتے اور نہایت جراُت اخلاقی کے ساتھ جس بات کو صائب اور صحیح سمجھتے اسے صاف صاف کہہ دیتے تھے۔

خلیل صاحب ایک خاموش با عمل انسان تھے۔ نام و نمود کی کوشش سے دور رہ کر سماجی، ادبی، اور ثقافتی میدان میں وہ خاموشی سے سرگرم عمل رہے اور ان کاموں کو مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دیتے رہے۔ وہ چاہے مختلف تعلیمی اداروں کی کرسی ہو۔ ادبی نشستیں ہوں۔ ڈاکٹریٹ کے مقالات کے لئے طلبا کی رہنمائی کا فریضہ ہو۔ ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل مرحوم اپنی لطف زیر لب مسکراہٹ اپنے تاباں و درخشاں چہرے اپنی ہمت افزا مفید اور معقول مشوروں سے نوازا کرتے تھے اور جو بھی ان سے امداد کا طالب ہوتا اس کی ہمت افزائی کرتے۔ نہ معلوم کتنی ہستیاں اُن کی مہربانیوں سے کامیاب ہوئیں۔

یہ مضمون اظہارِ تشکر بھی ہے اور خوشگوار فریضہ بھی وہ مجھ سے ذہنی اور روحانی طور پر بہت قریب تھے اور ان کے قول و عمل کی ہم آہنگی نے مجھے ہمیشہ بہت متاثر کیا اور جتنا زمانہ گزرتا گیا ان کی عظمت اور وقعت میرے دل میں بڑھتی گئی۔ ان کے ساتھ جو لمحاتِ مسرت میں نے گزارے وہ میری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

بقول اکبر الہ آبادی۔ سہ

تمھیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو
تمھاری خوبیاں زندہ تمھاری نیکیاں باقی

★

تسنیم فاروقی
۱۸۴ اے تلسی داس مارگ
لکھنؤ

غزل

آندھی میں کوئی پر اڑ آیا کھو گیا جیون مرا
اک شہر تھا جس میں کبھی آباد تھا آنگن مرا

اب تک وہ مجھ کو یاد ہے مقتل میں بارش خون کی
اس حادثے سے آج تک رنگیں ہے پیراہن مرا

رہنے دے تیرا شکریہ بس جی چکا اے زندگی
تو کب کی مجھ کو ڈس چکی پیچھا نہ کر ناگن مرا

عارض کی خوشبو چمپئی زلفوں کا سایہ ریشمی
دنیا کی ظالم دھوپ میں مجھ سے ملا ساون مرا

اے چاند تجھ کو دیکھ کر آتی ہیں یادیں دور کی
اک یار تھا قاتل مرا اک دوست تھا دشمن مرا

جاں کھینچتی ہیں صورتیں کڑھتی ہیں دل میں خواہشیں
ان تیلیوں کے بیچ میں کب تک رہے گا تن مرا

شاعر ہوں میں مجرم نہیں سب چھین لو سب لوٹ لو
سرگم ہیں میری دھڑکنیں نغمہ ہے سونا پن مرا

آواز دیتی ہیں مجھے وہ آخری اونچائیاں
تم چلتے چلتے تھک گئے اب چھوڑ دو دامن مرا

غم ہو نصیبِ دشمناں تم کو کسی کے غم سے کیا
آہیں مری آنکھیں مری آنسو مرے دامن مرا

تسنیم کے موتی چنو اجلے پروں کے پنچھیو
اٹھو نہ دامن جھاڑ کے مٹی نہیں ہے فن مرا

سبطِ محمد نقوی
اکبر پور۔ فیض آباد

مولانا ابرار حسین فاروقی

ایک جائزہ

آخر وقت موعود آ پہنچا اور مولانا الحاج محمد ابرار حسین فاروقی گوپاموی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ہم اس عالم، معلم، بالغ نظر مصنف، مشرقی تہذیب کے نادر نمونے اور قومی تحریک کے اکابر کے صحبت یافتہ بزرگ کی رحلت پر جس قدر بھی ماتم کریں کم ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ملَکُ الموت نے قیدِ حیات سے رہا کرکے بندِ غم سے نجات دلادی۔ وہ پیرانہ سالی کی کمزوری سے بہت عاجز تھے۔ نقل و حرکت بھی سہارے کے بغیر ممکن نہ تھی۔ لکھنؤ میں ہوتے تو قیام اپنے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی کے یہاں فرماتے۔ یہ قیام گاہ نعمت اللہ بلڈنگ کے بالاخانہ پر واقع تھی۔ اور زینہ چڑھنا اترنا مولانا کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

صرف جسمانی ہی نہیں۔ مولانا ادھر آٹھ دس سال سے بڑے روحانی کرب میں بھی مبتلا تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے بھتیجے نواب حاجی محمد رئیس الاسلام صاحب کو ۱۸ اکتوبر ۷۲ء مطابق ۹ رمضان المبارک ۹۲ ۱۳ھ کو فجر کے وقت مسجد میں گولی کا نشانہ بنادیا گیا۔ مولانا کے یہ کشتۂ ستم بھتیجے اپنی سعادت کی وجہ سے مولانا کے لیے اولاد سے بڑھ کے تھے۔ مولانا کو اس حادثے پر بے حد صدمہ ہوا۔ اس صدمۂ جانکاہ کے باعث مولانا نے محض وطن کی اقامت ہی ترک نہیں فرمائی بلکہ جینے سے بھی بیزار ہو گئے۔

۲۳ جنوری ۸۰ء کے شفقت نامے میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"آخرت کا ہوں مسافر تو یہ میری زاد راہ
جانے والا چاہتا ہے کوئی نہ ہواب سدِ راہ

پہلے تو یہ سن لیجئے۔ سالِ گزشتہ میں شدید ترین المیے سے دوچار ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مجھ سے وطن چھوٹ گیا۔ وہ المیہ یہ ہے کہ میرے محبوب بھتیجے نواب الحاج محمد رئیس الاسلام مرحوم کو ایک شقی بدبخت نے مسجد میں فجر کے وقت شہید کردیا وہ ایسا نواب اور رئیس تھا کہ اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ وہ نواب بھی تھا۔ عالم باعمل بھی تھا۔ درویش بے ریا بھی تھا۔ مسکینوں کا خدمت گزار، متمولین سے بیزار تھا۔ اس کے دو کام تھے۔ گھر پر درس حدیث و فقہ دینا اور خاندانی مسجد میں پانچوں وقت نماز پڑھانا۔ غرض کہ دینی اور دنیوی خدمتوں کا وہ مجموعہ تھا جو اولیاء ہی کی سیرتوں میں پڑھا۔ بہر حال اس کی شہادت باسعادت نے مجھے مجبور کردیا کہ میں بھی اس کی تقلید میں ترکِ وطن کردوں۔ ترکِ دنیا میرے بس میں نہیں ہے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ ؎

اس لیے زندہ ہوں مجبور آ کر ہوں بے اختیار
روزِ اجل موعود کا ہر دم ہے رہتا انتظار

اب یہاں اپنے چھوٹے لڑکے کے پاس معذوری میں مبتلا گویا قید کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ بقول غالب مرحوم ؎

"قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں"

مولانا کی ولادت دسمبر ۱۸۹۴ء مطابق ۱۲ ۱۳ھ میں اپنے آبائی

محلہ ڈونگر محل میں بمقام گوپامئو (ضلع ہردوئی) ہوئی۔ مولانا صلحاء علما اور امرا کے اس مشہور خانوادے کے فرد تھے جو مدینہ منورہ سے چل کے بخارا، کابل ہوتا ہوا دیارِ ہندوستان ہوا۔ بقول مولانا۔

"ملتان، دہلی، بدایوں میں صدیاں گزارتا ہوا قنوج آکر آباد ہوا۔ اکبری عہد میں یہ خاندان قنوج سے گوپامئو آگیا۔"

درس نظامی کی مشہور کتاب قاضی مبارک اسی خانوادے کے ایک باکمال ماہر منطق کی یادگار ہے۔ مشہور مجاہد آزادی احمد اللہ شاہ، اسی خانوادے کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو اب مدراس میں مقیم ہے۔ جہاں نواب سراج الدولہ خاں، محمد انوار الدین خاں حیدرآباد اور کرناٹک کے صوبے دار کے طور پر گئے تھے۔ ان کے اسلاف کو اب بھی وہاں پرنس آف ارکاٹ، کا لقب حاصل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جس سے شاہ صاحب کے وطن کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلتی رہیں اور مورخین کا ایک طبقہ انھیں مدراجی (مدراسی) لکھتا رہا۔ ان کی معرفت کا صحیح سراغ تو تاریخ اودھ کے مشہور مبصر شیخ تصدق حسین صاحب ایڈووکیٹ نے دیا لیکن شاہ صاحب کے حالات کے بارے میں تفصیلی اطلاع کے لیے علمی دنیا مولانا فاروقی کی منت گزار رہے گی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ کچھ دن مقامی مڈل اسکول میں پڑھا۔ پھر مدرسہ اسلامیہ عربیہ میں داخل کیے گئے۔ ابھی یہاں حفظ قرآن میں گیارھویں پارے تک پہنچے تھے کہ مولانا اور ان کے بڑے بھائی کو والد ماجد حافظ محمد حسین صاحب اپنے ہمراہ ٹونک لے گئے۔ جہاں موصوف رائے بریلی کے محکمۂ کورٹ آف وارڈس کی سربراہی کار کو خیرباد کہہ کر نائب وکالت کی خدمت پر مامور تھے۔ اس طرح مولانا حفظ قرآن کا شرف پانے سے محروم رہ گئے اور انھیں زندگی بھر اس کا صدمہ رہا۔ مولانا ٹونک کی سرکاری درس گاہ مدرسہ خلیلیہ میں داخل ہوئے اور اپنے والد ماجد کے ایک دوست سے فارسی بھی پڑھنے لگے۔ جب والد کا تبادلہ دہلی چھاؤنی ہو گیا تو وہاں کے سرکاری مدرسے میں داخلہ لے لیا اور اپنے طور پر انگریزی بھی پڑھتے رہے

۱۹۰۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے لیکن وہاں سلسلۂ تحصیل زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اور ۱۹۱۰ء میں منقطع ہو گیا۔ اب رام پور آکر مولانا عبدالعزیز صاحب کے درس میں شرکت کی۔ لیکن جلد ہی یہاں بھی دل برداشتہ ہو گئے اور مختصر وقفے کے بعد دلی کے مدرسۂ امینیہ چلے آئے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ اور مدرسہ سے علاحدہ ہو کے مولانا مشتاق احمد صاحب انبیٹھوی سے درس حدیث لینے لگے اور ماسٹر سے انگریزی پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ درسِ حدیث سے فراغت کے بعد ۱۳-۱۹۱۲ء میں عربک ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ میٹرک کی تیاری کے ساتھ ٹائپ کی ٹریننگ لینے لگے۔ ٹائپ تو سیکھ لیا مگر میٹرک پاس نہ ہو سکے تھے کہ دہلی کے بڑے ڈاک خانے میں باتنخواہ امیدوار (پیڈ اپرنٹس) کی جگہ مل گئی۔ اسی دوران منشی فاضل کے نصاب کا درس مولانا محمد سعید صاحب سے لے کر امتحان پاس کر لیا اور اس کے بعد سینٹ اسٹیفنس ہائی اسکول میں فارسی کے ہیڈ مولوی کی جگہ پر مقرر ہو گئے۔ یہیں سے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مولوی عالم اور میٹرک کے امتحان پاس کیے۔ اگرچہ اس دوران عربی کے ہیڈ مولوی مقرر ہو چکے تھے لیکن ۱۹-۱۹۱۸ء میں ایف اے کی جماعت میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۹ء میں امتحان دے کر تلاش روزگار میں شملہ چلے گئے۔ اور انگریز افسروں کو اردو پڑھانے کی خدمت پر مامور ہو کر مصر بھیج دیے گئے۔ وہاں بھی مولانا کی تشنگیٔ علم نے انھیں بے چین رکھا اور انھوں نے ۱۹۲۰ء میں عربی زبان و ادب کا وہ امتحان پاس کر لیا جو فرنگیوں کے لیے مخصوص تھا۔

اسی سال وطن مراجعت ہوئی اور تحریک ترک موالات سے متاثر ہو کر ملازمت میں توسیع کو خیرباد کہہ دیا اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے پرائیوٹ سکریٹری کی خدمت قبول کر لی اور اسے دو برس تک انجام دیا۔ پھر حکیم صاحب مرحوم کی تحریک پر بعض ریاستوں میں سکریٹری کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ لیکن ریاستی ماحول راس نہ آیا اور اس عزم مصمم کے ساتھ علاحدگی اختیار کر لی کہ اب ان خرافات میں کبھی نہ پھنسیں گے۔

۱۹۲۷ء مولانا کی زندگی کا بہت اہم سال ہے جس میں مولانا کی شادی ہوئی اور علی گڑھ میں معلم دینیات کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ نو برس تک علی گڑھ میں رہنے کے بعد حیدرآباد چلے گئے اور وہاں محکمہ تعلیمات میں گزیٹیڈ پوسٹ پر ان کا تقرر ہوا۔ وہاں خوش و ناخوش دس سال گزار دیے۔ ۴۳-۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین نے مولانا کی خدمات علی گڑھ کے لیے مستعار لے لیں۔ ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد واپس چلے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں براہ پاکستان مصر کا سفر کیا۔ واپسی میں مدینہ منورہ، نجف اشرف، کربلائے معلی اور بغداد نیز دوسرے متبرک مقامات کی زیارت کی۔ ریاض میں سلطان ابن سعود سے ملاقات کی اور شاہی مہمانی کا اعزاز پایا۔ اس سفر سے جولائی ۱۹۴۹ء میں واپسی ہوئی اور پچپن سال کی عمر میں درخواست دے کر پنشن لے لی۔

سبکدوش ہو کر وطن مالوف واپس آئے تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی جوہر شناس نظر نے مولانا کو اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری قاضی عبدالغفار کی مدد کے لیے منتخب کیا۔ دفتری کاموں کے علاوہ جو یادگار خدمت مولانا نے انجام دی وہ انجمن کے کتب خانے کے مخطوطات کی تشریحی فہرست سازی تھی جو کئی جلدوں میں تکمیل کو پہنچی۔ یہی نہیں مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست بھی اردو اور انگریزی میں تیار کر دی۔ ۱۹۵۲ء تک کی مدت علی گڑھ میں بسر ہوئی۔ پیر عبدالمجید خواجہ صاحب نے اسلامیہ کالج میں اپنا [illegible] سکریٹری بنا کر آمادہ بھیج دیا۔ یہاں کالج کی تنظیم و نگرانی کے ساتھ کتب خانے کے مخطوطات کی تنظیم و فہرست سازی کا کام انجام دیا۔ ان کی پہلی جلد تذکرہ جواہر نوادر کے نام سے مولانا آزاد مرحوم کی توجہ اور محکمہ تعلیمات مرکزی سرکار کی مالی امداد سے شائع ہو گئی۔ ۱۹۵۹ء میں بہ اصرار وہاں سے سبکدوشی حاصل کر کے ۱۹۶۰ء میں فریضہ حج ادا کیا۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں دہلی میں قیام کر کے اپنے خاندانی ذخیرہ کتب اور نادر اشیاء کی ترتیب و تنظیم، کتب خانہ فاروقی اور دوارالآثار میوزیم کے نام سے کی اور فہرست کئی جلدوں میں تیار کی۔

مولانا کی قلمی کاوشیں ۱۹۲۲ء سے ہی شروع ہو چکی تھیں [illegible] جب مولانا مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ اسی سال مولانا کے بڑے بھائی حافظ قاری حکیم محمد ناظم حسین صاحب نے حافظ المطابع کے نام سے اپنا پریس قائم کیا تھا۔ کچھ مطبوعات کا بہانہ بنا کر تحریک ترک موالات سے متعلق افراد کے اس مطبع سے ضمانت طلب کر لی گئی۔ جسے داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا اور مطبع بند ہو گیا۔

حکومت چھاپہ خانے پر پابندی لگا سکتی تھی لیکن مولانا کی گردش قلم کو قید کر لینا کہاں ممکن تھا! اس لیے جب تک قوتوں نے ساتھ دیا مولانا کا قلم نوبہ نو مضامین کے انبار لگاتا رہا۔

مولانا کی جو تصنیفات یادگار ہیں ان میں کتب خانوں کی فہرست کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ دوسری کتابیں یہ ہیں۔

۱۔ خدائی دربار:- ایک مصری مصنف کی کتاب سے ماخوذ ظالم پر مبنی ناول۔ جید برقی پریس دہلی سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔

۲۔ بنت سمرنا:- ایک عربی ناول کا اردو ترجمہ اس کا پہلا حصہ الامان پریس دہلی سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرے حصے کا حشر کیا ہوا اس سے مولانا بھی لاعلم تھے۔

۳۔ فتوح العرب:- مغرب میں علاوہ فرانس، سپین اور اسلامی فتوحات کی مختصر تاریخ۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں انتظامی پریس حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

۴۔ مجمل:- [illegible] اورنگ آباد میں [illegible] مولانا کی تقریر۔ اقبال پریس حیدرآباد سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ پیکر رس:- تصوف پر [illegible]

۶۔ مرقع افغان:- [illegible]

...علی گڑھ سے شائع کیا۔

۷۔ عدد السنین والحساب:۔ عیسوی و ہجری سنین کی مطابقت تفصیلی مقدمے کے ساتھ۔ مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔

۸۔ ضیاء الوارث من مشکوٰۃ [redacted] وارث علی شاہ کے سوانح۔ مطبوعہ ۱۹۶۵ء۔

۹۔ مآثر دلاوری۔ احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے حالات اور کارناموں کا تحقیقی اور تفصیلی مرقع۔ مولانا کے اس شاہکار کو کتب خانہ فاروقی و دارالاجاہ میوزیم نے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔

۱۰۔ مرآۃ احمدی:۔ (۱۰۶۰ھ) تاریخی نام "مجموعہ ادب و تواریخ" احمد اللہ شاہ کے مرید مولوی فتح محمد تائب کی مثنوی "تواریخ احمدی" کی مفصل شرح۔ اس کتاب میں مولانا نے فرماں روایان اودھ کے حالات پر مختصراً روشنی ڈال کر، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پورا پس منظر بھی پیش کر دیا ہے۔ اسے بھی کتب خانہ فاروقی کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا گیا۔ مولانا نے اس کتاب میں اپنے حالات اور خاندانی شجرہ بھی دے دیا ہے، اور مولانا کے حالات اس تحریر میں اسی سے لیے گئے ہیں۔

۱۱۔ کمال اتاترک:۔ جمہوریہ ترکیہ کے صدر کے حالات۔ ۲۳-۱۹۲۱ء سنہ اشاعت معلوم نہیں ہو سکا۔ ۱۹۲۸ء میں زیر طبع تھی۔

۱۲۔ مآثر مسیح:۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی سیرت پر ایک مختصر کتاب۔

انگریزی تصانیف

۱۳۔ نظامی و خسرو:۔ دونوں شاعروں کی دو مثنویوں کا تقابل۔ مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔

۱۴۔ شیر شاہ سوری:۔ کچھ حصہ ہسٹری کانگریس کے ایک مجموعہ میں ۱۹۴۲-۴۳ء میں شائع ہوا۔

ان تصنیفات کے علاوہ بہت سے متفرق مضامین مولانا کے قلم سے نکلے [redacted] بھی کی کتابیں اب بازار میں دستیاب نہیں ہیں۔ کاش ان کی ترتیب و اشاعت کی طرف کوئی توجہ کرتا۔

اگرچہ مقتضائے سن مولانا کے اعضاء و جوارح جواب دیتے جا رہے تھے، حاجی رئیس الاسلام صاحب کے سلسلے نے اور بھی طول ماجز کر رکھا تھا پھر بھی جن مسائل و موضوعات پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس کرتے۔ ان پر لکھتے ضرور تھے۔ ۱۹۷۴ء میں پاکستان کے محمد علی کریم چھاگلا کی خود نوشت شائع ہوئی جب مولانا کی نظر سے گزری تو اپنے اس عقیدت مند کو تحریر فرمایا۔

"...... میرے زیر ترتیب مضمون کا یہ عجیب عنوان ہے۔ مسٹر جینا اور مسٹر چاگلا۔ یہ دونوں میں رشتہ تھا گرو اور چیلا۔ مسٹر چاگلا نے انگریزی میں حال ہی میں اپنی آپ بیتی لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنے اور اپنے گرو کے اختلافی مسلک کو بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی روشنی میں میں نے (اپنے ذاتی تجربات کو سامنے رکھ کر) ان پر لکھا ہے۔ مضمون کافی تفصیلی اور طویل ہے۔ ان کی دونوں کی سیاست پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ ابھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کہاں اور کس پرچے میں اس کو بھیجوں..."

مجھے پھر اس کا موقع نہیں ملا کہ میں دریافت کرتا کہ مضمون مکمل ہو کر شائع ہو سکا یا نہیں۔ پیرانہ سالی، عوارض یا وسائل کی قلت کے باعث اگر کسی کام کا سرانجام دینا اپنے دست و قلم سے ممکن نہ دیکھتے تو دوسروں کو ترغیب دیتے یا مدد چاہتے۔ بلاشبہ وہ ایسے مجاہد تھے جن کی تیغ قلم میدان مصاف میں سرگرم ستیز رہی۔ یہاں تک کہ سرزمین علی گڑھ نے جہاں مرحوم کی علمی و عملی زندگی کا معتدبہ حصہ گزرا تھا مرحوم کو اپنے

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

غزلیں

شکیب جنوبی سیتاپوری
بزم شعر و ادب گوالٹولی کانپور

نخوت و قہر کا یہ بار مرے سر ڈالو
نکہتِ خندہ جبینی میری گھر گھر ڈالو

اتنی آساں نہ کرو میرے لیے راہِ حیات
دوستو آؤ مری راہ میں پتھر ڈالو

شورشیں زیست کے ساگر کی دبی جاتی ہیں
کچھ تو اس ذہن میں افکار کے کنکر ڈالو

قربِ منزل سے کہیں عزمِ سفر ختم نہ ہو
آشنا راہ سے قدموں کو ہٹا کر ڈالو

دیکھو منڈلانے لگے چرخ پہ بھوکے کرگس
یوں تماشائی نہ ہو لاش پہ چادر ڈالو

حوصلہ بھی ہے ذہانت بھی سلیقہ بھی شکیب
چل کے کچھ "پرورشِ لوح و قلم" کر ڈالو

وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد
لکھنؤ ۳

جینا مرنا محال ہے اب تو
زندگی اک وبال ہے اب تو
بے خیالی سی بے خیالی ہے
خواب جیسا خیال ہے اب تو
زندگی کا تمام اندازہ
اک ادھورا سوال ہے اب تو
بھول جانا بہت ہی آساں ہے
یاد رکھنا کمال ہے اب تو
"ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے"
ایک جیسا ہی حال ہے اب تو
ہو چکا جو عروج ہونا تھا
زندگی بھر زوال ہے اب تو
امن دنیا سے اٹھ گیا شاید
روز جنگ و جدال ہے اب تو
سارے اقدار مٹ رہے ہیں وقار
کوئی ماضی نہ حال ہے اب تو

موازنۂ انیس و دبیر

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ میر انیس اور دبیر ایک ہی صنف کے دو بڑے فن کار ہیں۔ یہ امر بھی سب پر عیاں ہے کہ دونوں ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے دونوں کے فن کا موازنہ ہوتا آیا ہے لیکن ان دونوں میں کون بڑا ہے اس کا منصفانہ فیصلہ اب تک نہ ہو سکا۔ موازنہ کے نام پر جو کچھ بھی ملتا ہے دراصل اس کو موازنہ کا نام دینا درست نہیں۔ کیونکہ وہ ایک طرح کی تحسین ہے جس میں تاثر اور تعصب کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ بعض نے فضیلت کی بنیاد اسی پر رکھی ہے کہ انیس کو شاعری وراثت میں ملی ہے۔ اور یہ دبیر سے پہلے مرثیے لکھتے رہے ہیں اس لیے دبیر سے بڑے ہیں
بعض کا کہنا ہے کہ پہلے دبیر نے ابتدا کی اور اپنی صلاحیت و ذاتی طبیعت کے بل بوتے پر اپنے فن کی بنیاد رکھی ہے اس لیے یہ انیس سے زیادہ قابل ستائش ہیں۔

موازنہ کے نام پر سب سے پہلی کتاب مولانا شبلی کی "موازنہ انیس و دبیر" ملتی ہے جس میں مولانا نے یہ تو ضرور کہا ہے کہ

"مدتہا سے ارباب ذوق کے غور و فکر، کد و کاوش،
بحث و تکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ترجیح
کا سہرا کس کے سر کو کہا جائے"

لیکن فصاحت و بلاغت کو معیار بنا کر، جو بنیادی طور پر صحیح [illegible] کے ذریعے خود کلام کے سامنے دبیر کی نسبت [illegible] ثابت کر دیا ہے کہ انیس کو دبیر [illegible]

دوسری کتاب اس سلسلے میں شوق رضوی کی "المیزان" ہے جو دراصل شبلی کی "موازنہ انیس و دبیر" کے ردعمل میں لکھی گئی ہے اس کتاب میں مصنف نے اپنا پورا زور شبلی کے اعتراضات کا جواب دینے اور دبیر کو انیس کے مقابلہ کا شاعر ٹھہرانے اور بعض اشاروں کے ذریعہ دبیر کے مرتبے کو بڑھانے میں صرف کیا ہے۔ شبلی نے دبیر کے کمزور شعروں کو جمع کیا ہے تو انھوں نے دبیر کے بلند کلام کے مقابلے میں انیس کے پست اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ مولانا شبلی نے انیس پرستی کا کام کیا تھا تو رضوی صاحب نے دبیر پرستی کا حق ادا کیا ہے۔ انیس اور دبیر کے تقابلی مطالعہ پر کچھ اور بھی چھوٹے چھوٹے مقالے ملتے ہیں جن میں پروفیسر [illegible] اور ڈاکٹر اکبر حیدری کے نام مشہور ہیں۔ کلیم الدین احمد نے شبلی ہی کی طرح انیس کے اچھے کلام کا دبیر کے کم تر درجے کے کلام سے مقابلہ کر کے اور دبیر کے مرثیوں کے اندر کردار نگاری کا فقدان دکھا کر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انیس دبیر سے بڑے مرثیہ نگار ہیں۔

اکبر حیدری کا مقالہ جو ان کی کتاب "انیس بحیثیت شاعر" میں شامل ہے بہت اچھا ہے۔ لیکن انھوں نے بھی دبیر کے ساتھ زیادہ انصاف نہیں کیا ہے۔ انھوں نے [illegible] میں دبیر کی کردار نگاری اور جذبات نگاری [illegible] کو کمزور دکھایا اور اس کے مقابلے میں انیس کو [illegible]

اجاگر کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی انصاف اور دیانت داری سے کام نہیں لیا ہے۔ کسی کے یہاں تحسین ہے تو کسی کے یہاں تعصب۔ کوئی موزونئ عصر حیات کو معیار بناتا ہے تو کوئی ذاتی کمالات کو پیمانۂ نقد قرار دیتا ہے۔ کسی کے یہاں لاعلمی ہے تو کسی کے یہاں علم و فن کا غلط استعمال۔

دراصل دونوں فنکاروں کے کلام کی قدر و قیمت میں امتیاز اور ان کی حیثیت کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان کی تمام تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے پھر دونوں کے بہترین فن پاروں کا انتخاب کرکے غیر جانبدارانہ طور سے دونوں کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ دونوں کے مزاج، انداز فکر اور اسلوب و طرز ادا کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے کہ دونوں کی الگ الگ کیا قیمت ہے اور ایک کے مقابلے میں دوسرے کا کیا مرتبہ ہے اس کے بغیر ان فنکاروں کے اصل مقام کا تعین غیر ممکن ہے۔

مرزا دبیر اور میر انیس دونوں ایک صنف سخن اور ایک دور کے شاعر ضرور ہیں لیکن دونوں کے مزاج، انداز بیان اور انداز فکر و نظر میں نمایاں فرق ملتا ہے۔ دبیر دقت پسند ہیں ان کا مزاج سودا اور غالب سے ملتا جلتا ہے اسی لیے وہ مضمون کو براہ راست بیان نہیں کرتے بلکہ پیچیدہ بنا کر علامتوں کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں معنی آفرینی، خیال آرائی، پیچیدگی صنائع بدائع وغیرہ کا اہتمام زیادہ ہے جو ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ؎

کس درجہ بلند ہے تیری فکر دبیر
کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور بھی ہے

اس کے برخلاف انیس سہل پسند ہیں ان کا مزاج براہ راست بیانیہ شاعری کا مزاج ہے جو میر حسن سے ملتا جلتا ہے۔ اسی لیے ان کے مرثیوں میں سلاست، روانی، شگفتگی اور سوز و گداز کا عنصر غالب ہے ان کے یہاں شعری پیکر زیادہ ابھرتے ہیں ان کے یہاں سب سے زیادہ محاکات کو اہمیت حاصل ہے جس نے ان کے مرثیوں میں فضا آفرینی کی ہے اور تمام واقعات زندہ اور متحرک صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی قادر الکلامی کے متعلق خود بھی لکھتے ہیں کہ ؎

خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

آؤں طرف رزم ابھی چھوڑ کے جو بزم
خیبر کی خبر لائے مری طبع اولعزم

جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

انیس دبیر کی طرح تجربے کو پیچیدہ بنا کر نہیں پیش کرتے ان کے یہاں علامتی طریقہ اظہار نہیں ہے اس لیے ان کے مرثیوں میں روزمرہ محاورہ کی کارفرمائی زیادہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کا مذاق سخن اور پیرایۂ اظہار الگ الگ ہے۔ دونوں اپنے اپنے انداز میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آسان نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں مفتی میر محمد عباس کا فیصلہ قابل توجہ ہے۔

"مرزا صاحب کا کلام دقیق اور میر صاحب کا کلام فصیح اور شیریں ہے دونوں کا مذاق علیحدہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی کیونکہ بعض طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور بعض طبائع شیریں پر مائل ہیں"

شبلی نے فصاحت اور بلاغت کو معیار بنا کر موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے الفاظ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک قسم میں نرم، دلکش، سلیس، شیریں اور شگفتہ الفاظ آتے ہیں۔ جبکہ دوسری قسم غیر مانوس، ثقیل، مکروہ، دقیق الفاظ پر مشتمل ہے۔ پہلی قسم کے الفاظ انیس کے یہاں ملتے ہیں

جس کی وجہ سے ان کا کلام دلکش، سنگین، وقیع اور اثر آفریں ہے۔ دوسری قسم کے الفاظ کے استعمال کی وجہ سے دبیر کے فن میں ثقالت اور غیر واقعیت پیدا ہو گئی ہے اور درد و اثر جاتا رہا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تقسیم صحیح نہیں۔ کوئی لفظ بذات خود اچھا یا برا نہیں ہوتا موقع اور ماحول کے ساتھ اس کے معنی کا تعین ہوتا ہے اور اسی کے اعتبار سے اس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انیس کے یہاں فصاحت کا دریا رواں دواں ہے لیکن فصاحت کو معیار نقد نہیں بنایا جا سکتا۔

اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انیس کے مقابلہ میں دبیر کے یہاں فصاحت کی کمی ہے لیکن یہ کہ فصاحت سرے سے ہے ہی نہیں، جیسا کہ شبلی نے کہا ہے کہ "فصاحت ان کے کلام کو چھو کر بھی نہیں گئی" سراسر غلط ہے۔ دبیر کے مرثیوں میں بھی فصاحت ہے اور بعض مقامات پر بہت خوب ہے مثلاً تلوار ہی کا بیان لے لیجئے، جس میں انیس کو کمال حاصل ہے۔

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی
سر پر تو لڑکھڑائی تو شانوں پر آ پڑی
تجویز جو نصیبوں نے کی وہ مفر پڑی
افتاد ان پہ پوچھیے یہ جن کے سر پڑی
اٹھی گری بلند ہوئی پست ہو گئی
پی پی کے مکھیوں کا لہو مست ہو گئی

بعض ہم مضمون اشعار میں تو مرزا دبیر کے مقابلہ میں میر انیس کمزور نظر آتے ہیں۔ مثلاً

ع۔ انیس آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پتلی کو خبر ہو
دبیر آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

سے
سینے پہ میرے زانوے قاتل نہ گراں ہے
خنجر کے تلے نام تیرا ورد زباں ہے (انیس)

اسی جگہ دبیر کا ایک شعر دیکھیے جو فصاحت میں بڑھا ہوا ہے سے

حلق پہ تیغ رہے سینے پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام تیرا دل میں تیری یاد رہے

مذکورہ بالا اشعار انیس فصاحت کی [illegible] وہ مقبول خاص و عام ہے۔ لیکن فصاحت کے چند نمونے بیان کر کے اس میدان میں بھی دبیر کا انیس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ انیس فصاحت میں دبیر سے بدرجہا بہتر ہیں۔ لیکن دبیر کے یہاں فصاحت کی دقت پسندی اور پیچیدگی ہے جو بجائے خود ایک خوبی ہے۔ ہمارے نقاد دبیر کے اشعار کو دقیق، ثقیل، غیر مانوس پیچیدہ اور مبہم کہہ کر انھیں چھوٹا شاعر ٹھہراتے ہیں لیکن ان میں پوشیدہ واقعات اور معنی کے خزانے کو پانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی ہیں تو اس کی داد نہیں دیتے کہ دبیر نے ایک ایک مصرعے میں کس خوبی سے ایک ایک واقعے کا احاطہ کیا ہے اور جو پردہ اٹھتے ہی واضح طور سے آنکھوں کے سامنے ابھر آتا ہے۔

ذیل کے بند کو غور سے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ صرف چھ مصرعوں میں کتنے واقعات، خوبصورت تلمیحات و تشبیہات سمٹ آئی ہیں۔

یوسف غریق چاہ نا گہاں ہوا
یعنی غروب ماہ تجلی سماں ہوا
یونس دہان ماہی شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوع نیر مشرق نشاں ہوا
فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

دبیر مناظر کی تصویر کشی میں نادر انداز کی تشبیہات، تلمیحات و استعارات لا کر قاری کی قوت متخیلہ کو متحرک کرتے ہیں۔ اور انسانوں کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ ان شعری محاسن کے ذریعہ مختلف واقعات ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں جو یقیناً ہماری لطف اندوزی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اور ہمارے لیے سامان مسرت و انبساط فراہم کرتے ہیں لیکن ان سے جہاں فائدہ ہے وہاں نقصان بھی کم نہیں ہے۔ بے شک یہ ہمارے تخیل کو بیدار کرتے ہیں اور ذہن کو انبساط حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے

ذریعے حواس ناظر کی دل کشی سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے
تلمیحات اور استعارات کے ذریعہ دور دراز کے واقعات تو ضرور
ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں لیکن کبھی کبھی اصل منظر ہماری
نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور صبح کی رنگینی، شام کی سیاہی
دھوپ کی تیزی، جنگ کی خونریزی وغیرہ کے اصل تاثر سے
محروم رہ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی دبیر کسی منظر کو ایسی تہوں میں لپیٹ
کر بیان کرتے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتانے لگتی ہے۔

اس کے برخلاف انیس مناظر کو سامنے کی تشبیہات اور مانوس
تلمیحات کے ذریعہ زندہ اور متحرک صورت میں پیش کرتے ہیں جس
سے ہمارے حواس فوراً بیدار ہو اٹھتے ہیں۔ اور اس منظر کی تمام
کیفیتوں سے محظوظ ہونے لگتے ہیں۔ لیکن انیس یا دبیر کی طرح دعوت
فکر نہیں دیتے اسی لیے ان کے زمانے میں خواص کا طبقہ ان کے
کلام کو عوام کی چیز سمجھ کر اس کی طرف توجہ کم دیتا تھا۔

مندرجہ بالا بیانات سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ زبان بیان
کے اعتبار سے دونوں کی اہمیت مسلم ہے اور کوئی کسی سے کم نہیں ہے
اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مرثیہ کا فن جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے ان
کو برتنے میں کون کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ کس کے یہاں کتنی
آفاقیت اور ہمہ گیری ہے اور کس کے مرثیوں میں سامعین کے
جذبات ابھرتے ہیں اور ان پر گریہ طاری ہوتا ہے جو مرثیہ کا
اصل مقصد ہے۔

ہم جب انیس اور دبیر کے منتخب فن پاروں کا تقابلی
مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دبیر کے یہاں مرثیے
کے اجزا میں اعتدال سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ چہرہ میں ایک
منظر کو مختلف طریقے سے پیش کرنے میں بے جا طوالت پیدا ہو گئی
ہے جس سے ذہن کو اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ دور از کار تشبیہات
استعارات، تلمیحات اور مبالغات کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ اصل
منظر غائب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سراپا نگاری میں اکتا دینے
والی طوالت ہوتی ہے مختلف سراپوں میں بہت کم فرق نظر
آتا ہے۔ کرداروں میں زیادہ تر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مخالف

فوج کے پہلوانوں کو حسینی لشکر کے بہادروں کے مقابلے میں بڑھا چڑھا کر
دکھایا گیا ہے۔ کرداروں کے جذبات، نفسیات، فرق مراتب
اور عمر کا کوئی زیادہ لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ بین کا حصہ اتنا
زیادہ طویل ہوتا ہے کہ آنکھوں میں آنسو آتے آتے خشک ہو جاتے
ہیں۔ گریہ طاری ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔

اس کے برعکس انیس کے یہاں مرثیہ کے تمام اجزا میں
اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ مناظر کی عکاسی میں بے جا طوالت
نہیں پائی جاتی۔ سامنے کی تشبیہوں اور موزوں ترین الفاظ کے
ذریعہ مناظر اپنی تمام تر کیفیات اور آب و تاب کے ساتھ واضح طور
سے ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں۔ جو ہمارے حواس کو بیدار کر کے
ہمارے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ سراپا نگاری میں انفرادیت کو
جگہ دی گئی ہے۔ حر کے گھوڑے کا سراپا یا رہوار حضرت امام حسین
یا حضرت عباسؑ کے گھوڑے سے مختلف ہے۔ شبیہ، اکبر، عباسؑ
کی تلواروں کی کاٹ میں کچھ حد تک امتیاز رکھا گیا ہے۔ یزیدی
فوج کے سپہ سالاروں کو بہادری اور دلیری میں حسینی فوج سے
ذرا بھی کم نہیں دکھایا گیا ہے۔ ایک پہلوان دوسرے پہلوان
سے مختلف نظر آتا ہے۔ بچے جوان بوڑھے اور عورت کے جذبات
و نفسیات میں نمایاں فرق دکھایا گیا ہے۔ موقع محل کے لحاظ سے
ان کی گفتگو کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ بین کا حصہ اتنا ہی ہے جو
درد و اثر کو بڑھا دے اور سامعین کی آنکھوں سے آنسوؤں
کو امنڈنے پر مجبور کر دے۔

دبیر کے مرثیوں میں وہ درد و اثر نہیں جو انیس کے کلام میں
پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مجلسوں میں زیادہ تر انیس کے مرثیے
پڑھے جاتے ہیں۔ دبیر کے یہاں ہمہ گیری اور وسعت نہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

غزلیں

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۰ - دیوان بلڈنگ لیڈر روڈ الہ آباد ۳

مٹ جائیں تیرے دور میں ایسے تو ہم نہیں
اے انقلاب تجھ میں ابھی اتنا دم نہیں

ہوں وہ چمن پرست کہ میری نگاہ میں
دورِ خزاں بھی عہدِ بہاراں سے کم نہیں

وہ قلب کیا، جو تیرے لیے ہو نہ بیقرار
وہ آنکھ کیا، جو تیری محبت میں نم نہیں

دنیا ہزار سرکش و مغرور ہو مگر
کس کا سرِ نیاز ترے در پہ خم نہیں

دیوانہ کہہ گئے وہ سرِ انجمن مجھے
یہ مرتبہ بھی اہلِ محبت کا کم نہیں

ہر زخمِ دل ہے رنگِ گلِ تر لیے ہوئے
جوہرؔ مجھے بہار کے جانے کا غم نہیں

اقبالؔ عظیم
۳ - سیری انسٹی ٹیوشنل ایریا
حوض خاص، نئی دلی

وہیں پہ رک گئے ہیں جہاں موڑ داستان کا تھا
وہ فاصلہ ہی رہا ہے جو درمیان کا تھا

اسی دیار میں ہم نے بھی دن گزارے ہیں
خیال سب کو جہاں اپنی آن بان کا تھا

ہمارے پاؤں کے نیچے زمین ایسی تھی
قدم قدم پہ گماں جس پہ آسمان کا تھا

اسی لیے تو لہو رو کے بھی [illegible] آئی
میں جانتا ہوں کہ وہ تیر کس کمان کا تھا

اڑا کے لے گئیں وحشی ہوائیں اس کو بھی
وہ سائبان نہیں دھوکا تو سائبان کا تھا

تباہ ہو کے بھی پائی ہیں دولتیں غم کی
وہ رنگ دیکھ چکا ہوں جو آسمان کا تھا

وہی ہے جینا سمجھتے ہیں جس کو ہم جینا
یہ وہ خیال ہے جو یارِ نکتہ دان کا تھا

نگارِ صبح کے ہمراہ بن سنور کے گیا
وہ رہنے والا جو اجڑے ہوئے مکان کا تھا

کسی پہ کھل نہ سکا ایک راز ایسا بھی
ہمارا حال وہی تھا جو کل جہان کا تھا

ہماری ہمتیں اقبالؔ ہم کو لے آئیں
ادھر تو رخ نہ ہوا کا نہ بادبان کا تھا

فرحت زیدی
[illegible]
[illegible] روڈ، کٹک (اڑیسہ)

نواب واجد علی شاہ

چند روز بنارس میں

جان عالم حضرت واجد علی شاہ مرحوم والیِ اودھ سے متعلق بہت سے واقعات مشہور ہیں، کچھ غلط کچھ صحیح۔ کچھ تو انگریزوں کے تعصب کی دین ہیں اور کچھ بعض ادیبوں کی گڑھی ہوئی کہانیاں ہیں جنھیں اس مظلوم بادشاہ میں سوائے عیب کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ کہانیاں جن میں بادشاہ کی غریب پروری، ذہانت اور اعلیٰ ذوق کے معاملے ملتے ہیں صرف اس لیے باقی رہ گئیں اور ہم تک پہنچ سکیں کہ انگریزوں کی نظر میں یہ [illegible] تھیں یا انھیں انگریزوں نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔

لیکن بادشاہ سے متعلق ایک دو واقعات ایسے بھی ہیں جو شاید دنیا کو نہ معلوم ہوں۔ مگر پہلے یہ سنیے کہ یہ مجھے کیسے معلوم ہوئے۔

بات میرے بچپن کی ہے۔ میرے والد مرحوم حیات تھے اور بنارس اسٹیٹ میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے اگرچہ اس وقت بنارس اسٹیٹ کا حکومت ہند یونین میں انضمام ہو چکا تھا لیکن مختلف شعبوں کا چارج ضلع کے حکام رفتہ رفتہ لے رہے تھے اور ادھر والد صاحب بھی ریٹائرمنٹ کی درخواست دے چکے تھے۔ والد صاحب چند گھنٹوں کے لیے کچہری جاتے اور واپس آجاتے۔ اس وقت انتظامی امور آج کل کی طرح چوبیس گھنٹے کی مصروفیت نہیں تھے۔ شام کو والد صاحب کے بچپن کے دوست شنکر بابو آجاتے، گھنٹہ دو گھنٹہ مختلف موضوعات پر بڑی دلچسپ باتیں ہوتیں۔ شنکر بابو ایک سگریٹ پیتے اور ٹھیک آٹھ بجے رخصت ہو جاتے۔ اسی گفتگو کے دوران ایک بار بادشاہ اودھ کا کچھ ذکر نکلا تو والد صاحب نے الماری سے ایک لمبی سی کتاب نکالی اور اس میں سے کچھ حصے پڑھ کر سنانے لگے۔ یہ کتاب کون سی تھی اب یہ تو یاد نہیں لیکن جو کچھ سنا یاد ہے وہ فارسی میں لکھی ہوئی ایک یادداشت کے کچھ حصے تھے۔ شنکر بابو فارسی جانتے تھے۔ یہ یادداشت دراصل میرے والد کے پردادا کے چھوٹے بھائی میر دولت علی مرحوم و مغفور کی تھی جو ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے زمانے میں بنارس میں تحصیلدار تھے۔ چونکہ میں نے ابتدائی دنوں میں فارسی پڑھی تھی اور درمیان میں کسی کسی واقعے کی وضاحت والد صاحب اردو میں بھی کرتے جاتے تھے اس لیے بہت کچھ میں سمجھ سکا اور اب تک یاد رہ گیا۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور اب وہ کتاب کون سی تھی جس کی جلد کے آخری صفحات پر وہ یادداشت تحریر تھی، معلوم نہیں۔ وہ کتاب یا یادداشت کیا ہوئی یہ بھی معلوم نہیں۔ ممکن ہے والد مرحوم کی کتابوں میں کہیں دھول میں پڑی ہو۔ اس وقت جو کچھ لکھنے جا رہا ہوں وہ اسی یادداشت سے سنی ہوئی باتوں پر مبنی ہے۔

حضرت واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء کی کش مکش کے خاتمے کے بعد کچھ دنوں تک تو لکھنؤ ہی میں مقیم رہے، اس کے بعد کلکتہ کی جانب مراجعت کی۔ ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت

ہیسٹنگز [illegible] کو کہا بادشاہ لکھنؤ میں جیسے حکومت کی
جانشین کے طور پر رہا یا بادشاہ کا یہ قدم [illegible] اور بادشاہ
کی لکھنؤ میں موجودگی عوام کے دلوں میں آزادی اور حب الوطنی
کی جگہ ہوئی بلکہ دبی ہوئی چنگاری کو کسی وقت بھی شعلہ بنا سکتی
تھی۔ چنانچہ بادشاہ کے [illegible] میں سے کچھ انگریزوں
کے ساختہ پرداختہ تھے [illegible] بادشاہ کے وفادار لیکن
انگریزوں کے مفادات کی طرف سے خوش عقیدہ بھی تھے،
بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ کے معاملات ایسٹ انڈیا کمپنی
اور مقامی انگریزوں نے جو زیادتیاں کی ہیں ان کی شکایت
آپ ملکہ انگلستان کو پیش کریں تو عجب نہیں کہ
آپ کا علاقہ آپ کو واپس کر دیا جائے۔ لہٰذا اس سلسلے میں
پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ آپ خود کلکتہ چل کر جہاں ایسٹ انڈیا
کمپنی کا ہندوستانی ہیڈکوارٹر تھا کمپنی کے اعلیٰ افسران اور
حکم کے نمائندہ سے ملاقات کریں۔ ایک بادشاہ کا اپنی حکومت
کے لیے کسی سے دادرسی کرنا کتنا تکلیف دہ ہے اس کا تصور کرنا کم از کم
آج کل نا ممکن ہے۔ لیکن یہ ایک خود مختار بادشاہ کی بات
تھی جس نے زندگی بھر صرف عطا کیا تھا آج وہ کسی کے آگے
دست سوال کیسے دراز کرتا خواہ وہ سلطنت کے لیے ہی کیوں نہ
ہو۔ بادشاہ کی ذہنی کیفیت اور روحانی اذیت کا اندازہ کرنا
بھی ہمارے لیے تقریباً نا ممکن ہے۔

بہرحال مصلحتاً اور مجبوراً بادشاہ عازم کلکتہ ہوئے چونکہ
یہ بھی امکان تھا کہ کلکتے سے شاید انگلستان جانا پڑے اور یہ
بھی ممکن ہے کہ واپس لکھنؤ نہ آ سکیں اس لیے بادشاہ نے بڑے
درد انگیز لہجے میں کہا تھا ۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بادشاہ کا قافلہ [illegible] ہے بلکہ
[illegible] تھا اور [illegible] ایک
بڑی تعداد پر بھی مشتمل تھا۔ سفر کے بعد قیام کی ایک منزل
[illegible] آج کل وارانسی کہا جاتا ہے) جہاں کے
مہاراجہ کا راجہ خود مختار ہونے سے قبل سلطنت اودھ کا [illegible]
تھا اس لیے بنارس کے اس وقت کے راجہ مہاراجہ ایشوری پرشاد
نرائن سنگھ نے بادشاہ کے قیام طعام کا ذمہ لیا گویا بادشاہ
کا اپنا یہاں جانے کی سعادت حاصل کرنا چاہی۔

میر واجد علی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا [illegible]
[illegible] بادشاہ کو کیسے دیکھا جائے کیونکہ
بادشاہ حکومت چھن جانے اور شاہی خاندان کے افراد کی
بے توقیری ہو جانے کے باعث نہ صرف گوشہ نشین
ہو [illegible] چند [illegible] کے کسی کو
[illegible]
یہاں تک سوچا تھا کہ کسی چوکیدار یا پہرے دار کی خوشامد کر کے
بادشاہ کو ایک نظر دیکھ لیں گے۔ یہاں دو باتیں قابل غور
ہیں [illegible] کے ایک ذمہ دار افسر کی [illegible]
[illegible] بادشاہ کو ایک نظر دیکھنے کا
[illegible] انگریزوں کا [illegible]
[illegible] عوام و خواص کے دلوں پر [illegible]
کی حکمرانی [illegible] اور عیاش [illegible]
کی [illegible] ایک غریب پرور اور سخی حکمران کی زیادتی کی
[illegible] کے واسطے انگریزوں کو
[illegible] دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انگریز
افسر [illegible] عزت و تکریم اور اطاعت [illegible]
[illegible] کہیں زیادہ تھا [illegible]
کی [illegible] آبادی [illegible]
[illegible] تھا کہ ایک [illegible] کو
[illegible] کی [illegible]
[illegible] کا خیال آیا لیکن [illegible]
[illegible] بادشاہ کے [illegible]
[illegible]

[illegible] کا تعین کیا گیا وہ میر دولت علی تھے۔ [illegible] کی اصطلاح میں میر صاحب OFFICER IN [illegible] یا LIAISON OFFICER یا ATTENDANCE کے [illegible] ہوئے۔

میر صاحب بنارس کی سرحد سے کچھ فاصلے پر بادشاہ کے قافلے میں شامل ہوئے اور مہاراجہ بنارس کی جانب سے استقبال کا پیغام دیا۔ بادشاہ کو علم ہوا تو انھوں نے خود میر صاحب کو اپنے حضور میں طلب کیا اور اس طرح میر صاحب کی بادشاہ کی زیارت کی تمنا بر آئی۔ بادشاہ نے بنارس پہنچنے کے وقت اور قیام کے سلسلے میں چند باتیں دریافت کیں جن کا میر صاحب نے تشفی بخش جواب دیا۔ میر صاحب کے بیان کے مطابق بادشاہ بہت آہستہ اور مختصر گفتگو کرتے تھے۔

بنارس میں بادشاہ اور ان کے قافلے کا قیام نندیسر کی کوٹھی اور اس کے بالمقابل سڑک کی دوسری جانب [illegible] ہاؤس نامی کوٹھی میں تھا۔ (نندیسر [illegible] کوٹھی [illegible] ہاؤس میں سرکاری دفاتر ہیں) [illegible] تھا [illegible] عمارتوں میں خس کے بے شمار [illegible] گئے تھے [illegible] انھیں خس کے پردوں سے ڈھک دیا گیا تھا [illegible] عمارت کے چاروں طرف دور دور تک [illegible] اور گلاب کے پانی کا چھڑکاؤ ہوتا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ [illegible] جون پور اور غازی پور کے [illegible] کے یہاں جہاں [illegible] اور [illegible] کے عرقیات کی کشید بڑے پیمانے پر ہوتی تھی (اور کسی حد تک آج بھی ہوتی ہے) عرقیات [illegible] وغیرہ مہاراجہ بنارس نے منگوایا تھا۔

بنارس میں بادشاہ کا قیام صرف چند روز رہا اور اس دوران بادشاہ نے صرف ایک بار مہاراجہ بنارس کو شرف [illegible] بخشا۔ اس ملاقات میں مہاراجہ [illegible] بادشاہ [illegible]

موگرے کے پھولوں کا ایک ہار مہاراجہ کو [illegible] کہا "اب کیا رہا"۔ یعنی سب کچھ تو انگریز لوٹ لے گئے ہمارے پاس اب کیا رہ گیا ہے جو ہم اپنے قدیم نمک خوار کو دیں۔ یہ سخی اور غریب پرور بادشاہ کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں اور یہ بھی دیکھئے کہ موگرے کے پھولوں کے اس ہار کے ہر گچھے میں کبوتر کے انڈے کے برابر ایک اصلی موتی تھا۔

نذر دینے کے بعد مہاراجہ کھڑے رہے تو بادشاہ نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مہاراجہ نے مزاج پوچھا۔ بادشاہ نے بڑے آہستہ اور دھیمے لہجہ میں جواب دیا "اچھا ہوں" اس کے بعد کہا "بیٹھئے" مہاراجہ پھر بھی کھڑے رہے اور ایک دو مزید رسمی باتیں کیں۔ جب بادشاہ نے دوبارہ بیٹھنے کے لیے کہا تو مہاراجہ نے دست بستہ جواب دیا "کبھی ہوا نہیں" یعنی بنارس کا راجہ جو اودھ کا باج گزار تھا شاہان اودھ کے سامنے بھی ملاقات کے دوران بیٹھنے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ (یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ اب بنارس کی ریاست ایک خود مختار ریاست ہو چکی تھی اور اودھ کی سلطنت [illegible] ختم ہو چکی تھی لیکن مہاراجہ کی وضع داری [illegible])

. . . . یہ سن کر بادشاہ آبدیدہ ہو گئے اور صرف اتنا کہا "اب وہ بات کہاں!" بادشاہ کو مغموم دیکھ کر مہاراجہ نے جھک کر فرشی سلام کیا اور الٹے پیروں واپس آ گئے۔

بادشاہ کے بنارس میں قیام کے دوران ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ بادشاہ نے اپنے کسی مقرب خاص سے کہا تھا کہ کیا بنارس کا [illegible] قریب ہو گیا ہے؟ اور پوچھنے پر بادشاہ نے بتایا کہ [illegible] میر دولت علی صاحب نے [illegible] [illegible]

بقیہ صفحہ [illegible] پر

پختہ عمارت

اس کم بخت پڑوسن نے تو میرے گھر کا ستیاناس ہی کر رکھا ہے۔ جب بھی میرے گھر میں قدم رکھتی ہے، ہمارے رہن سہن اور طور طریقوں پر لمبی چوڑی تنقیدیں کرتی ہوئی۔

کبھی کہتی ہے "تمہارے یہاں تو میں چھ سال سے یہ ٹوٹے شیشے کا ٹکڑا دیکھ رہی ہوں، تم کو نہ جانے اس میں چہرہ دیکھنا کس طرح اچھا لگتا ہے۔ میں نے تو قدِ آدم شیشہ امپورٹڈ لگوایا ہے۔"

کبھی کہتی: "فریج اور ٹی وی کے بغیر زندگی کیا ہے؟"

کبھی میری بیوی مجھ سے کہتی ہے "تم کو یہ سوتی کپڑے روز روز دھو کر پہننا بھلا کیسے اچھا لگتا ہے؟ آج کل تو دیہاتی بھی انہیں پسند نہیں کرتے۔"

کبھی بیگم کی پھٹی چپل کو ٹوکتی "آج سے چھ سال پہلے جب میرا بیاہ ہوا تھا تو میں نے بھی اسی طرح کی چپل پسند کی تھی، صرف دو مرتبہ پیر میں ڈالی۔"

مجھے اس کی باتوں پر خیال آتا کہ وقت بھی کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے انسان کے ساتھ۔ میرے ہی ٹوکو کو بیاہ کر [illegible] آج اپنی ناک سے کس طرح بولتی ہے۔ [illegible]

تلیاں ہیں، جہاں تھوڑا سا پانی ملا۔ بس آپے سے باہر۔ یہ بیگم کی عظمت ہی تو ہے، جو وہ اس کے دل سہ لیتی ہے۔ کوئی اور ہو تو ایک دن نہ سنے۔

لیکن اب تو بیگم بھی تنگ آ کر ناک بھوں سکیڑنے لگی ہیں۔ میں تو اس کم بخت کو کئی مرتبہ ڈانٹ بھی چکا ہوں، لیکن کتے کی دُم بھلا سیدھی کب ہونے لگی؟

اب تو اس نے میری بیگم کو ناداری کا احساس دلا دلا کر میرے گھر کو جہنم بنانا شروع کر دیا تھا۔ اب بیگم اکثر کھوئی کھوئی سی رہتی تھی اور کوئی بات کہنے پر پھوٹ پڑتی تھی۔ یہ سب اس کے رہن سہن کو دیکھ دیکھ کر اور اس کی باتیں سن سن کر ہی تو۔۔۔ ورنہ تو وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ میں اس کا احسان کہاں بھولنے کا۔ جو اس نے بچپن کی محبت کو برقرار رکھتے ہوئے، امیری اور غریبی کی تفریق بڑی دلیری سے مٹا دی تھی۔

بچپن میں ہم دونوں اپنے قصبے کے اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے اور وہیں ہماری محبت کا پھول کھلا تھا۔ میں ایک غریب پوسٹ مین کا لڑکا تھا اور وہ ایک سیٹھ کی لڑکی تھی۔ اس کے والد کا فلیٹ بمبئی میں بھی تھا۔ جس سے [illegible] ملتا تھا۔ اس کے والد [illegible] بھی کیا کرتے تھے۔ [illegible] ان کی آنکھیں [illegible] بے نور ہو گئی تھیں۔ اس لیے [illegible]

[illegible] اور دونوں کی بڑی [illegible] گئی۔

ہمارا گھر صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک ماں، دوسری خادمہ اور تیسری وہ خود۔ ہم دونوں کے شب و روز محبت کی فضا کو شاداب کرتے رہے۔ اس نے اپنی خادمہ کو گھر دے دیا تھا۔ اور ہم دونوں اس کے پائیں باغ میں بیٹھے بیٹھے چھوٹے سے ٹینک کے شفاف پانی میں پیر ڈالے بیٹھے بیٹھے پہروں گل و بلبل کی داستانیں دہراتے رہتے۔

ایک دن اچانک نجمہ کے والد کی وفات کا ٹیلی گرام آیا اور وہ آنسو بہاتی ہوئی بمبئی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ جہاں تک مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیتا رہا، وہ پیاسی آنکھیں مجھے فریاد کرتی چلی گئیں۔

اور میرا غم مجھے اس جانب بہا لے گیا، جہاں کا فن تھا، حیات کی تنہائی تھی، میں تھا اور قلم۔ میں قلم کی زبان سے اپنا غم دنیا کو سنانے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک ایک دن نجمہ کا خط آیا۔ اس کی تحریر مجھے بہت کھینچے لے گئی۔ پھر اس کی ماں ہم دونوں کے بچپن میں بچھڑے ہوئے پیار کے درمیان دیوار نہ بن سکی۔ اور ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے۔

ایک دن اچانک نجمہ کی ماں بھی دوسرے عالم کو چل بسیں اور پھر اس کا میرے سوا کوئی نہ رہا۔ اس زمانے میں [illegible] میرے یہاں [illegible] نام سے لازم تھا۔ اس کی شادی کچھ ہی دن [illegible] اس احسان فراموشی سمجھا ہے کر [illegible]

[illegible] مجھے لکھنے کا شوق تھا [illegible] نجمہ کی محبت [illegible]

[illegible]

میں نجمہ کی محبت اور اپنی شہرت کی دنیا میں [illegible] اتنا کھو گیا تھا کہ میری لائبریری کتابوں سے گھر کی الماریاں [illegible] ہونے لگی اور ہم تباہی کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ میری تنخواہ تک نہ نکل سکی اور میں نے [illegible] تلاش کرنے کے لیے کہہ دیا۔

ہم مفلس ہو گئے اور امیر وہ ناشر جو بار بار ایڈیشن کر کے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اب اس نے ہمارے فلیٹ کے سامنے ہی ایک خوبصورت فلیٹ بھی خرید لیا ہے۔ اس کے پاس فرج، کار، ٹی وی، سبھی کچھ ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو بڑھاپے کی [illegible] برکتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔

نجمہ اکثر اس کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اور جل جل کر مجھ سے شکوہ کرتی۔ "دنیا نے ترقی کی لیکن ایک آپ ہیں جو صرف لکھتے ہی رہ گئے ہیں۔ گھر کا سارا اثاثہ تمہارے قلم کی سیاہی نے چاٹ لیا۔ [illegible] تو [illegible] ہیں، [illegible] ہیں۔ ایک میرا [illegible] سب [illegible] گیا۔ اس شہرت کو کیا چاٹیں گے جو پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا نہیں دے سکی۔ خالی واہ واہ سے پیٹ نہیں بھرے گا۔ اسی لیے تو کہتی تھی کہ اس عادت کو فروخت کر کے [illegible] بڑا نفع ہے اس میں۔ دیکھو نا بھیا کی کل کیا حالت تھی اور وہ آج کس قدر خوشحال ہیں۔"

اور میں کیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کو سمجھایا کہ یہ عیب عارضی ہے اور [illegible]
[illegible]
[illegible] پھر کہتی "تمہاری عزت سے بھی کہاں؟
[illegible] کو بڑی کو بھی جہیز دیتا" کسی نے واہ! واہ! کے
[illegible] تو کیا عزت بڑھ
گئی۔ [illegible]! [illegible] دلانے پر بڑی بڑی کاریں
چھوڑ جاتی رہتی ہیں۔ بڑے بڑے اس کو نا تھا سکتے ہیں"
نجمہ کا پارہ جب حد سے بڑھنے لگا تو میں نے عمارت
فروخت کر کے امیر خاں جیسا روزگار کرنے والی اس کی بات
کو مان کر اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔ لیکن اس طرح میں کئی مرتبہ
اسے اور بھی دلاسے دے چکا تھا، اس لیے وہ مجھ سے الجھی
ہی رہی۔ اسی وقت کسی نے باہر سے مجھے آواز دی اور میں
[illegible] آیا کو نکل گیا۔

باہر ایک فلم پروڈیوسر صاحب اپنی ایک فلمی ہیروئن
کے ساتھ حاضر تھے۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد انھوں نے ہماری
پختہ عمارت کو مبلغ ایک لاکھ میں خرید لیا۔ میں نے معاہدے
پر دستخط کر کے ایک لاکھ نقد پیسے لیے اور اندر جانے کے لیے
[illegible] کہ یہ خوشخبری نجمہ کو سنا دوں چل دیا۔ اسے تلاش کرتے کرتے
بالکنی تک جا پہنچا۔ وہ باہر ہیروئن کو دیکھنے میں منہمک تھی۔
میں چپکے سے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ باہر کے مجمع میں [illegible]
اور امیر خاں کو ہیروئن کی قربت میں دیکھ کر مجھے سمجھنے میں
[illegible] دیر نہ لگی کہ آج اس کا اِمیگنگ کا بھانڈہ پھوٹ گیا۔
[illegible] نجمہ کے ہاتھ میں روپیہ رکھا [illegible] پکڑاتے
ہوئے کہا: "یہ لو نجمہ میں نے ایک [illegible] کے ہاتھ پختہ عمارت
[illegible] اب میں بھی امیر خاں جیسا
[illegible] ہو جاؤں گا۔"
[illegible] بڑی حیرت سے مجھے دیکھا
[illegible] سمجھانے بنانے کو [illegible]

[illegible] امیر صاحب کے پاس آ بیٹھا
تھوڑی دیر بعد نجمہ نے بہت [illegible]
لا کر پکڑتے ہوئے کہا: "مجھے امیر خاں جیسا [illegible]
آدمی نہیں چاہیے [illegible]
گی۔ مجھے اپنی عزت پیاری ہے۔ مجھے یہ رقم نہیں چاہیے۔"
"لیکن یہ تو معاہدے پر دستخط ہی کر چکے ہیں۔" [illegible]
صاحب نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے لفظ "دستخط"
پر زور دیا۔

"یہ ہونے کون ہیں دستخط کرنے والے" نجمہ جھلا کر
پروڈیوسر صاحب سے مخاطب ہوئی۔ اور فلمی ہیروئن بھی
حقارت سے دیکھنے لگی۔ پروڈیوسر صاحب نے [illegible]
پر سامنے میز پر رکھی ہوئی میری کتاب کا سرورق جلدی سے
پلٹ کر دیکھا اور مطمئن ہو کر مجھ سے مخاطب ہوئے "یہ کیا
ثبوت ہے کہ پختہ عمارت آپ کی ہے"؟

یہ سنتے ہی نجمہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح پھنکاری
"وہ میری ہے، میں اس کی مالکن ہوں، وہ میرے نام [illegible]"
پروڈیوسر نے کتاب کا سرورق پھر کھولا اور میرے نام پر [illegible]
رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئے "یہ تو مصنف کا نام [illegible]"
نجمہ کا سر ندامت سے جھک گیا اور وہ بے جان سی آواز میں کہتی
ہوئی "جی! میں تو......" اس کا جملہ حلق میں پھنس گیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" پروڈیوسر صاحب نے مزید
معلومات کے لیے نجمہ کو پھر کریدا۔

میں نے نجمہ کا مذاق اڑاتے ہوئے بات صاف کی:
"یہ تو اس پختہ عمارت کی بات کر رہی تھیں جس میں آپ
لوگ تشریف فرما ہیں" اور پھر ہم سب کے قہقہے فضا میں
بلند ہونے لگے اور نجمہ میری عظمت اور وقعت کا اندازہ کر کے
میرے قریب کھسک آئی۔ اب اس کی آنکھیں کبھی [illegible]
[illegible] اور کبھی مجھے انداز محبت سے دیکھ رہی تھیں۔

★

بقیہ مضمون مولانا [illegible] — ایک جائزہ — صفحہ [illegible] کا

[illegible] بہت کچھ کہہ گئے، ہر چند کہ رہتے "مجھ کو سہ
[illegible] ہر چند یہ بہلائے آسائش دیدہ ایں جا"

مولانا نے پسماندگان میں دو صاحبزادے، دو صاحبزادیاں اور ان کے بچے پاکستان میں چھوڑے ہیں۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد عزت حسین ندوی علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ سماجیات میں پروفیسر ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر محمد قیصر حسین ندوی نیشنل بوٹینیکل گارڈن میں سائنس افسر ہیں۔ افسوس ہے کہ مولانا کی بڑی صاحبزادی مولانا کی حیات ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔

★

بقیہ مضمون نواب واجد علی شاہ چند روز بنارس میں — صفحہ ۲۰ کا

بیگموں کی اس میں اس واقعہ کا ذکر بھی کیا۔ مہاراجہ نے پہلے [illegible] کو طلب کیا جسے بادشاہ کے قیام کے سلسلے میں خس کی ٹٹیاں اور پردے سپلائی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ٹھیکیدار نے کہا "حضور کی خدمت کرتے ہماری کئی پشتیں گزر گئیں۔ جو حکم ہمارے پاس ہے حضور کا بھیجا ہوا ہے۔ بادشاہ کے قیام کے سلسلے میں جب انتظامی رقم سرکار سے مانگی خوش دلی سے ہمیں ملی۔ اور اگر ہم اور رقم مانگتے تو ملتی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہم نے سنا تھا کہ واجد علی شاہ کو خوشبوؤں کی پرکھ بہت زیادہ ہے اسی لیے ہم نے بیت الخلا کی ایک ٹٹی میں صرف ایک مٹھی پرانی خس لگا دی تھی"

★

بقیہ مضمون موازنۂ انیس و دبیر —— صفحہ ۳۶ کا

دبیر کے کلام میں آفاقیت کا عنصر کم ہے یہی وجہ ہے کہ ایہام گوئی اور صنائع بدائع کا دور ختم ہوتے ہی ان کے مرثیوں کی اہمیت گھٹتی گئی اور آج خواص کی مجلسوں میں بھی ان کے مراثی بہت کم پڑھے جاتے ہیں جبکہ انیس کے مرثیے آج بھی اسی طرح اپیل کرتے ہیں جس طرح ان کی زندگی میں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی اپنی امتیازی خوبیوں کے اعتبار سے دونوں بلند پایہ مرثیہ نگار ہیں اور دونوں نے اپنے مخصوص انداز فکر اور طریقۂ اظہار کے دائرے میں رہ کر مرثیے کے تمام لوازمات کو زیادہ سے زیادہ اثر آفرینی والا وزنی اور آفاقیت کا حامل بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنی گرانقدر تخلیقات سے اردو ادب کو مالامال کیا ہے۔

★

غزلیں

مناظر حسن شاہین
پرائمری اسکول، علاول پور
ڈاکخانہ نگواں تورماں گیا

تاریکیوں پہ رکھ کے نظر جاگتے رہو
باقی ابھی ہے شب کا اثر جاگتے رہو

بڑھتے رہو رفیقو! یونہی عزمِ نو کے ساتھ
کانٹوں سے پُر ہے راہ گزر جاگتے رہو

سوئے رہے جو نام ونشاں ان کے مٹ گئے
ہو جاؤ گے جہاں میں امر جاگتے رہو

کیا خوف چھا رہی ہیں جو ظلمت کی بدلیاں
ہوگی شبِ سیہ کی سحر جاگتے رہو

دشمن بھی گھات میں ہے نہ غفلت کو راہ دو
شب خون مارنے کا ہے ڈر جاگتے رہو

آنکھیں جھپک بھی جائیں تو بیدار دل رہے
کہتے ہیں یہ نجوم و قمر جاگتے رہو

اختر شاہجہانپوری
پل شمسی خاں۔ بنگین چوپال
شاہجہاں پور۔

تم ستمگر اسے کہتے ہو یہ بے جا ہے بہت
وہ تو اک ابرِ کرم ہے کہ جو برسا ہے بہت

اس کی یادیں جو اُبھر آئی ہیں لوحِ دل پر
اس لیے ذہن کے صحرا میں اُجالا ہے بہت

جس کو پا لینے کی ہر اک نے قسم کھائی ہے
آج اس شخص نے میرے لیے سوچا ہے بہت

تیرے جلوے ہیں کہ تا حدِ نظر ہیں اب بھی
گو کہ آنکھوں نے مری ان کو سمیٹا ہے بہت

کس لیے گلشن و صحرا میں پھرے دل آوارہ
میری وحشت کو ترے کوچے کا رستا ہے بہت

وہ جہاں جائے وہاں انجمن آرائی ہو
اس بیاباں میں وہ آیا ہے تو آیا ہے بہت

ہم تو اختؔر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ زہرہ جمال
ہم کو چاہے ہے کہ ہم نے بھی تو چاہا ہے بہت

انس مسرور
سکراول ٹانڈہ۔
فیض آباد۔ یوپی

غزل

ہر گزرتا ہوا لمحہ ہے ہوا کی مانند
اور ہم دشت میں نقشِ کفِ پا کی مانند

تو کہ اک غنچۂ نورس کی طرح نکہت بیز
میں کہ آوارہ و بدنام صبا کی مانند

اپنے ہاتھوں پہ سجا لے کہ نہ مٹی میں ملیں
میرے آنسو ہیں ترے رنگِ حنا کی مانند

زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے
کسی پابستۂ زنجیرِ وفا کی مانند

میری آنکھیں بھی برستی ہیں ساون کی طرح
ان کی زلفیں جو بکھرتی ہیں گھٹا کی مانند

اس کا ملنا کوئی آسان نہیں پھر بھی مسرور
وہ فرشتوں کی طرح ہے نہ خدا کی مانند

مشتاق جاوید
پی ۹/۹۰ نجیہ پاڑہ۔ مٹیا برج
کلکتہ ۲۴

غزل

ہم قدم تھی روشنی راہوں میں دشواری نہ تھی
اس سے پہلے مجھ پہ یہ شب اس قدر بھاری نہ تھی

اپنی ٹوٹی ناؤ لے کر ہم اچانک چل پڑے
اک سمندر کے سفر پہ جس کی تیاری نہ تھی

منقطع ہر شخص کر لیتا تھا ہم سے دوستی
کیونکہ فطرت میں ہماری کچھ اداکاری نہ تھی

چاروں جانب تھا سرابی دائروں کا سلسلہ
پیاس ہم جس سے بجھاتے نہر وہ جاری نہ تھی

آنے والوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ لے
گھر کی دیواروں پہ ایسی کوئی گلکاری نہ تھی

میرے چہرے کی حقیقت آئینے سے تھی عیاں
میری آنکھوں میں مگر جاوید بیزاری نہ تھی

سہیل احمد
۲۳۔ تارین، شاہجہاں پور

اتر پردیش کے پہاڑوں پر سردیوں میں سیاحت کا لطف

ریاست اتر پردیش کے شمال میں ایک وسیع کوہستانی سلسلہ ہے جو نیپال اور چین کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سر بفلک برف پوش پہاڑی چوٹیاں، گھنے اور خوبصورت مناظر قدرت کی صناعی کا عجیب نظارہ پیش کرتے ہیں۔

ان پہاڑوں پر سیاحوں کی دلچسپی کے لاتعداد حسین و دلکش مقامات ہیں۔ یہاں کے رنگا رنگ اور رنگینیوں بھرے میلے اور تیوہار، یہاں کے تاریخی اور مذہبی مقامات کی خاموش عظمت، یہاں کے مندروں کی کانوں میں رس گھولتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز، یہاں کے برف پوش پہاڑوں کی دلوں پر جادو کر دینے والی خوبصورتی، یہاں کی ندیوں کی مست خرامی، یہاں کے گرتے ہوئے آبشاروں کی گنگناہٹ یہاں کی جھیلوں میں تیرتی ہوئی کشتیاں اور مچھلی کا شکار جیسے صدہا لطف اندوز ہونے کے ذرائع کے علاوہ روح کو بالیدگی عطا کرنے والی سرسبز و شاداب جنگلوں کی خنک ہواؤں کا لمس کسی کو بھی آسانی سے اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔

ویسے تو یہاں گرمی کے دنوں میں پہاڑوں کا حسن شباب پر ہوتا ہے لیکن سردیوں میں سیاحت کا کچھ اور ہی لطف ہے جس کی جانب سیاحوں نے حال ہی میں توجہ کی ہے۔ اب سردیوں کی برفیلی ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لیے اتر پردیش میں ہزاروں کی تعداد میں سیاح آنے لگے ہیں۔

اتر پردیش کے شمال میں واقع ہمالیہ کی ترائی میں کمایوں اور گڑھوال کی سردیوں کے زمانہ کی خوبصورتی یورپ کے کسی بھی خوبصورت پہاڑی خطہ سے کم نہیں ہوتی۔ نینی تال اور مسوری برفباری کے موسم میں سفید چادر میں لپٹا دلوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ رانی کھیت، الموڑہ، کوسانی، اترکاشی، چمپا، دھنولٹی اور پوڑی کے علاقوں میں جہاں سردیوں کے دوران ایک پرندہ بھی نظر نہیں آتا تھا وہاں اب ان برف پوش شہروں میں سیاحوں کا سیلاب رواں نظر آتا ہے۔

سردیوں کی سہانی صبح کا سورج نکلتے ہی لاتعداد سیاح، بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں مچلتے دلوں اور پھسلتے پیروں سے برف سے ڈھکی سڑکوں پر کانپتے، دانت بجاتے، برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے پر پھینکتے ہوئے اچھلتے کودتے ہیں تو ماحول بھی بچوں اور نوجوان جوڑوں کے قہقہوں سے گرما جاتا ہے۔

سیاحوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں ایک ہی مقام پر فراہم کرنے کی غرض سے نینی تال میں حکومت اتر پردیش کے محکمہ سیاحت نے سیاحوں کے لیے ایک خیر مقدمی مرکز قائم کیا ہے جہاں رہائش کے علاوہ پہاڑی علاقہ کے دیگر خوبصورت مقامات کی معلومات بھی مہیا کی جاتی ہیں نیز یہاں سیاحوں کے لیے طعام، غسل خانہ، ٹیلی فون، بک اسٹال، دستکاری کی اشیاء، کلوک روم کی سہولت، زرمبادلہ کی سہولت ڈاکخانہ اور کیفے ٹیریا کا بھی بندوبست ہے۔

نینی تال میں سردیوں کے دوران جھیل کے کنارے واقع ہوٹلوں کے کمروں کو گرم رکھنے، لذیذ کھانوں اور آمد و رفت کے ذرائع کا مناسب بندوبست ہے۔ نینی تال کوہ پیمائی کلب سردیوں کے موسم میں نوجوان سیاحوں کو کوہ پیمائی کی تربیت دیتا ہے۔ جس میں ہزاروں نوجوان لڑکے لڑکیاں ہر سال تربیت حاصل کرنے کے لیے یہاں

آتے ہیں۔

الموڑہ شہر جو کبھی کمایوں کی تہذیب کا مرکز اور راجدھانی تھا، سردیوں میں سیاحوں کی آمد کا منتظر رہتا ہے۔ ریاستی حکومت نے یہاں سیاحوں کی خاطر چھٹیوں کے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک شاندار عمارت تعمیر کی ہے جہاں سے عظیم ہمالیہ کی خوبصورتی کے مناظر چاروں طرف بکھرے نظر آتے ہیں اور نیلے شفاف آسمان اور پہاڑوں کے درمیان برف پوش چوٹیوں کی روپہلی دلکشی سیاحوں کو بے چین کر دیتی ہے۔

الموڑہ سے ۱۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع کوسانی قدرت کی صناعی کا حسین منظر پیش کرتا ہے۔ یہاں کی خوبصورتی کو دیکھ کر ایک عجیب نشہ سا طاری ہونے لگتا ہے۔ کوسانی کے ڈاک بنگلے سے نندا دیوی، نندا گھاٹ، پنچ چوڑی، ترشول نیل کنٹھ، چوکھمبا، بندر پونچھ اور ہاتھی پربت کی خوبصورت پہاڑی چوٹیاں سیاحوں کو جنت کا مزہ دیتی ہیں۔

اترکاشی میں قائم کوہ پیمائی کا ادارہ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے بہترین تفریحی مقام ہے۔ عالمی شہرت رکھنے والی پھولوں کی وادی سیاحوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے جہاں سردیوں میں اس کا غیر معمولی حسن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سیاحوں کے خیر مقدم کے لیے منتظر رہتا ہے۔ پھولوں کی وادی کے راستہ میں چار کیلومیٹر کے فاصلے پر گھنگھریا میں سیاحوں کے لیے ایک رہائش گاہ اور محکمہ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس رات میں قیام کرنے کے لیے دستیاب ہے۔

نوجوانوں کے لیے کمایوں میں پنڈاری گلیشیر کی کوہ پیمائی کی اسکیم کمایوں ترقیاتی کارپوریشن نے تیار کی ہے۔ اس کے علاوہ اولی بگیال اور پھولوں کی وادی کے لیے ٹریکنگ کی اسکیم گڑھوال ترقیاتی کارپوریشن نے وضع کی ہے۔ محکمۂ سیاحت نے ہمالین ٹور اسکیم کے تحت اتر پردیش کے شرقی ہمالیہ سے ہماچل پردیش اور کشمیر کے دور افتادہ پہاڑی مقامات پر جانے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس اسکیم سے سیاح ہمالیہ کی منصوبہ بند سیاحت کا بھرپور فائدہ اور لطف اٹھا سکیں گے۔

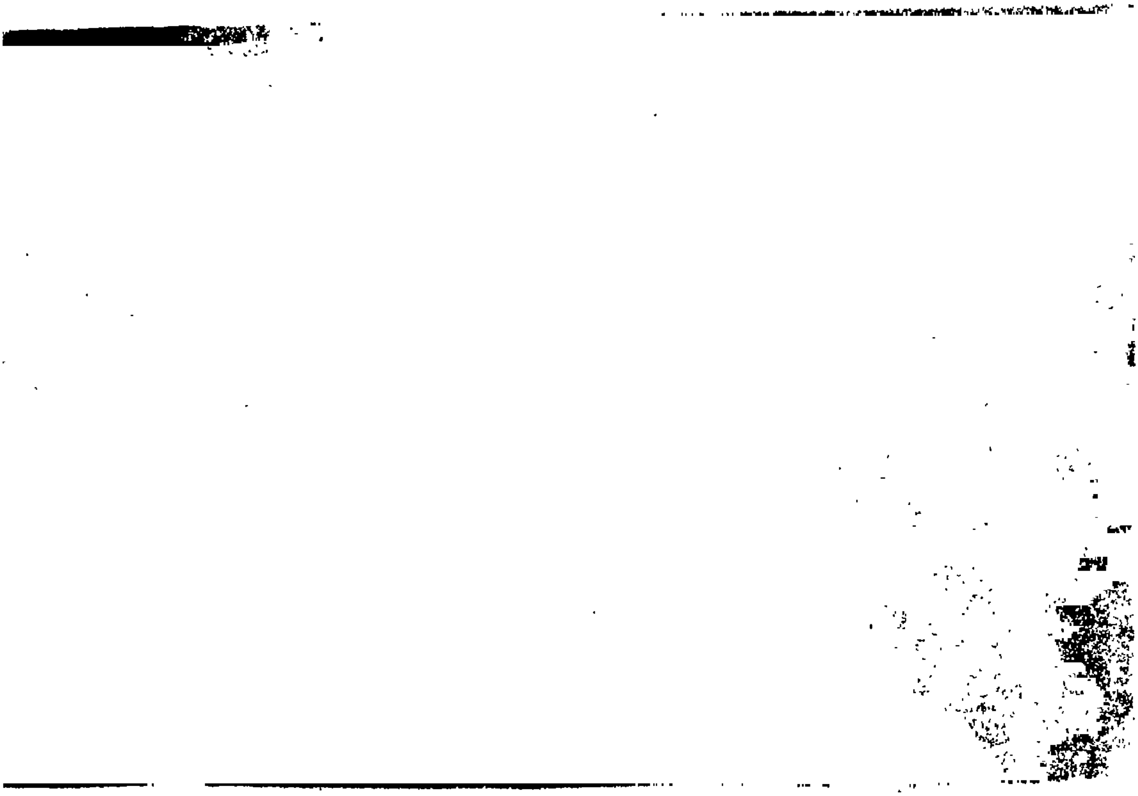
ان پہاڑوں پر سردیوں کے موسم کی ایک خاص دلکشی وہاں کی جھیلوں میں مچھلی کا شکار ہے۔ بھیم تال، سہویش تال اور ڈوڈی تال جو ٹراؤٹ مچھلی سے لبالب بھرے رہتے ہیں اور جہاں ہر سال سیکڑوں سیاح شکار کے لیے آتے ہیں۔

شمالی اتر پردیش کا یہ پہاڑی خطہ رنگ برنگے خوشیوں بھرے میلوں اور تیوہاروں کے لیے مشہور ہے۔ سیاحوں کے لیے یہ میلے جہاں ایک طرف انھیں تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں تو دوسری طرف مذہبی اور کاروباری ضرورتوں کو بھی پورا کرتے ہیں اس طرح کے میلے ہر سال مکر سنکرانت کے موقع پر اترکاشی، رشی کیش اور الموڑہ کے باگ ناتھ کے قدیم مندر میں بھی لگتے ہیں جہاں سیاحوں کو اس خطہ کی معاشرت اور تہذیب و تمدن کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ خطہ اپنی قدیم قابل فخر روایات، قرون وسطیٰ کی تاریخی مورتیوں اور اعلا درجہ کی فنکاری سے مرصع مندروں کے لیے مشہور رہا ہے جنھیں دیکھنے کے لیے لاتعداد سیاح ہر سال یہاں آتے ہیں۔

پہاڑوں سے نیچے اترنے پر ریاست کا ایک بڑا میدانی علاقہ گھنے جنگلات سے بھرا ہوا ہے جن میں بکثرت جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ ان جانوروں کے تحفظ کے لیے یہاں دو مشہور پناہ گاہیں جم کاربٹ نیشنل پارک اور دودھوا نیشنل پارک قائم ہیں جہاں جنگلی جانور قدرتی اور کھلے ہوئے ماحول میں گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں جو سیاحوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ گرجتے شیر، چنگھاڑتے ہاتھی، چوکڑیاں بھرتے ہرن، پیڑ پر چڑھتا ہوا تیندوا اور رنگ برنگی چہچہاتی ہزاروں چڑیوں کا جھنڈ سیاحوں کے دل و دماغ کو مسحور کر دیتا ہے۔

★

Urdu Monthly
Vol. 37 No. 6
SEPT 1982
50 Paise
NAYA DAUR
Regd No. LW/NP17
Annual Subs.



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی یکم ستمبر ۱۹۸۲ء کو رائے بریلی میں اتر پردیش کھادی اور دیہی صنعتی بورڈ کی جانب سے مربوط ترقیاتی اسکیم کے تحت دیہی صنعت کاروں کو مالی امداد دیتے ہوئے۔



نیا دور

جلد ۳۷ نمبر ۷

اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہنواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

[illegible]

پرنٹر: اشوک ڈر

[illegible]

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زرِ سالانہ: پانچ روپے

[illegible]

[illegible] پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ [illegible]

[illegible]

اپنی بات

ہمارے ملک کی تواریخ میں ۲؍ اکتوبر کا دن بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی دن ہمارے ملک کے نجات دہندہ اور جنگِ آزادی کے سپہ سالار مہاتما گاندھی پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک عظیم سیاسی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ ان کا رتبہ انسانی حیثیت سے اور بھی زیادہ بلند ہے۔ وہ صحیح معنوں میں انسانیت اور امن کا پیکر تھے اور دنیا میں وہ اسی عظمت اور بلندی کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ ملک کی جنگ آزادی میں بھی وہ انھیں اصولوں پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ ہندستان کی جنگ آزادی یقیناً دنیا کی پہلی جنگ آزادی ہے جو عدم تشدد ایثار اور قربانی کی بنیاد پر لڑی گئی اور جیتی گئی۔ انھوں نے کبھی اپنے اصولوں کو سیاسی مصلحتوں پر قربان ہونے نہیں دیا خواہ اس کے لیے انھیں کتنی ہی قربانیاں دینی پڑی ہوں۔ ہندستانی سماج کے مصلح اعظم کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار اور ہریجنوں اور اقلیتوں کے بہت بڑے ہمدرد تھے۔ ان کا کہنا تھا "اتحاد ایک طاقت ہے۔ اگر ہم میں پھوٹ ہوگی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہندو مسلم اتحاد کا مطلب صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ان سب جماعتوں کا اتحاد ہے جو ہندستان کو اپنا وطن سمجھتی ہیں چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں"۔ اس لیے محض رسمی طور پر ان کا جنم دن منا لینا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ ہم ان کے آدرشوں پر سچے دل سے کاربند نہ ہو جائیں۔ اپنے باپو کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم سب ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔

● ہندستان کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کے وزیر اعلا کے عہدے کی ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد شری سری پت مشرا نے ریاست کے سینیر افسروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ نظم و نسق کی مشینری کو خوش اخلاقی کے ساتھ اور خود کو وقف کر دینے کے جذبے سے کام کرنا ہوگا۔ اتر پردیش کو جن پیچیدہ اور بڑے مسائل کا سامنا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے شری مشرا نے کہا تھا کہ غریبی اور بے روزگاری جیسے دو بڑے مسائل کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ریاست کے عوام کو یہ مسائل حل کرنے کے لیے مل جل کر بھرپور کوشش کرنا ہوگی۔ کیونکہ دیگر مسائل بھی انھی دو مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ وزیر اعلا نے اپنی حکومت کی پالیسی واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس ریاست کی ۴۰ فیصد آبادی غریبی کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہی ہو، وہاں کے افسران اور ملازمین کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اختیارات کا استعمال سماج کے دبے، کچلے مظلوم اور استحصال کے شکار طبقوں کے لیے کریں۔ اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے عوام کے مسائل حل کرتے وقت اگر وہ ضروری سمجھیں تو قانون کی وضاحت غریبوں کے مفاد کو اولیں ترجیح دیتے ہوئے کریں۔ ریاست کے پیچیدہ اور بڑے مسائل نے حکومت کے لیے جو چیلنج پیدا کر دیے تھے، حکومت نے انھیں قبول کر کے پوری لگن اور خلوص کے ساتھ مختلف شعبوں میں بہت سے موثر اقدامات کیے اور متعدد قابل فخر کامیابیاں حاصل کیں۔ جہاں ایک طرف بڑے بڑے ڈاکوؤں کے گروہوں اور سماج دشمن عناصر پر قابو پایا گیا اور سماج میں ایک پرامن اور محفوظ ماحول پیدا کیا گیا؛ تو وہیں دوسری طرف منصوبے کو لامرکزی بنا کر حکومت نے اس کے فوائد دیہاتوں اور غریبوں تک پہنچانے میں پہل کی۔ اس پیداواری سال میں قدرتی آفتوں کے باوجود اناج کی پیداوار کا ۲۴۲ لاکھ ٹن کا مقررہ نشانہ حاصل کر کے ریاست نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا اور اس کے ساتھ ہی تقریباً ۱۵۰۰۰ چھوٹے صنعتی واحدے قائم کیے گئے اور کیمیاوی کھاد کے چار بڑے کارخانوں اور دیگر بڑی صنعتوں کے قیام کے لیے مرکز سے منظوری بھی حاصل کی گئی۔ اس کے علاوہ حکومت نے ریاست کی ۷۵۰۰۰ سے زیادہ گاؤں پنچایتوں کے انتخابات ایک دہائی کے وقفے کے بعد انتہائی دشوار حالات میں منعقد کرائے۔ وزیر اعظم کے نئے بیس نکاتی پروگرام کی، جو حقیقتاً غریب عوام اور بے سہارا لوگوں کی فلاح و ترقی کا پروگرام ہے، موثر عمل آوری پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اتر پردیش کی موجودہ حکومت وزیر اعلا شری سری پت مشرا کی قیادت میں ایک نئی امنگ اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ غریبوں، دبے کچلے مظلوم اور استحصال کے شکار طبقوں کی حالت بہتر بنانے اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے پوری طرح کوشاں اور سرگرم عمل ہے۔

—— ایڈیٹر

محبوب راہی
نزد گلزار مسجد
برسی ٹاکلی ضلع اکولہ مہاراشٹر

مہاتما گاندھی

اک ایسا دور تھا جب ہم پہ غیروں کی حکومت تھی
مقدر میں ہمارے صرف محکومی کی ذلت تھی
زمانے میں ہماری کوئی عزت تھی نہ وقعت تھی
اٹھا اک شخص نظم گردشِ دوراں بدلنے کو
بڑھا ہر جبر و استبداد کی قوت سے کچلنے کو
مقابل اس کے خونی بھیڑیوں کا ایک جتھا تھا
مسلح تھے وہ ظالم اور یہ تنہا نہتا تھا
تشدد ان کا شیوہ اس کا اک مسلک اہنسا تھا
اگر تھا ناز ان کو اپنی شیطانی حکومت پہ
بھروسہ تھا اسے بھی جذبۂ حق و صداقت پہ
جواں ہمت تھا وہ اک پیکرِ مردانگی تھا وہ
حریفِ تیرگی تھا وہ نقیبِ زندگی تھا وہ
بظاہر ایک لاغر منحنی سا آدمی تھا وہ
مگر اس میں پہاڑوں سے بھی ٹکرانے کی ہمت تھی
بلا کا جوش تھا اس میں غضب کی اس میں جرأت تھی
بالآخر رنگ لائیں اس کی وہ قربانیاں اک دن
ہوا اپنے مقاصد میں وہ راہی کامراں اک دن
غلامی سے ہوا آزاد پھر ہندوستاں اک دن
ترانے گونج اٹھے خوشیوں کے بھارت کی فضاؤں میں
سکوں کی سانس لی پھر ہم نے آزادی کی چھاؤں میں
ہمیں لیکن ابھی اک اور گہرا دکھ اٹھانا تھا
مقدر میں ہمارے خون کے آنسو بہانا تھا
ہمیں میں ایک پاپی تھا جو رسوائے زمانا تھا
کہ جس نے رہبرِ ہندوستاں کو قتل کر ڈالا
دکھی انسانیت کے مہرباں کو قتل کر ڈالا

نشاد اعظمی
۸/۲ نیم منزل سیتا پور روڈ
لکھنؤ۔

قومی یکجہتی کی علامت

مہاتما گاندھی

ہندستان میں قومی یکجہتی کی روایت تاریخ کے ہر دور میں خواہ وہ دھندلی ہی دکھائی ضرور دیتی ہے اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں وہ حکمراں زیادہ کامیاب و کامراں رہے جنھوں نے یہاں کے عوام کا خیال رکھا اور ان کے ہر طبقہ کو اپنے دورِ حکومت میں نمائندگی اور خدمت کا موقع دیا۔ جو بھی حکمراں باہر سے آئے وہ اپنی بادشاہت اور حکومت اسی وقت مضبوط اور مستحکم بنا سکے جب وہ خود یہاں کے لوگوں میں شیر و شکر ہو گئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی اور ایکتا کا تصور یہاں واضح ہو کر سامنے آتا رہا۔ ہندستان میں انگریزوں کی حکمرانی کا دور ایسا رہا جس میں ان کی استحصال کی پالیسی اور ظلم و جبر کے خلاف ہندوستانی قوم نے ایک مضبوط متحدہ محاذ بنایا اور اپنی طرف سے دیرپا اتحاد و یکجہتی کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ ہندستان میں بیداری کا صور پھونکنے اور جبر و استحصال کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے میں وقتاً فوقتاً یہاں کے تعلیم یافتہ طبقے نے گراں قدر خدمات انجام دیں پھر تحریک آزادی کے رہنماؤں نے اپنی تحریر و تقریر سے اتحاد و یگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کیا کہ جس نے ہندستان میں انگریزی سامراج کے مضبوطی سے جمے ہوئے قدم کو اکھاڑ پھینکا۔

تاریخ کے اس اہم اور نازک موڑ پر مہاتما گاندھی جیسی عظیم شخصیت کی جد و جہد اور محنت و کاوش کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا جنھوں نے اپنے گفتار و کردار سے اخلاق و محبت اور رواداری کی اس منزل کو چھو لیا تھا جہاں تک رسائی نہ کسی سیاسی رہنما کو نصیب ہوئی اور نہ کسی مذہبی پیشوا کو۔

مہاتما گاندھی جن کو ہندستانی قوم اپنا نجات دہندہ تصور کرتی ہے اور بڑے ادب و احترام کے ساتھ انھیں باپو کہہ کر پکارتی ہے، بڑی پرکشش اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں جذب و اثر کی وہ کیفیت موجود تھی جس کی بدولت لوگ ان سے سحر زدہ ہو جاتے تھے۔ سیاست، مذہب، تصوف، حق پرستی، عدل و مساوات، صداقت اور خلوص غرض جملہ صفات سے ان کی ذات عبارت تھی جن کے آگے بڑے سے بڑے رہنما، بڑے سے بڑا مذہبی پیشوا اور بڑے سے بڑے صوفی سنت ادب سے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار تھے۔ بلاشبہ ان میں کوئی طلسماتی عنصر ضرور موجود تھا جس نے سب کو موہ لیا تھا۔ غالباً تاریخ کے اس نازک موڑ پر قدرت نے انھیں ہندستان کی رہنمائی کے لیے چنا تھا جبھی تو ان کی شخصیت کسی کے لیے باعث اختلاف نہیں ہوئی۔ ان کی رہنمائی اور پرخلوص مشوروں پر باشندگان ملک نے وہ راہ اختیار کی، جس میں ان کی فلاح و بہبود کا راز مضمر تھا۔

مہاتما گاندھی کے ہر قول و فعل میں اتحاد و یگانگت، رواداری، انصاف اور مساوات کی روح پنہاں تھی۔ انھیں ہم سے رخصت ہوئے ۳۴ سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن

جب بھی ہم انھیں یاد کرتے ہیں، ان کے نظریات اور تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بہت پاس بہت قریب اور اپنے دل کی آواز کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔

ایک ایسا رہنما جو یہاں کے مسائل، حالات اور دیش واسیوں کے مختلف دین دھرم سے واقف تھا، گوناگوں رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت کا رازداں تھا، سماج کے پسماندہ طبقوں کی پریشانیوں اور بدحالیوں سے باخبر تھا۔ ہمیشہ ناانصافی کا شکار ہونے والے کمزور طبقوں کو انصاف دلانے اور ان کی بدحالیوں اور پریشانیوں کے علاج کی تدبیریں کرتا رہا۔ کیونکہ اس کی نظر میں سماج کے اندر نابرابری اور عدم مساوات جیسی لعنت موجود تھی جسے دور کرنے کے لیے وہ انتھک کوشش کرتا رہا۔ اس نابرابری اور ناانصافی سے لڑتا رہا اس کی یہ کوشش بارآور بھی ہوئیں۔ لوگوں میں بیداری آئی، ان کے نظریات کو تسلیم کیا گیا اور سماج کے کمزور طبقوں کو انصاف اور برابری کا حق دلانے کا خیال تمام ہندستانیوں کو ہوا کہ بغیر اس کے اتحاد و اتفاق اور میل جول کی فضا نہیں پیدا ہو سکتی تھی امیروں اور غریبوں کے درمیان کی خلیج کو پلٹے بغیر منافرت کو دور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہندستانی رہنماؤں کی نظر میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی یہ مسائل ترجیحی طور پر ان کے سامنے رہے چنانچہ آزاد ہندستان کا دستور اساسی وضع کرتے وقت ان سبھی باتوں کا خیال رکھا گیا۔ کمزور طبقوں کی بدحالیوں اور اقلیتوں کے مسائل حل کرنے، ہندستانی زبانوں اور تہذیبوں کی حفاظت و بقا کی ضمانت دی گئی۔ ان تمام توجہ طلب کاموں کی طرف مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی ہی میں اس محاذ پر جنگ شروع کر کے ان کے حل کے لیے ایک انداز فکر مہیا کر دیا تھا جس کے لیے آزاد ہندستان کے رہنما ہمیشہ ان کے احسان مند رہیں گے۔

ہندستان کی رنگارنگ تہذیب، متعدد مذاہب، تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کے جو تقاضے ہیں اور جن کے نتیجے میں یہاں جمہوری طرز حکومت اپنایا گیا ہے اُس کا بنیادی ڈھانچہ مہاتما گاندھی کے نظریات و خیالات سے ہم آہنگ ہے۔

مہاتما گاندھی نے تمام مذاہب کا بہ غور مطالعہ کیا تھا اور ان میں سے اچھائیوں، نیکیوں کا عرق کشید کر کے اخلاقیات کا ایک ایسا مرکب تیار کیا تھا جو ہندستان کے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے قابل قبول اور لائق عمل تھا۔ مہاتما کی تعلیمات اور اخلاقیات کا انداز مثبت تھا اگر کسی کو ان سے اختلاف رہا ہو تو ممکن ہے اس میں اپنے نفس کی کوئی غرض یا ناسمجھی کا دخل رہا ہو لیکن مہاتما گاندھی کی نیک نیتی اور پرخلوص ارادوں پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کسی ایک دھرم یا مذہب کی کھل کر حمایت اور تبلیغ نہیں کی گو کہ وہ ہندو مذہب کے پیروکار تھے۔ انھوں نے اپنے دھرم کے مقابلے میں کبھی کسی مذہب یا دھرم کو ہیچ یا کمتر نہیں سمجھا۔ ان کے [illegible] برہمنی آشرم اور سیوا گرام آشرم میں اگر مسلمان بچے زیر تربیت رہے تو انھوں نے ہمیشہ ان مسلمان بچوں کا بہت خیال رکھا اور انھیں پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کرنے کی ہدایت کرتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حق کی تلاش اپنے اپنے دھرم اور مذہب کی معرفت کرنا چاہیے گویا انھوں نے سبھی دھرم اور مذاہب کا مطالعہ بہ غور کیا تھا اور ہر ایک کی خوبیوں اور اچھائیوں کا علم انھیں حاصل تھا۔ اگر ان کے پیروکاروں میں کوئی سکھ بھی تھا تو اسے وہ گرو گرنتھ صاحب کے پڑھنے اور سمجھنے کی طرف مائل کرتے تھے، "اپنے اپنے مذہبوں سے ہندو دھرم کا مکمل گیان حاصل کرنے کا سبق دیتے تھے۔ انھوں نے بارہا اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ ہندو دھرم مجھے اپنی جان سے زیادہ پیارا ہے، قرآن کی تعلیمات بھی عزیز ہیں انھوں نے یہاں تک کیا تھا کہ اپنی پرارتھنا میں گیتا، قرآن اور انجیل کی تلاوت لازمی قرار دے دی تھی۔

مہاتما گاندھی اس راز سے بخوبی واقف تھے کہ ہندستانی قوم کی تشکیل تمام مذاہب کے ماننے والوں سے گوناگوں رنگ اور تہذیب نیز مختلف زبانوں سے مل کر ہوتی ہے اس لیے وہ سبھی مل کر دیش کو غلامی سے نجات دلا سکتے ہیں اور اسے آزاد کرا کے تعمیر و ترقی کی راہوں پر گامزن کر سکتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے وچاروں اور خیالوں، کاموں اور باتوں کی تہہ میں چھپی ہوئی دلسوزی اور غمخواری نے ہی ہندستانیوں کو ان کے ہر اشارے پر جان و دل سے قربان ہونے کے لیے آمادہ کر دیا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں دنیا کے بیشتر ممالک میں ذہین اور عیار قوموں نے سیدھی سادی قوموں کو اپنا غلام بنا کر ان کے استحصال کا کام شروع کر رکھا تھا اور یہ لعنت ہندستانیوں کے اوپر بھی مسلط تھی۔ مہاتما گاندھی ستیہ (JUSTICE) یعنی حق و انصاف پر یقین رکھتے تھے چنانچہ جہاں کہیں انھیں دنیا، ملک یا سماج میں ناانصافی نظر آئی اس کے دور کرنے کے لیے آواز بلند کی، احتجاج کیا اور اس وقت تک اس کے لیے لڑتے رہے جب تک اس کا قلع قمع نہیں کر لیا۔ ناانصافی کے خلاف لڑنے اور انتھک جدو جہد کا ہی نام انھوں نے "ستیہ گرہ" رکھا تھا جیسا کہ ان کی زندگی کے بیشتر واقعات اس کے شاہد ہیں۔ گویا مہاتما گاندھی کا ستیہ (JUSTICE) انصاف پر مبنی تھا اور ان کا ستیہ گرہ ناانصافی کے خلاف ایک موثر ہتھیار تھا۔

اس طرح مہاتما گاندھی کا نظریہ اہنسا بھی جس کے معنی عموماً عدم تشدد کے لیے جاتے ہیں۔ میل جول، اخلاق و جرأت اور رواداری کا ایک وسیع العمل نظریہ تھا گویا تشدد، نفرت، دوسرے مذاہب کے تئیں تعصب اور اس طرح کی بہت سی برائیوں سے ہندستانی قوم کو نجات دلانے کے لیے اہنسا کا نظریہ عملی طور پر ایک زبردست حربہ تھا جس کے دوررس نتائج سے انھوں نے بارہا لوگوں کو آگاہ کیا اور اس کی تشریح بھی اکثر و بیشتر کرتے رہے جسے بعد میں ہر ایک نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے۔ گاندھی جی کا مختلف مذاہب اور اہنسا کے سلسلے میں یہ خیال ہے کہ

"مجھے لفظ رواداری پسند نہیں لیکن اس سے بہتر کوئی لفظ مجھے نہیں ملا۔ رواداری سے کچھ یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ یہ فرض کر لیں کہ دوسرے مذاہب سے کمتر ہیں جب کہ اہنسا ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم سب مذہبوں کا ایسا ہی احترام کریں جیسے اپنے مذہب کا اور اس طرح اعتراف کریں کہ ہمارا مذہب بھی کامل نہیں ہے۔ حق کا جویا جو محبت کے قانون کا پابند ہے اس کا اعتراف بہت جلد ہی کر لے گا۔ اگر ہمیں حق کی پوری معرفت حاصل ہو جاتی تو ہم حق کے متلاشی نہ ہوتے بلکہ خدا سے واصل ہو جاتے کیوں کہ حق خدا ہے۔ لیکن چونکہ ہم محض متلاشی ہیں اس لیے تلاش حق میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی نارسائی کا احساس رکھتے ہیں اور جب ہم خود ناقص ہیں تو لازمی ہے کہ مذہب کا جو تصور ہم نے کیا ہے وہ بھی نامکمل ہو۔ ہم مذہب کی پوری پوری معرفت نہیں حاصل کر سکتے اسی طرح جیسے خدا کی نہیں کر سکتے۔"

ایک موقع پر مولانا الطاف حسین حالی کی "مناجات بیوہ" اور "برکھا رت" سن کر مولوی عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اگر آزاد ہندستان کی کوئی مشترکہ زبان ہو سکتی ہے تو یہی ہر نصیب زبان ہو سکتی ہے جس میں اردو ہندی کی گنگا جمنی موجود ہے۔ خود مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی میں ایسی ہی مشترکہ زبان "ہندستانی" کا تصور پیش کیا تھا اور اس کی ہمیشہ وکالت ہی کرتے رہے۔ گاندھی جی کی ہندستانی بھاشا کیا ہے خود انھیں کی زبانی سنیے۔

"ہندی، ہندستانی اور اردو شبد ایک ہی زبان کو ظاہر کرتے ہیں جسے اتر بھارت میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔"

(ہریجن سیوک ۳ر جولائی ۱۹۴۳ء)

ایک جگہ انھوں نے اس طرح فرمایا ہے :-

"ہندی اور اردو دو ندیاں ہیں اور ہندستانی ساگر ہے ان دونوں میں سے ہمیں کسی سے نفرت نہیں ہونی چاہیئے ہمیں تو دونوں کو اپنانا ہے۔ ہندستانی کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ وہ دونوں کو اپنا لے گی۔

(دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس میں ۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء کی تقریر سے)

ہندستانی زبان کے سلسلے میں انھوں نے آخر میں ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا وہ لکھتے ہیں۔

"کیا اردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کرکے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندستانی ہو گیا، کیا وہ ایک اکمل بھارتی بھاشا کی سیوا کر سکتے ہیں۔ اگر اردو لپی یا بھاشا کو اس سے نکال دیا جائے میں ہمیشہ تو تمھارے پاس رہوں گا نہیں مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے شبدوں کو یاد کروگے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہاتما گاندھی نے اتفاق و یک جہتی کے تحت ہندستانی زبان کا جو تصور پیش کیا تھا وہ ایک ایسا راستہ تھا جس میں اردو، ہندی دونوں کی بقا اور دونوں کے ارتقا اور فروغ کی راہیں موجود تھیں۔ ہمیں ہر ہر قدم پر مہاتما گاندھی اور ان کے اصول یاد آتے ہیں جن میں صلح کل کا راز اور ملک کی سالمیت اور تحفظ و بقا کے عناصر موجود ہیں۔ کاش ہم انھیں اپنی زندگی اور اپنے ملک کے نظام میں مشعل راہ بنا سکتے۔

★

شوکت پردیسی
جدہاں، جونپور

غزل

زندگی ہوتی جو مائل بہ کرم رات گئے
کیوں سسکتا کوئی آوارۂ غم رات گئے

تشنگی کہتی ہے اک جام ابھی اور پیوں
دل یہ کہتا ہے کہ بہکیں نہ قدم رات گئے

آئینہ خانۂ ہستی ہے منور جس سے
نظر آیا ہے وہ بادیدۂ نم رات گئے

دن تو کٹ جاتا ہے ہر جھوٹ کو سچ کہہ کے مگر
دل پہ گرتا ہے مرے کوہ الم رات گئے

درد ملتا ہے گلے جیسے کوئی بچھڑا رفیق
لوٹ کر آتے ہیں جب شہر سے ہم رات گئے

عظمت جبہ و دستار بنی راہ نما
گھر سے نکلا جو خریدار صنم رات گئے

کر سکا پھر نہ کوئی اس کو مکمل شوکت
وہ فسانہ جو کیا دل نے رقم رات گئے

وامق جونپوری
لال کوٹھی - کجگاؤں
جونپور

غزل

میں ایک طائرِ آوارہ اضطراب پسند
قفس دری تو کبھی بازیٔ عقاب پسند

ہر انقلاب نئے انقلاب کا ہے نقیب
مزاجِ وقت ہے کس درجہ انقلاب پسند

ہمارا ذوقِ تجسس صنم تراشی ہے
ہمیں ہے حسنِ پسِ پردۂ حجاب پسند

وہ پوچھتے ہیں سبب میری تلخ کامی کا
مگر نہ آئے گا ان کو مرا جواب پسند

اُلٹ کے آئنہ ہر بچہ دیکھتا ہے ضرور
سکونِ ذہن بھی ہے کتنا پیچ و تاب پسند

زمانہ لذتِ حرماں کا اس قدر خوگر
جو پورا ہو نہ کبھی اس کو ہے وہ خواب پسند

ہماری بادہ گساری ہے اک فریبِ اُمید
ہماری بادیہ پیمائی ہے سراب پسند

شرابیں جتنی ہیں سب اپنے وقت کی ہیں
تو کیا بتائیں کہ ہے کون سی شراب پسند

جو اس کو پڑھتے ہیں تفریح کے لئے وامق
کبھی نہ آئے گی ان کو مری کتاب پسند

ڈاکٹر نریش
ایوننگ کالج، پنجاب یونیورسٹی
چنڈی گڑھ

ہندوستانی رسوماتِ عروسی
اور ان کا
سماجی پس منظر

شادی کا موقع ہر قوم اور ہر سماج میں بڑا مبارک موقع مانا جاتا ہے لیکن اگر آپ ان رسومات پر غور کریں جو اس وقت ادا کی جاتی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ صدیوں کی مسافت کے بعد ہم تک پہنچنے والی یہ رسمیں قدیم سماج کی تاریخ اور اس کے تمدن کو آج بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ دراصل شادی کے ادارے کو ہی ابتدائی انسان کی دو ضرورتوں نے جنم دیا تھا۔ پہلی ضرورت تھی جسمانی ضرورت، جسے جماع کی خواہش کہا جا سکتا ہے۔ دوسری ضرورت تھی خانگی ضرورت، جسے اولاد کہا جا سکتا ہے۔ غیر مہذب معاشرے میں چونکہ عورت بھی مرد کی طرح اپنی جسمانی طاقت کے بل پر ہی زندہ رہا کرتی تھی، اس لیے وہ کسی بھی مرد کے ساتھ ہم بستری کرنے سے پہلے زچگی کے دوران کمزور پڑنے والے اپنے جسم کی اور پیدا ہونے والے بچے کی حفاظت کا یقین کرنا چاہتی تھی۔ اسی طرح غیر مہذب مرد اپنی اولاد کے لیے ابتدائی خوراک اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک مضبوط اور مربوط رشتے کا آرزومند ہوتا تھا۔ نتیجے کے طور پر 'شادی' کی متعدد صورتیں وجود میں آنا شروع ہوئیں۔ تہذیب یافتہ سماج نے اس نسبت پر دھرم کی مہر لگا کر اسے رسموں اور رواجوں کے بندھنوں میں جکڑ دیا تاکہ دو جسموں کا یہ تعلق پائیدار ہو سکے۔

رسم فرس نشینی

شادی کے موقع پر گھوڑی چڑھنے کی رسم درحقیقت ہندِ قدیم کی اس رسم کی یادگار ہے جسے منو نے "راکشس" بیاہ کا نام دیا تھا۔ دورِ حاضر کی یہ مقبولِ عام رسم جسے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، اصل میں ہمارے موجودہ مہذب معاشرے تک ہماری بے خیالی سے ہی چلی آ رہی ہے، ورنہ تہذیب یافتہ معاشرے میں عفریت جیسی معیوب رسم کا مروّج رہنا ممکن نہیں تھا۔ فرس نشینی کی رسم کا تعلق اس دور سے ہے جب دولہا اپنے زورِ بازو سے تلوار کی طاقت سے لڑکی اٹھا کر لایا کرتا تھا۔ منو نے اسی لیے اسے جنیت سے مامور کیا ہے کیونکہ ان کے مطابق جب لڑکی والوں کو مار پیٹ کر زخمی کر کے زبردستی لڑکی اٹھا لائی جاتی ہے اور اسے بیوی کے طور پر رکھ لیا جاتا ہے تو عفریتی شادی یعنی راکشس وواہ ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں نوشہ کا گھوڑی پر سوار ہونا، تلوار پکڑنا، سہرا باندھنا، بارات لے کر چلنا اور دلہن کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تلوار سے چراغ بجھانا جیسی رسموں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ فرس نشینی کی یہ رسم اور کچھ نہیں بلکہ عفریتی شادی کی تبدیل شدہ ایک صورت ہی ہے۔

قدیم ادب میں اگرچہ فرس نشینی کا ذکر نہیں ملتا لیکن عفریتی شادی کی دستیاب تفصیلات سے واضح ہو جاتا ہے کہ دولہا گھوڑی یا گھوڑے پر سوار ہو کر ہی دلہن کو لینے نکلتا تھا۔ ویدوں کے زمانے میں وِمد اور پورومتر کی شادی عفریتی طریقہ ہی سے ہوئی تھی۔ مہابھارت کے زمانے میں کورو شہزادوں کے لیے بھیشم پتامہ اسی طریقے سے بیویوں کا انتظام کرتے ہیں۔ راجپوتوں کے زمانے میں اسی طریقے سے پرتھوی راج سنجوگتا سے شادی کرتا ہے

موجودہ وقتوں میں گھوڑی چڑھنے سے پہلے نوشہ کو نہلا دھلا کر خوبصورت لباس پہنایا جاتا ہے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب کی موجودگی میں دستار پہن کر سہرا باندھتا ہے۔ سہرا باندھنے سے پہلے اس کے ماتھے پر افشاں باندھا جاتا ہے جو حفاظت جنہ کی ایک صورت ہوتا ہے۔ سہرے سے چھپا چہرہ اچھی روشنی ہی کی طرح ہے جو جی زبان میں کھو فلا جاتا۔ کہا جا سکتا ہے۔ عزیز و اقارب پر مشتمل بارات بھی دراصل فوج تھی جو اکٹھی تھی جو نوشہ کی امداد کے لیے ساتھ جاتی تھی۔ اب چونکہ عفریتی شادی مفقود ہو چکی ہے اس لیے اس موقع پر سہرا اور بارات محض خوشی کی علامتیں ہو گئی ہیں۔

سہرا باندھ کر نوشہ تلوار رکھتا ہے اور اس کی بہنیں گھوڑی کے بال گوندھتی ہیں۔ یہ رسم گھوڑی کے بناؤ سنگار کی علامت ہے۔ چلنے سے پہلے گھوڑی کو دانہ کھلایا جاتا ہے کہ کہیں بھوک کی وجہ سے اس کی رفتار سست نہ پڑ جائے۔ فرس نشینی کے بعد دولہا اس وقت تک گھر لوٹ کر نہیں آتا جب تک دلہن نہ لے آئے۔ اس کی والدہ فرس نشین بیٹے کی پیٹھ دیکھنے کے بعد تب تک اس کے منہ کی طرف نہیں دیکھتی تھی جب تک وہ دلہن نہیں لے آتا تھا۔ آج کل بھی اگر اس شہر کے راستے میں جہاں بارات کو جانا ہوتا ہے کوئی دریا پڑتا ہو تو بارات اگلی صبح روانہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں فرس نشینی کی رات دولہا اپنے گھر پر ٹھہرنے کے بجائے کسی دوسرے مقام پر ٹھہرتا ہے۔

مہذب معاشرے میں جب اس عفریتی رسم کو خوشی کی علامت کے طور پر مروج رکھا گیا اور اس پر دھرم کی چھاپ لگائی گئی تو اس رسم کے ساتھ ایک اور ریت بھی جڑ گئی۔ وہ یہ کہ دولہے کے ساتھ اس کا کوئی عزیز بچہ بھی گھوڑی پر بیٹھنے لگا اسے شہ بالا یا سربالا کہتے ہیں۔ اس ریت کی ابتدا میں بھی اگلے بچے کو ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار کرنے اور اس کے رسومات عروسی کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا منشا رہا ہوگا۔ پر زمانہ میں یہ ریت بھی رسم فرس نشینی کا ایک جز و تکلف بن کر رہ گئی ہے۔ شادی سے متعلق دیگر رسومات میں شہ بالا کا کوئی مقام نہیں ہے۔

موجودہ معاشرے کے تہذیب یافتہ ہونے کے باوجود گھوڑی پر سوار ہوا دولھا، دلھن کے گھر پہنچ کر بعض ایسی رسمیں ادا کرتا ہے جن کی بنیاد میں قدیم غیر مہذب رسموں کے بیج موجود ہیں۔ گونڈوں میں شادی کی آخری رسم یہ ہے کہ دلہن شادی کے منڈپ سے اٹھ کر بھاگتی ہے اور دولھا اس کے پیچھے بھاگ کر اسے پکڑتا ہے۔ پنجابی سماج میں شادی کے بعد چھڑیوں کا کھیل، یعنی ڈنڈے کے زور سے بیوی لانے کی ہی علامت ہے۔ ایسے طویل تاریخی پس منظر کے باوجود رسم فرس نشینی نے عصر حاضر میں خوشی کی علامت بن کر نئے معانی حاصل کر لیے ہیں۔ باجے گاجے کے ساتھ ناچتے گاتے ہوئے دوست احباب، رشتہ دار اس موقع پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے اجتماعی لاشعور سے وابستگی کے باعث یہ رسم بہت مقبول ہے۔

رسم خانہ آبادی

قدیم زمانے میں آٹھ قسم کی شادیاں مروج تھیں شیطانی (پیشاچ) دھوکے سے بہلا پھسلا کر یا سوتے میں لڑکی اٹھا کر لانا اور اسے بیوی بنا لینا۔ عفریتی (راکشس) تلوار کے زور سے لڑکی اٹھا لانا۔ شعاعی (گاندھرو) لڑکی کی رضامندی سے مگر اس کے والدین کی رضامندی کے بغیر بیاہ کرنا؛ خاقانی (آسر) قیمت ادا کر کے بیوی لانا؛ مرتاضی (آرش) بیوی کا مول تول کرنا لیکن شادی پر ہونے والے اخراجات کی ادائیگی کر کے بیوی لانا، ملکی (دیو) بیوی کے علاوہ چند خادماؤں کو ساتھ لانا اور انھیں داشتہ کے طور پر رکھنا؛ ربانی (پراجاپتیہ) لڑکی کے والد کا خود اس کے لیے شوہر تلاش کر کے اسے بیٹی دینا؛ خدائی (براہم) لڑکی کے والد کا اپنے ہاتھوں جہیز دے کر بیٹی کو رخصت کرنا۔

صدیوں کی مسافت کے بعد شادی کی جو قسم ہمارے موجود

معاشرے تک پہنچی ہے، وہ ہے ہندوانی شادی۔ مذہبی، تمدنی اور ثقافتی رسم و رواج سے لدی ہوئی یہ رسم خانہ آبادی ایسی ریتوں سے آراستہ ہے کہ ہر ریت ایک علامت بنی ہوئی ہے۔ ذہنی ارتقا کے اس دور میں اگرچہ یہ ریتیں مذاق معلوم ہوتی ہیں لیکن ہمارے معاشرے کے ذہن میں ان کی تقدیس کا تصور اس قدر گہرا ہے کہ وہ انھیں ادا کیے بغیر شادی کی رسم کو مکمل سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ رسم خانہ آبادی کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سے طے شدہ دن کے مطابق دولہا دولہن کے گھر پہنچتا ہے جہاں شادی کا منڈپ تیار ہوتا ہے۔ منڈپ میں بیٹھ کر وہ دیوتاؤں اور آگ کی پوجا کرتا ہے۔ اسی آگ کو گواہ بنا کر وہ دلہن کے والد سے اس کی لڑکی کا ہاتھ قبول کرتا ہے۔ چار بار دلہن کے ساتھ آگ کا طواف کر کے وہ دلہن کو اپنی بیوی بنانے کی پیش کش کرتا ہے۔ اسے 'چار لاما' یا پھیرے کہتے ہیں، دلہن جو ابھی تک اس کی دائیں طرف بیٹھی ہوتی ہے، دولہا کی پیش کش کو قبول کرنے سے پہلے اس سے سات وعدے لیتی ہے۔ اسے سپتپدی کہتے ہیں۔ ان عہدوں کے ذریعہ سے وہ اس سے اقرار کراتی ہے کہ وہ اس کی رضامندی کے بغیر کوئی یگیہ نہیں کرے گا، مقدس مقامات کا سفر نہیں کرے گا، دولت کو خرچ نہیں کرے گا، نفع عام کے سائل کنواں اور تالاب بنوانا وغیرہ کی تعمیر نہیں کرے گا، مویشی نہیں خریدے گا، کوئی موسمی کھیل نہیں کھیلے گا، دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اسے سخت و سست نہیں کہے گا اور کسی دوسری عورت سے جنسی تعلق نہیں رکھے گا۔ اس طرح ہندو عورت بجائے مرد کی غلامی قبول کرنے کے اس کی شریک حیات (اردھانگنی) بننا قبول کرتی ہے۔ ان شرائط کو قبول کر کے دولہا بھی اپنی پانچ شرطیں دلہن سے منواتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسے اعلیٰ (دشنو روپ) تصور کرے گی، اس کی رضامندی کے بغیر کھانے پینے یا پہننے میں اپنی مرضی سے کام نہیں لے گی، اپنے اعلیٰ کردار سے دونوں خاندانوں کا نام روشن کرے گی، شوہر کے والدین اور دیگر اہل خاندان کی خدمت کرے گی، اور اس کی بیوی بن کر صدق و شرافت سے رہے گی، اس طریقہ سے مرد بہت ہوشیاری سے عورت پر برتری حاصل کرتا ہے۔

دولہا اور دلہن جب ایک دوسرے کی شرطیں قبول کر لیتے ہیں تو دلہن اپنی جگہ سے اٹھ کر دولہا کی بائیں طرف بیٹھ جاتی ہے۔ شرطیں قبول کرنا اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آریوں کے معاشرے میں ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کو برابر کا درجہ حاصل تھا چونکہ دونوں کی رضامندی، محبت اور یگانگت کے بغیر ازدواجی گاڑی نہیں چل پاتی ہے اس لیے دلہن کے دولہا کی بائیں طرف آنے پر رسم خانہ آبادی مکمل ہو جاتی ہے۔

رسم جہیز

جب سے مہذب معاشرے نے شادی کے 'براہم وِیہ' کو قبول کیا ہے تب سے ہی شادی کے موقع پر لڑکی کو جہیز دینے کی رسم بھی رائج ہوئی ہے۔ اولین قانون ساز منو نے آبائی جائداد میں بیٹی کا حصہ اس طرح متعین کیا تھا کہ بیٹے کے حصے کا ایک چوتھائی بیٹی کو جہیز میں دیا جائے۔ شادی کے بعد لڑکی کا آبائی جائیداد میں کوئی حق یا حصہ نہیں رہتا تھا۔ منو کا بنایا ہوا یہ قانون ہندو سماج میں شادی کی ایک اہم رسم بن گیا جسے مختلف علاقوں میں کھاپنی داج، دہیز وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اسی رسم کا ایک مقبول عام نام ہے 'کھٹ دان'۔ اگرچہ رگ وید میں سوم اور سوریا کی شادی کے بیان میں جہیز دینے کا ذکر ہوا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کھٹ دان کی موجودہ رسم ویدوں جتنی پرانی نہیں ہے۔ یہ رسم مہذب معاشرے کے ترقی یافتہ عہد میں شروع ہوئی ہوگی۔

لفظ کھٹ کھاٹ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ شادی کے موقع پر لڑکی کے والدین جو کچھ اپنی بیٹی کو دینا چاہتے تھے، اس سامان کو کھاٹ پر بچھا دیتے تھے، دولہا اور دلہن اس سامان

کا پھیلا لگا کر اسے قبول کرتے تھے۔ ڈولی میں رکھ کر سامان بھیجنے کے باعث اسے جہانی کہا گیا۔ آگے چل کر ایک اور ریت اس سے منسلک ہو گئی کہ جہیز کے سامان کے علاوہ ایک تھالی میں کچھ روپے پیسے رکھ کر لڑکی کا باپ لڑکے کے باپ کو دیتا تھا۔ لڑکے کا باپ تعظیماً تھالی کو سر پر رکھ لیتا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس نے جہیز بخوشی قبول کیا۔ اسے 'دات' کہا جاتا ہے اس ریت نے روپے یا نقدی کو ہی جہیز کی علامت بنا دیا۔ موجودہ وقتوں میں تھالی دینے کی رسم تو متعدد علاقوں میں رائج ہے لیکن کھاٹ پر جہیز بچھانے کی رسم تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ آج کل جہیز میں دیے جانے والے صوفے یا ڈبل بیڈ پر ہی دولہا دلہن کو بٹھا کر یہ رسم ادا کر دی جاتی ہے۔

کھاٹ لفظ کو ایک اور معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے وہ ہے کھٹنا یعنی کمائی۔ مہذب سماج نے جہیز کو لڑکی کے والدین پر بار بنا کے رکھ دیا ہے، سے لڑکی کی کمائی کہنا زیادہ مناسب سمجھا ہوگا غرض یہ کہ جو کچھ بطور جہیز لڑکی کو دیا جا رہا ہے اس میں تو احسان کا جذبہ شامل ہے اور نہ اسے تاوان سمجھ کر دیا جا رہا ہے بلکہ اسے لڑکی نے اپنی شادی کے ساتھ اپنے قدرتی حق کے طور پر حاصل کیا ہے۔ یہاں کھاٹ لفظ کا استعمال دو پہلوؤں سے اہم ہو جاتا ہے۔ اول یہ کہ شادی کا ارادہ ہی آدمی کی جماعی حس اور خواہش اولاد سے وابستہ ہے۔ اس کی سیدھی سادی علامت کھاٹ ہی بنتی ہے۔ موجودہ وقتوں میں بھی جہیز کے سامان میں ڈبل بیڈ یا دو بستروں کا دیا جانا اسی علامتی معنی کی طرف اشارا کرتا ہے۔ دوسرا پہلو ہے سماجی اعلان کا۔ کھاٹ پر بچھے جہیز کے سامان کو (تعظیماً زمین سے اونچا رکھ کر) ملا دے کر برادری کو دکھایا جاتا تھا تاکہ سماج کو یہ معلوم ہو جائے کہ لڑکی کو اس کا حصہ دے دیا گیا ہے۔

جہیز سے متعلق ریتوں میں ایک اور ریت بھی شامل ہے دھان بونے کی رسم جس وقت دولہا دلہن جہیز کے پھیرے لگا رہے ہوتے ہیں اس وقت ان پر دھان چاول یا کھیلیں ساری جاتی ہیں۔ اسے "دھان بونا" کہتے ہیں۔ اس ریت کی بنیاد میں بھی دو باتیں زیر غور ہیں۔ پہلی یہ کہ دھان بونا اولاد پیدا کرنے کی علامت ہے اور دوسری یہ کہ لڑکی کو وداع کرنے کے بعد بھی اس کے والدین اپنی خوشحالی کا ثبوت دیتے رہیں۔

اب چونکہ ہندو کوڈ بل میں ترمیم کے مطابق شادی کے بعد بھی بیٹی اپنے باپ کی جائیداد میں حصہ دار رہتی ہے اس لیے جہیز کی رسم سماج سے اٹھتی جا رہی ہے۔ جہیز مخالف تحریک سے اس رسم کا چلن بہت کم ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب جہیز کی نمائش نہیں کی جاتی بلکہ مخفی طور پر دیا جاتا ہے۔ رسم جہیز کی ادائیگی میں لڑکی کا باپ لڑکے کے باپ کو اس سامان کی فہرست پکڑا دیتا ہے جو جہیز میں شامل ہوتا ہے۔

مظفر ہاشمی

نوہسینا ل

۲/۶ زیارت خرے والی۔ سلم پور

کوئی کہتا ہے اک مفکر تھا
نغز گو خوش بیان شاعر تھا
حق نگر، حق نظر، مبصر تھا
اور ادب عالیہ کا ماہر تھا
کوئی کہتا ہے اک ادیب تھا وہ
اک مقرر تھا اک خطیب تھا وہ
سب کا محبوب اک حبیب تھا وہ
نبض غالبؔ کا اک طبیب تھا وہ
کوئی کہتا ہے ایک ناقد تھا
طلب علم و فن کا قائد تھا
عارف و حق شناس عابد تھا
ہمہ اوصاف فرد واحد تھا
میں یہ کہتا ہوں ایک انسان تھا
اور انسانیت کا پیکر تھا
ایسا انسان مر نہیں سکتا
وہ کتابوں کی اوٹ میں گم تھا

ڈاکٹر گوپال مغموم
۹۶ گلشن روڈ، فیرفیلڈ
نیو جرسی، ۰۷۰۰۴، امریکہ

احسان دانش کی یاد میں

دانش کے والدین تھے نادار و خستہ حال
وہ آپ ہمتی تھا، بڑا ہوشیار تھا

اسکول کے بھی درجے مکمل نہ کر سکا
روٹی کی فکر میں اسے جینا بھی بار تھا

گارا بنایا، اینٹیں بھی ڈھوئیں کئی برس
محنت کشی پہ زیست کا دار و مدار تھا

پانی بھرا کہیں، تو کہیں چوکیداری کی
ادنیٰ سے کام کرنے میں کب اس کو عار تھا

حق حلال اس کی کمائی جو تھی تو پھر
وہ خود بھی لائق کرم کردگار تھا

وہ کاندھلہ کو چھوڑ کے لاہور جا بسا
یہ شہر بے نظیر اسے سازگار تھا

لاہور اُن دنوں تھا بڑا مرکز ادب
شعر و سخن میں منتخب روزگار تھا

چھوٹی سی اک شکست دکان کتابوں کی کھول لی
چھوٹا سا ابتدا میں یہی کاروبار تھا

دن رات اب کتابیں نفیس زیر مطالعہ
دن رات فکر شعر اب اس کا شعار تھا

علامہ تاجور سے کیا اکتساب فیض
وہ صدق دل سے ان کا عقیدت گزار تھا

علم و ادب میں دسترس خاص ہو گئی
حاصل ہر انجمن کا اُسے اعتبار تھا

آواز دل نشیں میں تھا اس کی بلا کا سوز
ہر ایک بزم شعر میں وہ نغمہ بار تھا

مزدور پہ کسان پہ، ہر دردمند پر
ہر شعر نظم درد کا آئینہ دار تھا

تاریک رخ جو دیکھے ہوئے تھا حیات کا
ہر ایک غم نصیب کا وہ غمگسار تھا

مفلس کی عید پر تھی کبھی نظم بے پناہ
جس نے سنی وہ نظم، وہی اشکبار تھا

ہر اک مشاعرے میں تھا مقبول خاص و عام
وہ شاعروں کی صف میں بڑا باوقار تھا

غزلیں کہیں بہت سی تو قطعات بھی کہے
اس کا کلام واقعی پایہ دار تھا

کتنی ہی چھاپ ڈالیں تصانیف نظم و نثر
فضل و کمال علم کی وہ یادگار تھا

محنت سے اپنی شعر میں کیا نام کر گیا
کیا خوب اس کا کلام تھا، کیا کاروبار تھا

اللہ مغفرت کرے اس نیک نام کی
وہ مرد حق پرست و عبادت گزار تھا

مغموم! اس کی یاد میں مغموم میں بھی ہوں
انسانیت کی بزم کا وہ شاہکار تھا

ڈاکٹر آفتاب احمد
۴۲/۱ بی پی ڈبلیو ڈی ہاؤسنگ کالونی ناگپور

مجنوں گورکھپوری کا تنقیدی نظریہ

اردو میں تنقید نگاری کی ابتدا بڑی تاخیر سے ہوئی۔ اس کمی کا اعتراف مختلف ناقدین نے مختلف پیرایوں میں کیا ہے۔ کسی نے اس کم مائیگی کا مذاق اڑایا ہے تو کسی نے ہمدردانہ انداز میں اس کمی کا احساس دلایا ہے۔ کلیم الدین احمد کا یہ جارحانہ جملہ "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے" کے ضبط تحریر میں آنے سے کافی قبل امداد امام اثر نے اپنی کتاب کاشف الحقائق میں لکھا ہے کہ

"وہ فن جسے انگریزی میں (CRITICISM) کہتے ہیں اردو اور فارسی تذکروں میں مفقود ہے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں تنقید کی داغ بیل بڑی تاخیر سے پڑی۔ اس کمی کا ذکر چاہے کلیم صاحب کی طرح جارحانہ انداز میں کیا جائے یا اثر صاحب کی طرح پرخلوص انداز میں، اس سے اس کی صداقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ درحقیقت اردو میں تذکرہ نگاری ایک حد تک تنقید کی کمی کو پورا کرتی رہی ہے۔ لیکن تذکرہ نگاروں کے انداز نقد کی نوعیت کچھ اور ہی تھی۔ تذکرہ نگار حضرات جب کسی شعری تخلیق پر اظہار خیال کرتے تو ان کی رائے بڑی حد تک ان کے تاثرات یا تعصبات پر مبنی ہوتی۔ اگر تذکرہ نگار کو کوئی تخلیق پسند آ جاتی تو وہ اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ اس کے برعکس اگر وہ عیب جوئی پر اتر آتا تو پھر مبالغہ، غلو اور اغراق کی تمام صنعتیں شعر ہی میں استعمال کر بیٹھتا۔

حالی کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو کو تنقید سے روشناس کرایا۔ حالی کے بعد اردو تنقید نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ ایک جانب تو تنقید کا رخ استدلال کی طرف موڑا گیا اور دوسری جانب مغرب سے استفادہ پر زور دیا گیا۔ گزشتہ نصف صدی میں اردو تنقید نے اپنا ارتقائی سفر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ طے کیا ہے۔ اب اردو کے ناقدین تجزیہ اور تنقید کے فن سے مکمل طور پر واقف ہو چکے ہیں۔ ادب کی جو نئی جہتیں سامنے آئی ہیں اس کی روشنی میں ہمارے ناقدین ادب کو مقامی رنگ و آہنگ کے پس منظر میں پرکھنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی اس کا تجزیہ کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

مغرب سے استفادہ کرنے والے ناقدین میں مجنوں گورکھپوری کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مجنوں نے اپنی تنقیدی نگارشات کو مغرب کے مختلف رجحانات و اسالیب سے مزین کیا اور ایسے خیالات و نظریات پیش کیے جو اردو تنقید کی تاریخ میں اہم گوشوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجنوں نے جہاں مغربی خیالات و افکار سے استفادہ کیا وہیں انھوں نے مشرقی خیالات سے بھی خاطر خواہ فیض حاصل کیا۔ ایسی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجنوں نے مشرقی اور مغربی

خیالات و افکار کے امتزاج سے اپنے تنقیدی نظریے کی تشکیل کی۔
مجنوں گورکھپوری کا ذہن بنیادی طور پر رومانی ہے جس کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں ہمیں صاف نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کی تنقید کی عمارت کی بنیاد رومانیت اور حقیقت پسندی کا امتزاج ہے۔ اگر ایک جانب مجنوں اپنے فطری میلان کے باعث تخیل پسند ہیں تو دوسری جانب وہ مارکس اور اینجلس جیسے مفکرین سے متاثر ہو کر حقیقت پسند نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں رومانی عناصر کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا تصور بھی اجاگر ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ دونوں صورتیں تضاد پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن مجنوں ان دونوں اسکولوں میں سے کسی سے مستقلاً وابستہ نہیں رہنا چاہتے۔ نتیجتاً وہ کروچے کے نظریہ جمالیات پر بھی زور دیتے ہیں اور مارکس کے نظریہ اشتراکیت پر بھی۔ درحقیقت مجنوں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادب میں زندگی کا عکس موجود ہے لیکن تخلیق کار کی گرفت فن پر بھی مضبوط ہے۔ درحقیقت ادب میں جمالیات کا وجود لازمی ہے۔ ورنہ محض زندگی کی تصویر کشی ادب کو خشک بے کیف بنا دے گی۔ مجنوں نے اپنی تنقید میں اسی کلیدی نکتہ کی وضاحت کی ہے۔

مجنوں اپنے تنقیدی نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اینجلس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مصنف کا مقصد جس قدر پوشیدہ ہوگا فنی لحاظ سے اس کا کارنامہ اتنا ہی بلند دارفع ہوگا۔ گویا مجنوں ادب میں مقصدیت کو برا نہیں تصور کرتے ہیں۔ لیکن وہ فن کا مقصد پر قربان کرنے کے مخالف ضرور ہیں۔ ادب میں مقصدیت کے بارے میں مجنوں کا ذہن صاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر مقصدیت ادب یا کسی دوسری صنف فنکاری کا معیار قرار دے دیا جائے تو بنا فو کی غزلیات اور ہومر کے رزم ناموں سے لے کر اب تک کی ۹۹ فیصدی تخلیقات کو فضول و بیکار سمجھ کر نذر آتش کر دینا پڑے گا۔ اس لیے کہ ادب کی غایت یہ ہے کہ وہ انسان کے کردار سے منفی رجحانات سلب کر دے اور معصومیت کے ساتھ زندگی کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔"

یہاں مجنوں نے ادب کے مزاج و اسلوب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ادبی تخلیق کا طریقۂ اظہار فنی خوبیوں سے مملو نہ ہو تو وہ ادب سے رشتہ توڑ کر صحافت کی صف میں چلی جائے گی۔ اپنے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ادب میں بناوٹ کا حسن یا اسلوب کا حسن اہم ترین امر ہے۔ یعنی یہ ہے کہ مشتملات جس انداز میں پیش کیے گئے ہیں اس انداز میں حسن کاری کتنی ہے۔ اس میں جمالیاتی احساس کا عنصر کتنا ہے۔ اس لیے کہ جمالیات ادب کی جان ہے اور اس کی اپنی ایک شریعت ہے جو دوسرے تمام اصول و ضوابط پر مقدم ہے۔"

مندرجہ بالا سطور میں مجنوں نے ادب میں حسن کاری کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ مجنوں جمالیاتی احساس کو ادب کی جان بتاتے ہوئے جمالیات کو تمام اصول و ضوابط پر مقدم گردانتے ہیں لیکن جب مجنوں مارکس کے فلسفہ سے اثر قبول کرتے ہیں تو وہ کچھ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے ان کے اپنے رجحان پر ضرب کاری لگتی ہے۔ مجنوں ایک طرف تو حسن کاری اور جمالیاتی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں اور دوسری طرف موضوعات کی جڑیں سماجی مسائل سے آب و گل میں تلاش کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں مجنوں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

"ادب کا مقصد یہ ہے کہ اس کے اثر سے انسان بغیر وعظ و تبلیغ کے خود بخود پہلے سے زیادہ مہذب، زیادہ شریف اور زیادہ نیک ہوتا جائے۔ فنکاری بالخصوص ادب انسان کے کردار سے نفس پرستی، خود غرضی، حسد، کینہ، مکاری، عیاری ۔۔۔ رکیک میلانات کو سلب کرتا ہے۔"

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجنوں ادب کے بجائے مذہب کا مقصد بیان کر گئے ہیں۔ مذکورہ سطور میں مجنوں نے ادب کا جو مقصد بیان کیا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ ادب کا مقصد نشاط و انبساط بخشنا ہے۔ انسان کے منفی

رجحانات کو سلب کرنا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ رو میں بہہ کر مجنوں رومانیت کو انسانی تمدن کے لیے خطرہ کہہ جاتے ہیں۔

حالانکہ رومانیت ہمیشہ ادب میں بڑی اہم شے تصور کی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ورڈزورتھ، کیٹس اور دیگر رومانی شعراء کو عالمگیر شہرت نصیب نہ ہوتی۔

مجنوں ادب میں مقصد کی اہمیت جتاتے ہوئے اپنے اس نظریہ کی تردید کر جاتے ہیں جس میں انھوں نے جمالیات کو تمام اصول و ضوابط پر مقدم بتایا ہے۔ غرض کہ خیالات کے تصادم سے مجنوں کے نظریہ ادب میں ایک تضاد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مجنوں کے اس انداز فکر و نظر پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ مجنوں کی تنقید افراط و تفریط کا شکار ہے۔ مجنوں ایک جانب تو جمالیات پر زور دیتے ہیں، اور دوسری جانب مارکس کے نظریہ کی حمایت کرتے ہیں۔

اگر ہم مجنوں کے خیالات کا ہمدردی سے جائزہ لیں تو یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مجنوں درحقیقت یہ چاہتے ہیں کہ وہ رومانیت اور حقیقت کے مابین ایک رشتہ قائم کریں جو اعتدال پر مبنی ہو۔ مجنوں پروپیگنڈہ قسم کے ادب کو پسند نہیں کرتے۔ پھر مجنوں کا یہ خیال بھی باوزن نظر آتا ہے کہ زندگی کے مسائل کو فنکارانہ طور سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

مجنوں نے اپنی کتاب ادب اور زندگی میں چند مضامین ادب اور مقصد اور ادب اور زندگی وغیرہ ایک خاص مقصد کے تحت لکھے تھے۔ ان مضامین میں انھوں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ ادب کا کام زندگی آمیزی اور زندگی آموزی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی فن کار محض حسن کو نقطۂ نظر بنا کر ادب کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا۔ اس تصور کی روشنی میں مجنوں مارکس اور اینجلس کے بہت قریب نظر آتے ہیں لیکن جب مجنوں کا مقالہ حسن اور حسن کاری ہمارے سامنے آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجنوں انتہا پسند اور ترقی پسند نہیں ہیں۔ بلکہ انھوں نے حقیقت پسندی کو ایک اعتبار سے محدود کرنا چاہا ہے۔

مجنوں زندگی آمیزی اور زندگی آموزی کے مرحلے میں جمالیاتی احساس کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ مجنوں کے مطابق ادب انسان کے جملہ مادی اور غیر مادی تاثرات کا نتیجہ ہے اور اس کے تمام عملی اور فکری حرکات اور سکنات کا ماحصل ہے۔ گویا کہ ادب نہ تو خارجی حالات سے ماورا ہے اور نہ مقصد و غایت سے بے نیاز لیکن مجنوں جہاں مقصدی ادب پر زور دیتے ہیں وہاں جمالیاتی احساس کی طرف بھی مبہم اشارے کرتے ہیں۔ مجنوں کا خیال ہے کہ ادب کسی حد تک وسیلۂ نشر و اشاعت کا کام کرتا ہے۔ لیکن یہ نشر و اشاعت نمایاں نہیں بلکہ پنہاں ہوتی ہے۔ اگر یہ نمایاں ہو گئی تو صحافت کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے اور صحافتی تحریر کسی حال میں بھی ادب کا درجہ نہیں پا سکتی۔ چنانچہ مجنوں واقعیت اور رومانیت میں تال میل قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی کے امتزاج سے ادب کے نقش و نگار کو تابناک بنانا چاہتے ہیں۔ مجنوں نے اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے:

"کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ بھی ہو اور مستقبل کا اشاریہ بھی جس میں جذباتیت و واقعیت ہوتی ہے، جو افادیت اور جمالیات سے ہم آہنگ ہوتا اور جس میں اجتماعیت اور انفرادیت کا ادغام ہوتا ہے۔ ایسا ادب ہمارے ذوق حسن اور ذوق عمل دونوں کو متاثر کرتا ہے۔"

درحقیقت مجنوں کا یہی سلجھا ہوا نظریہ انھیں دوسرے ناقدین سے ممتاز کرتا ہے۔ مجنوں ادب میں مقصد کی اہمیت کا احساس تو دلاتے ہیں لیکن جمالیاتی احساس کی اہمیت بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ اگرچہ کہیں کہیں مجنوں پر مارکسی نظریات حد درجہ غالب آ جاتے ہیں تاہم بنیادی طور پر انھوں نے حقیقت اور رومان کے سنگم سے اپنے تنقیدی نظریہ کی تشکیل کی ہے یعنی بہ الفاظ دیگر مجنوں کا نظریۂ ادب حقیقت اور رومان کے توازن اور اعتدال کا حامل ہے اور یہی ان کی تنقید کا طرۂ امتیاز ہے۔

★

ہندوستاں ہمارا

جہاں کا گوشہ گوشہ والا ہمارا
ہر دور میں رہا ہے یہ شانیاں ہمارا
ہر اس کے ماہ و انجم یہ آسماں ہمارا
"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا"

جب بات ہو وطن کی پھر اختلاف کیسا
اس مرکزِ نظر پر ہوتے ہیں ذہن یک جا
قوموں کا، ملتوں کا تسبیح جیسا رشتہ
"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

دشمن کی یورشوں سے ہم کو بچانے والا
رفعت کی اک علامت، عظمت کا استعارہ
وہ تاج برف سر پر رکھے ہوئے ہمالہ
"پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا"

کیا جگمگاتے تارے ٹوٹے ہیں آسماں سے
کیا تیز رو مسافر بچھڑے ہیں کارواں سے
کردار کھو گئے ہیں کتنوں کے داستاں سے
"یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا"

گونجا تھا ایک نغمہ، وہ دن ہے یاد تجھ کو
پھیلا تھا اک اجالا، وہ دن ہے یاد تجھ کو
لائے تھے اک سندیسا، وہ دن ہے یاد تجھ کو
"اے آبِ رودِ گنگا، وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا"

ہر سمت سے اٹھا ہے طوفان سنگباری
ہر گام پر ہوئی ہے کیا کیا ذرہ خستہ کاری
تہذیب کا ہماری، لیکن سفر ہے جاری
"کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا"

کیا حسن ڈھونڈتے ہو پیرایۂ بیاں میں
کیا لطف رہ گیا ہے اب اپنی داستاں میں
کیا حال دل سنائیں ہم بزمِ دوستاں میں
"اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا"

محمد اسحاق صدیقی
۵۔اے۔ گوئن تالاب لکھنؤ

ہاتھی اٹھا لیجانیوالا پرند

رُخ



رُخ کے بارے میں ہماری معلومات کا خاص ذریعہ الف لیلہ ہے۔ سندباد جہازی اپنے دوسرے سفر کے دوران ایک ویران جزیرے میں پہنچا۔ جب وہ کھا پی کر سو رہا تھا تو جہاز روانہ ہو گیا۔ تنہائی میں اُس پر کیا گزری۔ خود اُس کی زبان سے سنیئے :۔

"آخر خدا کو یاد کر کے اٹھا، لیکن سخت متحیر کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں، کیونکہ سوا پانی اور آسمان کے ہر چہار طرف کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بعد دیر کے خشکی میں ایک چیز بہت بلند و سفید دُور سے مجھے دکھائی دی۔ میں اس شے کی طرف روانہ ہوا۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا کہ وہ بطور گنبد کے گول اور بڑی ایک شے ہے اور چھونے سے بہت چکنی اور پھسلنی معلوم ہوئی۔ پھر میں گرد اُس گنبد کے پھرا کہ شاید دروازہ نظر پڑے، مگر وہ چاروں طرف سے بند تھا اور دور اس کے قریب پچاس قدم کے تھا۔ اتنے میں آفتاب قریب غروب کے ہوا۔ ہر چہار طرف تاریکی معلوم ہونے لگی میں سخت حیران ہوا۔ اور ایک چڑیا کو کہ بہت بڑی تھی دیکھ کر زیادہ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ میری جانب کو اڑتی آتی تھی۔ اس وقت مجھے جہازیوں کا کہنا یاد پڑا کہ ایک چڑیا رُخ نامی بہت بڑی ہوتی ہے۔ ہندی میں اسے گرڑ کہتے ہیں۔ میں نے قیاس کیا کہ یہ گول سفید شے گنبد نما اس کا انڈا ہے۔ آخر سوچنا میرا صحیح ہوا۔ وہ چڑیا انڈا سینے کے واسطے وہاں آئی تھی اور وہ گنبد اس کا انڈا تھا۔ ایک پنجہ اس کا میرے پاس آکر پڑا۔ ہر ناخن اس کا مانند بہت بڑے درخت کی جڑ کے تھا۔ میں نے اپنے تئیں اُس کے ناخن میں پگڑی سے خوب مضبوط باندھا اور خیال کیا کہ کل جس وقت یہ رُخ یہاں سے اڑے گا، مجھے کسی طرف لے جائے گا۔

غرض دوسرے دن وہ وہاں سے اڑ کر اس قدر بلند ہوا کہ زمین مجھے مطلقاً دکھائی نہ دیتی تھی۔ پھر وہ ایک ہی لمحہ میں کسی صحرا کی طرف جا کر اترا۔ میں جلد اُس کے پاؤں سے الگ ہوا۔ وہ ایک بڑے اژدہے پر جا گرا اور اپنی چونچ میں داب کر لے اڑا۔ جس جگہ میں رخ نے مجھے چھوڑا، بہت گہرا درہ کوہ کا تھا اور چاروں طرف اُس کے بہت بڑے بڑے پہاڑ تھے۔ کسی بشر کا مقدور نہ تھا کہ اس پر چڑھ سکے۔ یہ جگہ اوّل سے زیادہ مہلک تھی۔ میں نے وہاں چاروں طرف الماس کے ٹکڑے دیکھے۔ بعضے اتنے بڑے کہ میں حیران ہوا اور بڑے بڑے ٹکڑے الماس کے جمع کر کپڑوں میں میں نے باندھے، مگر اژدہے وہاں بکثرت

تھے اور اس قدر بڑے کہ چھوٹا ان کا بہت بڑے ہاتھی کو بے تکلف نگل جاتا۔ میں اس خوشی کو جو ہیروں کے ملنے سے مجھے ہوئی تھی، بھول گیا۔ دن بھر سانپ رخ کے خوف سے غاروں میں چھپے رہتے، رات کو نکل کر پھرتے۔"[۱]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ (۱) رخ کو ہندی میں گرڑ کہتے تھے۔ یہ لفظ گرڑ (गरुड़) کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ (۲) رخ اژدہے یا اجگر کھاتا ہے۔

اپنے دوسرے سفر کے سلسلے میں سندباد یہ بھی بیان کرتا ہے کہ:

"وہ جزیرہ ردھا پہونچا جہاں اس نے اتنا طاقت ور گینڈا دیکھا کہ وہ اکثر ہاتھی کے شکم میں سینگ چبھو کر اس کو سر پر اٹھا لیتا ہے۔ مگر بہ سبب لہو اور چربی کے کہ ہاتھی کے شکم سے بہہ کر اس کی آنکھوں پر پڑتی ہے تو اندھا ہو جاتا ہے اور پھر اسی حالت میں رخ آکر اس گینڈے کو ہاتھی سمیت پنجوں میں پکڑ لے جاتا ہے اور اپنے بچوں کو کھلاتا ہے۔"[۲]

ظاہر ہے کہ جس پرند کے گنبد نما انڈے کا دور پچاس قدم ہو۔ اور جب وہ پرند آسمان پر نمودار ہو تو سورج کے اس کے پیچھے چھپنے سے اندھیرا ہو جائے۔ اور جس کے بدن میں اتنی طاقت ہو کہ ایک ساتھ گینڈے اور ہاتھی کو دبوچ کر اٹھا لے جائے وہ یقیناً ان دونوں قوی ہیکل جانوروں سے کئی گنا بڑا ہوتا ہوگا۔

رخ اور اس کے انڈے کا ذکر سندباد جہازی کے پانچویں سفر میں بھی آتا ہے:

"بعد کتنے دنوں کے جہاز ہمارا ایک جزیرۂ ویران میں پہونچا۔ ہم سب اس جزیرے پر گئے۔ وہاں ہم نے ایک بیضۂ رخ کا بہت بڑا کہ اس کا ذکر پیشتر ہو چکا ہے۔ دیکھا اس انڈے سے بچہ قریب تھا کہ نکلے۔ ان سوداگروں نے جو میرے ہمراہ تھے، اس بیضہ کو کلہاڑیوں سے توڑا۔ ہر چند میں نے منع کیا مگر انھوں نے نہ مانا۔ رخ کے بچے کو کاٹ اور بھون کر کھا گئے۔ ان کے کھاتے ہی دو ٹکڑے بادل کے ہوا میں دور سے دکھائی دیئے۔ کپتان جو کہ میرا نوکر تھا، اس حال کو دیکھ کر گھبرایا اور ہم سب کو پکار کر کہا جلد جہاز پر سوار ہو۔ ماں باپ اس بچے کے جسے تم نے کھایا ہے، آ پہونچے۔ ہم نے جلدی سوار ہو کر جہاز کو کھول دیا۔ وہ جوڑا رخ کا ایسا شور و غل کرتا ہوا آیا کہ ہم ڈر گئے، پھر وہ اپنے بیضے کو ٹوٹا ہوا دیکھ کر نہایت غضبناک ہوئے اور جدھر سے آئے تھے ادھر گئے اور تھوڑی دیر تک غائب رہے۔ اس عرصے میں ہم نے جہاز کو کھول کر سب پالیں اس کی کھول دیں تاکہ دور نکل جائیں، مگر انھوں نے ہمیں آ گھیرا۔ بڑے بڑے پہاڑ کے ٹکڑے اپنے پنجوں میں داب کر ہمارے جہاز کے مقابل ہوا میں تھرانے لگے۔ چنانچہ ایک نے پتھر کو ہمارے جہاز کی طرف پھینکا۔ ناخدا نے جہاز کو گھما دیا۔ پھر وہ پتھر دریا میں ہمارے جہاز کے نزدیک اس زور سے گرا کہ تمام دریا تہ و بالا ہو گیا اور زمین سمندر کی دکھائی دینے لگی، لیکن دوسرے نے ایسا تاک کر پتھر مارا کہ جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سب سوداگر اور خلاصی دریا میں ڈوب گئے۔ مگر میں تھوڑی دیر تک دریا کے اندر رہا، پھر پانی کی سطح پر اٹھا اور ایک تختے کو جو کہ میرے پاس بہا جاتا تھا پکڑ لیا اور ایک ہاتھ سے پیرنے لگا۔ جب وہ ہاتھ تھک جاتا تو دوسرے سے میں پیرتا، یہاں تک کہ بہتا بہتا کنارے پر جا لگا اور بڑی مشکل سے خشکی میں پہونچا اور گھاس میں بیٹھ گیا۔"[۳]

رخ کے بارے میں ہماری معلومات کا دوسرا ذریعہ قرون وسطیٰ کے مشہور سیاح مارکوپولو (۱۲۵۴ء-۱۳۲۴ء) کا سفرنامہ ہے۔ اس نے ایشیا، خصوصاً چین کی سیاحت کی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

"جزیرے امیڈاگاسکر کے لوگ بیان کرتے ہیں کہ سال کے ایک خاص موسم میں ایک غیر معمولی پرند، جسے وہ

نما کہتے ہیں۔ جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ اس کی صورت عقاب سے مشابہ ہوتی ہے لیکن جسامت بہت بڑی۔ وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اپنے پنجوں میں ہاتھی کو اٹھا لے جاتا ہے اور اسے ہوا میں سے نیچے زمین پر گرا دیتا ہے تاکہ جب وہ مر جائے تو اطمینان سے کھائے۔ جن لوگوں نے اس پرند کو دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ اس کے بازوؤں کا پھیلاؤ ۱۲ قدم ہوتا ہے اور شاہ پر آٹھ قدم لمبے ہوتے ہیں اسی تناسب سے ان کی موٹائی ہوتی ہے۔"

مارکو پولو یہ بھی بیان کرتا ہے کہ چین کے ایلچی نے خان اعظم کو رُخ کا ایک پَر نذر کیا تھا۔

سر رچرڈ برٹن نے اپنے الف لیلہ کے انگریزی ترجمے (۱۸۵۵) میں ایک ایرانی تصویر کا ذکر کیا ہے، جس میں رُخ کو اپنی چونچ اور پنجوں میں تین ہاتھی دبوچے دکھایا گیا ہے اور دونوں حیوانات میں وہی نسبت ہے جو تنکے اور چوہے میں ہوتی ہے۔

رُخ (RUKH) کی روایت قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں نہایت عام تھی۔ چنانچہ فادر جارڈینس FR. JORDANUS کا بیان ہے:

"مشرقی افریقہ میں بعض پرند ہوتے ہیں، جنہیں راک (ROC) کہتے ہیں وہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ آسانی سے ہوا میں ہاتھی کو اٹھا لے جاتے ہیں۔"

عربوں کا عقیدہ تھا کہ رُخ بآسانی اونٹ نگل جاتا ہے وہ دیو ہیکل ہونے کے باوجود نہایت تیز اڑتا ہے اور بادلوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی صورت عقاب یا گدھ سے مشابہ ہوتی ہے۔ ویران مقامات مثلاً جبل القمر میں رہتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے اس افسانوی پرند کا مقابلہ ہندوؤں کے گرُڑ (गरुड़) ایرانیوں کے سیمرغ اور عربوں کے عنقا سے کیا جا سکتا ہے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ یہ پرند ۱۸۶۳ء تک پایا جاتا تھا اور ایک دوسرے پرند ڈوڈو کی طرح ناپید ہو گیا۔



میرے خیال میں اس پرند کا ایک سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ بلاشبہ رُخ کا تصور ہندوؤں کے گرُڑ سے ماخوذ ہے۔ ہندو دیومالا کے مطابق ہر دیوتا کی ایک خاص سواری ہے۔ وشنو جی کی سواری گرُڑ ہے۔ یہ ایک دیو ہیکل عقاب ہے جو سانپوں کا دشمن ہے۔ چنانچہ تصاویر میں وشنو جی کو گرُڑ پر سوار اور گرُڑ کو سانپ کو پکڑے دکھایا جاتا ہے۔ ایسی تصویریں بھی موجود ہیں جن میں گرُڑ کو بجائے سانپ کے ہاتھی پکڑے دکھایا جاتا ہے۔ اب یہ امر قابلِ غور ہے کہ یہ تبدیلی کیوں اور کیسے رونما ہوئی؟ اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ سنسکرت زبان میں لفظ ناگ (नाग) کے دو معنی ہیں۔ سانپ اور ہاتھی، ہتھنی کو (नागी) کہتے ہیں۔ اندر دیوتا کی سواری کے ہاتھی ایراوت کو ناگ اِندر (नाग-इन्द्र) کہا جاتا ہے۔ اور گرُڑ کا لقب ناگ دار کا (नाग-[illegible]) ہے۔ مصوروں نے لفظ ناگ کے دو معنی ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ کبھی انہوں نے گرُڑ کو سانپ پکڑے دکھایا اور کبھی ہاتھی۔ جن لوگوں نے وہ تصویریں دیکھیں جن میں گرُڑ کو ہاتھی پکڑے دکھایا گیا تھا اور

جو سنسکرت زبان کے مذکورہ بالا ذو معنی لفظ سے ناواقف تھے۔ انھوں نے ان تصاویر سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یقیناً وہ ایک ایسے پرندکی تصاویر ہیں، جو ہاتھی کو اٹھائے جاتا ہے اور جب یہ خیال ایران ہوتا ہوا عرب پہنچا تو وہاں گرنڑ رُخ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پھر اس کے گرد وہ عجیب و غریب افسانے گڑھے گئے جو الف لیلہ کی زینت ہیں۔

حواشی

سلہ ہزار داستان یعنی ترجمۂ الف لیلا (باتصویر) مطبع تیج کمار، لکھنؤ۔ پندرھواں ایڈیشن ۱۹۷۰ء، صفحات ۱۰۸-۱۰۹۔
سلہ ایضاً صفحہ ۱۱۱۔ سلہ ایضاً صفحات ۱۲۱-۱۲۲
V.A. ARTES SANSKRIT ENGLISH DICTIONARY, (POONA 1958).سلہ
VOL. II PP. 884 – 85.

★

غزلیں

خضر برنی
ایڈیٹر لبریری
جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

جنونِ شوق ہی جب فتنہ ساماں ہو تو کیا کیجے
خود اپنے ہاتھ میں اپنا گریباں ہو تو کیا کیجے

نہیں ہوتی ہمارے دل میں پیدا بے سبب الجھن
نظر کے روبرو زلفِ پریشاں ہو تو کیا کیجے

یہاں ترکِ تعلق کا بھی پیماں ٹوٹ جاتا ہے
تصور میں اگر تصویرِ جاناں ہو تو کیا کیجے

مٹائے مٹ نہیں سکتا مقدر کا لکھا ہرگز
ہماری داستاں کا درد عنواں ہو تو کیا کیجے

وہاں شکوۂ شکایت کی کہاں رہتی ہے گنجائش
کوئی جب اپنی حالت پر پشیماں ہو تو کیا کیجے

خضرؔ سارا زمانہ ضبط کی تلقین کرتا ہے
ہمارا درد جب محرومِ درماں ہو تو کیا کیجے

کرامت علی کرامت
رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار
کٹک نمبرا (اڑیسہ)

ہم گل کے تبسم کی اذاں کب نہیں سمجھے
لیکن ستمِ دہر کا مطلب نہیں سمجھے

ہم کبر و خودی، حرص و ہوس کے تھے پرستار
رب جس کو سمجھنا تھا اسے رب نہیں سمجھے

چھٹائے رہے دار کے فوّادوں کو دل سے
ہم قصۂ رخسار و قد و لب نہیں سمجھے

دنیا کو سمجھتے رہے بازیچۂ اطفال
لیکن اسے عرفان کا مکتب نہیں سمجھے

جو دین کہ انسان کو انسان نہ جانے
اس دین کو اللہ کا مذہب نہیں سمجھے

اُبھرا تھا جو پیکرِ دل ایام کی تہہ سے
ہم اس کو کرامتؔ مہِ نخشب نہیں سمجھے

طیب بخش
پیلی کوٹھی۔ محلہ سوتھہ بدایوں

بدایوں کا ایک گمنام شاعر

یعقوب بخش راغب

بعض لوگ زندگی بھر اپنے نجی کاموں اور علمی مشاغل میں اس درجہ مشغول رہتے ہیں کہ وہ نہ تو کسی سے داد کے خواہاں ہوتے ہیں اور نہ نمود و نمائش کی خواہش ان کے دل و دماغ کو پریشان کرتی ہے۔ دنیا کے لوگ یہ نہیں جان پاتے کہ یہ حضرات کس طرح اپنی عمر عزیز بسر کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات کے انتقال کے بعد اصحاب بصیرت کی نگاہیں ان کی جانب اٹھتی ہیں اور لوگ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ افسوس ہم نے زندگی میں ایسی قابل ہستی کی کما حقہٗ قدر نہ کی۔ ایسی ہی ایک گمنام شخصیت مولانا یعقوب بخش صاحب راغب کی تھی۔

یعقوب بخش صاحب راغب سر سید احمد خاں صاحب کے ہم عصر اور گہرے دوست حاجی علی بخش خاں صاحب بدایوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۱۸ء میں آپ پیدا ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کے والد غوث بخش صاحب کا انتقال ہو گیا اب آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کی والدہ پر آ گئی۔ آپ کے تایا خان بہادر حامد بخش صاحب آپ کی جائیداد کی دیکھ بھال کرتے اور آپ نے ان دونوں کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ آپ نے عربی و فارسی۔ فقہ و حدیث علم الکلام، فلسفہ، منطق، اقلیدس، ہیئت، نجوم، رمل، طب وغیرہ کی تعلیم بدایوں ہی میں حاصل کی۔ آپ کے استادوں میں رفاقت اللہ صاحب

سید یونس علیگ، حضرت مولانا عبدالمقتدر صاحبؒ، مولانا ابراہیم صاحب بدایوں، مولانا محب احمد صاحب وغیرہ وغیرہ کے نام مشہور رہیں۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک کا زمانہ سیاست ملکی میں عملی طور سے حصہ لے کر گزرا۔ گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور بی اماں وغیرہ جب بدایوں آئے اور جامع مسجد میں ہزار ہا ہندو مسلمان سامعین کے سامنے ان حضرات کی تقاریر ہوئیں۔ اس موقع پر راغب صاحب نے بھی اپنا یہ قطعہ پڑھ کر سنایا ؎

انگریز گیا پھینک کے ننگا جھنڈا
کل ہند اٹھائے گا ترنگا جھنڈا
برباد نہ ہو جائیں یہ تینوں قومیں
اب یہ تنہا چلے گا گنگا جھنڈا

تحریک ترک موالات سے متاثر ہو کر یہ قطعہ لکھا ؎

کیوں کانپ رہے ہیں وہ ستم پیشہ ہے کیا
لرزاں اس خوف سے رگ و ریشہ ہے کیا
انگریز کا ستم اجل کا پیغام سہی
مرنا ہے ضروری پھر اندیشہ ہے کیا

ہوم رول (HOME RULE) کے اعلان سے متاثر ہو کر یہ

قطعہ لکھا۔

آزادی ہے اصول کا ملنا کیا
یوں جھینک میں خاک دھول ملا کیا
گھر میں نہیں قانون کی جب پابندی
باہر سے یہ ہجوم رول کا ملنا کیا

مختصر یہ کہ یعقوب بخش صاحب کانگریس کی تحریک سے عملی طور پر وابستہ رہے۔ لیکن کسی عہدے کے خواہاں کبھی نہ ہوئے۔ پنڈت ہرگووند پنتھ جی کے ساتھ مل کر پہاڑی علاقوں میں کام کیا۔ اکثر مواقع پر آپ کا وارنٹ گرفتاری جاری ہوتا اور آپ ڈاکٹر ٹکہ اور ڈاکٹر ملہوتری کمانڈے سول سرجن سینی ٹوریم بھوالی کی مہربانی سے بھوالی سینی ٹوریم میں فرضی طور پر داخل ہو کر انگریز کی قید و بند سے نجات پاتے۔ ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

۱۹۳۸ء سے قبل کا زمانہ بھی راغبؔ صاحب کی زندگی کا بہترین زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں آپ گھر پر طلباء کو عربی فارسی وغیرہ کی مفت تعلیم دیا کرتے تھے۔ شام کو آپ کے دولت کدہ پر شہر کے مشہور شعرا کرام کی روزانہ نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ حاجی عطا محمد عطا بدایونی جب بھی تلہر سے بدایوں آتے ان صحبتوں میں ضرور شرکت کرتے اور اپنے تازہ کلام سے یاران نکتہ داں کو محظوظ کرتے۔

حاجی عبدالجامع جامیؔ تولاقمر، قاضی غلام سجاد بسملؔ، اکرم احمد شادؔ، مفتی لطفؔ، استاد محمد مبین نازشؔ، مجتہدالدین عیشؔ، حکیم کفیل الدین عالیؔ، حاجی عبدالرزاق حمزہؔ وغیرہ شریک محفل ہوتے تھے۔

انہی دنوں سید ابی النصر الحموی بھی شام سے تشریف لائے اور کچھ عرصہ مدرسہ قادریہ میں قیام کر کے راغبؔ صاحب کے یہاں مقیم ہوگئے۔ راغبؔ صاحب چونکہ خود عربی کے عالم تھے اور سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ اس لیے حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ کے ان پر پوتے کو بہت تکریم و تعظیم سے اپنے یہاں رکھا۔ سید ابی النصر صاحب کو بھی عربی شاعری سے شوق تھا اور راغبؔ صاحب بھی عربی میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ اس ذوق و شوق کو بڑھاوا ملا اور کئی قصیدے آل اہل بیت کی مدح میں تصنیف ہوئے۔ ایک قصیدہ منقوط لکھا جس کو اہل علم حضرات نے عربی ادب میں نمایاں اضافہ قرار دیا۔ یہ جملہ قصائد زیور طبع سے آراستہ ہوئے اور صاحب ذوق حضرات کو مفت میں تقسیم کئے گئے۔ سید ابی النصر الحموی صاحب بفضلہ تعالیٰ آج بھی حیات ہیں اور میسور میں مقیم ہیں۔ بے حد عابد و زاہد شب بیدار بزرگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو زندہ و صحت مند رکھے۔ آمین۔

۱۹۳۸ء میں قانون مسعودی از علامہ ابیرونی کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جس کو سر شاہ سلیمان صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مقرر کردہ کمیٹی نے بے حد پسند کیا۔ اس ترجمہ سے متاثر ہو کر سر شاہ سلیمان صاحب مرحوم نے راغبؔ صاحب کو یونیورسٹی میں ملازمت کرنے پر بے حد مجبور کیا اور بالآخر راغبؔ صاحب یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات میں بہ حیثیت لیکچرر مقرر کر دیئے گئے۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران روزانہ شام کو اول آفتاب منزل میں بعدہ قیام گاہ ثانی کرشنا آشرم میں علمی صحبتیں روزانہ شام کو رہتی تھیں۔ جن میں مولانا ضیا احمد، مولانا اکرام اللہ، حکیم عبداللطیف صاحب، مبین صاحب، بدرالدین علوی، پروفیسر نامیؔ، خواجہ منظور صاحب، بشیر صاحب، پروفیسر کیمسٹری، بشیر صاحب لائبریرین، ڈاکٹر یوسف صاحب، سید الطاف علی بریلوی وغیرہ وغیرہ روزانہ کے شرکا میں تھے۔ نشستوں میں شعر و شاعری علم و ادب پر گفتگو رہا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ یونیورسٹی نے بہت سا کاغذ منگوایا۔ رشید احمد صدیقی صاحب صدر شعبہ اردو اس کی تقسیم کے انچارج بنائے گئے۔ راغبؔ صاحب اپنی کسی کتاب کو چھپوانے کے لیے کاغذ چاہتے تھے۔ رشید صاحب نے از راہ مذاق کہا کہ راغبؔ صاحب میرے متعلق کوئی غزل وغیرہ لکھیں تو کاغذ دوں گا۔ راغبؔ صاحب نے یہ سنا اور کچھ دیر اردو شعبہ کے سامنے درختوں

کے زیر سایہ پلے اور مطلع موزوں کر لائے بعد مولانا ضیا احمد صاحب رشید صاحب وغیرہ کے سامنے وہ مطلع سنایا۔ مطلع یہ تھا۔

بہار آگئی ہے اب کے برس بہ رنگ جدید
ہوا میں اڑنے کو پر تولنے لگے ہیں رشید

یہ مطلع سن کر رشید صاحب نے فوراً صلح کر لی اور راغب صاحب کو کتاب چھپوانے کے لیے کاغذ دینے کا وعدہ کر لیا۔

۱۲ر فروری ۱۹۴۸ء کو قریب ڈھائی بجے دن قلب کا دورہ پڑا فوراً ڈاکٹر نفیس صاحب نے دیکھا وہ دوا لینے اسپتال گئے۔ اسی دوران راغب صاحب نے وضو کیا اور کہا کہ صبح کا وظیفہ نہیں پڑھا ہے وہ وظیفہ پڑھ لوں۔ یہ کہہ کر لیٹ کر وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی ڈاکٹر نفیس صاحب انجکشن وغیرہ لے کر کمرے میں داخل ہوئے راغب صاحب کے ہونٹ ہلنا بند ہو گئے۔ ڈاکٹر نفیس صاحب اور حکیم عبداللطیف صاحب اور ناجی صاحب اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے نبض ٹٹولی اور سب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ہائے مولانا۔ یہ سن کر گھر کے سب لوگ سمجھ گئے کہ راغب صاحب جاں بحق ہو گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

راغب صاحب کے گھر کے لوگ تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے۔ نواب اسماعیل خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے خود اپنی کوشش سے نعش بدایوں لے جانے کی فوری اجازت حکام ضلع سے حاصل کی۔ دوسرے دن صبح راغب صاحب کی میت کو بدایوں کے لیے لے جایا گیا۔ بدایوں میں ان کے جسد خاکی کو ان کی والدہ کے پہلو میں درگاہ عالیہ قادریہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ علی گڑھ ہی میں اکرسفنا آشرم کے وسیع میدان میں ادا کی گئی۔ شعبہ دینیات کے ناظم صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی نواب چھتاری، نواب اسماعیل خاں اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وغیرہ وغیرہ نے نماز جنازہ ادا کی۔ ایک کثیر تعداد سوگوار طلبا کی نماز جنازہ میں شریک تھی۔

مرحوم عربی کے بڑے عالم، ادب و لغت کے فاضل اور ہیئت و نجوم کے استاد تھے۔ عربی میں قصیدے بہت لکھے، اور بہت اچھے لکھے۔ بدایوں کے سلسلۂ قادریہ میں حضور کی ذات سے بے انتہا شیفتگی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے مرحوم کو مجھ بدنام کنندہ نکونامے چند سے بھی محبت کی عقیدت تھی۔ چنانچہ اپنے عربی قصیدوں کو میری طرف نسبت دے کر میری عزت بڑھائی۔ ہیئت و نجوم سے ان کو خاص ذوق تھا۔ ان کے گھر میں بزرگوں کا اندوختہ بڑا اچھا کتب خانہ تھا جس میں بعض نادر قلمی کتابیں تھیں۔ انہی میں محقق طوسی اور دوسرے قدیم مسلمان علمائے ہیئت کے قدیم رسالے تھے۔ مرحوم نے اپنے ذوق سے ان کو پڑھ کر اور صحیح کر کے الانجم الطوالع کے نام سے شائع کیا۔ سر شاہ سلیمان مرحوم کے اشارے سے علامہ البیرونی کی قانون مسعودی کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

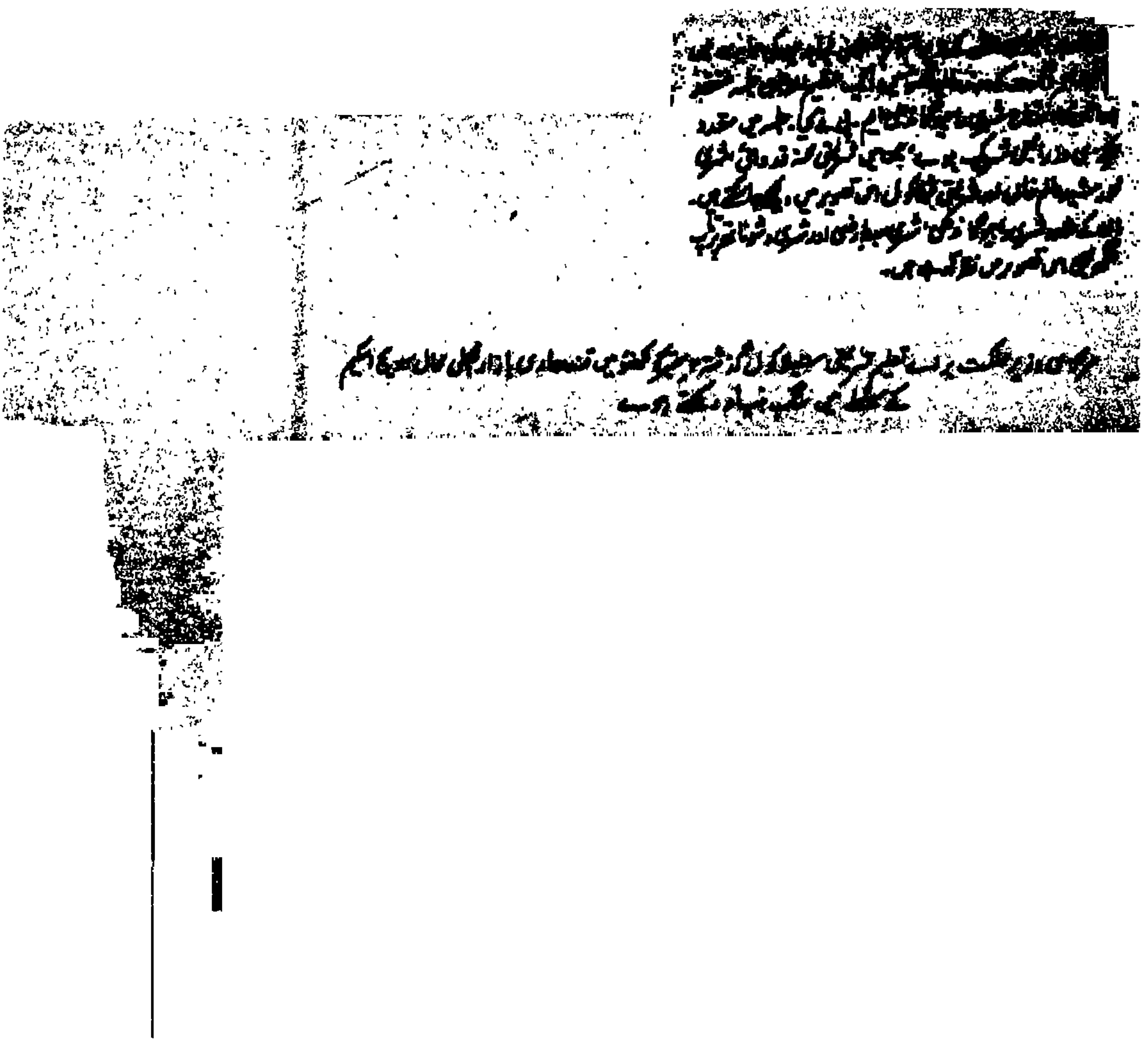
مرحوم نے درس نظامیہ کے اسباق مولانا رفاقت اللہ اور مولانا فضل احمد بدایونی سے پڑھے تبرکاً چند سبق مولانا عبدالمقتدر صاحب بدایونی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی پڑھے حدیث میں ان کا سلسلۂ تلمذ مولانا سید یونس علی صاحب (المتوفی ۱۹۰۴ء) شاگرد مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے واسطے سے خاندان ولی اللہی تک اور معقول میں مولانا محب احمد بدایونی (المتوفی ۱۹۶۰ء) کے توسط سے خانوادۂ خیرآباد تک منتہی ہوتا ہے۔

اردو شاعری میں شیخ احمد علی شوق لکھنوی کے شاگرد رہے۔ اور بیعت سلسلۂ قادریہ میں مولانا عبدالقادر صاحب بدایونی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھی۔

راغب صاحب نے شاعری اغلباً ۱۹۰۹ء سے قبل ہی شروع کر دی تھی۔ جیسا کہ ان کی ایک غزل سے ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدا میں راغب صاحب کو استاد جلال لکھنوی سے شرف تلمذ رہا۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں استاد جلال کے انتقال کے بعد جلال صاحب مرحوم کی یاد میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں راغب صاحب نے ایک غزل پڑھی۔ اس کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو

[illegible] تصویر میں [illegible] نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے یکم ستمبر ۱۹۸۲ء کو [illegible] کا دورہ کیا اور انہوں نے وہاں ایک [illegible] کا افتتاح کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں وزیر اعظم [illegible] نظر آ رہے ہیں۔


[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

قیامت ہے میری دیوانگی بزم حسیناں میں
گنی جائے گی اب ہنگامہ محشر کے ساماں میں

عجب حالت ہے میری ماتم استاد میں راغبؔ
کہوں کیونکر غزل گم ہوں میں اس فکر پریشاں میں

استاد جلالؔ کے انتقال کے بعد آپ نے ان کے صاحبزادے استاد کمالؔ سے اصلاح لی۔ بعدہٗ منشی احمد علی صاحب شوقؔ سے اصلاح لینا شروع کی۔ جیسا کہ ان اشعار سے نشان دہی ہوتی ہے ؎

سن کر مرا کلام یہ کہتے ہیں اہل ذوق
راغبؔ ہے یادگار جلالؔ و کمالؔ کی

راغبؔ غزل پہ حضرت استاد شوقؔ کی
میری نظر پڑی کہ کلیجہ نکل پڑا

سخنِ داغ کے مزے راغبؔ
سخنِ شوقؔ ہی سے ملتے ہیں

ملی راغبؔ آپ کو طبع گرم و خیال تغزل تو کیا ہوا
نہ زباں ہے حضرت شوقؔ کی نہ یہ طرز طرز شررہ ہوئی

راغبؔ صاحب کا ابتدائی کلام ضائع ہو گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ علی گڈھ میں قیام کے دوران مرحوم نے خود اپنی بیاض سے اپنی غزلیں از سر نو لکھنا شروع کیں۔ جن غزلیات کو مناسب نہ سمجھا تلف کر دیا۔ مابقی کلام میں سب سے پرانی غزل وہ ہے جو آپ نے استاد جلالؔ کے انتقال پر لکھی اور استاد مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے اعزاز میں منعقدہ ایک مشاعرے میں پڑھی۔ یہ مشاعرہ نومبر ۱۹۰۹ء میں ہوا تھا۔ غزل کے چند اشعار ہدیہ ناظرین ہیں۔

قیامت ہے مری دیوانگی بزم حسیناں میں
گنی جائے گی اب ہنگامہ محشر کے ساماں میں

یہی ہے آرزو فرقت ہو اب اپنے تن و جاں میں
تمنا وصل کی آئے دلِ مایوسِ ہجراں میں

کہوں کیا بات ہے جو تابشِ رخسارِ جاناں میں
ہم تو ہیں دھنس گئے ہیں جل کے نظارے کے ارماں میں

عجب حالت ہے میری ماتم استاد میں راغبؔ
کہوں کیونکر غزل گم ہوں میں اس فکر پریشاں میں

راغبؔ صاحب مرحوم اکثر کل ہند مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے۔ چند غزلیات جو انہوں نے مختلف مشاعروں میں پڑھیں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

مشاعرہ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۰ء بمقام کلیر شریف۔

جو تو آکر تسلی دے تو یہ درد جگر کیوں ہو
خیال زلف صابرؔ بے قراری رات بھر کیوں ہو

ترا مداح راغبؔ کس لئے ماتم کرے دل کا
تما قسمہ سرائے بیارے صابرؔ لیسر گر کیوں ہو

یکم جنوری ۱۹۱۰ء کو منعقدہ مشاعرے میں جو غزل پڑھی گئی اس کے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

جھلک یہ عارض پر نور کی نقاب میں ہے
کہ برق حسن نہاں پردۂ حجاب میں ہے

امید وصل جو قلب پر اضطراب میں ہے
کبھی نکل نہیں سکتی بڑے عذاب میں ہے

میں اپنے آپ کو دیکھوں نہ کس طرح راغبؔ
نگاہ کہتی ہے تو میرے انتخاب میں ہے

سہارن پور میں منعقدہ مشاعرہ ۱۹ ستمبر ۱۹۱۲ء میں پڑھی گئی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

آدمی آدمی سے ملتے ہیں آپ بھی کیا کسی سے ملتے ہیں
یہ حسیں جب کسی سے ملتے ہیں جانتا ہے مجھی سے ملتے ہیں

سخن داغ کے مزے راغبؔ
سخنِ شوقؔ ہی سے ملتے ہیں

۲ اپریل ۱۹۱۷ء کو علی گڈھ میں منعقدہ مشاعرہ میں جو غزل پڑھی اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سر کو جنوں میں ضعف سے بیکار دیکھ کر
ہنستا ہوں جانب در و دیوار دیکھ کر

آپ حشر تک بہار تماشا ہے اور ہم
آنکھیں ہوئی ہیں بند رخِ یار دیکھ کر

راغبؔ اک اور بھی ہو غزل اپنے رنگ میں
بے خود ہے بزم جلوہ اشعار دیکھ کر

غزل بر غزل مضطرؔ خیرآبادی مشاعرہ ۲۳ر اگست ۱۹۱۷ء۔

کھل گئی ہے آنکھ ان کو خواب میں پانے کے بعد
خواب سا بھولا ہوا ہوں آنکھ کھل جانے کے بعد

راغبؔ آتے جاتے رہنا میکدے میں عمر بھر
دم بہ دم شغلِ نفس آتا ہے مر جانے کے بعد

غزل مشاعرہ بدایوں ۱۴ر مئی ۱۹۱۷ء۔

جاؤں کیا سمجھانے کے میں وہ بدگماں ہو جائے گا
رنگ کے اڑنے سے عشق اس پر عیاں ہو جائے گا

کہہ سکے گا کچھ بھی اے راغبؔ نہ اس خاموش سے
بے دہن کے سامنے تو بے زباں ہو جائے گا

غزل مشاعرہ ۱۹۱۸ء

کام دشوار بہت تھا مگر آساں نکلا
جاں یوں نکلی کہ جیسے کوئی ارماں نکلا

کس قدر جوشِ جنوں سلسلہ جنباں نکلا
بڑھ کے دامن سے بھی دو ہاتھ گریباں نکلا

بیکسی کیوں نہ کرے دید تری اے راغبؔ
سو تغافل ہی ترا پرسشِ پنہاں نکلا

غزل مشاعرہ مارہرہ منعقدہ ۴ر اگست ۱۹۲۳ء۔

سر پر مہ نوسدہ خوش ہے کہ اس کا پتہ ملا
پوچھو تمھیں پتہ ہی ملا وہ بھی کیا ملا

سنتا تو ہوں کہ نالۂ غم کیا رسا ملا
رونے میں دل کو ان کی ہنسی کا مزا ملا

راغبؔ یہ آفتِ غمِ دوری عجیب ہے
سچ تو یہ ہے کہ ہم سے کبھی وہ نہ تھا ملا

غزل مشاعرہ ۲۶ر اگست ۱۹۲۸ء۔

جلوہ دکھاؤ یوں کہ نظر کو خبر نہ ہو
ایسی ہو بے خودی کہ خبر کو خبر نہ ہو

پاسِ ادب کہوں اسے راغبؔ کہ جوشِ اشک
ہر سجدہ چاہتا ہے کہ سر کو خبر نہ ہو

استاد مومنؔ کا رنگ دیکھنا ہے تو اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ہم اور ہم کو دید ہو ان کے جمال کی
دیوار سامنے ہے خود اپنے خیال کی

ایسی تیری نظر کی اداؤں نے چال کی
لٹتے رہے خبر نہ ہوئی اپنے حال کی

راغبؔ یہی ہے حضرت مومنؔ کا اتباع
چھو لے فرازِ عرش بلندی خیال کی

میرؔ و فانیؔ بدایونی کا رنگ دیکھنا ہے تو یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ان سے دل ملتے ہی فرقت کی بلا بھی آئی
جان آنے بھی نہ پائی کہ قضا بھی آئی

دلِ بیتاب کو فرقت میں تسلی نہ ہوئی
باوجودیکہ تسلی کو قضا بھی آئی

نعش پر آکے مری اس نے وہ باتیں چھیڑیں
ہر عزادار کو عبرت بھی حیا بھی آئی

دعویٰ سحر بیانی ہے عبث اے راغبؔ
میرؔ صاحب کی تمھیں طرزِ ادا بھی آئی

مختلف غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جاتے ہو کدھر پھیر کے رُخ میری نظر سے
دیکھو یہ نظر روٹھ چلی دیدۂ تر سے

یہ جدّتِ تخیل یہ مضمون کی نزاکت
راغبؔ مجھے پہونچی ہے وراثت میں ثمرؔ سے

منزل کے بعد و قرب میں پھر کیوں یہ بل پڑا
جس راہ تو نے مجھ کو چلایا میں چل پڑا
آنکھوں کی کھڑکیوں سے انہیں جھانکتا تھا دل
چمکی جو ایک برق تڑپ کر نکل پڑا

سید سلیمان صاحب ندوی کی نذر ہے
کسی کو شوق سے عیش جہاں نہیں ملتا
خوشی کہاں کہ غم جاوداں نہیں ملتا
نقاب الٹتے ہیں دے کر نگاہ چین کے ہوش
زبان ملتی ہے لیکن بیاں نہیں ملتا

غزل مشاعرہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۲ء
طاقت سے بڑھ کے شوق تکلم کا جوش تھا
یوں کہہ رہا تھا حال میں گویا خموش تھا
جز وہم کیا ہے عالم دید و شنید میں
دیوانہ تھا جو معتقد چشم و گوش تھا

مجھے عشق دنیا سے کھو کر رہے گا
یہ انجام ہونا ہے ہو کر رہے گا
بہا دے گا آنکھوں کو دل روتے روتے
سفینہ میری ڈبو کر رہے گا
انہیں دیکھتے ہی بھر آتے ہیں آنسو
مجھے دیدۂ تر ڈبو کر رہے گا
نہ کہہ گریہ ہے منع فرقت میں ناصح
یہی دل کے داغوں کو دھو کر رہے گا

تم اپنی سی کوشش کیے جاؤ راغب
جو قسمت میں ہونا ہے ہو کر رہے گا

لگا تا ٹھوکریں دنیا کو قدرت کا پیام آیا
کھڑے ہو جائیں خاک افتادہ ہنگام قیام آیا
رہا ہے اب یہاں غیر جنون شوق کیا باقی
خرد کا جو عمل تھا اس کے جھگڑے میں کام آیا
ہوں کیا سامنا ہوتے ہی ان کا دل پہ کیا گزرا
نگاہوں کے اشاروں میں قیامت کا پیام آیا
روتے دھوتے عمر بسر کی عشق میں کب آرام کیا
آہیں کر کے شب کی سحر کی صبح کو رو کر شام کیا

یہ کس کی نظر کا اشارہ ہوا
کہ بس خاتمہ ہی ہمارا ہوا
یہ ذوق غم عشق پیارا ہوا
مجھے جان دینا گوارا ہوا
شہیدوں میں سنتے ہیں مشہور ہے
وہ راغب محبت کا مارا ہوا

حسرت کا داغ دے کے جوانی نکل گئی
پیری کی صبح ، صبح کفن سے بدل گئی
اس کے حسین دکھا کا راغب اثر ہے کیا
جو بات کی وہ نور کے سانچے میں ڈھل گئی

ہائے نکلی تھی کے ڈھونڈنے وحشت میری
موت کو لے کے پھری گردش قسمت میرا

غزلیں

کشفی لکھنوی
شاہی مسجد، رانا بھون
سر جنگ ناتھ مارگ، لکھنؤ

گلوں کی چاہ میں آئے تھے خار لے کے چلے
چمن سے ہم غمِ فصلِ بہار لے کے چلے

شمیمِ گل سے مرا دل نہیں بہلتا اب
کہو صبا سے کہ خوشبوئے یار لے کے چلے

ہوا کے جھونکے خدا جانے جا رہے ہیں کدھر
کہاں یہ میرے گریباں کے تار لے کے چلے

ہے بات کیا جو ترے میکدے سے ساقی
ملالِ تشنہ لبی بادہ خوار لے کے چلے

ہم ان کی بزم میں پہنچے تو تھے تہی دامن
چلے تو رحمتِ پروردگار لے کے چلے

فرازِ عرش نظر آ رہا تھا زیرِ قدم
ہمیں جب اہلِ ستم سوئے دار لے کے چلے

رہِ حیات میں ہے کامراں وہی کشفی
جو اپنے دوش پہ اوروں کا بار لے کے چلے

اطہر نبی
محمد نور ہاؤس
جادو ناتھ سانیال روڈ، لکھنؤ

مختلف رنگوں کے کاغذ سے سجائے رکھا
میں نے اس گھر کا ہر اک زخم چھپائے رکھا

تیرے بخشے ہوئے زخموں کو کھلائے رکھا
رات بھر سرد ہواؤں نے جگائے رکھا

میرے قاتل کی جو پہچان بتا سکتے تھے
ان چراغوں کو ہواؤں نے بجھائے رکھا

یہ الگ بات بہت زخم بھی آئے لیکن
میں نے ہر دور میں سر اپنا اٹھائے رکھا

میں سمجھتا تھا عدالت کی مشیت کیا ہے
میں نے مجرم کی طرح ہاتھ اٹھائے رکھا

کیا یہ کم ہے کہ حوادث کے نگر میں اطہر
میں نے آئینے کو آئینہ بنائے رکھا

سید ضیاء النساء اعظمی
[illegible]
[illegible]

مُلّا مُطربی سمرقندی

تعارف: مولانا مطربی الاصم سمرقندی ۹۶۶ھ مطابق ۱۵۵۹ء میں شہر سمرقند میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علوم متداولہ کے حصول کے لیے سمرقند سے بخارا گئے اور اس زمانہ کے مشہور تذکرہ نویس اور ادیب خواجہ حسن نثاری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نیز علم موسیقی سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کے لیے استاد کمال الدین حافظ عبدالرحیم کا انتخاب کیا۔ چونکہ ملا مطربی کو اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری اور موسیقی سے کمال شغف تھا اس لیے اس کی مناسبت سے اپنا تخلص مطربی رکھا۔ تذکروں میں اُن کے اشعار کے جو نمونے ملتے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

تصانیف: ملا مطربی کی مندرجہ ذیل تین تصانیف ان کی یادگار ہیں:-

۱۔ تذکرۃ الشعراء ماوراء النہر، ایران اور ہندوستان۔
۲۔ تذکرہ نسخۂ زیبائے جہانگیر۔
۳۔ خاطرات مطربی سمرقندی (روداد ملاقات با جہانگیر بادشاہ)

اُن کی ان تصانیف سے اگر انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز تاجکستان کے مشہور اہل قلم اور ریسرچ اسکالر پروفیسر مرزا عبدالغنی میرزایف نے دلچسپی نہ لی ہوتی تو وہ پردۂ گمنامی میں چلی جاتیں۔ اُن کو منظرِ عام پر لانے کے لیے ہم مرحوم کے رہین منت ہیں۔

۱۔ تذکرۃ الشعراء ماوراء النہر، ایران اور ہندوستان
اس تذکرہ کو میرزایف نے بڑی محنت شاقہ اور چھان بین کے بعد ایڈٹ کیا ہے جس پر انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی یونیورسٹی کے جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کا پیش لفظ بھی ہے۔ میرزایف مرحوم کو اپنی محنت کا ثمرہ دیکھنا نصیب نہ تھا چنانچہ یہ تذکرہ پروفیسر میرزایف مرحوم کی موت (۱۵ اگست ۱۹۷۶ء) کے صرف چند مہینے بعد ۱۹۷۷ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔

اس تذکرہ کو ملا مطربی نے اپنے استاد خواجہ حسن نثاری متوفی بہ سال ۱۶۰۰ء کے اسلوب میں ۱۰۱۳ھ مطابق ۱۶۰۴ء میں مکمل کیا اور اپنے مربی عالیجناب ولی محمد خاں استرخانی حکمراں ماوراء النہر کی نذر کیا۔ یہ ماوراء النہر، ایران اور ہندوستان کے ۳۰۲ منتخب شعراء کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ تاشقند میں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، اکاڈمی آف سائنسز، ازبکستان کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور دوسرا نسخہ کابل میں دانشمند افغانی پروفیسر محمد صالح پروتا کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲۔ تذکرہ نسخۂ زیبائے جہانگیر

ملا مطربی نے تذکرۃ الشعراء ماوراء النہر، ایران اور ہندوستان کے لکھنے کے بیس برس بعد تذکرہ نسخۂ زیبائے جہانگیر کو مرتب کیا۔ اس میں اس نے صرف ۱۹۰ شعراء کا تذکرہ لکھا ہے۔ پروفیسر میرزایف کا کہنا ہے کہ یہ تذکرہ اپنے نفس مطلب کے اعتبار سے سرکاری حیثیت رکھتا ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

الف۔ ملا مطربی نے تذکرۃ الشعراء ماوراء النہر، ایران اور ہندوستان

میں ترمیم اور اضافے کے بعد یہ تذکرہ 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' سنہ ۱۰۳۵ھ مطابق سنہ ۱۶۲۵ء میں اس خیال سے مرتب کیا تھا کہ اسے شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔

ب۔ 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' میں مطربی نے ہندوستان سے اپنے وطن سمرقند آکر شہنشاہ جہانگیر سے دو ماہ کے اندر اپنی چوبیس ملاقاتوں کی روداد سنہ ۱۰۳۷ھ مطابق سنہ ۱۶۲۷ء میں لکھ کر شامل کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اہل سمرقند کو یہ معلوم ہو جائے کہ دربار جہانگیری میں اس کی کتنی قدر و منزلت کی گئی۔۔۔ اس روداد کا مطربی نے 'خاطرات مطربی سمرقندی' نام رکھا۔۔۔

ج۔ 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' میں تذکرۃ الشعراء جہانگیر بھی شامل ہے جسے جہانگیر نے تخت نشینی سے قبل سنہ ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۳–۹۴ء میں مرتب کیا تھا۔ اس میں ہندوستان، ایران اور ماوراء النہر کے صرف ان اکیاسی شعراء کا ذکر ہے جو عہد اکبری میں بہت ممتاز تھے۔ مطربی نے یہ تحریر کیا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے اس تذکرہ کو 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' میں شامل کرنے کے لیے میری تیئسویں ملاقات میں کہا تھا۔

اس طور پر 'خاطرات مطربی' اور 'تذکرۃ الشعراء جہانگیر' دو مختلف چیزیں ہیں جو بطور ضمیمہ تذکرہ 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' میں شامل کر دی گئی ہیں۔

اپنے ممدوح ولی محمد خاں استراخانی حکمراں ماوراء النہر کی موت سنہ ۱۶۱۱ء کے بعد سنہ ۱۶۱۲ء میں مولانا مطربی سمرقندی کے دل میں ہندوستان کے سفر کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ حکومت مغلیہ کا سربراہ بادشاہ جہانگیر چونکہ علم دوست اہل قلم کا قدردان اور فنون لطیفہ کا پرستار تھا اس لیے وہ اس کی بھی قدر کرے گا۔ مطربی پر اپنے متعلقین کے نان نفقہ کا بار اتنا تھا کہ فوری طور پر وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہا۔ مگر جب اس نے اپنے متعلقین کی جملہ ضروریات زندگی کا معقول انتظام کر لیا تو اس نے سنہ ۱۰۳۰ھ مطابق سنہ ۱۶۲۱ء میں سفر کی تیاری شروع کر دی۔ چونکہ اس کا مقصد مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہونا اور اس سے ملاقات کرنا تھا اس لیے اس موقع پر کوئی گرانقدر تحفہ بھی پیش کرنا از بس ضروری تھا۔ اس نے غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ جہانگیر جیسے صاحب نظر، سخن شناس، نکتہ سنج اور باذوق حکمراں کے لیے ادبی تحفہ سے بڑھ کر کوئی اور تحفہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس نے ماوراء النہر، ایران اور ہندوستان کے منتخب شعراء پر مشتمل ایک تذکرۃ الشعراء مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے پہلے اس نے ماوراء النہر کا سفر اختیار کیا۔ بعدہٗ سنہ ۱۰۳۱ھ مطابق سنہ ۱۶۲۲ء میں بلخ اور بخارا کی راہ اختیار کی۔ بلخ، بخارا، طالقان، قندوز اور دیگر محال بدخشاں کے شعرائے وقت سے ملاقاتیں کیں اور اپنی غرض و غایت بتا کر ان سے ان کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام حاصل کیے۔ سنہ ۱۶۲۳ء میں یعنی اپنی عمر کے ۶۹ ویں سال میں تذکرۃ الشعراء موسوم بہ 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' تحریر کرنا شروع کیا جسے اس نے ایک سال کی مدت میں تقریباً مکمل کر لیا۔ اس طور پر سنہ ۱۶۲۵ء کے آخری ایام میں وہ عازم ہند ہوا۔

طویل سفر کی وجہ سے اس نے بلخ اور کابل میں کچھ عرصہ تک قیام بھی کیا۔ قیام کے دوران میں اس نے مزید معلومات بھی حاصل کر لیں۔ سنہ ۱۶۲۶ء میں وہ ہندوستان کے پایۂ تخت شہر لاہور میں داخل ہو گیا۔ ایک ماہ تک 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' کو مکمل کرنے کی غرض سے مزید معلومات حاصل کرنے میں مشغول رہا۔ جب تذکرہ تکمیل کو پہنچ گیا تو اس نے شہنشاہ جہانگیر ابن جلال الدین اکبر کی خدمت میں حاضر ہو کر ملاقات کا شرف حاصل کیا اور اپنا گرانقدر تحفہ 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' بطور نذرانہ پیش کیا۔

ملا مطربی سمرقندی نے لاہور میں اپنے دو ماہ کے قیام کے اندر شہنشاہ جہانگیر سے جو چوبیس ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کی تفصیلی روداد مطربی نے وطن واپس جا کر قلم بند کر کے اسے 'خاطرات مطربی سمرقندی' کا نام دیکر 'نسخۂ زیبائے جہانگیر' میں شامل کیا۔ ان جملہ ملاقاتوں کی تفصیلی روداد کے لیے اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے البتہ چند ملاقاتوں کی صرف جھلکیاں ہی پیش کی جا رہی ہیں

جو مثالی از دلچسپی نہ ہوں گی۔ قارئین کرام انھیں ملاحظہ فرمائیں۔
مطربی نے جہانگیر سے اپنی ملاقاتوں کا حال اس طرح بیان کیا ہے :-

(ملاقات اوّل)

جہانگیر : استاد العصر بوار السرور لاہور میں آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے ؟

مطربی : ایک ماہ۔

جہانگیر : اب تک کہاں رہے کہ آستاں بوسی کے لیے نہیں آئے ؟

مطربی : "نسخۂ زیبائے جہانگیر" کی تکمیل میں مشغول رہا اسے جہاں پناہ کی خدمت میں تحفہ گزارنے کی غرض سے اس کی نوک پلک درست کرنے میں مشغول رہا۔

جہانگیر : چہ خوب! "نسخۂ زیبائے جہانگیر" کی تکمیل کے سلسلے میں قطعۂ تاریخ بھی تو کہا ہوگا ؟

مطربی : ہاں! قطعۂ تاریخ یوں نظم ہو گیا :-

برنام جہانگیر شہ چرخ فخیم
ایں نسخۂ دلکشا چو آمد بقلم
تاریخ تمامش خرد خورده شناس
زد "نسخۂ زیبائے جہانگیر" رقم
سنہ ۱۰۳۵ھ

اس قطعہ کو پسند فرماتے ہوئے دوبارہ پڑھنے کے لیے ارشاد گرامی ہوا۔ میں نے دوبارہ پڑھا۔ اس کے بعد فرمایا :-

جہانگیر : اس ملک میں قیام کا ارادہ ہے یا اپنے وطن کو واپس جانے کا قصد ہے یا حرمین شریفین کی زیارت مقصود ہے ؟

مطربی : قبلہ عالم! یہ ناچیز بندہ و خلیفۂ الٰہی کے فرمان کا تابع ہے۔ اگر قیام کے لیے فرمائیں گے تو رہ جاؤں گا۔ اگر جانے کی اجازت دیں گے تو چلا جاؤں گا۔ اگر ارض مقدس کی زیارت کو بھیجیں گے تو بسر و چشم جاؤں گا۔ ان میں سے کسی پر بھی میرا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں تو آپ کی رضا کا خواہاں ہوں :-

ہر آں کہ مبتلائے دوست باشد رضائے او، رضائے دوست باشد
(مطربی)

اس کے بعد فرمایا کہ ما بدولت آپ کو چار چیزیں مرحمت فرمائیں گے مگر یکبارگی نہیں بلکہ بتدریج۔ اول نقدی برائے خرچ، دوئم خلعت برائے پوشش، سوم اسپ و زین برائے سواری، چہارم غلام بچہ برائے خدمت گاری۔ ان میں سے کون سا تحفہ آج قبول کریں گے میں نے عرض کیا :-

بے زر مقبل کہ کار زر دارد زر نزد ہمہ اعتبار زر دارد زر
گویند کہ: اعتبار از زر بہتر مشنو کہ اعتبار زر دارد زر
(مطربی)

اسی لمحہ ایک ہزار روپے کی تھیلی مرحمت کی گئی اور پانچ سو روپے کا عطیہ ملکہ نورجہاں کی جانب سے پیش کیا گیا۔ اسی وقت یہ شعر موزوں ہو گیا :-

الٰہی! تا جہاں باشد، شہ صاحبقراں باشد
بظلِ شاہ، باقی تا ابد نورِ جہاں باشد
(مطربی)

اس بیت کو پیش کرنے کے بعد میں نے کہا "شاہا! آپ کی عنایت بیکراں مجھے اس جود و سخا کی یاد دلاتی ہے جو صاحبقرانی (امیر تیمور گورگان) نے خواجہ شمس الدین محمد الحافظ الشیرازی پر کی تھی۔ جب صاحبقراں نے شیراز کو فتح کر لیا تو خواجہ حافظ سے استفسار کیا کہ اے حافظ! کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں تیغ و سناں کے ذریعہ ملکوں کو اس غرض سے فتح کرتا ہوں کہ اپنی موروثی مملکت کے شہر سمرقند و بخارا کو اُن کے شایانِ شان آباد کر دوں اور تو ایسے آباد، پر رونق اور گلزار شہروں کو جن کی مثال مشکل سے ہی کسی ملک میں ہو گی ایک ترک شیرازی کے رُخ کے سیاہ تل پر بخش دیتا ہے :-

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را (حافظ)

نواب [illegible] اس وقت مخلص در پیشان حال [illegible] نے کہا قبلہ عالم! الٰہی اس کی بخشش بدگم کی ہے تو میں [illegible] ہو گیا ہوں۔ حضرت صاحبقراں کو ریلیۂ بعد یاد فرمایا کہ میں مجھے جلد چند اشعار و چیا ہوں تو ایک [illegible] دوں گا۔ بر وقت خلعت تو نظر کی مگر اسپ و زین نہ ملی۔ حافظ نے کہا کہ خداوند نعمت اگر زر عنایت کریں تو اسپ و زین بازار میں مل جائیں گے۔ صاحبقرانی نے درخواست قبول فرمالی: اتنا عرض کرنے کے بعد دست بدعا ہو کر میں نے کہا:

الٰہی! تاکہ مہر و ماہ باشد　　جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات دوم)

جب آداب سلطانی بجا لایا تو مجھے اپنے قریب بلا لیا۔ اس وقت شاہزادہ شہریار، ارکان دولت میں نواب آصف خاں، خواجہ ابوالحسن دیوان، ارادت خاں، خواص خاں، بہادر خاں، ملا شیری، بیگمات اور کنیزیں سبھی حضرت کی بندگی کے لیے حاضر تھے۔ حکم یہ صادر ہوا کہ استاد مطربی کو خلعت بخشی جائے۔ چنانچہ مجھے اور میرے بیٹے محمد علی کو ملبوسات فاخرہ سے مشرف کیا گیا۔ بعدہٗ فرمایا کہ اسپ و زین کل عنایت ہوگی۔

الٰہی تاکہ مہر و ماہ باشد　　جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات سوم)

شب دیگر کہ شاہ ہفت کشور　　نشیمن کرد تخت عالی زر

(مطربی)

آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ ارکان دولت و اعیان حضرت سبھی حاضر تھے۔ فرنگی تمہارے ہی پیش کش نذر کر رہے تھے۔ ظل الٰہی کے دست مبارک میں ایک مقفل کتابچہ دیباچہ بارہ اوراق پر مشتمل تھا۔ بندہ کو طلب کیا اور پوچھا یہ کونسی کتاب ہے۔ چونکہ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا اس لیے عرض کیا کہ قبلہ عالم! میں نہیں جانتا کہ یہ کیسی کتاب ہے۔ اپنے دست مبارک سے قفل کھول کر مجھے دکھایا بعد فرمایا کہ اس خوش نصیب کی اس سفید کاغذ کے حروف غائب ہو جاتے ہیں اور جب ورق کو اٹھا لیا جائے تو کاغذ پھر سفید ہو جاتا ہے۔ دوبارہ لگے اور انشا پنے کے لیے [illegible] دنیا کی ساری کتابیں اس پر لکھی جائیں [illegible] سفید ہی رہے گا۔ مجھے اس بات پر تعجب بھی ہوا اور حیرت کا اظہار بھی کیا۔ مجھے اس کی کرشمہ سازیاں دکھانے کے لیے آنکھوں سے اپنا ایک شعر تحریر فرمایا:

ما مہر بہ برگ گل نوشتیم　　شاید کہ صبا بیاد رساند

(جہانگیر)

پھر اپنے ہاتھ سے اسے مٹا دیا اور مجھے دکھایا۔ کاغذ سفید کا سفید ہی رہا۔ اس کے بعد فرمایا کہ بادولت اس کتاب کو تمہارے ہاتھ ایک روپیہ میں بیچ کرنا پسند کریں گے۔ کیا تم قبول کرو گے؟ ہمیں نے کہا قبلہ عالم! ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی طلسم ہو جسے کتابچہ کی شکل دے دی گئی ہو۔ اگر میں نے لے لی تو ممکن ہے مجھے کوئی نقصان پہنچ جائے۔ فرمایا کہ یہ کوئی طلسم نہیں ہے اور نہ اس سے کسی کو کبھی کوئی ضرر پہنچ سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ بروقت میری جیب میں ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ یہ سن کر فرمایا کہ تم کو بطور انعام دیتا ہوں۔ بعد تعظیم و تسلیم کتابچہ کو یہ کہتے ہوئے قبول کر لیا کہ اگر بتوفیق تعالیٰ اس دربار سے رخصت ہو کر توران پہنچ گیا تو اس مجموعہ روزگار کو مملکت توران کے تاجدار امام قلی بہادر خاں کو تحفۃً نذر کر دوں گا۔

ملاقات ششم

ظل سبحانی جشن مبارک قمری کی تیاری تھی۔ ایک عالم تھا کہ زیب و زینت میں غرق تھا۔ میں بھی بہر تماشا گیا۔ اس جشن کی خوبی و تزئین کی شرح زبان سے ادا کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس ساعت کو دیکھ کر عقل حیران تھی۔ ظل الٰہی سونے، چاندی اور جواہرات میں تولے گئے۔ نقد جواہر بخشش میں دیے گئے۔ اس بندہ ناچیز پر بھی دو [illegible] سے بھرے ہوئے دو طبق نچھاور کیے گئے۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے دست مبارک سے دونوں طبق کے روپے میرے دامن پر گرا دیے۔ [illegible] شکرانہ کیا۔

الٰہی تاکہ مہر و ماہ باشد　　جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

بعد ازآں فرمایا کہ میرے جشن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے فی البدیہہ یہ رباعی عرض کی۔

در جشن شہنشاہ عود، حیران شد — وز حیرت آں، سپہر سرگرداں شد
چوں شاہ نشست در ترازو، گفتم — خورشید جہاں، بخانۂ میزاں شد

(مطربی)

اس رباعی کی تعریف کی اور سو روپے مزید لطف و انعام عنایت کیا اور فرمایا کہ اسپ و زین دینے کا جو وعدہ بادولت نے کیا تھا، اسے آج دینا چاہتا ہوں۔ ہاں! یہ تو بتاؤ کس نسل کا گھوڑا پسند کروگے۔ عراقی یا ترکی؟ میں نے کہا قبلۂ عالم! جس کی قیمت زیادہ ہو وہی مرحمت فرمائیں۔ فرمایا کہ عراقی گھوڑے کی قیمت تو زیادہ ہے مگر وہ بہت ہی شوخ و شریر ہے۔ تم اس پر سوار نہ ہو سکوگے۔ اچھا! زین کونسی لوگے۔ مخملی یا سقرلات کی؟ میں نے عرض کیا کہ جس کی قیمت زیادہ ہو۔ فرمایا کہ کونسی زین تمہارے خیال میں زیادہ قیمتی ہوگی۔ میں نے کہا کہ زین مخملی۔ فرمایا کہ ٹھیک کہتے ہو۔ مگر زین مخملی بارش میں تر ہو جائے گی اور زین سقرلات اگرچہ نسبتاً کم قیمت ہے مگر بارش کے اثر سے محفوظ رہے گی۔ میں نے کہا کہ قبلۂ عالم! برسات کا موسم ابھی دور ہے۔ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ عراقی گھوڑا اور مخملی زین مابدولت تم کو مرحمت فرماتے ہیں۔ میں نے ایک قطعہ فوراً نظم کیا جس کے دو اشعار یہ تھے:-

لطف بیکراں، اسپے عنایت کرد با بندہ
کہ تواں رسیدن گرد گردش روز میداں باد
بہ خادم کرد از احساں و دستار و زر و خلعت
الٰہی سال عمرش در جہاں بے پایاں باد

(مطربی)

ملاقات ہشتم

روز دیگر کہ شد از مہر جہاں نورانی — گشت ظاہر بہ جہاں کوکبۂ سلطانی

(مطربی)

آستاں بوسی کے بعد میں نے دیکھا کہ قبلۂ عالم کے سامنے چاندی کے طبق میں قند کا ایک اتنا بڑا ٹکڑا رکھا ہوا ہے جو بخارا کے وزن میں نصف من رہا ہوگا۔ مجھے اپنے قریب بلا کر کہا کہ قند کا اتنا بڑا ٹکڑا کیا تم نے ماوراءالنہر میں دیکھا ہے۔ میں نے کہا اپنی زندگی میں اتنا بڑا ٹکڑا نہیں دیکھا ہے۔ فرمایا کہ آج ہی میرے ایک بندۂ صادق الاخلاص مسمی محمد حسین اسے لکناؤ (لکھنؤ) سے لائے ہیں۔ لکناؤ سے دارالسرور لاہور تک ایک ماہ کی مسافت ہے۔ اسے میں تم کو بطور تحفہ دیتا ہوں۔ میں نے تعظیم و تکریم بجا لانے کے بعد کہا۔

الٰہی تا کہ مہر و ماہ باشد — جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

فرمایا کہ اس قند کو لاہور ہی میں استعمال کروگے یا اپنے وطن کو لے جاؤگے۔ میں نے کہا قبلۂ عالم! لاہور میں تو کھانے کے لیے قند بافراط ملتی ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ میں اسے سمرقند لے جاؤں۔ فرمایا کہ ماوراءالنہر میں یہ قند کس کے لائق ہے۔ میں نے کہا اس قند کے لائق دو ہستیاں ہیں۔ ایک تو توران کے حکمراں امام قلی خاں اور دوسرے قطب زماں حضرت خواجہ ہاشم محمد دہبیدی۔

ملاقات دھم

خلیفۂ الٰہی کی آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ چونکہ ظل سبحانی ارکان دولت سے امور سلطنت کے بارے میں محو گفتگو تھے اس لیے تعظیم بجا لانے کے بعد ایک کنارے بیٹھ گیا۔ احکامات نافذ کرنے کے بعد مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں نے دیکھا کہ قبلۂ عالم کے سامنے ایک طشت میں شکار کیا ہوا ایک پرندہ (سرخاب) رکھا ہوا ہے۔ مجھ سے فرمایا کہ میں کل شکار کھیلنے گیا تھا۔ یہ سرخاب دکھائی پڑا۔ میں نے اپنی بندوق اٹھائی اور یہ کہہ کر فیر کر دیا کہ یہ شکار استاد مطربی کی نذر ہوگا۔ نشانہ صحیح پڑا اور یہ سرخاب شکار ہو گیا۔ تمہارے لیے یہ محفوظ کر دیا گیا تھا اسے تمہاری نذر کر رہا ہوں۔ تسلیم بجا لایا اور کہا:

الٰہی تا کہ مہر و ماہ باشد — جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

جب میں نے سرخاب کو اٹھایا تو میرے محسن نے فرمایا کہ میں نے تمہارے لیے یہ کام کیا ہے۔ تم نے میرے لیے کیا کام کیا ہے؟ میں نے یہ رباعی پیش کی:-

شاہی کہ بخشش، بہ مہر و مہ آبی داد
ابر از کششِ بجفت دل آبی داد
چوں دید کہ موفیم بہ پیران سری
سرخ آب ندارد بلکہ سرخابی داد

(مطربی)

خوش ہو کر ایک سو روپیہ انعام میں عطا کیے۔

(ملاقات دوازدھم)

چاندنی رات تھی۔ ماہ عالم افروز اپنی ضیا پاشیوں سے عالم کو منور کر رہا تھا۔ ارکان دولت داعیان حکومت سبھی سفید پوش خدمت عالی میں ایستادہ تھے۔ اس جشن سیمیں کے لیے سفید سنگ مرمر کا ایک تخت نصب کیا گیا بادشاہ سلامت اس تخت پر رونق افروز ہوئے۔ میں آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ امیروں میں سے بعض نے مجھے ٹوکا کہ آج کی رات آستاں بوسی کے لیے خلعت سفید شرط ہے۔ چونکہ مجھے اس شرط کا علم نہ تھا اور میں غیر سفید لباس میں ملبوس تھا اس لیے یہ رباعی کہہ کر عندلیب خوش الحان فصیح خاں کو دیدی کہ خلیفہ الٰہی کے حضور پیش کر دیں:۔

امشب کہ خورد ودو زخواب آمدہ است
آفاق ز ماہ نور یاب آمدہ است
در پرتو ماہ، شاہ گردید عیاں
یا مہر، بسیر ماہتاب آمدہ است

(مطربی)

اس رباعی کو سن کر حکم صادر ہوا کہ استاد مطربی کو دستار سفید اعلیٰ و خلعت سفید زیبا پہنا کر حضور میں پیش کیا جائے چونکہ خلعت سے سرفراز اور درباریوں میں شامل کر لیا گیا تھا اس لیے تسلیم بجالانے کے بعد کہا:۔
الٰہی! تا کہ مہر و ماہ باشد جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات چہاردھم)

شبے چوں صبح صادق، نور افشاں منور گشتہ از نورش، دل و جاں

(مطربی)

جب آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا تو خلیفہ الٰہی نے فرمایا کہ میں خرید و فروخت کے سلسلے میں احکام خداوندی پر عمل کرتا ہوں۔ چنانچہ تین نفر غلام بچے دربار میں لائے گئے۔ ظل الٰہی نے فرمایا کہ ان غلام بچوں کی قیمت دیکر خرید کیا ہے۔ اب انھیں اسی قیمت پر فروخت کرنا ہے حاضرین میں سے جو بھی چاہے قیمت ادا کر کے خرید سکتا ہے۔

عندلیب خوش الحان فصیح خاں نے ایک غلام بچے کی قیمت دو سو روپے تھی خرید لیا۔ دوسرے غلام بچہ کو جو قد میں کسی قدر پست تھا۔ محمد حسین نے ڈیڑھ سو روپے میں خرید لیا تیسرے غلام بچہ کو میرے بیٹے محمد علی نے میری خدمت کے لیے لینا چاہا۔ قیمت دریافت کرنے پر فرمایا کہ اس کی قیمت ایک سو بیس روپے ہے۔ میرے بیٹے نے اسے اسی قیمت پر خرید لیا۔ لے کر جب ہم لوگ جائے قیام پر پہنچے تو جلد ہی اس بات کا علم ہو گیا کہ غلام بچہ بہرا ہے۔ میرے لیے یہ ایک حیران کن بات تھی کہ اگر میں معاہدہ کو رد کر کے غلام بچہ کو واپس کرتا ہوں تو ظل سبحانی کے شایان شان نہ ہوگا۔ دوسرے دن میں ایک سو بیس روپے گن کر رومال میں باندھ کر آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ اس وقت دربار میں سبھی ارکان دولت حاضر تھے۔ ظل الٰہی کی نظر انور جب اس خاکسار پر پڑی تو فرمایا" استاد ہاتھ میں کیا لیے ہوئے ہو؟" میں نے کہا" غلام بچہ کی قیمت لایا ہوں" فرمایا" کیا غلام بچہ بہرا نہیں ہے؟" میں نے کہا قبلہ عالم! وہ بہرا ہے میں بہرا۔ غرضکہ بہرا ہی بہرا" زیر لب مسکراتے ہوئے فرمایا" غلام بچہ کی قیمت تم کو بخش دیتا ہوں اور مزید سو روپے عطا کرتا ہوں"۔ تسلیم و تعظیم بجالاتے ہوئے عرض کیا:
الٰہی! تا کہ مہر و ماہ باشد جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات شانزدھم)

آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا اور جب تعظیم و تکریم بجالایا

تو خلیفۂ الٰہی متوجہ ہوئے اور فرمایا "استاد! گورے رنگ کا آدمی زیادہ خوبرو ہوتا ہے یا سانولے رنگ کا۔ میں نے کہا کہ طبائع میں فرق ہوتا ہے۔ کسی کو گورا رنگ پسند آتا ہے اور کسی کو سانولا۔ خلیفۂ الٰہی نے فرمایا کہ ہم بدولت تمہاری طبیعت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں دوسروں کی طبائع سے کیا سروکار۔ میں نے کہا کہ نظر آئے تو بتاؤں۔ فرمایا۔ دائیں اور بائیں جانب نگاہ دوڑاؤ تو شاید معلوم ہو جائے"۔ میں نے دائیں جانب نظر کی تو دیکھا کہ سانولے رنگ کا راجہ بچہ کھڑا تھا جو آفت جاں تھا۔ جب اسے دیکھا تو دل ہاتھ سے جاتا رہا:-

ہندو بچہ، دل زمن مسکیں برد — از سینہ قرار، واز دلم تسکیں برد
عقل و خرد و صبر و شکیبائی را — ایں جملہ بخندۂ شیریں برد

— مطربی

بائیں جانب گورا چٹا خوبرو کمسن نوجوان کھڑا تھا۔ وہ اتنا حسین تھا کہ اس کے دیکھنے سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور بینائی ختم ہو گئی:-

اے ماہ سفید پوست از شب خوبی — در پر تو شمع، بس عجب مرغوبی
دل می بری از مطربی بے سرو پا — با غمزہ و ناز و عشوہ و محبوبی

— مطربی

میں نے ایک مرتبہ پھر دونوں جانب نظارہ کرتے ہوئے کہا "قبلۂ عالم! ایک بار تو میری آنکھوں میں سیاہی آئی اور دوسری بار سفیدی۔ ان دونوں رنگوں کے اختلاط سے تیسرا رنگ حاصل ہوا یعنی سبز نباتی رنگ کہ یہ رنگ ملاحت پر دلالت کرتا ہے"۔ قبلۂ عالم نے فرمایا کہ اسے سبز نمکین کہنا چاہیے۔

میں نے عرض کیا:-

الٰہی! تا کہ مہر و ماہ باشد — جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات نوزدہم)

خلیفۂ الٰہی کی بندگی کے لیے حاضر ہوا۔ تخت پر جلوہ گر ہو کر ایک شعر کہا اور کاغذ پر لکھ کر اس فقیر کو دیا اور فرمایا کہ اسی وزن اور قافیہ میں کہو۔ وہ شعر یہ تھا:-

چشم عاشق چراغ را ماند — تا نسوزد نمی رود خوابش

(جہانگیر)

میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:-

دل عاشق کباب را ماند — تا نسوزد نمی رود آبش

منکرین میں سے ایک نے کہا کہ یہ شعر تو غالباً استاد کا ہے۔ یہ طعنہ سن کر میں نے دوسرا شعر کہا:-

چشم عاشق مثال دریا ہست — کو نیابند خلق پایابش

خلیفۂ الٰہی نے اس ملحد پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ بھی استاد کا شعر ہے؟ میں نے ایک دوسرا شعر نظم کر دیا:-

ہر کہ عاشق بود بمعشوقی — راست گویم، نمی برد خوابش

خلیفۂ الٰہی نے یہ شعر میری خاطر کہا:-

ہر کجا دل شکستہ باشد — پادشاہا بلطف دریابش

(جہانگیر)

اس کے بعد فرمایا کہ میں تم کو لے کر کشمیر جنت نظیر کی سیر کو جاؤں گا اور انعام و اکرام سے نوازوں گا۔ تسلیم بجا لانے کے بعد میں نے عرض کیا:-

الٰہی! تا کہ مہر و ماہ باشد — جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات بیست و یکم)

روز دیگر کہ ز خورشید جہاں، نور گرفت
جام مے، بر کف خود، ساقی مخمور گرفت

(مطربی)

آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ فرمایا کہ فصیح خاں روزانہ ایک پہر تمہاری تصنیف "نسخۂ زیبائے جہانگیر" میرے سامنے پڑھتے ہیں جسے سن کر میں بے حد محظوظ ہوتا رہتا ہوں اور اس کی قدر و قیمت میری نگاہ میں بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ استاد! آپ کی عمر کتنی ہو گی۔ میں نے کہا ایک رباعی عرض کی ہے جس سے میری عمر کا اندازہ ہو جائے گا۔ فرمایا اسے پڑھو۔ میں نے رباعی پڑھ کر سنائی۔

در آخر عمر، چوں خدا دولت داد — راہم بسوئے خطۂ لاہور فتاد

دیدار ہمایوں جہانگیر نمود   آں روز کہ بود سالِ عمرم ہفت:

(مطربی)

درباریوں میں سے ایک بیوقوف نے کہا کہ "جہانگیریم دری" کا اضافہ کرکے جہانگیری پڑھنا چاہیے۔ آں حضرت نے اس کی بات رد کرتے ہوئے فرمایا کہ استاد نے جو کچھ کہا ہے وہی خوب ہے۔

میں نے عرض کیا کہ جب میری عمر ساٹھ سال کی ہوئی تو میں نے اپنی عمر ظاہر کرنے کے لیے ایک رباعی کہی اور ہر سال اس میں عمر کے ساتھ اضافہ کرتا جاتا ہوں اور آخر دم تک یہ سلسلہ جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔ میں نے ایک ایک کرکے چالیس رباعیاں اعلیٰ حضرت کو سنائیں۔ ظلِ سبحانی نے ان رباعیوں کو پسند فرمایا اور مجھے انعام واکرام سے نوازا۔ تسلیم بجا لاتے ہوئے میں نے کہا:۔

الہٰی! تاکہ مہر و ماہ باشد   جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات بست و سوم)

روز دیگر کہ دلم جانب شہ راہی شد
بوسہ گاہ لب من خاک رہ شاہی شد

(مطربی)

جب میں آستاں بوسی کی رسم بجا لایا تو بصد لطف وعنایت فرمایا کہ فصیح خاں نے آج "نسخۂ زیبائے جہانگیر" کے آخری صفحات بھی پڑھ کر سنا دیے۔ مابدولت نے اس نسخۂ دلپذیر کا منہ لیاقوت والوجات (ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی) ــــ کو مکتوب خاں کے سپرد کر دیا ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے سعیٔ بلیغ کرے۔ اب میری دلی خواہش ہے کہ "تذکرۃ الشعراء جہانگیر" کو جسے میں نے عہدِ شہزادگی میں ترتیب دیا تھا اپنی کتاب میں شامل کرنے کا شرف بخشیں۔ میں نے کہا کہ اس نسخہ کو بطور تبرک "نسخۂ زیبائے جہانگیر" میں شامل کرکے اس کی زینت بڑھاؤں گا۔ تسلیم بجا لانے کے بعد کہا:۔

الہٰی! تاکہ مہر و ماہ باشد
جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

(ملاقات بست و چہارم)
(آخری ملاقات)

خلیفۂ الٰہی کی بندگی کے لیے حاضر ہوا۔ ارکانِ دولت موجود تھے۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ ظلِ سبحانی کا خیال ہے کہ آپ اُن کے ہمراہ کشمیر کی سیر کو جائیں مگر میں اپنی ناسازیٔ طبع اور ضعفِ پیری کی وجہ سے وطن واپس جانے کا متمنی تھا۔ چنانچہ میں نے اس خیال کے تحت فی البدیہہ ایک غزل کہی جس کا مقطع یہ تھا:

دل می کشد بسوئے وطن باز مطربی   رخصت ز بادشاہ جہانگیر اکبر است

(مطربی)

یہ پوری غزل سماعت کرنے کے بعد زبان گوہر بار سے کچھ نہ فرمایا۔ آصف خاں نے کہا "قبلۂ عالمیان! استاد مطربی کیا کہتے ہیں؟" ترش روئی سے فرمایا "کیا پوچھتے ہو۔ رخصت چاہتے ہیں۔" اس کے بعد میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا "استاد! آپ کی غزل خوب ہے۔ مجھے پسند آئی۔ مابدولت نے ابھی ابھی اسی بحر، اسی وزن اور اسی قافیہ میں ایک شعر نظم کیا ہے مناسب یہ ہے کہ اسے اپنی غزل میں شامل کر لیں۔ میں نے تسلیم بجا لاتے ہوئے عرض کیا:۔

الہٰی! تاکہ مہر و ماہ باشد   جہانگیر ابن اکبر شاہ باشد

بعدہٗ قبلۂ عالم نے اپنا شعر پڑھ کر سنایا:۔

از من بتاب رُخ، کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو، بصد خون برابر است   (بیت جہانگیر)

بعد ازاں فرمایا کہ "مجھ سے رخصت لے کر کہاں جانے کا قصد کیا؟" "سمرقند جاؤں گا کہ اپنے اہل وعیال کو آپ کے صدقات پہنچا سکوں۔" فرمایا کہ "تمہارے متعلقین کی کل تعداد کتنی ہے؟" میں نے کہا کہ "بیس نفر۔" فرمایا "تم میرے ہمراہ بہ کشمیر جنت نظیر چلو اور مابدولت دو ہزار روپے کی رقم تمہارے متعلقین کے لیے سمرقند بھجوا دیں گے۔" مگر میں رخصت لینے کے لیے اصرار کرتا رہا۔ بعدہٗ فرمایا کہ تم مجھ سے زبردستی اجازت چاہتے ہو تو میں بھی کسی کو زبردستی روکنا نہیں چاہوں گا۔

ہی اس شرط پر بادولت ہمیں جانے کی اجازت دیتے ہیں کہ سال میں ایک بار سمرقند سے لاہور ضرور آؤ۔ میں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔

اس طور پر مطربی ۱۶۲۴ء مطابق سنہ ۱۰۳۴ھ میں اکیاسی سال کی عمر میں لاہور سے روانہ ہو کر سمرقند پہنچ گئے جیسا کہ مندرجہ ذیل رباعی سے آشکارا ہوتا ہے:۔

صد شکر کہ از لطف خدائے ذوالمنن　　رفتم سوئے لاہور چو بادِ یمن
در مدت سیر بود عمرم ہفتاد　　ہفتاد و یکم بود رسیدم بوطن
(مطربی)

صد شکر کہ این نامہ باتمام رسید　　وآغاز کتاب ما بانجام رسید
(مطربی)

اس تاریخ کے بعد مطربی نے دوبارہ ہند کا سفر کیا کہ نہیں۔ یہ معلوم نہیں۔ غالباً وہ اپنے وطن مالوف میں ہی وفات پا کر سپرد خاک کر دیئے گئے۔

حوالہ

(خاطرات مطربی سمرقندی، مرتبہ پروفیسر عبدالغنی میرزایف (تاجکستان) (انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔ کراچی یونیورسٹی)

★

رئیس نعمانی
۱۹۱، اصطبل چارباغ لکھنؤ

غزل

بات کا رنگ، بہر رنگ، رہا بات کا رنگ
کسی عنواں سے نمایاں نہ ہوا ذات کا رنگ

نہیں معلوم، ہے کیا ان کے خیالات کا رنگ
یاں تو اب بھی وہی دل ہے وہی جذبات کا رنگ

دیکھیے رنگ بدلتا ہے زمانہ کیا کیا
کبھی ایسا تو نہ تھا گردشِ حالات کا رنگ

ابھی مستور ہے نظروں سے حقائق کا جمال
اور تبدیل ہو رسم و روایات کا رنگ

میری آشفتگیٔ شوق کو الزام نہ دے
گر تری بات میں آ جائے مری بات کا رنگ

اے ہوائے المتانِ تمنا، بس کر!
اڑ چکا لوحِ تصور سے نشانات کا رنگ

زندگی اس کے نہ ہونے سے ہے بے رنگ اپنی
ورنہ اب بھی وہی دن کا ہے وہی رات کا رنگ

کون جانے دلِ شاعر پہ جو گزرے ہے رئیسؔ
لب تلک آتے بدل جائے ہے ہر بات کا رنگ

وجاہت علی سندیلوی
سندیلہ۔ ہردوئی

(افسانہ)

رشتہ اِفلاس کا

ماں کا خط پڑھ کر رمیش نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے اس کی روح کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسا دیے گئے ہوں۔ وہ جب ہردوئی کی نوکری چھوڑ کر لکھنؤ میں زیادہ اچھی اور بڑی تنخواہ کے عہدے پر تعینات ہوا تھا تو وہ اپنی ماں سے وعدہ کر آیا تھا کہ وہ ہر مہینے اپنے بھائی مکیش کی پڑھائی کے لیے کچھ روپے ضرور بھیجتا رہے گا۔ لیکن آٹھ مہینے گزر جانے کے باوجود وہ اپنی ماں کو کچھ بھی نہیں بھیج پایا تھا۔ شہر آ کر ایک تو یوں ہی اس کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ اور پھر دوسرے دفتر والوں کی ریس میں کپڑے لتوں کی ٹیم ٹام میں بھی اس کی تنخواہ کا اچھا خاصہ حصہ نکل جاتا۔

اپنے خط میں ماں نے اپنی اور مکیش کی خیریت بتانے کے بعد ڈیوڑھی کی چھت ٹپکنے اور پچھواڑے کے کھیت میں دھان کی فصل کی بابت لکھا تھا۔ پھر بھینس کے پڑیا بیانے کی خوشخبری بھی سنائی تھی اور سب سے آخر میں لکھا تھا۔ "تمھارے بھیجے ہوئے روپے مجھے ہر مہینے مل رہے ہیں۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔

"تمھاری ماں"

روپے بھیجنے کے بارے میں، رمیش نے خط کو بار بار پڑھا اور ہر بار پڑھنے کے بعد وہ تلملا اٹھتا۔ اس نے تو ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا تھا۔ ماں نے کتنی مہین چٹکی کاٹی تھی، کیسی نفرت سے اس کے منھ پر تھوک دیا تھا! وہ چاہتا تھا کہ اسی وقت ماں کو کچھ بھیج دے لیکن مہینہ ختم پر تھا، بہت سے خرچ باقی تھے، اور اس کے پاس پورے تیس روپے بھی نہیں تھے۔ اس نے اپنے ساتھی کلرک احمد دین سے اگلی تنخواہ ملنے تک کے لیے سو روپے قرض مانگے۔ لیکن وہ بیوی بچوں والا آدمی پہلے ہی سے پریشان حال تھا، کہنے لگا "یہ لڑکی کے واسطے جہیز خریدنے کے لیے پچیس روپے بڑی مشکل سے گھر والی نے دیے ہیں۔ تمھیں ایسی ہی ضرورت ہو تو وہ لے لو، جہیز کا کپڑا اگلے مہینے آ جائے گا۔" رمیش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جیب سے روپیہ نکالنے سے روکتے ہوئے کہا "اتنے سے میرا کام نہیں چلے گا۔ رہنے دو۔ میں کوئی دوسرا انتظام کر لوں گا۔" وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد ماں کو سو روپے سے کم کیا بھیجے؟ اور یہ رقم اتنی تھی جو وہ اگلی تنخواہ پر بھی نہیں بھیج سکتا تھا۔ کیونکہ درزی کے یہاں اس کا ایک سوٹ پڑا ہوا تھا اور سلائی کے دام ادا کر کے اس کا لینا ضروری تھا۔ اسکوٹر کی اگلی قسط بھی پچھلی قسط کی بقایا کے ساتھ اگلے مہینے میں دیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اوشا جی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ہرگز مایوس نہیں کریں گی اور سو روپے قرض کیا بخشش کے طور پر دے دیں گی لیکن — لیکن — لیکن — اس سلسلے میں بہت سے لیکن تھے اور رمیش کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے ان کی اوٹ میں اس کی خودداری، اس کی شخصیت بلکہ اس کے پورے وجود کی میت رکھی ہو۔

کماری اوشا چترالنشی نے اس پر اس کی پچیس سالہ زندگی میں اتنے احسانات کیے تھے کہ وہ ان کے بوجھ کے تلے دب کر رہ گیا تھا۔ اوشا اس سے چند ہی مہینے بڑی تھی اور ساتھ کھیلی اور پڑھی تھی۔ لیکن اس کی کرم فرمائیوں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے انتہائی حقیر محسوس کرتا اور اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا۔ اکثر اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی ذات کا مصرف ہی صرف یہ ہو کہ اوشا جی اس پر اپنی غریب پروری کی نمائش کر سکیں۔

اسے اپنے بچپن کی سب سے پہلی بات جو یاد تھی وہ یہ کہ اوشا جی اپنی ماں سے یہ کہہ رہی تھیں "میں نے اپنا گرم کوٹ رمیش کو دیدیا ہے۔ وہ بے چارا جڑا رہا تھا۔" اور پھر جہاں تک رمیش کی یادداشت کام کرتی تھی اس نے بچپن میں جو بھی اچھے اور خوشنما کپڑے پہنے تھے وہ سب اوشا جی ہی کی اتارن تھے۔ اوشا کے دیے ہوئے کھلونے اور کتابوں کا اس کے پاس ایک ڈھیر سا لگ گیا تھا۔ اوشا کے باپ کی شاندار کوٹھی ہی کے کمپاؤنڈ میں رمیش کے باپ کا، جو کچہری میں چپراسی تھا، کچا اور کچھ پکا مکان تھا۔ اوشا اپنے دولتمند باپ کی اکلوتی لڑکی اور بہت دُلاری تھی۔ اس نے ضد کر کے رمیش کا نام اسی اسکول میں لکھا دیا تھا جس میں وہ خود پڑھتی تھی اور پھر اپنے پتا کامتا پرشاد چترالنشی سے جو قصبے کے مشہور ڈاکٹر تھے اس کی فیس، کتابیں اور یونیفارم وغیرہ کا خرچ ادا کرواتی۔ رمیش اوشا سے بالکل پیچھے نہیں تھا، پھر بھی وہ اپنے پرائیوٹ ٹیوٹر سے جو کچھ پڑھتی اسے باقاعدہ رمیش کو بھی پڑھاتی اور اگر کسی بات پر خفا ہوتی تو اس کی گوشمالی بھی کرتی۔

انٹرمیڈیٹ میں اوشا اور رمیش دونوں ہی فرسٹ ڈویژن پاس ہوئے۔ رمیش کو سرکاری وظیفہ ملا، یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے وہ بنارس چلا گیا اور اوشا لکھنؤ چلی آئی۔ اوشا ایم۔ اے کرنے کے بعد ڈگری کالج میں لیکچرار ہو گئی۔ اس کے ماں باپ اس کی ملازمت کرنے کے خلاف تھے۔ لیکن پھر اس کے شوق اور ڈاکٹریٹ کرنے کے ارادے کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ رمیش مقابلے کے کئی امتحانات میں بیٹھا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ پھر ہردوئی میں اسے نہر کے محکمے میں ایک معمولی سی نوکری مل گئی اور وہ دو سال وہاں کام کرتا رہا۔ لیکن آٹھ مہینے ہوئے اسے کارپوریشن میں ایک بہتر جگہ مل گئی تھی۔ لہٰذا وہ بھی لکھنؤ چلا آیا۔

یہ جانتے ہوئے بھی وہ لکھنؤ آنے کے پندرہ روز بعد تک اوشا سے نہیں ملا۔ وہ مکان یا کم سے کم ایک کمرے کی تلاش میں بری طرح سرگرداں رہا۔ لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اسے مجبوراً رات کو چارباغ اسٹیشن کے مسافر خانے میں رہنا پڑتا۔ تھک ہار کر وہ اوشا سے ملا، اور اس نے چٹکی بجاتے میں اس کی یہ مشکل آسان کر دی۔ اوشا کے فلیٹ سے ملی ہوئی دوسری بلڈنگ میں مالک مکان کا کچھ سامان ایک کمرے میں بند تھا۔ اس نے کہہ سن کر مالک مکان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنا سامان اس کے فلیٹ کی ایک ناغول میں منتقل کر دے اور صاف کرا کر وہ رمیش کو کرائے پر اٹھا دے۔ رمیش سے اس نے کہا "رمّو جب تک کوئی اور انتظام نہیں ہوتا، تم اسی کمرے میں آ جاؤ۔ باتھ روم وغیرہ نیچے کی منزل میں ہے۔ فی الحال اسی سے کام چلاؤ۔"

رمیش کو منہ مانگی مراد مل گئی ـــ یہ کمرہ اور اوشا کا فلیٹ بالکل ملے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ دونوں علیحدہ علیحدہ بلڈنگ سے متعلق تھے۔ لہٰذا کوئی درمیانی دروازہ نہیں تھا اور ایک دوسرے تک ایک زینہ اتر کر اور دوسرا چڑھ کر ہی پہنچا جا سکتا۔ البتہ دونوں کے سامنے کے برآمدے آپس میں بہت نزدیک تھے۔

رمیش کی سویرے کی چائے اور ناشتے کا مستقل ذمہ اوشا نے لے لیا تھا۔ پہلی ہی صبح اس نے اپنے برآمدے سے پکار کر کہا تھا۔ "رمّو آؤ یہ چائے لے لو۔" رمیش کو رمّو صرف اوشا اور اس کی ماں کہتی تھی۔ ہر روز سویرے رمیش ابھی ٹھیک سے جاگ بھی نہ پاتا کہ پہلے وہ یہ پکار سنتا اور پھر چند لمحوں بعد چائے اور ناشتے کی کشتی اس کے ہاتھ میں ہوتی ـــ ایک دو دفعہ رمیش نے کہا بھی "اوشا جی! آپ میرے لیے یہ تکلیف کیوں اٹھاتی ہیں؟" تو اوشا نے زبان

موجود ہیں لیکن یہ لوگ تعداد میں اتنے نہیں کہ ہر مقصد کے لیے پہنچ جا سکیں۔ لہٰذا مقاصد کی تکمیل کے لیے فرسٹ کلاس کے مغالطے سے دماغ کو صاف کر لینا چاہیے اور ڈویژن کو دماغی صلاحیتوں کی سند ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔

اردو ریسرچ میں خان آرزو کا نام سرفہرست ہے۔ محمود شیرانی، پرنسپل محمد شفیع، آزاد، حالی، شبلی وغیرہ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اردو ریسرچ کی باضابطہ اولین ڈگری ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۲۹ء میں "ہندستانی لسانیات اور صوتیات" پر لندن یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ہندستانی یونیورسٹیوں میں سب سے پہلے سید رفیق حسین نے ۱۹۴۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے "اردو غزل کی نشو و نما" پر ڈی۔فل کی ڈگری لی تھی۔ اردو کے سب سے پہلے ڈی۔لٹ۔ سید اعجاز حسین ہیں جنھیں الہ آباد یونیورسٹی نے "مذہب اور شاعری" پر یہ ڈگری دی تھی ۱۹۴۶ء تک اردو میں یورپ سے دو یا تین حضرات نے اور ہندستانی یونیورسٹیوں سے سات یا آٹھ حضرات نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ سردست ہندستان کی یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ ورک کی مجموعی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ اس موضوع پر جامع اور مکمل کتاب ڈاکٹر سید حامد حسین (بھوپال) کی زیر تحریر ہے۔ اس کتاب سے قارئین کو اردو ریسرچ کے جملہ اعداد و شمار کا صحیح علم حاصل ہوگا۔ بہر کیف! اس قدر وسیع پیمانے پر ریسرچ ورک ہونے کے باوجود ایسا مقالہ دستیاب نہیں جسے کلی اعتبار سے "حرف آخر" تسلیم کر لیا جائے۔ مالک رام نے اردو ریسرچ کے سمپوزیم میں بڑی صحیح بات کہی تھی کہ "اردو میں تحقیق کا معیار اس سطح پر نہیں آیا جس کی کسی ترقی یافتہ زبان سے توقع کی جا سکتی ہے"[۵] اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو کے تحقیق کنندگان سہل انگاری اور سہل پسندی سے کام لیتے ہیں۔ ہلکی سی محنت اور تھوڑے سے خرچ پر جو چیزیں دستیاب ہو جاتی ہیں اسی پر اعتبار کر کے اکتفا کر لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقالہ ریسرچ کی بنیادی خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا۔

ہندستان کی یونیورسٹیوں میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک لکچرر ریڈر بننے کے لیے تصنیف، تالیف پر کافی کاوش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک ریڈر پروفیسر بننے کے لیے اپنے علمی مساعی میں رواں دواں رہتا ہے لیکن پروفیسر بننے کے بعد عموماً علمی جد و جہد میں سستی اور دماغی کاوشوں میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے اور انسان اپنے ریٹائرمنٹ کے دن گنتے یا توسیع ملازمت کی جد و جہد میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ یہاں تحصیل علم کی غرض و غایت تبدیل ہو گئی ہے۔ تحصیل علم کی اصل غرض تو تکمیل نفس تھی لیکن اب اصلی غرض تکمیل روزی اور تکمیل ملازمت ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں علم سے لگن اور مصائب میں مگن رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ ہم آپ کو پہلے بتا چکے ہیں کہ جب تک کسی کے سر میں دھن دل میں لگن نہ ہو اور وہ مصائب میں مگن رہنے کے لیے تیار نہ ہو ریسرچ نہیں کر سکتا۔ یعنی بقول اقبال ؎

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی

یہی وجہ ہے کہ اردو میں کوئی ایسا نمایاں ریسرچ ورک نہیں ہو سکا۔ جسے ماہرین نے ایک مدت سے لیے بالاتفاق رائے مستند تسلیم کر لیا ہو۔ آج کل ہر یونیورسٹی میں اردو کا شعبۂ تحقیق مصروف کار ہے۔ اس کے علاوہ دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلما لکھنؤ، شمس الہدیٰ پٹنہ اور جامعہ رحمانی مونگیر کے اندر اردو کے مختلف پہلوؤں پر ریسرچ کا کام ہو رہا ہے لیکن اس وقت تک ایسی جامع، مکمل، مستند اور قابل قدر چیز برآمد نہ ہو سکی جسے اطمینان کلی کے ساتھ بین الاقوامی مقابلے میں پیش کیا جا سکے اور اس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ حقیقتاً معاملہ کیا ہے۔ ریسرچ کا طریقۂ کار مناسب اور درست نہیں یا پھر ہمارا ذہن علمی کاوشوں سے محروم ہے اور ہم تکرار کی جانب بڑھ رہے ہیں ایک ہی موضوع پر کئی مقالے ہمارے پیش نظر ہیں۔ جس سے تحقیق کنندگان کی عالمانہ چشم پوشی اور ذہنی تساہل صاف جھلکتا ہے اردو میں صرف داستان کے موضوع پر پانچ مقالے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے "اردو شاعری اور فن داستان گوئی" لکھا۔ ڈاکٹر گیان چند نے

۵؎ اردو میں تحقیق کا معیار: ماہنامہ "آج کل"، تحقیق نمبر

اوشا ہنستے ہوئے بولی: "تو شادی رمیش چندر سریواستوا جی! اسے انعام میں یہ سیب بھی کھاؤ کیونکہ سموسوں میں مرچ تیز ہونا لازمی ہے۔"

اور اس نے ایک سیب بھی رمیش کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تھوڑی دیر وقفے کے بعد وہ کافی کی پیالی لاتی ہوئی تو کہنے لگی: "آج ہم کچھ ٹیچرز اپنے کالج کی پرنسپل کے ساتھ 'معصوم قاتل' دیکھنے جا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ فلم بہت اچھی ہے۔ تمہارا جی چاہے تو تم بھی آجاؤ۔ لیکن وہاں مجھے پہچاننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ —— تم یقین ہی نہیں کر سکتے کہ میرے کالج میں آئے دن نت نئے اسکینڈل اڑتے ہیں اور ان سے سب سے زیادہ لطف میری کھوسٹ پرنسپل لیتی ہے۔"

بجلی کی جیسی سرعت سے ایک مکمل پلان رمیش کے ذہن میں آگیا اور اس نے زندہ دلی سے کہا: "اچھا آجاؤں گا اور یہ کیا رہے گا کہ میں آپ کے بجائے آپ کی پرنسپل کو پہچاننے اور ان سے پینگ بڑھانے کی کوشش کروں گا۔"

اوشا ہنستی کھلکھلاتی چلی گئی اور اپنے کمرے سے پکار کر کہا۔ "آ ضرور جانا، رتو!"

رمیش نے اوشا کو جب وہ کئی عورتوں کے ساتھ بالکونی کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اپنی جھلک دکھلا دی اور اس کی نگاہوں میں ایک شرارت آمیز مسکراہٹ بھی محسوس کی۔ وہ اپنے ٹکٹ والی سیٹ پر جو بالکونی کے نیچے تھی بیٹھ گیا لیکن جیسے ہی فلم شروع ہوئی وہ سینما ہال سے باہر نکل آیا اور اپنے اسکوٹر کے بجائے کرایے کے رکشے پر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ شام ہو چکی تھی اور سڑک کی روشنی کے باوجود کافی اندھیرا تھا۔ وہ نظریں بچا کر اپنے زینے پر چڑھ گیا اور پھر بڑی پھرتی سے جوتے اتار کر اپنے برآمدے سے اوشا کے برآمدے پر پہنچ گیا۔ دونوں دروازے اندر سے بند تھے۔ وہ شیشہ توڑ کر اندر کی سٹکنی کھولنے کے متعلق سوچنے لگا لیکن پاس ہی اسے باورچی خانے کی کھلی ہوئی کھڑکی دکھائی دی جو برآمدے ختم ہونے کے فوراً بعد تھی۔ وہ برآمدے کی منڈیر پر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس کھڑکی سے اندر پہنچ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ اوشا اپنے روپے اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر لگی ہوئی کتابوں میں سب سے شروع کی لال جلد والی کتاب میں رکھتی ہے۔ کئی روز ہوئے جب وہ اوشا کے برآمدے میں پردہ ٹانگ رہا تھا تو اس نے اس کو اسی کتاب سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا، حالانکہ اوشا کی اس کی طرف پیٹھ تھی۔ اس نے لپک کر وہ کتاب کھولی تو دیکھا کہ اس میں سو سے لے کر دس تک کے بہت سے نوٹ تھے۔ لیکن زیادہ تر سو کے، اور جن کی مالیت کئی ہزار ہو سکتی تھی۔ لیکن ان نوٹوں کے ساتھ کچھ منی آرڈر کی رسیدیں بھی تھیں۔ اس نے ان کو پڑھنے کے لیے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو تعجب کے مارے اسے ایک جھرجھری سی آگئی۔ ہر مہینے اس کے نام اور اوشا کی معرفت سے اس کی ماں کو پچاس روپے بھیجے گئے تھے اور ہر رسید پر وصول یابی کی سند میں اس کی ماں کا انگوٹھا لگا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے کتاب بند کر کے اسی جگہ پر رکھ دی اور جس طریقے سے فلیٹ میں داخل ہوا تھا ویسے ہی نکل کر انٹرول سے پہلے سینما ہال میں اپنی سیٹ پر پہنچ گیا۔

رمیش ایک بہت ہی اذیت ناک ذہنی اضطراب اور انتشار میں مبتلا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے یہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ بار بار ایک موہوم سی خواہش اس کے دل میں یہ ابھرتی کہ وہ کسی صورت سے اوشا کو کوئی تکلیف پہنچائے۔ اسے نیچا دکھائے۔ اسے ذلیل کرے۔ لیکن آخر کیوں؟ اس سوال کا جواب دینے کے متعلق وہ پھر ایک ذہنی بھول بھلیاں میں کھو جاتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ اسے اوشا کے پیروں پر سر رکھ کر اپنی حد درجہ کمینہ پن کی حرکت پر معافی مانگنا چاہیے۔ لیکن پھر وہ بڑی حقارت سے اس خیال کو ٹھکرا دیتا۔

وہ انٹرول ہی میں سینما ہال سے نکل گیا تھا اور پارک اور سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ گیارہ بجے کے قریب جب اسے یقین ہو گیا کہ اوشا

ہو چکی ہوگی، وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ لیکن اس کی آہٹ پاتے ہی اوشا نے پوچھا: "رتو فلم کیسی تھی؟"

رمیش ڈرا کہ اوشا پھر اپنی باتوں میں لگانے لگی اور خود اس کے دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ لہٰذا اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ "اوشا جی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!"

اوشا اپنے نائٹ گاؤن پر ایک چادر لپیٹے سامنے برآمدے پر آ گئی "کہو، کون سی ایسی بات ہے جو اسی وقت کہنا ضروری ہے؟"

"میں آپ سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ آپ مجھے حقارت سے دیکھتی ہیں۔ آپ کے ٹکڑوں اور حقیر ٹکڑوں پر پلنے والا میں ایک غریب چپراسی کا لڑکا ہوں نا۔ آپ مجھے اپنی خیرات دے دے کر کبھی سر اٹھا کر زندہ رہنے کا موقع نہیں دینا چاہتیں۔ اپنی انا کی طمانیت کے لیے آپ مجھے ہمیشہ اپنا دستنگر بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔ آپ میرے جسم کے ریشے ریشے کو اپنے احسانوں سے خرید کر مجھے صرف اپنے ایک حلقۂ بگوش غلام کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہیں...."

"بکواس بند کرو! یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے آج؟ ادھر آؤ میرے کمرے میں۔"

اوشا صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے رمیش کو ہاتھ سے اشارہ کیا، پھر بولی: "رمیش، تم خود اپنے احساس کم تری کا شکار ہو۔ کسی غریب چپراسی کی اولاد ہونا کوئی گناہ نہیں۔ میرے پتا جی کے والد ایک زمیندار کے یہاں صرف منشی تھے اور شاید اس سے بھی کم تنخواہ پر جو تمھارے پتا جی پاتے تھے۔ میں تمھیں ایک خود ساختہ اور قابل قدر انسان سمجھتی ہوں جیسے اپنے پتا جی کو سمجھتی ہوں...."

"آپ مجھ پر اتنی عنایت اتنے احسان کیوں کرتی ہیں؟"

"میں جو کچھ بھی تمھارے لیے کرتی ہوں، مجھے اچھا لگتا ہے۔ تم عنایت اور احسان کے الفاظ بھلا دو تو بات تمھاری سمجھ میں آ جائے۔ میرے پتا جی مجھے جو بلا ضرورت روپے، کپڑے، زیور اور تحفے بھیجتے ہیں تو کیا مجھے ذلیل اور حقیر سمجھ کر؟ مجھے اپنا دست نگر اور غلام بنانے کے لیے؟ میں ان سوغاتوں کو اس بات کا انعام سمجھتی ہوں کہ میں انھیں اچھی لگتی ہوں۔ کیا تم اس صورت سے نہیں سوچ سکتے؟"

رمیش کا ہیجان بہت کچھ پگھل رہا تھا لیکن وہ اپنے آپ پر جارحانہ کیفیت طاری رکھنا چاہتا تھا۔ "آپ نے میری ماں کو ماہ بماہ روپے بھیجے۔ میرے نام سے بھیجے اور مجھے بتائے بغیر؟"

"تو کیا ہوا؟ تم ہی نے چند مہینے ہوئے بتایا تھا کہ تم دعدہ کر آنے کے باوجود ماتا جی کو روپے نہیں بھیج پائے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ وہ منتظر ہوں گی، بھیج دیئے۔ تمھیں بتانے سے کیا فائدہ تھا۔ نہ بتانے سے زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ اگر ماں کو تم بھی بھیج دیتے تو انھیں دوہرے روپے مل جاتے۔"

رمیش پر اوشا کے دلائل کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ پھر اس پر سبقت لے جا رہی ہے اور اس کی شخصیت کو پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے، اوشا کو تکلیف پہنچانے کی موہوم خواہش کی جو چنگاری اس کے دل میں چھپی تھی، وہ ایک دم سے شعلہ بن گئی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اسے نیچا دکھا کر اس پر اپنی ہیبت کا سکہ جمانا چاہتا تھا۔

"اوشا جی! آپ کو معلوم ہے کہ میں کتنا احسان فراموش اور قابل نفرت ہوں؟" اور پھر اوشا کے چہرے پر تعجب کی کوئی بھی علامت نہ پا کر بہت زور دے کر کہا۔ "میں آج سینما ہال سے بھاگ کر آپ کے فلیٹ میں چوری کرنے کی نیت سے داخل ہوا تھا۔"

"تم فلم سے بور ہو کر سو گئے ہو گے۔ بہر کیف تم ایسا کرتے بھی تو میں تم سے نفرت نہ کرتی۔" اوشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے زمین پر رینگنے والے کسی کیڑے سے بھی حقیر نہ سمجھیے۔ میں اپنے آپ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دوں گا۔ دیکھیے اس وقت تو میں نہیں سو رہا ہوں۔" رمیش نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک

دم سے اوشا کو دبوچ لیا۔

اوشا نے کسمساتے ہوئے اپنی پوری طاقت سے اسے صوفے کے ایک کونے میں ڈھکیل دیا اور کھڑے ہو کر زور سے اس کے تھپڑ مارا۔

"اب بتاؤ نہ کرو گی مجھ سے نفرت؟" رمیش نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔

اوشا کچھ نہ بولی اور آہستہ سے چلتی ہوئی اس نے کمرے کی لمبائی کے دو چکر لگائے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی پھر وہ آ کر رمیش کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور متوازن لہجے میں کہنے لگی۔ "تمھیں خود نہیں معلوم رمو کہ تم نے یہ ہو ہیکا کیوں رچائی؟ مجھے تم سے نفرت نہیں ہمدردی ہے۔ میں تمھاری فطری ضرورت اور پیاس کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ لیکن ہر بات کا ایک سلیقہ اور قرینہ ہوتا ہے۔"

رمیش نے شرمندگی سے گڑگڑاتے ہوئے کہا "مجھے معاف کر دو اوشا جی! تم عورت نہیں دیوی ہو! تم عظیم ہو! میرا کوئی بھی تو تمھیں تمھاری بلندی سے نیچے نہیں لا سکتا۔ لیکن تمھیں بچپن سے پیار کرتا ہوں۔ میں تمھیں ہمیشہ اپنی پہنچ سے دور بہت دور سمجھتا رہا۔ میں مجبور تھا کہ تمھاری محبت اور ہمدردی کو کوئی دوسرے معنی پہناؤں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں کل سویرے ہی اپنے کمرے سے کسی ہوٹل میں اٹھ جاؤں گا اور پھر کبھی تمھیں منھ نہیں دکھاؤں گا۔"

اوشا نے رمیش کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "تو تم کہیں نہیں جا سکتے۔ اب تمھیں زندگی بھر مجھ سے قریب رہنا ہوگا اور شاید تمھیں یہ بتا دینا بھی ضروری ہوگا کہ ڈاکٹر کانتا پرشاد چترانشی میرے اصلی باپ نہیں ہیں۔ میں ان کی گود لی ہوئی بچی ہوں۔ میں صرف پانچ برس کی تھی جب وہ مجھے ایک یتیم خانے سے لائے تھے۔ انھوں نے اور ممی نے مجھے ٹوٹ کر پیار اور محبت دی ہے لیکن رمیش! تمھاری ہی طرح میں اپنے بچپن کا افلاس بھول نہیں سکتی!"

★

قاسم صہبا جمیلی
سکشن آفیسر، ڈوڈا ہائی کورٹ،
رانچی (بہار)

قطعات

کہدے کوئی تہذیب کے معماروں سے
اینٹوں سے نہ کچھ ہوگا نہ کچھ گاروں سے
تم شوق سے دیواریں اٹھاتے جاؤ
سیلاب رکا ہے کہیں دیواروں سے

لذتِ دردِ جگر سوزِ نہاں بھی چھینو
چھینو چھینو مری تاثیرِ فغاں بھی چھینو
چھین تو لی ہے مری شام و سحر کی رونق
چھن سکے گر تو مرا عزمِ جواں بھی چھینو

مری شاعری سوزِ دل کا فسانہ
مری زندگی اک تپشِ جاودانہ
بجھائے گا کیا میرے دل کی لگی کو
مری آگ کو تاپتا ہے زمانہ



رضا چکرپنوی
چکرپن ۔ بھیں ضلع مونگیر
بہار

اے شامِ اودھ، اے شامِ اودھ!
یہ حسن کہاں سے آیا ہے، پھولوں میں ترے خاروں میں ترے
یہ رنگ کہاں سے برسا ہے، لہکے ہوئے گلزاروں میں ترے
یہ نقش کہاں سے ابھرا ہے، بکھرے ہوئے شہپاروں میں ترے

اے شامِ اودھ، اے شامِ اودھ!
بازارِ امین آباد ہے یا رقصندہ ہے جمعِ زیبائی
یہ چوک ہے یا چھلکی ہے یہاں میخانۂ شب کی رعنائی
یہ خطۂ حضرت گنج ہے یا گلزارِ ارم کی انگڑائی

اے شامِ اودھ، اے شامِ اودھ!
یہ گومتی جمنا کے پانی سے تاثیرِ شفا ہے اب بھی عیاں
یہ قیصر باغ کے نظارے فردوسِ تمنا کے ساماں
گلزارِ حسین آباد میں ہے اک اور جہانِ حسنِ بتاں

اے شامِ اودھ، اے شامِ اودھ!
سرشار نے دنیا دیکھی تھی ان گلیوں میں بازاروں میں
رسوا نے ادائیں پرکھی تھیں ان ہی راہگزاروں میں
برسایا تھا جانِ عالم نے کیا عیش کا رنگ بہاروں میں

اے شامِ اودھ، اے شامِ اودھ!
اس ارضِ حسیں نے پہلے پہل آزادی کا نعرہ گایا تھا
اس باغ امیر الدولہ میں اک پرچم نو لہرایا تھا
نہرو، گاندھی، پنت نے یاں غنچہ کھویا تھا پھر پایا تھا

اے شامِ اودھ، اے شامِ اودھ!
سرسبز ہے اب بھی تیرا چمن نظارے ہیں تیرے اب بھی جواں
سرشار ہوائیں چلتی ہیں لہراتے ہیں آنچل اب بھی یہاں
ہر سمت نظر آجاتے ہیں گلبدن شمشاد قداں جلوہ ساماں

اے شامِ اودھ، اے شامِ اودھ!
یہ رنگ یہ حسن یہ رعنائی ہے جلوۂ فیضِ شامِ اودھ
بے شبہ نگاہِ عالم میں روشن ہے سدا یہ شامِ اودھ
شاید کہ مرے دل پر بھی رضا چھلکی ہے مے گلفامِ اودھ
اے شامِ اودھ اے شامِ اودھ
اے شامِ اودھ اے شامِ اودھ

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب۔ تذکرۂ شعرائے اترپردیش حصہ اول۔

نام مصنف۔ عرفان عباسی۔ صفحات ۲۲۰۔ قیمت ۳۰ روپیہ

عرفان عباسی صاحب اردو کے ایک مشہور مصنف ہیں۔ ان کا لکھنے پڑھنے کا رجحان ذوق و شوق کے حادثے سے گزر کر جذب و جنون کی منزل تک پہنچ گیا ہے۔ اس سے قبل وہ "تذکرہ شعرائے لکھنؤ" حصہ اول بہ عنوان "آپ" لکھ کر شائع کر چکے ہیں۔ ان کا دوسرا تذکرہ "آپ سے" بھی شائع ہو چکا ہے جو شعرائے قصبات اودھ پر مشتمل ہے۔ ان کی تیسری تصنیف "تذکرہ شعرائے اترپردیش" ہے جس میں اترپردیش کے ان شعرا کو شامل کیا گیا ہے جو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان گزرے ہیں۔ اس تذکرے میں ۵۰ شعرا شامل ہیں۔

عرفان عباسی صاحب نے "تذکرۂ شعرائے اترپردیش" حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر یہ تذکرہ ہی ہے۔ اس بنا پر یہ تذکرہ ترتیب کے اعتبار سے دور جدید کی ان کتب سے مختلف ہے جن کا موضوع تاریخ ادب اردو ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ تذکرہ قدیم تذکروں سے بھی جدا ہے۔ عرفان عباسی صاحب کے تذکرے میں تفصیلات زیادہ ہیں۔ خصوصاً انھوں نے شعرا کے بیانات میں ان کا سال ولادت اور سال وفات درج کر دیا ہے۔ قدیم تذکروں میں ان تاریخی امور سے عام طور پر بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ مگر عرفان عباسی صاحب نے اس امر کا خاص طور سے خیال رکھا ہے چنانچہ ہر شاعر کے نام کے نیچے اس کا سال ولادت اور سال وفات درج ہے۔ اس التزام کی بنا پر مختلف شعرا کا زمانہ متعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اس تذکرے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ عرفان عباسی صاحب نے نہایت کاوش اور تگ و دو کر کے مختلف شعرا کی تصویریں حاصل کی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے نہایت ایمانداری سے کام لیا ہے یعنی جس شاعر کی تصویر جس شخص کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے اس کا نام انھوں نے تصویر کے نیچے لکھ دیا ہے۔ اس طرح اس تذکرے میں ۴۸ شعرا کی تصویریں ہیں۔ صرف دو شاعرات یعنی سپہر آرا رابعہ خاتون پنہاںؔ بریلوی اور امۃ اللہ تسنیم رائے بریلوی کی تصویریں نہیں شائع کی ہیں کیونکہ یہ پردہ نشین شاعرات تھیں۔

عرفان عباسی صاحب کے تذکرے کی ایک اہم خصوصیت اس کو قدیم تذکروں سے ممتاز کرتی ہے۔ عرفان عباسی صاحب نے زیادہ تر انھیں شعرا کا ذکر کیا ہے جن کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لیے ان کی شکل و شباہت کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے اس میں صحت و صداقت کے جلوے رقصاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تذکرہ بہت وقیع اور مستند ہے۔ مثلاً اصغر گونڈوی کو نئی نسل نے نہیں دیکھا ہوگا کیونکہ ان کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہو گیا تھا مگر عرفان عباسی صاحب نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ فرماتے ہیں۔

"میں نے اصغر صاحب کی ایک جھلک اس وقت دیکھی جب وہ میرے بابا (بڑے چچا) کی عیادت کے لیے تشریف لائے اور چند لمحے بیٹھے۔"

چونکہ عرفان عباسی صاحب نے اصغر گونڈوی کا دیدار بذات خود کیا اس لیے ان کی شکل و شباہت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

"اوسط قد۔ اکہرا بدن۔ سن رسیدگی کے باوجود دلکش خد و خال۔ متوسط آنکھیں۔ ان پر چشمہ۔ سفید بھوئیں قدرے ابھری اور نکیلی ناک۔ چھوٹے کان۔ موٹی گردن موٹے تبسم ہونٹ۔"

اصغر گونڈوی کے کلام پر تنقیدیں لکھنا آسان ہے اور یہ کام ہر تعلیم یافتہ اور باشعور انسان کر سکتا ہے مگر اصغر گونڈوی کی شکل و صورت کا نقشہ کھینچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو
عرفان عباسی صاحب کا تذکرہ بھی ذاتی مشاہدے کی بنا پر اہم ہے۔
عرفان عباسی نے مختلف شعرا کے حالات زندگی یکجا کرنے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اس قدر مواد کس طرح حاصل کیا۔ مشہور شعراء کے حالات زندگی تو مختلف کتب میں مل جاتے ہیں مگر عرفان عباسی صاحب نے بہت سے گمنام شعرا کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ادب سیتا پوری، بیدل ملفوظ نگری، جوتم محمد آبادی۔ محشر مرزا پوری اور ناشاد کانپوری وغیرہ کے بارے میں لوگوں کو واقفیت کم ہے لیکن عرفان عباسی صاحب نے بہت تگ و دو کے بعد ان شعرا کے حالات زندگی اور کلام حاصل کرلیا اور ان کو اس تذکرے میں شامل کردیا۔

غرضیکہ تذکرہ شعرائے اترپردیش "حصہ اول" ہر لحاظ سے اہم ہے صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے یہ تذکرہ قابل تحسین ہے۔ اس کی کتابت اور طباعت اعلا درجے کی ہے۔ کاغذ بہت نفیس ہے۔ خصوصاً اس کا ٹائٹل پیج بہت دل کش ہے۔ ٹائٹل پیج پر اترپردیش کے حدود دکھائے گئے ہیں اور اس کے اندر مشہور شعرا کی تصویریں شائع کردی گئی ہیں اس لیے پہلی ہی نظر میں مختلف شعرا کے چہرے جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔ اس جدت سے ٹائٹل پیج بہت دل کش اور جاذب نظر ہوگیا ہے۔

عرفان عباسی صاحب نے تذکرہ شعرائے اترپردیش لکھ کر اردو ادب کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے بہت سے شعراء کو غیر فانی بنادیا ہے اور خود بھی غیر فانی بن گئے ہیں۔ یہ تذکرہ آئندہ کے محققین کے لیے مشعل راہ کا کام دے گا۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی

نام کتاب: "منتشر خاکے" مرتبین: شبیر اقبال و نورانی نور
قیمت: دس روپے (مجلد ثانی نسخہ: پندرہ روپے)
ملنے کے پتے: ناظمہ پبلی کیشنز دھولیہ، مکتبۂ شان ہند
انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

دھولیہ کے ۲۴ شعراء کے تذکرے پر مشتمل "منتشر خاکے" کئی سو برس پرانی ثقافتی اہمیت کے حامل اس دورافتادہ اور قدیم قصبہ کے چند نسبتاً غیر معروف غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے جسے شبیر اقبال اور نورانی نور نے احتیاط سے ترتیب دیا ہے۔ نمونۂ کلام کے علاوہ اس میں شعرا کے حالات زندگی بھی درج ہیں۔

ایسے وقت جب پیش لفظ نگار کے قول کے مطابق "ہر علاقے کے لوگوں نے اپنے علاقوں میں اردو ادب کی اہمیت اور اس کی مقبولیت کا جائزہ لینا شروع کیا ہے" مہاراشٹر کے اس مردم خیز قصبہ کے کچھ فنکاروں کا یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہیں ہے۔
آغاز ایک پیش لفظ سے کیا گیا ہے جس میں خاندیش اور دھولیہ میں اردو کی رسائی اور وہاں زبان و ادب کے فروغ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر ایک مختصر دیباچہ میں مراٹھی زبان و معاشرت سے متاثر اس علاقہ میں اردو کو گہوارے سنوارنے اور اسے نیا رنگ روپ دینے کے لیے ان شعرا کی کاوشوں کا ذکر ہے۔ ایک نسبتاً تفصیلی مقدمہ "شہر دھولیہ کی علمی ادبی و شعری حیثیت" کے بارے میں ہے جس میں دھولیہ کی تاریخ اس کے ثقافتی پس منظر اور جغرافیائی اہمیت کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔
انتخاب کلام سے قبل دھولیہ کے شعرا کی ایک نامکمل فہرست بھی درج ہے جسے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے جس میں لگ بھگ دو سو شعرا کے نام ہیں۔
"منتشر خاکے" میں شامل شعرا کا رنگ تغزل اگرچہ روایتی غزل گوئی کے اسلوب کا نمائندہ ہے پھر بھی کہیں کہیں جدت اور ترقی پسندی کے رجحانوں کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔

"بڑھ کر وہیں پہ تیرے تبسم نے روک دی
آئی جو میرے لب پہ غم زندگی کی بات"
(دائم احسن)

غم کا جھونکا تو مرے گھر کی طرف سے گزرا
اترا اترا ہے ترے شہر کا چہرہ کیسے
(عاجز)

غزل کا جو اسلوب عام طور پر مجموعہ میں شامل شعرا کے کلام میں اپنایا گیا ہے وہ معاملہ بندی، بندش کی چستی ردیف و قوافی کی خوبصورت تکرار اور واردات قلب و نظر کے اثر خیز بیان کے سبب پرکشش اور جمالیاتی خوبیوں کا حامل ہے۔

"ویرانے گلشن تو نہیں تھے
گلشن ہی ویرانے نکلے" (نورانی قر)

"بچ کے طوفاں سے مری کشتی کنارے آ بھی
مجھ پہ ہنسنے والو تم کو ڈوب جانا چاہیے" (شفیق طارق)

تاہم روایتی غزل گوئی کا اثر انتخاب پر حاوی ہے اگرچہ یہ بھی تانیثی نشتر زنی سے اکثر خالی نہیں ہے:

"نہیں معلوم کہ یہ رات کہاں تھی دن بھر
صبح کی بھٹکی ہوئی شام کو گھر آئی ہے"

"میری افتادگی عشق پہ ہنسنے والے!
چوٹ ابھی تو نے محبت کی کہاں کھائی ہے"

(حنیف انصاری)

اردو کے غیر معروف شعراء کو پڑھنے والوں میں روشناس کرانے کی سعی ہمیشہ لائق تحسین رہی ہے "منتشر غلکے" بھی اسی سلسلے کی ایک کامیاب کڑی ہے اور ہر طرح سے پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے .... — شاکر چودلی

نام کتاب: جاگتی آنکھوں کا خواب۔ شاعر: نازاں جمشید پوری ناشر: پندرہ روزہ لہو پیت تحصیل پورہ امرتسر قیمت: پانچ روپے

اس کتاب کے تخلیق کار نازاں جمشید پوری نے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ انھوں نے ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور کئی مختلف ناموں سے خدمات قلم انجام دیتے ہیں۔ پچھلے سال سکھوں میں جو کچھ ممکن تھا انھوں نے کیا ہے موجودہ کتاب ان کی آزاد نظموں سے مزین ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس مصرعوں کی چھوٹی چھوٹی نظمیں بھوک، دلربا، مجبوریہ، سکہ، سانپ، تارے، بچھو، قبر، چوٹیا، بندر وغیرہ شامل ہیں۔ گو کتابت اچھی نہیں ہے تاہم مصنف کی کوششوں نے اپنی لاج رکھ لی ہے۔

نام کتاب: گلشن گلستاں مرتبہ: شاہد ساگری
ناشر: شاہد پبلی کیشنز بھوپال قیمت: دس روپے

ڈاکٹر سید حامد حسین اور حافظ عاشق برکاتی کے مضامین کے ساتھ تین سو چھیالیس شاعروں کا کلام اس کتاب میں موجود ہے۔ بعض بالکل مبتدی شعراء ہیں تو کچھ منتہی بھی ہیں بلکہ بہت سے شعرا اور شاعرات تو ایسے ہیں جنھیں شاہد ساگری صاحب کی دریافت کہا جائے تو مناسب ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ ۳۴۶ شاعروں کا کلام یکجا کر لینا ہی کمال ہے چہ جائیکہ ان کے بارے میں مزید کچھ لکھنا۔ پچھلے پانچ چھ برس میں جو کتابیں اس ٹائپ کی چھپی ہیں ان میں یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے۔

— تسنیم فاروقی

نام کتاب: "موسم موسم" شاعر: جلیس نجیب آبادی
قیمت: دس روپے ملنے کا پتہ: پٹھان پورہ، نجیب آباد (یو، پی)

اترپردیش اردو اکیڈمی کے اشتراک سے شائع شدہ جلیس نجیب آبادی کا یہ مجموعہ ان کی دوسری شعری پیش کش ہے۔ "موسم موسم" غزلوں، گیتوں اور نظموں پر مشتمل ایک ایسی منظوم کاوش فکر ہے جو ایک نوجوان شاعر کے تجربات، احساسات اور جذبات کی دھیمی دھیمی آنچ میں تپ کر کندن بن گئی ہے۔ تفکر کا وہ ابہام، فلسفہ کی وہ گہرائی اور لب و لہجہ کا وہ اجنبی پن یہاں کہیں نظر نہیں آتا جو ان دنوں "بڑی شاعری" کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے مگر لاوے کی طرح سلگتی ہوئی سوز دروں کی وہ کیفیت، کرب کا وہ ذخیرہ اور درد کی وہ جلن ضرور ملے گی جس میں آج کا ذہن اور دل دونوں جھلستے رہتے ہیں:

تمھاری یاد کے شعلوں میں جل رہی ہے حیات
میں خود کو اس سے بڑی اور کیا سزا دیتا

پھر تو دن رات سلگنے کا صلہ دو ہم کو
ایک دن اتنا دلا کر کہا دو ہم کو
کتنی چڑھتی ہوئی ندیوں کے پیام آئے مجھے
تیری آنکھوں کا سمندر نہیں بھولا مجھ کو

تاہم حیات کے خوشگوار اور ناخوشگوار تجربات جوان فکری کو جو درس دیتے رہتے ہیں اس کی ترجمانی بھی "موسم موسم" میں ورق در ورق ملے گی۔ انسان کی زندگی اور [illegible] وجود "نقشِ جل بر آب" کی صورت کس قدر ناپائیدار اور غیر استوار ہے:

"پڑھا تو چہرہ یہ چہرہ لکھا ہوا نکلا
دیارِ عمر سرابوں کا سلسلہ نکلا"

بلقیس نجیب آبادی کی نظمیں بڑی حد تک حقیقی واردات اور رومانی کیفیات کے مدوجزر کی عکاسی کرتی ہیں مگر دوسرے موضوعات سے بھی انھوں نے کماحقہ انصاف کیا ہے۔ گیت صرف چند ہیں مگر اچھے ہیں۔

— شاکر جرولی

نام کتاب: "شگاف در شگاف" نام مصنف: علیم صبا نویدی
قیمت: دس روپے ملنے کا پتہ: علیم صبا نویدی۔ ۲۶ امیر النسا بیگم اسٹریٹ۔ مونٹ روڈ۔ مدراس ۔ ۲

شگاف در شگاف علیم صبا نویدی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے دل پر چوٹ کھا کر لکھے گئے ہیں، عورت کی روح کے بجائے اس کا رنگین جسم ان افسانوں کے پس منظر میں چھپا ہوا ہے۔ ان کے کچھ افسانے جیسے "جسموں کی دیوار سے آگے" بہت عریاں ہیں جو ہندوستانی سماج کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ عوام کے جذبات اور تجربات سے بہت دور ہیں۔ ان کا قلم سن رسیدہ آدمی کی طرح سنجیدہ بھی ہے اور معصوم بچے کی طرح بھولا بھی۔ اس مجموعہ کا بہترین افسانہ "چیل" ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آدمی کس طرح 'دولت' اور 'لذت' کے لیے چیل کی طرح دوسروں پر جھپٹتا ہے۔

کتابت طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ ہے [illegible] کی ظاہری صورت اور نفاست قابلِ تعریف ہے [illegible]

نام کتاب: بھنور بھنور زندگی ۔ مصنف: سید عبدالمجید سلیم
قیمت: پندرہ روپے۔ ملنے کا پتہ: آندھرا پردیش اردو اکادمی بک ڈپو حیدرآباد۔

"بھنور بھنور زندگی" سید عبدالمجید سلیم کا پہلا ناول ہے جو محبت کا ایک حسین مرقع ہے۔ ان کی یہ کہانی اگرچہ ہر خاص و عام کے لیے ہے تاہم بالخصوص اُن حضرات کے لیے ہے جو اپنے سینے میں حساس دل رکھتے ہیں، جنھیں جینے کی آرزو ہے اور جو بننا چاہتے ہیں لیکن دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

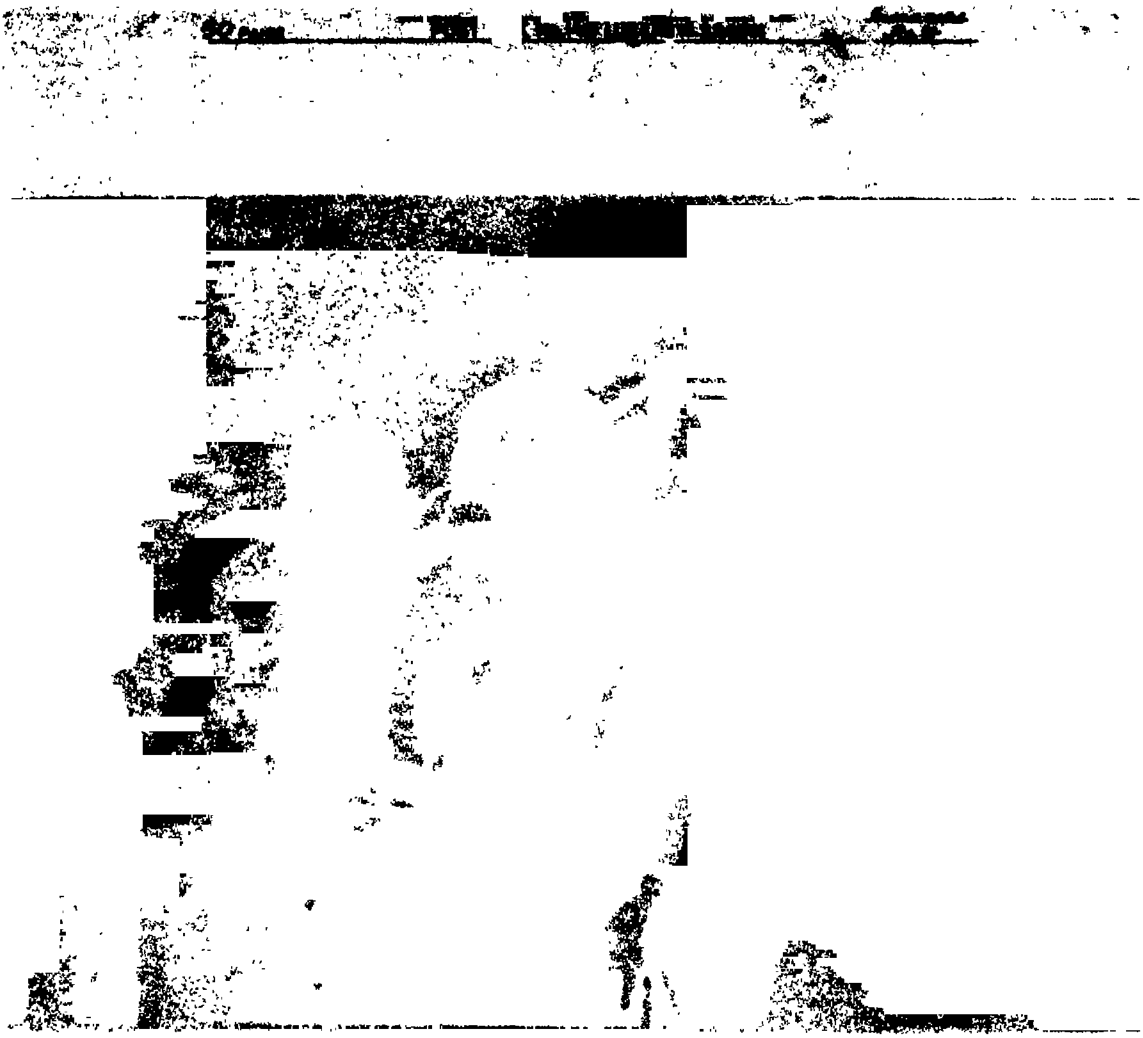
ناول نگار نے اس ناول میں ایک اچھے ناول کی جملہ خوبیوں کو بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے یکجا کر دیا ہے جس کے باعث چند سطریں پڑھتے ہی قاری کا تجسس اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور وہ پورا ناول از اوّل تا آخر پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ تھکے ماندہ ذہن کو نہ صرف تازگی بخشتا ہے بلکہ عزم و عمل کا جذبہ بھی بیدار کرتا ہے۔

ناول کی زبان نہایت صاف ستھری، لطیف اور رواں اور موثر ہے اور اس میں سلیس الفاظ کے ساتھ ساتھ محاوروں کا برمحل استعمال انگوٹھی میں نگینے کی طرح کیا گیا ہے۔ سلیم صاحب نے اس ناول کے ذریعہ قارئین کو پیوٹین اور کنگ بردس کی مانند مصائب و آلام کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جہدِ مسلسل کا پیغام بھی دیا ہے۔

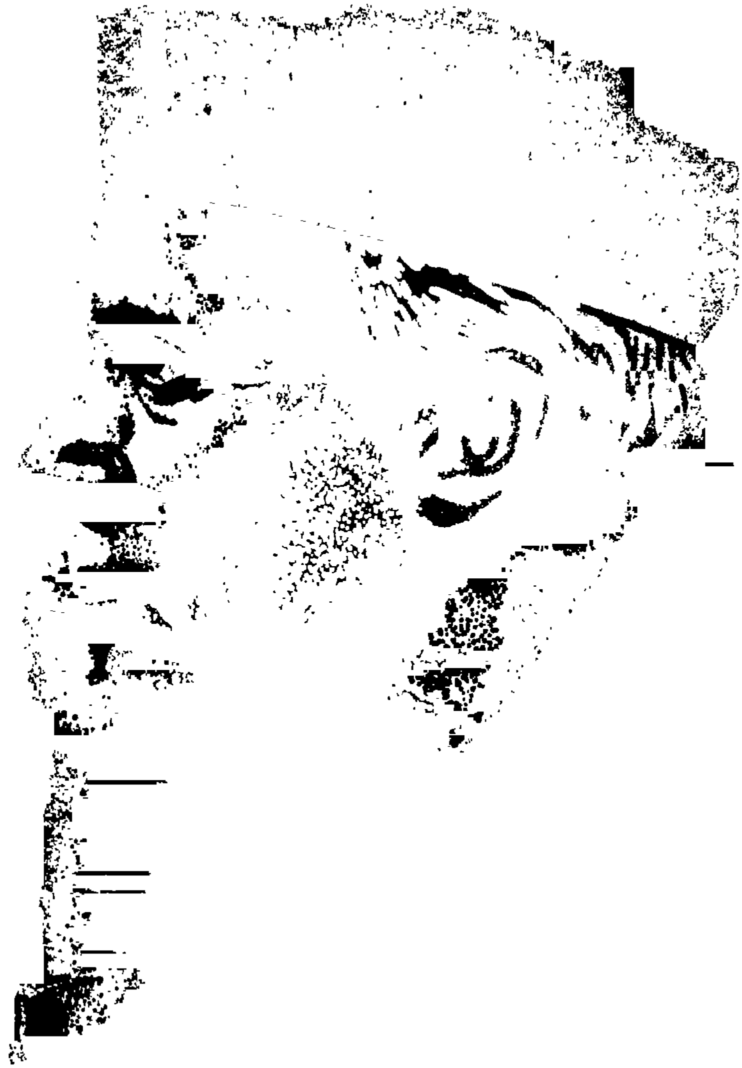
توقع ہے کہ یہ ناول کافی پسند کیا جائے گا۔

— سلطان خاں

★



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۳ر ستمبر ۱۹۸۲ء کو ماسکو کے قریب واقع اسٹار سٹی میں ہندستانی خلا بازوں اسکواڈرن لیڈر شری راکیش شرما اور ونگ کمانڈر شری رویش ملہوترہ کے ساتھ۔ یہ ہندستانی خلا باز روس میں، ہند روس مشترکہ خلائی مہم کے سلسلے میں زیر تربیت ہیں۔



عنوانات

جلد ۳۷ نمبر ۸

نومبر ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اپنی بات

اتر پردیش کی موجودہ حکومت نے شری وی پی سنگھ کی قیادت میں گزشتہ ۹ رجولائی ۸۰ کو باگ ڈور سنبھالی تھی۔ اتر پردیش ایک بڑی ریاست ہے اس لیے اس کے مسائل بھی اتنے ہی بڑے ہیں۔ تین ماہ کی قلیل مدت میں ریاست کو درپیش تمام مسائل کے حل کیے جانے کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس مختصر سے عرصہ میں ترقی کا جو سفر شروع کیا گیا ہے اور جو اچھی شروعات ہوئی ہے اسے حوصلہ افزا ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

زیر نظر مدت کے دوران سیلاب جیسی آفات کا کامیابی سے مقابلہ کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں تمام دستیاب آبپاشی صلاحیت، بجلی اور بچاؤ سے متعلق دیگر وسائل کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ دور دراز دیہی علاقوں میں ضروری اشیاء کی فراہمی کا یقینی بندوبست کیا گیا۔

اس مدت میں ہر قسم کے جرائم میں کمی آئی اور مجموعی طور پر امن و قانون کی صورت حال میں قابل ذکر سدھار ہوا۔ سماج دشمن عناصر اور چور بازاری کرنے والوں کے خلاف مہم کے نتیجے میں ضروری اشیاء کی قیمتوں میں کمی آئی اور ان میں استحکام پیدا ہوا۔

اس دوران زرعی زمرہ میں خریف کی فصل کا خسارہ پورا کرنے کے لیے ربیع کی پیداوار کا جامع منصوبہ بند پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ صنعتی ترقی کی کوششیں جاری ہیں اور متعدد پراجکٹوں کی منظوری حاصل ہو گئی ہے جن میں قدرتی گیس پر مبنی چار صنعتیں بھی شامل ہیں۔ بجلی کی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اور اس وقت کسانوں، صنعت کاروں اور دیگر صارفین، خصوصاً دیہی علاقوں کے صارفین کو مناسب مقدار میں بجلی فراہم کی جا رہی ہے۔

آبپاشی اور بجلی کے وسائل میں سدھار کے نتیجہ میں مستقبل میں بہتر زرعی پیداوار کی توقع ہے۔ اس کے لیے ضروری بیج، کھاد، جراثیم کش دوائیں وغیرہ مناسب مقدار میں فراہم کی جا رہی ہیں۔ ادارہ جاتی بینکوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی بہبود کو یقینی بنائیں، کمزور طبقوں کو قرضہ دینے کی رفتار تیز کریں۔ اور اس سلسلہ کی کوششیں بھی تیز تر کر دی گئی ہیں۔ انھیں مکانات، رہائشی قطعات، روزگار وغیرہ فراہم کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔

ریاستی حکومت کے سبھی محکمے ریاست کی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور سماج کے کمزور و پسماندہ طبقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہیں جو یقیناً ایک فال نیک ہے۔

● پچھلے دو تین مہینوں سے بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر نیا دور کی اشاعت میں جو بے قاعدگی [illegible] اس کے لیے ادارہ اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہے۔ بہرحال اب اشاعت معمول پر [illegible] ہے اور امید ہے کہ آئندہ جنوری سے نیا دور کی اشاعت میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہوئے لبریز جھلکا جامِ امن   رو بہ خنداں لالہ و نسریں بہ فیضِ عامِ امن
[illegible] فانی وقت و بامِ امن   چودھویں آئی نومبر کی لیے پیغامِ امن
آج ہی پیدا ہوا تھا حریت کا تاجدار
دیدنی تھا شاخِ گل تھی رقص کرتی تھی بہار

وہ جواہر [illegible] اک [illegible] انقلاب   وہ جواہر جس نے ازبر کی تدبر کی کتاب
وہ جواہر جس کے دم سے آدمیت کا شباب   وہ جواہر جو بظاہر اک شگفتہ سا گلاب
ارضِ پاکِ ہند جس کی ذات سے خلدِ بریں
مرحبا صد مرحبا، صد آفریں صد آفریں

اک ذرا جنبش میں آئی تھی سیاست کی نظر   خیمۂ افرنگ سے اٹھی صدائے الحذر
ظلم کی اکڑیں طنابیں، بندھ گیا رختِ سفر   شامِ غم رخصت ہوئی آئی مسرت کی سحر
نام باپو کا رہا وقتِ عمل وردِ زباں
ہو گئی آخر شکستہ زعمِ باطل کی کماں

کیف میں ڈوبی فضائے گلشن ایجاد تھی   خلدزارِ رنگ و بو کی معتبر روداد تھی
شور تھا [illegible] سے ہر اک دنیائے دل آباد تھی   آشیاں آزاد تھا اپنا، فضا آزاد تھی
گلشن آرائی میں تھا تنظیمِ نو کا امتزاج
لے لیا تھا اس چمن نے خلد سے بڑھ کر خراج

[illegible] میں آئی جب حکومت کی زمام   [illegible] شباب امنِ عالم کا سلام
اٹھی ارباب وطن پر چشمِ الطاف انتظام   وا رہے جمہوریت کا دل میں عز و احترام
[illegible]
[illegible]

[illegible] گزرے ہوئے ایام کو   کیف میں ڈوبے ہوئے لمحاتِ صبح و شام کو
[illegible] ہوئے پیغام کو   جس نے آگاہی عطا کی جس نے خاص و عام کو
ایک ہی لو تھی شمع کی جس کا اک جہاں پروانہ تھا
اپنا ہر دل زندہ دار [illegible] خانہ تھا

نومبر [illegible]

جمیل مہدی
مدیر "عزائم" امین آباد
لکھنؤ

جواہر لال نہرو

جدید ہندستان کے معمار اور معلم



جواہر لال نہرو۔ جدید ہندستان کے جمہوری اور پارلیمانی نظام کے عظیم معمار و معلم بھی، اور ایک ایسی جماعت کے سیاسی رہنما بھی، جو عوام میں اپنی مقبولیت کے لئے جماعت کے محتاج نہیں تھے لیکن اس کے باوجود جماعت کو شخصیت پر فوقیت دینے کے خیال پر آخر تک جمے رہے۔ ہندستان کے سیاسی نظام میں آج جتنی بھی برکتوں کا ظہور ہے، ان کی نشوونما میں جواہر لال کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ہندستان کے عوام پر جتنا اعتماد نہرو کو تھا، جتنی محبت نہرو کو تھی جتنا احترام نہرو کے دل میں تھا، ان کے بعد اس کی دوسری مثال سیاسی منظر پر سامنے نہیں آئی۔ اگرچہ نہرو سیاسی اور تاریخی تناظر میں گاندھی جی سے بڑی شخصیت نہیں تھے، نہ ہی انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا، اس کے برعکس گاندھی جی کی فضیلت کا اقرار، ان کی قیادت کا اعتراف اور ان کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار، وہ مدت العمر کرتے رہے، اسکے باوجود گاندھی جی کے تربیت یافتہ اور ممتاز سیاسی دانشوروں کے اس جھرمٹ میں، جس میں راج گوپال اچاریہ، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر بی سی رائے، بی جی کھیر، ستیہ مورتی، خان عبدالغفار خاں، روی شنکر شکلا، ونوبا بھاوے اور کاکا کالیکر جیسے مختلف انواع کے اشخاص موجود تھے، جواہر لال نہرو کی شخصیت سب سے الگ اور ممتاز تھی۔

گاندھی جی کی قیادت پر مکمل اعتقاد و اعتماد کے ساتھ گاندھی جی کے کتنے ہی خیالات سے عدم اتفاق، اور اس کا اعلانیہ اظہار، راج گوپال آچاریہ کو چھوڑ کر، جواہر لال نہرو کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ گاندھی جی کی غیر معمولی دور اندیشی کے اتنے قائل تھے کہ ان کے سامنے اختلاف کے اظہار کے بعد اختلاف پر اصرار کو انھوں نے اپنے کاموں کے نقشے سے خارج رکھا تھا، کئی بار انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ

"گاندھی جی کی کتنی ہی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں، ان باتوں کی کوئی منطقی بنیاد بھی نہ ہوتی تھی، میں ان باتوں سے اختلاف کا اظہار بھی ان کے سامنے کر دیتا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ یہ باتیں ٹھیک اسی انداز سے واقعات پر پوری اترتی تھیں، جس انداز سے گاندھی جی ان کی توقع کرتے تھے، اور نتائج کے اعتبار سے اتنی ہی درست ثابت ہوتی تھیں، جن کی پیشین گوئی گاندھی جی کرتے تھے"۔

پھر یہی نہیں تھا کہ گاندھی جی، جواہر لال نہرو کی شخصیت کے اس انداز سے واقف نہیں تھے، جو ان کی شخصیت اور ان کے خیالات سے بالکل مختلف ایک انداز تھا، لیکن وہ جواہر لال نہرو کی ذات کے اس حصہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے جو ان کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اور اسکے استحکام اور مضبوطی پر اتنا اعتماد رکھتے تھے کہ جب انہوں نے جواہر لال نہرو کو اپنا جانشین بنانے کا اعلان کیا تو اس اختلافی عنصر کی بھی وضاحت ضروری سمجھی جو ان کے اور جواہر لال نہرو کے خیالات میں پایا جاتا تھا اور پورے ملک

کے لیے معلوم اور نمایاں حقیقت کے طور پر طے شدہ بھی سمجھا جاتا تھا انہوں نے کہا کہ

"جواہر لال کے خیالات بظاہر میرے خیالات سے بہت سے معاملوں میں مختلف معلوم ہوتے ہیں، لیکن مجھے پورا اعتماد ہے کہ میرے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آئے گا تو جواہر لال نہرو سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی دوسری نہیں ہوگی۔ ملک اور قوم کا مستقبل، جواہر لال کے ہاتھ میں بالکل محفوظ ہے۔"

جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کی توقعات کو کتنی ہمت، صلاحیت اور شجاعت کے ساتھ عملی جامہ پہنایا۔ یہ سوال مورخوں کے لیے ہمیشہ دلچسپ اور جستجو انگیز بنا رہے گا، اور اس کا جواب اکیسویں صدی کے وسط تک ہی کہیں، واضح طور پر سامنے آسکے گا۔ یہ ہمارا خیال ہے۔ جواہر لال نہرو کی جمہوریت پسندی، بین الاقوامیت، یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے اسباب و عوامل کا گہرا شعور، ہندستان کی تاریخ اور اس تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی۔ اور صدیوں تک جاری رہنے والے انقلابی دھاروں کی نوعیت، کیفیت اور نتائج سے واقفیت جدید ہندستان کے سیاسی نقشے کے بنیادی محرکات میں شامل ہے۔ ہندستان کے سیاسی نظام اور اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل میں لگنے سے پہلے وہ روس کے انقلاب اور اس کے معاشی نتائج، اسپین کی خانہ جنگی اور وہاں آمریت کے قیام کے علاوہ ہٹلر کے عروج و زوال اور دوسری جنگ عظیم کے دوران بین الاقوامی سیاست کے ڈرامائی واقعات کے اثرات و نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور انگلستان کی پارلیمانی جمہوریت کے متضاد کردار کا تجربہ، انھیں انگلستان کے عوام کی آزادی اور ترقی، اور ہندستان کے عوام کی غلامی اور استحصال کی جیتی جاگتی خالوں کی صورت میں ہو چکا تھا۔ اس سیاسی تناظر میں انہوں نے ہندستان کی جمہوری، پارلیمانی اور سیاسی قیادت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائی اور آزادی کے بعد سترہ برسوں تک وہ ولہ ماہ اس نقشہ کی تکمیل میں لگے رہے، جو کئی جگہوں اور کئی گوشوں پر مدہم ہو جانے کے باوجود بنیادی طور پر ابھی تک قائم ہے۔

انھوں نے سپریم کورٹ، کرشی بھون، وگیان بھون، اور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کی صرف عمارتیں ہی اپنے ذوق و شوق اور نگرانی میں تعمیر نہیں کرائیں بلکہ ان سبھی شعبوں کے لیے اپنی مخصوص دلچسپی اور اہمیت کا علامتی اظہار بھی کیا۔ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے درمیان ہندستان کی گزشتہ علمی اور تاریخی عظمت، ایک نقطۂ اشتراک تھی لیکن دونوں کے فکر و فلسفہ کے اثرات مختلف سمتوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ گاندھی جی ہندستان کی گزشتہ عظمتوں کا محل اسی پرانے رنگ و روغن کے ساتھ تعمیر کرنا چاہتے تھے، اور جواہر لال اس کے ملبے کو عصر حاضر کے طرز کی عمارت میں صرف کرنے کے قائل تھے، اور یہی بنیادی فرق تھا جس کی وجہ سے ہندستان کے مستقبل کا معاشی ڈھانچہ جواہر لال نہرو کے ہاتھوں بڑی صنعتوں کی ترویج عظیم منصوبوں کی تکمیل اور جدید باندھوں اور کارخانوں کی نشو و نما کی صورت میں نمودار ہوا، جو آج ساری دنیا میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جواہر لال نہرو نے پارلیمانی جمہوریت سے ہندستان کو روشناس ہی نہیں کرایا، اپنے ساتھیوں، اپنے رفیقوں اور اپنے عوام کو اس طرز حکومت کی تربیت بھی دی، انھوں نے ہندستان کے لیے اس جدید دنیا کا سب سے ضخیم کانسٹی ٹیوشن (دستور) مرتب کرایا، جس میں روس، برطانیہ، فرانس، امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کے دساتیر کے بہتر جمہوری اور معاشی عناصر داخل کئے گئے لیکن ساتھ ہی ہندستان کی مخصوص معاشرت، تاریخی عوامل اور رنگا رنگی میں یک رنگی کے مزاج کا بھی اس نمایاں طریقے سے خیال رکھا گیا کہ دنیا کی جدید اور ترقی یافتہ قوموں کے دساتیر اور آئینوں کا عکس ہو کر بھی یہ دستور اپنے خصائص، رجحان اور مزاجی کیفیت اور قومی حیثیت میں تمام تر مشرقی ہی نظر آتا ہے۔

فرد کی رائے کی اہمیت اور جماعتی مفاد کے تحفظ کا خیال اور احترام جواہر لال نہرو سے زیادہ اب تک ہندستان کے کسی

لیڈر کی زندگی میں نہیں دیکھا گیا۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ مختلف مسائل میں ان کی رائے مختلف تھی اور وہ یقینی طور پر سمجھتے تھے کہ ان کی رائے کے برخلاف جماعت کا کوئی فیصلہ نتائج کے لحاظ سے نقصان دہ ہوگا، لیکن ورکنگ کمیٹی اور وزارت کی اکثریت ان کی رائے کے خلاف ہوئی تو انہوں نے اولیت تامل کے بغیر اکثریت کے فیصلہ کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اس پر کسی ناگواری کے بغیر عمل درآمد بھی کرایا۔

وہ جمہوری روایتوں کے نہ صرف نقیب بلکہ ان کے محافظ بھی تھے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ انھیں ایک غیر ملکی سفر پر جانا تھا۔ سامان تیار تھا اور وہ اپنے وزیروں اور ساتھیوں سے الوداعی گفتگو کرنے میں مصروف تھے کہ یکایک پریشان نظر آنے لگے۔ انھوں نے اسی پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا تو لوگوں نے وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ نائب صدر رادھا کرشنن سے ایک ضروری بات کرنا ہے اور اب اس کا وقت ختم ہو گیا ہے، کیونکہ یہاں سے سیدھے ہوائی اڈہ جانا ہے۔ لوگوں کے ہجوم میں سے کسی نے کہا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کو بلا لیا جائے تاکہ وہ ہوائی اڈے پر ان سے بات کر لیں۔ نہرو نے بڑے سمجھانے کے انداز میں ان سے کہا۔

" نائب صدر صاحب کو بلایا نہیں جاتا۔ ان کے گھر جایا جاتا ہے۔"

اس کے بعد وہ تنگ وقت کے باوجود، خود ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کوٹھی پر پہنچے اور ان سے بات کرنے کے بعد سیدھے ہوائی اڈے کی طرف چلے گئے۔

یہ واقعہ بظاہر ایک چھوٹی سی مثال ہے، لیکن اس کے ذریعہ جواہر لال نہرو کے جمہوری اور پارلیمانی ذہن کی پوری تصویر ہم دیکھ سکتے ہیں اور اس چھوٹے سے واقعہ کی مدد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ پارلیمانی روایتوں کا نہ صرف احترام کرتے تھے بلکہ ان کی تربیت دینے کے لیے بھی کس درجہ مستعد رہتے تھے۔

مقبولیت، محبوبیت، عوامی قوت اور شخصی عظمت و شوکت کے لحاظ سے کوئی دوسرا لیڈر آج تک جواہر لال نہرو کی ہمسری کا دعوا کرنے کے لائق نہیں بن سکا۔ لیکن اس شخصی قوت اور عوامی اہتمام و احترام اور لامحدود اختیارات کے حامل ہونے کے باوجود انہوں نے کسی وقت بھی ان اختیارات اور طاقت کو جمہوری اور پارلیمانی روایت کے خلاف استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے شخصی اختیارات اور قوت کو، جمہوری قدروں کے استحکام اور پارلیمانی نظام کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے ایک ایسے ملک میں جو صدیوں سامنتی، جاگیرداری اور ملوکیت کے نظام میں جکڑا ہوا تھا جمہوری اور پارلیمانی نظام کو نہ صرف قائم کیا بلکہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وہ ہندستان کے عوام میں اس نظام کی بنیادی خصوصیتوں کو مقبول بنانے اور عام کرنے میں لگے رہے اور لگاتار تین عام انتخابات کے دوران جو ۵۲ء سے ۶۲ تک ہوئے وہ اپنی بے شمار تقریروں کے ذریعہ ہندستان کے عوام کو ووٹ کی قدر و قیمت رائے دہندگی کی نوعیت اور حکومت سازی میں ان کے اختیارات اور حقوق و فرائض سمجھاتے رہے۔

آج ہندستان میں معاشی ترقی کی جو بھی ہما ہمی ہے۔ کارخانوں اور دیو پیکر مشینوں کی جتنی بھی گھڑ گھڑاہٹ اور رونق ہے، ہندستان کی بیرونی تجارت اور سائنسی اہلیت کا جتنا بھی وقار ہے، بین الاقوامی سیاست میں ہندستان کی جتنی بھی اہمیت اور عزت ہے۔ ہندستان کے جمہوری نظام، عدلیہ اور پارلیمانی طرز حکومت کا جتنا بھی استحکام ہے۔ وہ اسی نقشے کے مطابق ہے، جو جواہر لال نہرو نے ہندستان کے مستقبل کو سامنے رکھ کر بنایا تھا۔ ان کی زندگی میں لوگ ممکن ہے ان کے طرز فکر اور بنیادی رجحانات اور ان کے مغرب

(باقی ص ۱۲ پر)

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی وارانسی

غزل

حادثوں کی کوئی کمی تو نہیں — زیست محتاجِ زندگی تو نہیں
پیار سب کچھ ہے زندگی تو نہیں — اور بھی کام ہیں یہی تو نہیں
ملنے والوں کی کچھ کمی تو نہیں — ہاں مگر سب سے دوستی تو نہیں
کہیں دیکھا ہے میں نے تم سا حسیں — سوچتا ہوں کہ تم وہی تو نہیں
کیوں* نہ ماضی کو حال پر چھوڑیں — گزری باتوں کا وقت بھی تو نہیں
اتنی کم فرصتی کے ہوتے بھی — آپ سے بے تعلقی تو نہیں
دیکھیے چل کے زندگی کا ثبوت — بیٹھے رہنا ہی زندگی تو نہیں
جو اکیلے ہنسے وہ پاگل ہے — صرف اپنی خوشی خوشی تو نہیں
جو کسی کے بھی کام آ نہ سکے — تم وہ ناکام زندگی تو نہیں
عشق نے پارسا بنایا ہے — ورنہ ہم بھی کوئی ولی تو نہیں
گھر کو جس کی بہت ضرورت ہے — گھر کی تقدیر میں وہی تو نہیں
مے کشی ہم نے چھوڑ دی لیکن — قرض لے کر کسی سے پی تو نہیں
وقت بانٹے ہے کیوں متاعِ جنوں — جیبِ دانش وراں تہی تو نہیں
اس جنوں ساز دور کے پیچھے — کہیں ذہنوں کی مفلسی تو نہیں

زندگی ہے تو پھر ملیں گے نذیر
یہ ملاقات آخری تو نہیں

مرزا جعفر حسین
بارود خانہ
گولہ گنج۔ لکھنؤ

ثاقب لکھنوی

مرزا ذاکر حسین قزلباش المتخلص بہ ثاقب کا نام سنتے ہی ایک مجذوب قسم کے انسان کا تصور دماغ میں آجاتا ہے ایک نحیف الجثہ آدمی، میانہ قد، ستواں ناک، چوڑی پیشانی اور چمکدار آنکھیں، سادہ وضع وقطع سر پر ایرانی ٹوپی۔ جسم پر شیروانی معمولی کپڑے کی، پاؤں میں تنگ مہری کا سفید پاجامہ اور پیروں میں بہت سستے قسم کا جوتا ہوتا تھا۔ گردن عموماً بائیں جانب جھکی رہتی تھی جو متانت اور منکسر المزاجی ظاہر کرتی تھی۔ ان کی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں برابر حرکت میں رہتی تھیں جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ہر وقت کچھ سوچا کرتے تھے، گویا شعریت میں غرق رہتے تھے یہ غرقابی اتنی گہری ہوتی تھی کہ اپنی ہستی کو بھلا دیتے تھے۔ اس خود گم شدگی میں اتنی شدت تھی کہ آئے دن جسمانی چوٹیں کھایا کرتے تھے۔

ان کا کوئی دوست ایسا نہیں تھا جو ان کے اس طرح راہ چلنے اور چوٹیں کھانے کے واقعات کا عینی شاہد نہ رہا ہو۔ مثال کے طور پر کچھ واقعات پیش کر رہا ہوں۔ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی شباب پر تھی۔ مجھے فوراً امین آباد جانا پڑا گلی گلی جاکر جعفر منزل کے قریب چوراہے پر نکلا تو دیکھا کہ آپ امین آباد کی طرف سے ہاتھوں کو ہلاتے چلے آرہے تھے لیکن کنپٹی کے پاس تازہ زخم ہے جس میں سے لہو جھلک رہا ہے جو لہو پہلے نکل چکا تھا وہ شیروانی کے کاندھوں پر آگیا میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے اور خون کیسا ہے۔ تب وہ چونکے اور فرمایا کہ ایک آدمی لکڑی کا گٹھا سر پر لیے جارہا تھا اسی کی ٹھوکر لگ گئی ہوگی، کیا واقعی خون جاری ہے۔ میں نے سمجھا تھا کہ گرمی کے باعث پسینہ جاری ہوگیا۔ دوسرا واقعہ پل جھاؤ لال والی سڑک کا تھا۔ میں کھیروگنج روڈ سے اس سڑک پر آیا تو دیکھا کہ چند قدم کے فاصلے پر ثاقب اپنا کندھا پکڑے مل رہے ہیں۔ میں نے قریب جاکر پوچھا کہ کیا ہوا۔ فرمایا کہ راستہ چلتے ہوئے کندھا اس کھمبے سے لڑ گیا تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ کھمبا بجلی کے تاروں والا لوہے کا تھا۔ مجھے جواب دے کر خوب ہنسے ایسے موقعوں پر ان کو اپنے حال پر ہنسی آجاتی تھی۔

تیسرا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ ڈالی گنج کی سڑک پر میں اپنی بہن کے یہاں سے باہر نکلا تو دیکھا کہ ثاقب تیز

تیز تیز آگے جا رہے ہیں۔ میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ میرے اور ان کے درمیان ایک آدمی اور راستہ حائل رہا تھا۔ کچھ فاصلہ پر بائیں جانب شراب خانہ تھا۔ دفعتاً ثاقب کے پیچھے والا آدمی تیزی سے بڑھا اور ثاقب کے داہنی جانب ہوتا ہوا بہت جلدی سے شراب خانہ میں داخل ہو گیا۔ وہ راستہ چلتے چلتے رُک کے اس آدمی کو دیکھا اور پھر شراب خانہ کو دیکھا۔ اب میں قریب پہنچ چکا تھا۔ بے انتہا خوش ہو کر مجھ سے فرمایا کہ "میاں! دیکھو تمہیں اچھا مطلع ہو گیا ہے" اور یہ مطلع پڑھا:

آنکھ لڑتے ہی نہ تھا نام شکیبائی کا
در میخانہ تھا نقشا تری انگڑائی کا

فرمانے لگے کہ پرسوں مشاعرہ میں غزل پڑھنی ہے۔ ہر استاد انگڑائی کے قافیہ پر اپنا زورِ سخن صرف کر دے گا۔ مجھ کو راہ چلتے یہ خیال اور یہ شعر مل گیا جو غالباً ہر استاد کے شعر پر بھاری پڑے گا۔ میں نے مزاحاً کہا کہ دوسروں کو محنت کرنا پڑتی ہے، آپ کو زر و جواہر سڑک پر پڑے مل جاتے ہیں۔

ثاقب صاحب سے میری ملاقات اسی زمانہ میں ہو گئی تھی جب میں نویں یا دسویں درجہ کا طالب علم تھا۔ اساتذہ کی خدمت میں حاضری دینے کا شوق تھا اور یہ محترم ہستیاں میرے یہاں بھی آجاتی تھیں۔ ان آنے والے اساتذہ میں ثاقب کی تشریف آوری بہت زیادہ ہوتی تھی جس کی غالباً یہ وجہ تھی کہ ان کا مکان وزیر گنج میں تھا اور میں گولہ گنج میں رہتا تھا۔ وزیر گنج سے امین آباد جاتے ہوئے یا واپسی پر ثاقب عموماً میرے یہاں قیام فرما لیتے تھے۔ ہر استاد کی طرح وہ بھی سخن فہم لوگوں کی قدر کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہر استاد مجھے سخن فہم اور بلند ذوق سمجھتا تھا اس لیے میری عزت افزائی ہر جگہ ہوتی تھی۔ ثاقب سے میری ملاقات برابر ہوتی تھی اس لیے ہمارے درمیان دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے۔ میں نے ان کو ہر مقام اور ہر محل پر شریف النفس اور بلند کردار پایا تھا۔ نیکی اور سدھائی ان کے مزاج اور کردار کا جوہر تھے۔ بات کرنے کا یہ انداز تھا کہ دوسروں کے دل موہ لیتے تھے۔ اور سختی کے ساتھ اس کا خیال رکھتے تھے کہ ان کے منہ سے کوئی ایسا کلمہ یا لفظ نہ نکلے جو سننے والے کے لیے بارِ خاطر ہو جائے۔ رفتار و گفتار، وضع قطع اور لباس کی طرح طعام و آدابِ طعام میں بھی وہ انتہائی سادہ مزاج اور مسکین طبع تھے۔ مجھے بارہا ایک ہی دسترخوان پر ان کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے:۔

یہ واقعہ غالباً ۱۹۳۰ء کا ہے جب مرحوم مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی محمود آباد کی سرکار سے ثاقب وابستہ تھے اور میں مہاراجہ کا بہ حیثیت پرائیویٹ سکریٹری ملازم تھا۔ مہاراجہ کا دسترخوان باہر بچھتا اور ایسا برابر ہوا کرتا تھا تو ہم سب ان کے متعلقین جو موجود ہوتے ان کے ہمراہ شریکِ طعام ہو جانا نہ صرف اپنی سعادت بلکہ فرضِ منصبی بھی سمجھتے تھے۔ کھانا کھلانے کا طرز یہ تھا کہ حاضرین میں سب کے سامنے پلیٹیں لگ جاتی تھیں اور انواع و اقسام کے کھانے ڈشوں اور ڈونگوں میں لگا دیے جاتے تھے۔ مہاراجہ کا مخصوص ملازم ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتا اور ہم لوگ اپنے پسندیدہ کھانے خود ہاتھ بڑھا کے نکال لیتے تھے۔ اس موقع پر ڈشوں اور ڈونگوں کے ڈھکنے ہٹائے گئے تو دال کا ڈونگا ڈپٹی سید نذیر حسین مرحوم جو اس زمانہ میں سہالی اور سہاریا اسٹیٹ کے منیجر تھے کے سامنے اور کبابوں کا ڈونگا ثاقب کے آگے تھا۔ نذیر میاں نے فی الفور ڈونگے بدل لیے ثاقب نے پورے اطمینان کے ساتھ اپنی پلیٹ میں دال نکال کر لطف لیتے ہوئے کھانا شروع کر دیا۔

[illegible] ثاقب [illegible] اور مسکرا تے رہے۔ چند منٹ کے بعد [illegible] خادم خاص کو ثاقب کے سامنے [illegible] حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ثاقب نے [illegible] کا شکریہ ادا کیا لیکن اس کے بعد [illegible] گردن جھکائے کھانا کھایا۔ بعد میں [illegible] بیان سے [illegible] میں بھی مزاح [illegible] زیادہ اور کوئی بات نہیں تھی۔ انھوں نے بھی مزاح [illegible] تھے مگر ثاقب نے اس وقت کوئی کلمہ مزاح کا زبان سے نہیں نکالا صرف اس لیے کہ شاید اس کو حرف شکایت سمجھا جائے۔ اس قسم کا مذاق مہاراجہ کے دستر خوان پر حاضرین کے درمیان اکثر ہوا کرتا تھا اور سب ایک دوسرے سے لطف لیتے تھے۔

ثاقب لکھنوی کی شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا۔ میں اس مختصر مضمون میں ان کے شاعرانہ کمال پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن ان کی شاعری سے متعلق اور ان کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے انداز پر کچھ روشنی ڈال دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنے میں آتی ہے کہ ان سے زیادہ زود گو بلکہ ان کے برابر زود گو بھی کوئی دوسرا اساتذہ میں نہیں تھا۔ وہ برا [illegible] اشعار [illegible] ان میں جو شاعروں سے متعلق نہ ہوتے وہ زیادہ تر [illegible] جاتے تھے۔ اسی طرح یہ بات بھی [illegible] آتی ہے کہ [illegible] برس تک اپنا دیوان [illegible] کے بعد زندہ رہے تھے۔ لیکن اس قدر کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہے۔ حالانکہ ان کی زود گوئی کے پیش نظر ان کے مطبوعہ دیوان کے برابر ہی ایک اور دیوان ہمارے پاس ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی جتنا کلام بھی ہمارے پاس ہے وہ ان کو شاعر اعظم ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ زود گوئی کی مثال میں وہ [illegible]

کر دیا [illegible] [illegible] کے لیے [illegible] [illegible] تھے۔ [illegible] اس دور کے اساتذہ میں [illegible] روز ثاقب بھی [illegible] بعد کھانا [illegible] کو کھانے کی [illegible] نشست کا خیال ظاہر کیا اور [illegible] بھی بتایا کہ نشست میں بعض ارباب نشاط بھی موجود ہوں گے۔ کھانے کے بعد ایک کمرہ میں ثاقب کو آرام کرنے کے لیے تنہائی ملی۔ انھوں نے قلیل وقفہ میں ایسی غزل کہہ ڈالی جس کا ہر شعر جواہر پارہ تھا اور مقطع میں بعض حاضرین بزم کے مخصوص حالات کی طرف اشارہ ہے۔ جو اشعار یاد آ رہے ہیں درج ذیل ہیں۔

مل گئے شاید کہیں حسرت بھرا دل اور آپ
خواب دیکھا ہے کہ اک افسردہ محفل اور آپ
چشم گریاں سے اگر [illegible] دل فرمایئے
[illegible] کر دریا اور ساحل اور آپ
خون [illegible] آنکھوں کو دھوکا ہو گیا
ایک ہی صورت کے ہوں گے [illegible] اور آپ
آئیے گا اس [illegible] کے بعد
ایک دن ہو گی یہی [illegible] منزل اور آپ
ادعائے پارسائی کیا [illegible] کہ آج
یہ [illegible] یہ انداز [illegible] اور آپ

اس زمانہ میں مشاعرہ [illegible] یہاں [illegible] اور شعر [illegible] کی بات میں [illegible] کا درجہ رکھتا تھا [illegible]

پر کبھی اگر کسی اور اساتذہ کو [illegible] سمجھتے تھے۔
تعریفوں کا یہ [illegible] شاعر کو [illegible] اس کے سب
سے زیادہ مستحق وہ شاعر کی بہت تعریفیں ہوتی تھیں۔ ان
تعریفوں پر شاگرد چشمک زنی کرتے اور کبھی کبھی اساتذہ میں
نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی۔ ہر ہر شاعر غلطی پر ٹوک دینا
بھی روا تھا۔ لیکن تہذیب کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا تھا۔
ثاقب مرنجان مرنج اور خاموش طبیعت کے آدمی تھے
وہ صبر و سکون سے غزل پڑھتے تھے۔ تعریفوں پر مسکراہٹ
آجاتی کبھی نہیں بھی دیتے تھے۔ آداب محفل اور وضعداری
روایات کا پورا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ وضعداری ان کے
کردار کا جزو تھی اور اپنے حریف کی تعریف میں کبھی بخل نہیں
کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک مشاعرہ کا تذکرہ دلچسپی سے
خالی نہیں ہوگا۔

پرنس باقر علی خاں کے یہاں مشاعرہ تھا۔ ڈیوڑھی
آغا میر اسٹیشن سے متصل چوک جانے والی سڑک کی
چڑھائی کے بائیں جانب ان کا محل اب بھی برقرار ہے۔
یہ مشاعرہ دن کے وقت گیارہ بجے منعقد ہوا تھا۔ پرنس
موصوف اغلباً وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے دن کو مشاعرہ
کرنے کا چلن رائج کیا تھا۔ ان کے یہاں کے مشاعروں
کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ وہ بہت ثقیل طرحیں دیا کرتے
تھے۔ چنانچہ اس مشاعرہ میں مرزا غالب کے ایک شعر کا
پہلا مصرع

"ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں"

طرح تھی۔ پرنس موصوف کو کلیم سے تلمذ تھا لیکن وہ مولانا
صفی کے زبردست عقیدت مند تھے اور مولانا صفی کا بہت
احترام کرتے تھے۔ ثاقب سے دوستانہ روابط تھے اور
بہ حیثیت شاعر کے بھی ان کو بہت بلند سمجھتے تھے۔ ثاقب
ان کے یہاں مشاعروں میں شرکت کرتے اور طرح کہہ لیں
سکتے تھے مگر اس مرتبہ ان کو عین مشاعرہ کے دن کانپور جانا
پڑ گیا۔ ضرورت اتنی اہم تھی کہ ملتوی کرنا [illegible]
ثاقب صاحب مشاعرہ کے ایک روز قبل میرے پاس
تشریف لائے اور مجھ پر یہ فریضہ عائد کیا کہ میں حاضر
ہو کر ان کی عدم شرکت کے لیے پرنس سے معذرت خواہی
کروں اور ان کی غزل مشاعرہ میں پڑھ دوں۔ چنانچہ میں نے
تعمیل ارشاد میں جا کر شرکت کی۔ پرنس سے نیازمندانہ
تعلقات تھے اس لیے صف اساتذہ میں جگہ ملی اور میں نے
ثاقب صاحب کی جانب سے معذرت کرتے ہوئے ان
کی غزل پڑھ دی بعض اشعار بہت پسند کیے گئے اور مجھ کو
مکرر پڑھنا پڑا۔

دوسرے روز شام کو ثاقب میرے یہاں آئے اور
مشاعرہ کا حال دریافت کیا۔ میں نے بتایا کہ آپ کی جانب
سے معذرت کر دی تھی اور آپ کی غزل بہت [illegible]
پسند کی گئی اور فلاں فلاں اشعار [illegible]
ان کو اطمینان ہوا اور پھر مشاعرہ کا تفصیلی حال پوچھا
میں نے ہر سوال کا جواب دیا اور آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ صفی
صاحب کا مطلع حاصل مشاعرہ رہا۔ مطلع پڑھ کر سنایا جو حسب
ذیل تھا۔

اسیرِ پنجۂ جوشِ جنوں فتنہ ساماں ہوں
اگر دامن ہوں یوسف کا زلیخا کا گریباں ہوں

وہ سن کر خاموش ہو گئے اور ذرا دیر کے بعد رخصت ہو گئے۔
دوسرے روز دوپہر کو گھبرائے ہوئے اس طرح آئے کہ شیروانی
[illegible] تھی۔ فرمایا کہ میں بہت جلدی میں ہوں [illegible]
سے کہہ آیا کی گاڑی کے سامنے ہے میں ادھر آیا وہ آگے
بڑھ گیا ہے اس کو پکڑنا ہے۔ صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ
صفی کا مطلع بہت عمدہ ہے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ
سکوں وہ خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ ان کی
انصاف پسندی کی بہترین مثال ہے۔
پھر لکھنؤ کے اساتذہ اپنے صفوں میں کسی بیرونی شاعر

کو جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کے اسی طرزِ عمل کی وجہ سے یاس عظیم آبادی نے لکھنؤ کے اساتذہ کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا جو ہمیشہ گرم رہا۔ ثاقب بھی بیرونی شاعر تھے وہ اکبرآباد سے لکھنؤ آئے تھے لیکن انھوں نے اپنے اخلاق اپنی منکسر المزاجی اور اپنی اہلیت کے بل بوتے پر اپنی جگہ اس طرح بنالی تھی کہ وہ ثاقب لکھنوی کہلائے اور جہاں بھی لکھنؤ کے اساتذہ کا ذکر آتا ہے تو صفی، عزیز، محشر، اثر، آرزو وغیرہم کے ناموں کے ساتھ ثاقب کا نام آنا لازمی ہے۔ البتہ لکھنؤ کے نام پر یہ بدنما داغ ضرور پڑ گیا تھا کہ بعض لوگوں نے ان کو شاعر ہی تسلیم نہیں کیا اور یہ مشہور [illegible] تھا کہ ثاقب جو کچھ پڑھتے ہیں وہ کلام مولانا سید سبط حسن کا تصنیف کردہ ہوتا ہے۔ اس بہتانِ عظیم کا کبھی کوئی جواب ثاقب نے نہیں دیا۔ وہ ہر بات سنتے اور ٹال جاتے تھے۔ مجھے مولانائے محترم کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، میں ان کی خدمت میں کافی گستاخ بھی تھا۔ کم سے کم دو بار میں نے ان سے ثاقب کے بارے میں استفسار کیا اور انھوں نے دونوں مرتبہ یہی جواب دیا تھا کہ ثاقب بہت اچھے شاعر ہیں، وہ جو کچھ پڑھتے ہیں انھیں کا کہا ہوا ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ میں غزل کہہ کر ان کو دیتا ہوں۔ زمانہ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد بھی ثاقب اپنے مخصوص رنگ میں غزلیں کہا کرتے اور مشاعروں میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ غزلیں طرحی مشاعروں میں پڑھی جاتی تھیں، ان کے پرانے ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ بات قابلِ غور ہے کہ ثاقب کا جو مطبوعہ کلام ہمارے پاس ہے وہ خود اپنی جگہ پر اتنا ضخیم ہے کہ کوئی صاحبِ فہم انسان اس کو کسی دوسرے کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ بہرحال وہ دور ختم ہو گیا اور ثاقب کا نام اردو شاعری کی دنیا میں درخشندہ و تابندہ ہے اور ہمیشہ زندہ و فروزندہ رہے گا۔

★

غزل

حسیب مفتوم

یہ کون المس نہ تا دُور کوئی سایا تھا
فصیلِ جسم پہ تنہائیوں کا پہرا تھا

نظر میں اس کی اجالا، لبوں پہ نغمہ تھا
مگر عجیب [illegible] تھی جہاں وہ رہتا تھا

اس [illegible] پہ اسلوب کر دیا ہم کو
روش سے اہلِ زمانہ کے ہٹ کے چلتا تھا

خیال اس کا تھا شفاف چاندنی کی طرح
مگر وجود تو یکسر غبار جیسا تھا

لہو لہو تھا اگر دل تو روح زخمی تھی
عجیب شخص تھا وہ پھر بھی مسکراتا تھا

خود اپنے آپ سے جو بے نیاز تھا مفتوم
وہ میری ذات پہ کتنا عجیب لمحہ تھا

جواہر لال نہرو : صفحہ ۶ کا بقیہ

کی طرف [illegible] اور جدید معاشی اور صنعتی خیالات سے مالامال ہوں لیکن ان کے عمل و کار، اور ان کے ہنسلے ہوئے نقشے کے جو نتائج نکلے ہیں، اور ہندستان کا شمار، ان نتائج کی بدولت جس طرح دنیا کی سب سے بڑی پانچویں صنعتی قوت میں ہونے لگا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مستقبل کے بارے میں نہرو کا خیال ہی انسب اور صحیح تھا، اور ہندستان کے معمار، اور معلم کی حیثیت سے نیز جمہوری اور پارلیمانی نظام کے بانی کی حیثیت سے ان کے مقام کا کوئی شریک اور سہیم، قومی قیادت کی اس صف میں کبھی نہیں جس میں دنیا کے متعدد نادرِ روزگار، دانش مند اور عبقری مثال تھے۔

★

مرزا افسر حسین قزلباش
معرفت روزنامہ 'پائنیر'
لکھنؤ

میرزا ثاقب لکھنوی

(مختصر تعارف)

میرزا ذاکر حسین نام، ثاقب تخلص، تاریخی نام۔
میرزا انتظار مہدی و آغا محمد فائق
۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ

وطن مالوف طبرستان، مولد اکبر آباد (آگرہ)، گہوارۂ تعلیم و تربیت لکھنؤ۔ سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش مازندرانی المعروف بہ علی قلی خاں شاملو کی سے ملتا ہے۔ حاجی صاحب ممدوح میرزا صاحب کے مورثِ اعلیٰ تھے اور شاہ طہماسپ صفوی کے معتبر علیہ امرائے دربار میں سے تھے، میرزا صاحب کے اسلاف کو تنگیٔ معیشت کے باعث ترکِ وطن کرنا پڑا۔ وہ سلسلۂ تجارت وارد ہندوستان ہوئے اور اس گہوارۂ تہذیب و تمدن اور علم و ادب کے مرکز کو اپنا مسکن و مستقر بنا لیا۔ میرزا صاحب کے آباو اجداد نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کی۔ شہنشاہ اکبر نے کچھ ایسی مبارک گھڑی میں اس شہر کی بنیاد رکھی تھی کہ قلیل عرصہ میں ہی یہ شہر علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ خود آگرہ میں میر و غالب جیسے خدایانِ سخن بھی اس مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے ہمارے میرزا صاحب کے لیے یہ امر کچھ کم باعث شرف و سعادت نہیں تھا کہ وہ ۲ جنوری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۹ ماہ رمضان المبارک بوقتِ صبح اسی مبارک خطۂ ارض پر تولد ہوئے۔ جسے یہ سعادت نصیب ہو اس سے زیادہ میر و غالب کی جانشینی کا مستحق کون ہوسکتا ہے خود فرماتے ہیں ؎

ملی اس شرط پہ ہے جانشینی میر و غالب کی
کہ رکھا جائے میرے بھی مقدر کا ورق سادہ

میرزا صاحب ابھی آغوشِ مادر میں ہی تھے کہ ناسازگاریٔ روزگار نے میرزا صاحب کے والد ماجد کو اکبر آباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے لکھنؤ آکر مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ دہلی کے مٹنے کے بعد لکھنؤ اردو زبان کا واحد مرکز اور مستند ٹکسال ہوگیا۔ چنانچہ میرزا صاحب نے اسی زبان کی آغوش میں پرورش پائی جسے ناسخ و آتش اور انیس و دبیر جیسے اربابِ کمال نے آبِ کوثر سے دھو کر تمام خس و خاشاک سے پاک و صاف کر دیا تھا۔ ماہ دسمبر ۱۸۸۱ء میں میرزا صاحب کی شادی ہوئی اور ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ میرزا صاحب نے اعلیٰ پیمانے پر تجارت کی لکھنؤ میں بنیاد ڈالی جس کا سلسلہ کسی صورت چار یا پانچ سال قائم رہا لیکن کاروبار میں زبردست خسارہ اٹھایا لہٰذا بہ تلاش معاش ۱۹۰۶ء میں کلکتہ چلے گئے اور سفیر ایران کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے تقریباً دو سال نہایت خوش اسلوبی سے کام کیا لیکن جس شخص کی آنکھوں میں شام اودھ کی لوبیاں بس گئی ہوں وہ درازیٔ زلفِ بنگالہ کی جلوہ سامانیوں سے کیونکر متاثر ہوتا۔ اسی کش مکش بیم و رجا میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری شیخ الرئیس الزماں صاحب کا ایک تار پہنچا کہ جناب راجہ صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں میرزا صاحب نے اس دعوت پر لبیک کہہ کر فوراً سفیر ایران سے رخصت حاصل کی۔ راجہ صاحب ممدوح نے پچاس روپے کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی ایک انداز علم نوازی تھا۔ زمانے نے ہزاروں کروٹیں بدلیں لیکن میرزا کی قناعت نواز صبر آشنا خوددار اور وطن پرست طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ لکھنؤ سے باہر قدم نکالتے۔

وہ صاف دل، آزاد خیال اور راسخ العقیدہ تھے اور تعصب نیز تنگ نظری سے بالکل پاک تھے۔

ثاقب صاحب نے ۸۰ سال کی عمر میں نومبر ۱۹۴۹ء میں وفات پائی اور مطابق وصیت کربلائے تالکٹورہ میں دفن ہو گئے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ تقسیم کے بعد ملک میں جو ہیجان پیدا ہوا اس کی وجہ سے نہ تو میرزا ثاقب کے شایان شان کوئی یادگار قائم ہو سکی اور نہ ایسی تقریبات منعقد ہو سکیں جن کے ذریعہ اس عظیم شاعر سے آنے والی نسلوں کو متعارف کرایا جا سکتا۔ ایسے اہل خاندان کی عدم توجہی کہی جائے یا حالات کی ستم ظریفی کہ یہ عظیم شاعر گمنامی کے پردے میں ایسا گم ہو گیا کہ اس کے ضرب المثل اشعار بھی دوسروں کے نام سے منسوب کیے جانے لگے رفتہ رفتہ مرزا ثاقب کا ذکر ادبی حلقوں میں بھی برائے نام رہ گیا۔ تقریباً ۲۵ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ میں ایک مجلس میں شریک تھا جو پروفیسر مسعود حسن صاحب مرحوم کے دولتکدہ ادبستان میں منعقد ہوئی تھی۔ مجلس کا موضوع ڈاکٹر اقبال کا شعر ؎

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

تھا اور سید العلماء خطاب کر رہے تھے۔ قبل مجلس یہ بحث ہو رہی تھی کہ یہ شعر ؎

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

مولانا سبط حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ کا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ شعر مولانا کی قبر پر کندہ ہے لیکن جس غزل کا یہ شعر ہے وہ پوری غزل دیوان ثاقب میں شامل ہے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ شعر مولانا کی وصیت کے مطابق کندہ کیا گیا یا مرزا ثاقب کی خواہش پر لیکن مرزا صاحب کو مولانا سے بے حد عقیدت تھی اور عسکری منزل کی ۴ محرم کی تاریخی مجلس ملتوی کر دی جاتی تھی اگر مولانا لکھنؤ میں نہیں ہوتے تھے۔

مولانا کی وفات پر مرزا ثاقب نے جو تاریخ کہی تھی صرف اس کے دو شعر یہاں نقل کر رہا ہوں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ مرزا صاحب کو مولانا سے کس حد تک عقیدت تھی ؎

ہائے یہ ماہِ محرم یہ عزاداری کے دن
اس پر اک طرفہ قیامت زینتِ منبر کی موت
زندگی پر خاک ایسے ہادیٔ ایماں کے بعد
باعثِ مرگِ جہاں ہو جس اکیلے دم کی موت

میری نظر میں مرزا ثاقب صرف ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ اس منزل پر تھے جہاں خودی کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ چونکہ میری پرورش حالات کی بنا پر زیادہ تر ننھیال میں ہوئی لیکن جد محترم کے حکم کے مطابق کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ سلام کرنے کے لیے حاضر ہونا پڑتا تھا۔ ابھی شعور کی منزلوں میں قدم نہ رکھ سکا تھا لیکن یہ بخوبی یاد ہے کہ عزاخانہ سے ملحق شہ نشین جو مرزا صاحب کے لیے مخصوص تھی اس لق و دق شہ نشین میں صرف ایک چٹائی ایک چوکی ایک سجدہ گاہ اور ایک حقہ یہاں نہ کتابوں کی کثرت نہ شاگردوں کا ہجوم نہ دوستوں کا انبوہ۔ بارہا ایسا ہوا کہ سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا اور کافی وقت گزر گیا لیکن جد محترم کو میرے آنے کا مطلق احساس نہ ہوا۔ جب دادی اماں مرحومہ کو خیال آیا تو وہ شہ نشین میں داخل ہوئیں اور میرے حاضر ہونے کا مرزا صاحب کو مقصد بتایا۔ میں نے جھک کر آداب کیا اشارے سے بیٹھنے کا حکم دیا میں بالکل قریب ہو کر ادب کے ساتھ بیٹھا۔ سر پر ہاتھ پھیرا محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے درازیٔ عمر کی دعائیں دیں تعلیم کا حال پوچھا اور پھر اسی عالم میں محو ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ اگر سیلاب اشک آنکھوں سے رواں نہ ہوتا تو دیکھنے والے کو زندگی کا یقین ہی نہ ہوتا۔ خود فرماتے ہیں ؎

(باقی ص ۴۵ پر)

حرمت الاکرام
رام باغ۔ مرزاپور
(یوپی)

غزل

(نذرِ فراق)

امیدِ خانماں برباد لوٹ کر آئی — بنا کے ٹوٹتی شاخوں پہ کتنے گھر آئی
حیات نکلی تھی گھر سے مرے تہی دامن — مگر لیے ہوئے پنہائے بحر و بر آئی
زمانہ خاک اڑاتا رہا سفر بہ سفر — کہ زندگی نہ کسی طرح راہ پر آئی
صبا گئی تھی پئے رقصِ سرخوشی لیکن — سنا ہے اور بھی ان کو اداس کر آئی
قبول کر نہ سکی بیسویں صدی جس کو — خوشا نصیب! وہ تہمت ہمارے سر آئی
پہنچ گیا ہے کہاں حسرتِ دوام لیے — کہ وقت پوچھتا ہے کس کی رہگزر آئی؟
ہماری پیاس کہ ٹھہری حریفِ آبِ سراب — تہی سبو تھی مگر کتنے جام بھر آئی!
ہزار قہقہے لائی ہے نذر کی خاطر — یہ ایک شام کہ سورج کو دفن کر آئی!
چلی تھی کون سی دھن لے کے آرزوئے نمو — کہ دشت دشت اگاتی ہوئی شجر آئی
چلی فرات سے چھلکاتی جامِ خوں لیکن — ہماری پیاس زمانے میں نام کر آئی

بلوغِ خاک کے انداز ہیں جدا حرمت
کہ عمر گزری تو دنیا شباب پر آئی

سویرے رک نہیں سکتے

[illegible]

جلی بجھی سی مشرق میں ہے تا حدِ نظر سُرخی
دہکتا سُرخ عنابی سا اک گولا اُبھرتا ہے
ہوئی بے نام سی آواز پانی کھلبلانے کی
رو پہلی روشنی رہ رہ کے سُرخی چاٹ لیتی ہے
سحر کا گول سورج کانپتے صابن کے غبارے
دہکتا گرم گولا اُٹھ کے قائم ہو گیا آخر
ہوائیں چھو کے کرنیں کیسی بے باکی دکھاتی ہیں
سنورتے جائیں گے گیتی کے گیسو ان شعاعوں سے
تپش گرمی حرارت سوز بخشیں گی جوانی کا
بہت اوپر اٹھا محور پہ گھوما جھک گیا سورج
زوال آمادہ ہو تو کون روکے کس طرح روکے
دہکتا سُرخ گولا گر پڑا مغرب کے آنچل پر
پھر اس سرخی کو ڈھک دیتی ہے بھوری اک سیاہی سی
پرندوں کا بسیرے کے لیے یہ شور و غل کرنا
مسلط ہو گئیں خاموشیاں آخر اندھیرے کی!
ان ہی راتوں میں اہی راستے بھی بھول جاتے ہیں
گناہوں کو زمانے کے چھپا لیتی ہیں یہ راتیں!
دکھائی کچھ نہیں دیتا سجھائی کچھ نہیں دیتا!
سیاہی اور گہری اور گہری ہوتی جاتی ہے
صدائیں جھینگروں کی ذکے سناٹے بڑھاتی ہیں
مگر وہ سُرخ انگارا تو پھر اُبھرے گا مشرق سے
اندھیرے کے خدا لینا ہے جتنا امتحاں لے لے
جلا رکھی ہے اک تخئیل کی قندیل سینے میں

بسے مرغابیوں کے جھیلوں پر آ کر گھرنے والے ہیں
نقاب نیلگوں چہروں سے جیسے اُٹھنے والے ہیں
سمندِ آسماں کے ڈر کے پیچھے ہٹنے والے ہیں
لبِ شیریں جواں بوسوں سے چھٹکے پڑنے والے ہیں
کسی معصوم کی پھونکوں سے اُڑ کر گھرنے والے ہیں
حرارت پا کے کرنوں کی کنول بھی کھلنے والے ہیں
نقابیں اٹھ گئیں محمل کے پردے اُٹھنے والے ہیں
کلی سے پھول، خوشبو، رنگ، ہستی بننے والے ہیں
جو کچے تھے وہ دانے سینک پا کر پکنے والے ہیں
نظارے دے کے بوسے اس کو رخصت ہونے والے ہیں
تمدن مٹ چکے کتنے تمدن مٹنے والے ہیں
اندھیرے گھات میں ہوں گے اُجالے مٹنے والے ہیں
دھڑکنے سی کسی دوشیزہ لبوں پر جمنے والے ہیں
اشارہ ہے کہ اب ظالم اندھیرے بڑھنے والے ہیں
ہزاروں سازشیں ہوں گی نئے گل کھلنے والے ہیں
ستاروں سے کہاں راتوں کو رستے ملنے والے ہیں
لٹیرے لوٹنے نکلے ہیں ڈاکے پڑنے والے ہیں
جو دن کو کارواں نکلے تھے شب کو لٹنے والے ہیں
اندھیروں کو اندھیرے سانپ بن کر ڈسنے والے ہیں
اندھیرے جبر مجبوری مشیت بننے والے ہیں
اسی امید پہ مر مر کے بھی ہم جینے والے ہیں
جو موت آ جائے کیا غم دل کے غنچے کھلنے والے ہیں
چھپالی دل میں اس ڈر سے کہ فتنے اٹھنے والے ہیں

اندھیرے لاکھ گہرے ہوں یقیں لیکن مکمل ہے
سویرے رک نہیں سکتے سویرے آنے والے ہیں

[illegible]

اندر سبھا: تنقید و تجزیہ

کسی فن پارے کی خصوصی اہمیت کا اندازہ اس وقت تک صحیح طور پر نہیں ہو سکتا جب تک اس کے فن کار سے واقفیت نہ ہو اور اس ماحول کو نظر میں نہ رکھا جائے جس میں وہ فن پارہ وجود میں آیا۔ اندر سبھا کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت کا تعین کرتے وقت ہمیں ان نکات پر نظر رکھنا ہوگی۔

سید آغا حسن امانت لکھنؤ اسکول کے شاعر تھے لیکن اس پائے کے نہیں تھے کہ انہیں لکھنؤی اسکول کا نمائندہ کہا جا سکے۔ وہ اگرچہ بسیار گو تھے اور کثیر تلامذہ رکھتے تھے لیکن خود ان کی فکری کاوشیں اپنی انفرادیت تسلیم کرانے میں بری طرح ناکام رہیں۔ دلیل یہ ہے کہ ان کا سوا تمام کلام مفقود ہے جس کی کسی زمانے میں دھوم تھی۔ مسعود حسن رضوی مرحوم نے اندر سبھا کے دیباچے میں امانت کے حالات زندگی کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے کہ ایک زمانے میں امانت نے مرثیہ گوئی کی جانب توجہ دی اور بہت سے مرثیے کہے۔ بقول لطافت ان کے مراثی خاصے مقبول تھے [illegible] مسعود حسن [illegible] باوجود امانت [illegible]

ہو جاتے جن کے ہیرو میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر تھے۔

اس مثال سے یہ حقیقت کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ امانت کی شاعری اوسط درجے سے تجاوز نہیں کر سکتی تھی۔ یہی حال ان کے مراثی کا تھا جن کے بارے میں ان کے صاحبزادے لطافت نے دعوا کیا تھا کہ وہ مرثیے عوام میں مقبول تھے تو پھر ان کی غزلوں کے بارے میں سوچنا تضیع اوقات سے زیادہ کچھ نہیں۔ امانت کو مرثیہ گوئی ہی میں نمایاں مقام حاصل کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ اپنے عہد کے مانے ہوئے ذی علم مرثیہ گو میاں دلگیر کے شاگرد تھے اور تا بقا میں مرثیے، سلام اور رباعی کے علاوہ کچھ نہیں کہتے تھے اور جب غزل گوئی کی جانب مائل ہوئے تو کوئی راہ نما نہیں تھا کیونکہ استاد نے غزلوں کی اصلاح سے انکار کر دیا تھا۔

ایک ایسا شاعر جو اپنے بعد کے لیے کوئی ایسا فکری سرمایہ نہ چھوڑ گیا ہو جس پر اہل نظر سر دھنیں اس سے کسی عظیم شاہکار کے [illegible] کی توقع فضول ہے۔

اندر سبھا جس عہد میں منظر عام پر آئی وہ دور عشرت [illegible] تھا۔ جان عالم واجد علی شاہ [illegible]

تعیش نے شعری مزاج بدل دیا تھا۔ اور شاعری اب ارباب نشاط کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی تھی جس سے جذباتی بلکہ جنسی مضامین سے شعری [illegible] حال ہو رہا تھا۔ [illegible] مانی جاتی تھیں اور پھر ان سب سے بالاتر شاہی محل میں رہس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ جان عالم خود بنفس نفیس ان رہسوں میں حصہ لیتے تھے۔ احاس رہس کی دھوم عوام تک پہنچ چکی تھی لیکن وہ بے چارے، شاہی محل تک پہنچنے کی سکت کہاں رکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں بھی رہس کو دیکھنے اور اس میں حصہ لینے کی امنگ تو تھی ہی۔ اس امنگ کی تکمیل امانت کی اندر سبھا نے کر دی اور پھر اسے وہ مقبولیت حاصل ہو گئی جس نے امانت کو [illegible] غیر فانی زندگی عطا کر دی۔

جہاں تک اندر سبھا کی مقبولیت کا تعلق ہے اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اردو کا کوئی ڈرامہ اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ بلا شبہ آغا حشر کاشمیری نے اسٹیج ڈراموں میں لافانی شہرت حاصل کی۔ ان کے انگنت ڈراموں نے اسٹیج ہی پر نہیں دلوں میں بھی ہلچل مچا دی، اور ڈراموں میں بولے جانے والے مکالمے زبان زد ہو گئے لیکن اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اندر سبھا" کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ کسی اور ڈرامے کو نصیب نہ ہو سکا۔

آغا حشر یقیناً امانت سے بڑے ڈرامہ نگار تھے اور پھر آغا حشر ہی نہیں منشی احسن اور دوسرے ڈرامہ نگار بھی ڈرامے کی تکنیک کے اعتبار سے امانت سے بہت آگے تھے اور آج تو یہ فن خاصا فروغ حاصل کر چکا ہے۔

اندر سبھا کی مقبولیت کا سبب ایک طرف تو وہ عہد ہے جس میں اس رہس کی تخلیق ہوئی اور دوسری طرف وہ انداز تحریر ہے جو اپنے اندر قبولیت کا جوہر رکھتا ہے۔ امانت بلند پایہ شاعر [illegible] اندر سبھا میں [illegible] نے اپنی جن شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لیا ہے وہ بہر حال قابل قدر ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں [illegible] کیا جا چکا ہے امانت کے [illegible] شعری تخلیقات [illegible]

جو دب رہا تھا وہ بعد معنوی تھا۔ جنسی مضامین [illegible] پر مقدم ہو چکی تھی۔ تصوف پر جنسی جذبات غالب آ چکے تھے [illegible] شاعری بن گیا تھا کس نے کتنی [illegible] استعمال کیے۔

اندر سبھا میں بھی یہی عیب ہے۔ اندر کا کردار اگرچہ ڈرامہ میں بظاہر جنس زدہ نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقتاً اسے بھی پاکدامنی کی سند نہیں دی جا سکتی ہے۔ تاج رنگ کا متوالا [illegible] کی صحبت میں زندگی بسر کرنے والا، عیش و عشرت میں گم اور پھر جذبات عشق کی قدر سے عاری، یہ ہے [illegible] اندر سبھا کا سب سے بھاری بھرکم کردار، دوسرا کردار سبز پری کا ہے۔ یہ کہانی کی جان ہے لیکن یہ اس قدر جنس زدہ ہے کہ پہلی ہی نظر میں [illegible] حسین کو نہ صرف دل دے بیٹھتی ہے بلکہ اسے زینت بستر بھی بنا لیتی ہے اور بے باکانہ بلکہ بے حیائی سے اظہار عشق کرتی ہے پھر گلفام ہے جو اگرچہ کنواری لڑکیوں کی طرح بدن چراتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے سب بھول کر پری کا [illegible] وعشق پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ اندر سبھا کا ماحول ہے اور اسی دائرے میں شاعر کے قلم کو گردش کرنا ہے اور پھر اپنی حیثیت بھی تسلیم کروانا ہے۔ یقیناً یہ بہت دشوار گزار [illegible]

امانت نے [illegible] کوشش کی ہے کہ وہ اندر سبھا کو ادنیٰ معیار [illegible] ادبی ماحول عطا کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے امانت نے [illegible] سے زیادہ غزلوں اور چھندوں پر زور دیا ہے۔ ٹھمریاں اور ہولیاں بھی ایک حد تک [illegible] ہوتی ہیں لیکن وہ زیادہ موثر نہیں ہو [illegible] کیونکہ بات یہ ہے کہ ان کا اصل ڈرامے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

[illegible]

سے کہ "مساقہ" "تماشے" کی رعایت اپنے عہد کی نمائندگی
کر رہا ہے۔ کیونکہ رعایت "آدم زاد" بھی ہے جس کا پریوں سے کوئی
تعلق نہیں۔ دراصل "آدم زاد" کا تصرف "سایہ" کی رعایت
سے پیدا ہوا ہے۔ اس سے [illegible] غزل کی [illegible] کا عمل ہے۔ سبھا اندر
کے اکھاڑے میں "آدم زاد دیو" کا کیا دخل، ایک بے چارہ گلفام
پہنچ گیا تھا تو اسے چاہ قاف میں قید و بند کی زندگی گزارنا پڑی تھی۔
تاہم صنعتوں کے استعمال کے اعتبار سے شاعر ادب کی نمائندگی
کر رہا ہے۔ پھر نیلم پری اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہے ؎

اللہ نے بخشا ہے مجھے رتبہ اعلیٰ
گردوں مجھے کہتے ہیں وہ بام ہے میرا

ہمارے ادب میں "بام گردوں" خاصا متعارف ہے۔ زیر
نظر شعر اسی صنعت گری کا نتیجہ ہے۔

پھر اب پری غزل شروع کرتی ہے ؎

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کرو چاہ ہماری

"یوسف" اور "چاہ" (چاہ بابل) میں جو ایک اتفاقی رشتہ
ہے اسی تلمیح سے شعر وجود میں آیا ہے۔

جب پکھراج پری اپنا کام پورا کر لیتی ہے تو راجہ خوش
ہو کر کہتا ہے ؎

خوب رچایا ناچ کے گا کے
پاس میرے اب بیٹھو آ کے

یہ شعر کلام موزوں کی اعلیٰ مثال ہے۔

"اندر سبھا" میں اسی طرح کے بے شمار اشعار ہیں جو
اپنے عہد کی ادبی روش کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ دعوا
چند اشعار سے واضح کر دینا بے جا نہ ہوگا ؎

ہم [illegible] تجھے ہم نے بنایا [illegible]
اس طرح دل سے [illegible] ہوتے تھے [illegible]
[illegible]
[illegible] کے عشق کا [illegible] اٹھانے [illegible]

ایک لفظ نہیں سمجھی ہے [illegible] لفظوں کی
لگ گئی کیا تری آنکھوں کو ہوا ساون کی

رعایت لفظی بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اس کا برمحل
اور مناسب استعمال کلام میں حسن بھی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جب
وہ مقصود کلام بن جاتی ہے اور شعر کی بنیاد بھی اسی پر رکھی جاتی
ہے۔ تو وہ شعر کو بے کیف اور مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔

امانت کے جن شعروں کی بنیاد رعایت لفظی پر ہے ان
میں بیشتر قافیہ پیمائی کی مشق ہیں۔ ایسے شعر بہت کم ہیں جو حقیقی
شاعری کے معیار پر پورے اتر سکیں۔ مگر اس میں امانت کی تخصیص
نہیں۔ ان کے عہد کے تقریباً تمام غزل گو شاعروں کا یہی حال ہے۔

امانت نے اسے ایک ادبی دستاویز بنانے کی کوشش کی ہے
یہ اور بات ہے کہ موجودہ ادبی معیار پر پوری نہ اتری ہو۔ اگر ہم یہی
معیار پرانے ادب پاروں کو جانچنے کے لیے مقرر کر لیں تو صرف
اندر سبھا ہی نہیں پرانے ادب کا بیشتر سرمایہ فکر [illegible] جائے گا۔

اندر سبھا کی تخلیق اس وقت عمل میں آئی جب لکھنؤ میں
شاہی رہس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ خواص و عوام میں اس رہس کو
دیکھنے کا جذبہ ہیجان [illegible] لے رہا تھا۔ خواص میں سے تو غیر بہت
خوش نصیب ایسے تھے جنھیں مذکورہ شاہی رہس کا دیدار نصیب
ہو گیا۔ مگر عوام کی رسائی شاہی رہس تک کیونکر ممکن ہو سکتی
تھی۔ اور پھر یہی بات اس کی بنیاد بن گئی اور عوام میں ایسے
ہی ایک رہس کی تخلیق کا جذبہ جاگ اٹھا۔

رہس اصل میں اس ناچ کو کہتے ہیں جو کرشن جی اپنی
گوپیوں کے ساتھ ناچتے تھے۔ اودھ کے تاجدار حضرت جان عالم
واجد علی شاہ نے کرشن اور گوپیوں کے نام اور کہانیوں کو
اسٹیج کیا۔ اس لیے اس کا نام رہس رکھا جو اس ناچ کے لیے
اصطلاحاً رائج تھا۔

ابتداً رہس صرف قصر شاہی تک محدود تھا۔ خود بادشاہ
کرشن جی کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس رہس کا دیدار
مقربین کو بھی حاصل ہوا اور پھر رہس کی شہرت سارے شہر [illegible]

ہوگئی چونکہ عام لوگ شاہی رہس تک رسائی نہیں حاصل کر سکتے تھے اس لیے فطری طور پر ان میں یہ امنگ پیدا ہوئی کہ وہ بھی اس طرح کا رہس بنائیں اور اسے اسٹیج کر کے تفریح کا سامان فراہم کریں۔ اس عوامی تمنا کا اولین نقش اندر سبھا ہے کیونکہ اندر سبھا کی تخلیق کے وقت اردو میں ڈرامے کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا اندر سبھا کو بھی رہس کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

امانت نے اس عوامی رہس یا ڈرامے کے لیے جسے اندر سبھا کے نام سے قبول عام حاصل ہوا۔ وہ اسلوب نگارش اختیار کیا جو اس وقت سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتا تھا۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے کہ امانت کو نظم کے علاوہ نثر پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ نثر بھی دل پذیر لکھ سکتے تھے۔ بہتر صورت یہ ہوتی کہ اندر سبھا نثر میں لکھی جاتی۔ اس طرح مکالموں میں زیادہ حقیقت پسندی کی کیفیت ہوتی اور جا بجا نظم کی مجبوریاں جو دیوار بن کر حائل ہو گئی ہیں ان سے چھٹکارا مل جاتا۔ مگر امانت نے یہ تمام دشواریاں قبول کر لیں۔ بظاہر یہ کوئی بہت بڑی قربانی نظر نہیں آتی جو نظم کی محبت میں دی گئی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت عوام میں شعری ذوق رچا بسا ہوا تھا اور پڑھنے میں زیادہ مقبول ہوتی تھی جو منظوم ہو۔ مثال میں سحر البیان اور گلزار نسیم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ امانت نے اسی شعری ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اندر سبھا کے لیے نظم کا راستہ اختیار کیا۔

اندر سبھا میں جو اسلوب نگارش اختیار کیا گیا ہے وہ سلیس [illegible] دلکش ہے۔ اگرچہ بعض اوقات امانت کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور حصول مقصد کے لیے سخت ناہمواریوں سے دو چار ہونا پڑا ہے پھر بھی بڑی حد تک وہ کامیاب رہے ہیں۔ اگرچہ اندر سبھا کے تمام کردار سوائے گلفام کے مافوق البشر اور ماورائی نوعیت کے ہیں تاہم امانت نے انہیں لکھنوی انداز [illegible] پریوں میں انسانی عشق کی تڑپ اور دیوؤں میں [illegible] رقابت جو انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔

امانت کی زبان [illegible]
اندر سبھا [illegible]
نے پری کا [illegible] کی کہ [illegible]
گلفام کی گرفتاری کے بعد سبز پری جوگن بن کر جب آتی ہے تو
کالا دیو اندر کو خبر کرتا ہے

پرستان میں جوگن اک آئی ہے
خلائق سب اس کی تماشائی ہے

اور جب راجہ اندر نے اس کا حال سنا تو اس قدر بیتاب ہوا کہ کہنے لگا ۔

نہ کر دیر اے دیو بہر خدا
اکھاڑے میں میرے اسے جلد لا
کسی دل جلے کی ستائی نہ ہو
میرے پاس فریاد لائی نہ ہو

کالا دیو جب جوگن کے پاس جاتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ راجہ نے طلب کیا ہے اور وہ کافی انعام و اکرام دے گا تو جوگن اس ترغیب پر گویا بپھر جاتی ہے اور کہتی ہے۔

یہ باتیں نہ لانا زباں پہ کبھی
فقیروں سے اچھی نہیں دل لگی
[illegible]
[illegible]

مذکورہ بالا مثالوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ امانت نے اندر سبھا کے لیے جو سلیس انداز بیان اختیار کیا ہے اسے قبول عام حاصل ہونا ہی چاہیے تھا۔ ویسے بہت سی باتوں میں خامیاں بھی ہیں۔

مثلاً اندر کا دیو سے کہنا کہ [illegible] جوگن کو جلد لا یہاں پر خدا کا واسطہ اپنے ماحول کے اعتبار سے [illegible] روایتوں سے بھی بدلی گئی ہے بلکہ اکثر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف رعایت کے لیے شعر کہا گیا ہے۔ جوگن کا کالے دیو سے کہنا کہ تیرا منہ خوشامد کی وجہ سے کالا ہو گیا [illegible]

رعایت ہے اور کچھ نہیں۔ تاہم [illegible] ایک محاورہ ہے۔
امانت نے اس محاورہ کو بھی [illegible]

ہر اک تاج پر [illegible]

گیسو بڑھ کے [illegible] تھے جو وہ بل
ڈسنے کو میرے سانپ ہیں پالے نئے نئے

ان چند مثالوں سے قطع نظر اندر سبھا کے زیادہ تر اشعار اسلوب نگارش کے اعتبار سے دلکشی [illegible] بے ساختگی کے حامل ہیں۔
مثلاً لال دیو گل فام کی موجودگی کی خبر [illegible] دیتا ہے۔

شجر جو پرانا ہے [illegible]
گزر وال ہے اک آدم زاد کا

راز کھل جانے پر سبز پری لال دیو سے [illegible]
دل عاشق کا اس بات سے [illegible]
مجھے ہائے حسرت [illegible] ملال ہوگا

دیو شاہی حکم سے گلفام کو اس طرح لے کر آیا ہے

شجر کے تلے سے اٹھایا اسے
سبھا کی طرف کھینچ لایا اسے

مذکورہ بالا مثالوں کی مدد سے ہم اندر سبھا کو اسلوب نگارش کا اعلیٰ نمونہ قرار دینے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔

اس مختصر ڈرامے میں جو نصف سے زیادہ خود ستائی یا غزلوں اور دادروں پر مشتمل ہے۔ مکالموں کی نوبت بہت کم آئی ہے۔ پہلی بار جب راجہ اندر سو جاتا ہے تو سبز پری کالے دیو سے گلفام کے سلسلے میں گفتگو کرتی ہے۔ پھر گلفام اور سبز پری میں بات چیت ہوتی ہے۔ اندر، لال دیو، گلفام اور اندر اور پھر اندر اور سبز پری کے درمیان مختصر مکالمے ملتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امانت نے اس وقت جب کہ ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ اپنے رہس اندر سبھا میں مکالموں کی ادائیگی میں بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔

[illegible] کا [illegible] داستان سے
گل فام [illegible]

اس کو [illegible] کر پیار
تو پری میں ہو وہ ماڈل کی تیری ہے تکرار
کالا دیو سے تیری خاطر ہے [illegible] یہاں ہوا
پتہ بتا معشوق کا لا [illegible] اٹھا

سبز پری سے

[illegible]
[illegible]

دیو گلفام کو اٹھا [illegible] کر اپنے گھر
غیروں کو دیکھ کر حیران ہو [illegible] میں کہاں
ہوں سے

کو تھا میں [illegible] تھا کہاں مکاں
سویا تھا میں کس جگہ آیا ہے کہاں

سبز پری سے

دیکھو تم [illegible] کر [illegible]
[illegible] مجھ کو [illegible] یہاں کرو آرام

اور پھر سبز پری گلفام سے مخاطب ہے۔

سر پہ آنکھوں پہ کلیجے پہ بٹھاؤں تجھ کو
آمری جان گلے سے میں لگاؤں تجھ کو

گلفام سے

وصل کی تیری قسم گھر میں ہے کھانا مجھ کو
نہ خبردار ابھی ہاتھ لگانا مجھ کو

ان مکالموں میں اگرچہ نہ کوئی خاص کشش ہے اور نہ تاثر تاہم یہی کیا کم ہے کہ اس عہد میں جب دور دور تک راہ بے نقش قدم نظر آ رہی ہو امانت کا بطور خود ایک راہ متعین کرنا اور اس پر کامیابی سے گزر کر دوسروں کے لیے اپنے نشان قدم چھوڑ جانا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ کہیں کہیں مکالمے غیر فطری بھی ہیں اور کہیں ابتذال کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ پھر بھی اندر سبھا کے مکالمے

[illegible]

اندر سبھا ایک [illegible]
سے اس میں وہ تمام پابندیاں لازم آتی ہیں جو عام طور سے ڈراموں
کے لیے مخصوص ہیں۔ جیسے تمثیل نگاری، نقل عمل اور اسٹیج وغیرہ۔
جس عہد میں اندر سبھا وجود میں آئی تھی اس وقت اسٹیج کا کوئی
باقاعدہ تصور نہیں تھا اس لیے اندر سبھا میں اسٹیج کا بھی کوئی لحاظ
کیا جا سکتا ہے مگر کرداروں اور ان کے عمل کو فراموش نہیں کیا
جا سکتا کیونکہ یہ تمثیلیں ہی تو ڈرامے کی بنیاد ہوتی ہیں۔ اکثر
ناقدوں کا خیال ہے کہ اندر سبھا میں ڈرامائیت کم اور مثنویت
زیادہ ہے۔

اندر سبھا کا مثنویوں سے تقابل محض اس لیے ہے کہ
اندر سبھا کے خالق نے اپنے رہس یا ڈرامے کو نظم کا قالب عطا کیا
ہے اور مثنویاں بھی قوت نظم کی رہین منت ہیں۔ ان کے لیے عمل
اور تمثیل نگاری کی بھی شرط نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ڈرامے کا
بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ تمثیل اور عمل پر خصوصی توجہ دی جائے اب
ڈرامہ چاہے منظوم ہو یا نثری لباس میں عمل اور تمثیل کی پابندی
دونوں صورتوں میں لازم ہوگی۔

اندر سبھا میں عمل اگرچہ بالکل معدوم تو نہیں پھر بھی ڈرامہ
میں جس قدر عمل کی ضرورت ہے اس کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ اس
کے تمام کردار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ راجہ اندر آتا ہے
سبھا میں آکر بیٹھ جاتا ہے۔ پریاں آتی ہیں، گانے سناتی ہیں
ناچتی ہیں اور جب جب راجہ گویا اکتا جاتا ہے تو آواز لگاتا ہے،
لاؤ دوسری پری کو ۔۔۔ اور یہ بے عملی تقریباً آخر تک جاری رہتی
ہے۔ سوائے ان مواقع کے جب وہ گلفام اور سبز پری کو سزا دیتا
ہے یا جب انھیں رہا کرتا ہے۔ خود سبز پری جو سب سے زیادہ فعال
کردار ہے عملی حیثیت سے بہت زیادہ پرکشش نہیں کیونکہ تقریباً
ایسا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ جاندار کردار سحر البیان کی اس پری
کا ہے جو شہزادہ بے نظیر پر عاشق ہو کر قید و بند کی سختیاں
جھیلتی ہے مگر زبان سے اف نہیں کرتی۔

[illegible]
کی عموماً کہانیوں اور [illegible]
کا پلاٹ ان کہانیوں اور [illegible] کی رہین منت ہے جو عہد کا [illegible]
افسوناتی ماحول، یعنی جنوں اور پریوں کی داستانیں جو اس
وقت تک [illegible] اندر سبھا میں رچ بس چکی تھیں۔
اب کیونکہ امانت نے اندر سبھا کے لیے منظوم طرز اظہار اختیار
کیا، لہٰذا فطری طور پر وہ مثنویوں کا اثر زیادہ قبول کیا کیونکہ
وہ عمل یا نقل عمل پر کوئی خصوصی توجہ نہ دے سکے۔ نتیجتاً ان کا
ڈرامہ مثنوی کی حدود سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا اور ناقدوں
کو یہ کہنے کا بجا طور پر موقع مل گیا کہ اندر سبھا میں ڈرامائیت
کم اور مثنویت زیادہ ہے۔ یقیناً اگر اندر سبھا میں اسٹیج
کو دخل نہ ہوتا تو اپنی منظوم صورت میں اسے ایک مختصر یا مکمل
مثنوی ہی کہنا بجا ہوتا۔

اندر سبھا چونکہ ایک عوامی جذبۂ تفریح کی تسکین
کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس لیے مصنف نے ان پہلوؤں کو سامنے
رکھا جو اس ماحول میں پسندیدہ تھے۔ چنانچہ تقریباً تمام کہانی
گانوں کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے اور اس سے جو صورت ہوتی ہے
تو بیانیہ انداز آجاتا ہے۔ عمل کا [illegible] مختصر ہے اسی اعتبار
سے کشمکش بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پورے ڈرامے میں صرف
دو تین مواقع ایسے آتے ہیں جب کشمکش کا انداز ہوتا ہے۔ ایک
تو اس وقت جب کالا دیو شہزادہ گلفام کو پرستان اٹھا لاتا
ہے۔ وہ خواب سے بیدار ہو کر خود کو نئے ماحول میں پاتا ہے۔ پھر
سبز پری اپنے عشق کی داستان چھیڑ بیٹھتی ہے۔ شہزادہ اس
عشق کے لیے ایک شرط رکھتا ہے کہ پہلے راجہ اندر کا دربار دکھلاؤ۔
پری [illegible] باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور شہزادہ جانے کی
ضد کرتا ہے۔ یہاں پہونچ کر ذہن اس تصادم کے انجام کے
بارے میں تھوڑی دیر تک سوچتا رہتا ہے ۔۔۔ دوسرا موقع
وہ ہے جب اندر کو آدمی کے وجود کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے طلب
کرتا ہے۔ سبز پری اپنے عشق کا اقرار کرتی ہے۔ یہاں بھی ذہن سوچتا

[illegible] گیا تمام [illegible] کو [illegible] اور پھر [illegible] ہے۔

اندر سبھا میں ایک [illegible] کشمکش [illegible] ہے جب [illegible] کے دو [illegible] اہمیت [illegible] ہے [illegible] ہے جو گن [illegible] رہتی ہے اور پھر [illegible] گلفام [illegible] ہے [illegible] کشمکش میں مبتلا رہتا ہے [illegible] کا پیچھا کیا ہوتا ہے۔ [illegible] کے علاوہ [illegible] کشمکش [illegible] ہے۔ اس لیے اس عنصر کی [illegible] کو بھی کہانی سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ اس حصے میں وہ زندگی اور توانائی نہیں پائی جاتی جس کے ہم خواہش مند ہیں پھر بھی اندر سبھا کا [illegible] ہے اور اپنے محدود دائرہ عمل کی رونق کے لیے کافی ہے۔

ڈرامے میں محوری یا مرکزی کردار کی اہمیت کا حامل ہوتا ہے یہ اہمیت اس لیے بھی ہے کہ پورا ڈراما اسی کے گرد گھومتا ہے [illegible] دار [illegible] کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے کیونکہ ساری کہانی کا انحصار اسی پر ہوتا ہے اس لیے اسے محوری کردار یا مرکزی کردار کہا جاتا ہے۔

عموماً مرکزی کردار ابتدا ہی سے نمایاں رہتا ہے لیکن کبھی کبھی پلاٹ کی پیچیدگی ذہنوں کو الجھا لیتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کہانی کا "محور" کون ہے۔ بعض کردار اس قدر متنوع اور ہم رنگ ہوتے ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ عقل شش و پنج میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ آخر کس کردار کو کس پر ترجیح دے اور کسے مرکزی کردار مانے۔ یہی کشمکش اکثر معکوس صورت میں بھی ہوتی ہے یعنی کردار اس قدر بے اثر اور بے عمل ہوتے ہیں اور اس لیے اتنی دبے عمل میں مختلف کردار اس قدر ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک پر مرکزی کردار کی چھاپ لگانے میں دشواری ہو جاتی ہے۔ [illegible] سبھا بھی ایسے ہی ڈراموں کی صف میں شامل

ہے جس میں مرکزی کردار کے لیے [illegible] ہے [illegible] کالا دیو [illegible] لال دیو [illegible] ہے۔ اگر اندر سبھا میں [illegible] ہوتے تو [illegible] نہیں ہوتا۔ گلفام کا کردار بھی [illegible] کالا دیو کے کردار بھی عمل کے اعتبار سے [illegible] ہیں [illegible] صرف دو کردار [illegible] اور دو [illegible] ہیں کی مگر سبز پری کا کردار [illegible] ہیں جس کے [illegible] تلاش کرنا پڑے گا۔

اندر سبھا میں نام کے لحاظ سے جو کردار سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ خود راجہ اندر ہے۔ اندر سبھا یعنی اندر کی محفل اس اعتبار سے اگر راجہ اندر کے کردار کو مرکزی یا محوری کردار مان لیا جائے تو بے جا نہ ہو گا مگر سوال یہ ہے کہ عمل کے اعتبار سے خود راجہ اندر کا کردار بھی بھول سا [illegible] پوری کہانی میں اندر کا صرف صرف یہ ہے کہ تمام رات پریوں کا ناچ دیکھتا رہے اور پھر دن بھر آرام کرتا رہے اور دوسری شام کا انتظار کرے۔ بال صرف دو مواقع پر راجہ اندر میں شاہانہ انداز پائے جاتے ہیں ایک اس وقت جب وہ گلفام اور سبز پری کو سزا دیتا ہے اور دوسرا وہ وقت جب جوگن کے گانے [illegible] ہو کر قول ہار جاتا ہے اور گلفام کی رہائی کا حکم دیتا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود راجہ اندر کو مرکزی کردار نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اگر راجہ اندر کو مرکزی کردار مان لیا جائے تو اندر سبھا صرف ان پریوں کے گرد گھومتی ہے جن کا کام ایک عیش پرست راجہ کو ناچ گا کر خوش کرنا تھا۔ اس طرح اندر سبھا اپنی ڈرامائیت کھو بیٹھتی۔ دراصل اندر سبھا کا مرکزی کردار سبز پری ہے۔ جیسے وہ اسٹیج پر آتی ہے کہانی میں جان آجاتی ہے۔ سبز پری کے بعد ہی وہ تمام کردار سامنے آجاتے ہیں جن کا تعلق اصل کہانی سے ہے۔ گلفام، کالا دیو اور لال دیو سب کا وجود سبز پری کی آمد کے بعد ہی نظر آتا ہے کیونکہ

اصل کہانی کا تعلق سبز پری سے ہے جو محض [illegible] پہلا کا ہونا چاہیے۔

سبز پری کا کردار بھی کوئی معیاری نہیں۔ وہ بھی اپنے [illegible] سبز پری کی [illegible] شہزادہ گلفام کو [illegible] بے تاب ہو جاتی ہے کہ [illegible] بھی [illegible] اور پھر سبز پری شہزادہ گلفام سے [illegible] اظہار عشق کرتی ہے وہ بھی کچھ ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ اظہار عشق [illegible] عاشق ہو جانے کے بعد کردار میں فراوانی پیدا ہوتا ہے اور [illegible] آخر تک نہیں چھوٹتی۔ سبز پری کا کردار دراصل ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو عشق پیشہ اور صاحب اختیار ہے۔ بگڑے کردار جو کسی کو جبراً محبت کرنے پر مجبور کرے اعلیٰ کردار نہیں ہو سکتا۔ سبز پری کا کردار بیک وقت عاشقانہ بھی ہے اور ستمگرانہ بھی۔

ہر تخلیق اپنے دور کے اثرات قبول کرتی ہے اور ان کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جو اسے ماحول سے ورثہ میں ملتی ہیں۔ ادیب نے بھی ہر عہد میں وہی پیش کیا ہے جو ماحول سے حاصل کیا ہے۔ میرامن کی "باغ و بہار" اگرچہ ایرانی داستان "چہار درویش" کا ترجمہ ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس داستان میں ہمیں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دہلوی ماحول، دہلوی زبان، دہلوی رسم و رواج اور دہلوی رہن سہن کی روشن جھلکیاں "باغ و بہار" میں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہیں اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ داستانوں کی مقبولیت کا سبب یہی ہوتا ہے کہ لوگ ان سے غیریت محسوس نہ کریں۔

رجب علی بیگ سرور کا "فسانۂ عجائب"، میر شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" اور رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" سب کے سب لکھنوی ماحول میں پروان چڑھے۔ "فسانۂ آزاد" کے کردار اسکا جائے وقوع، انکے رسم و رواج سب کچھ لکھنؤ سے متعلق [illegible] لیکن [illegible] اور [illegible] میں [illegible] ماحول [illegible] سب ایرانی ہی ہیں لیکن "فسانۂ عجائب" کہاں [illegible] کہاں [illegible] جہاں عالم [illegible] کا تہذیبی [illegible] پائی جاتی ہے جنھیں [illegible] سکتے ہیں۔

میر حسن کی "سحر البیان" اگرچہ مافوق الفطرت کرداروں کو سمیٹے ہوئے ہے لیکن آگے چل کر وہ دہلوی تمدن میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح نسیم کی "گل بکاؤلی" بھی لکھنوی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ "بکاؤلی" جو قوم کی پری ہے جب اپنے جذبات محبت کا خاموش اقرار کرنا چاہتی ہے تو ایک مشرقی لڑکی نظر آتی ہے جو لکھنؤ کے ماحول میں پروان چڑھی ہے۔ بکاؤلی سے جب تاج الملوک کے بارے میں رائے لی جاتی ہے تو وہ اس انداز میں اقرار کرتی ہے ؎

اقرار میں تھی جو بے حیائی
شرمائی، لجائی، مسکرائی

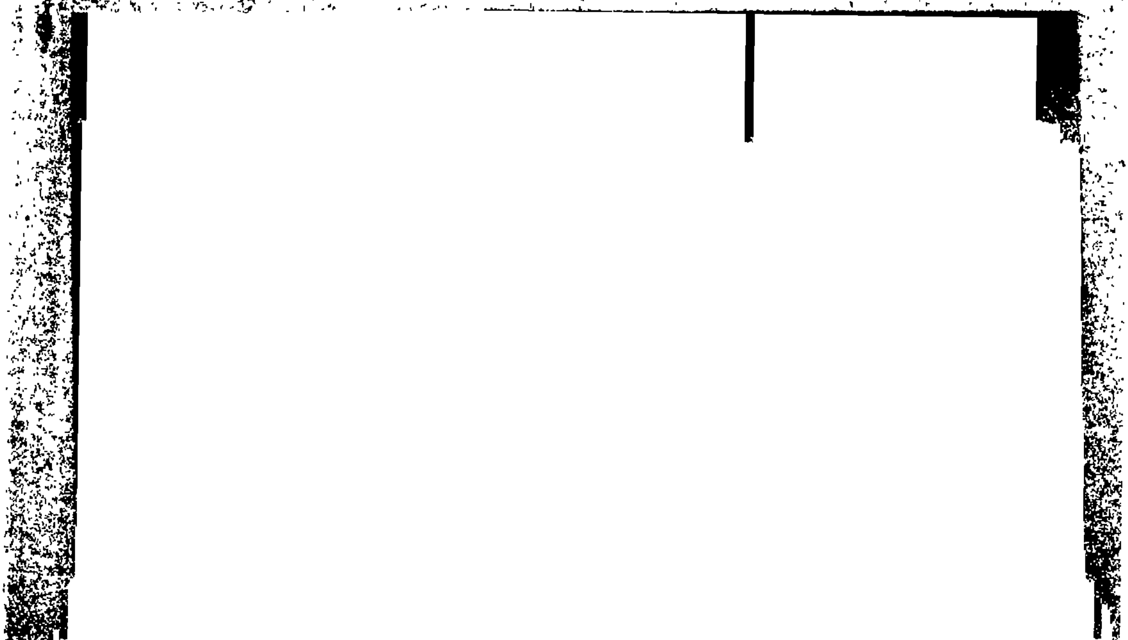
ایسی ہی کیفیت کم و بیش سارے فسانوں، ساری داستانوں اور تمام مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ امانت نے جب "اندر سبھا" کی داغ بیل ڈالی تو وہ بھی لکھنؤ کی حدوں سے آگے نہ نکل سکے۔

قصہ راجہ اندر کے اکھاڑے کا ہو یا کسی دور دراز کے ملک کا، اسے صفحۂ قرطاس پر لانے کے لیے ان واقعات و تفصیلات کی ضرورت ہوگی جو پیش آتے ہیں یا پیش آ سکتے ہیں۔ چوں کہ کہانیوں اور داستانوں میں سارے قصے فرضی ہوتے ہیں اور سارے کردار مصنوعی، لہٰذا وہ ماحول جس میں یہ کردار پروان چڑھیں ظاہر ہے ذہنی اپچ کا رہینِ منت ہوگا۔ اب اگر ذہن کوئی ماورائی ماحول تخلیق کرے تو وہ عوام کے لیے چیستاں بن کر رہ جائے گا اور اسے وہ مقبولیت مل ہی نہیں سکتی جس کا تصور فنکار رکھتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے جانے پہچانے ماحول، مانوس رسم و رواج ہی کا سہارا لینا پڑے گا کیونکہ "اندر سبھا"



وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو لاڑکانہ میں ہائی اسکول کی تقریبات کے اختتام پر منعقدہ تقریب ۱۰ اکتوبر کو ہائی اسکول میں ہائی اسکول
کی بنیاد رکھی اور خراج عقیدت پیش کیا۔ تصویر اسی موقع کی ہے۔ جس میں گورنر سندھ بیگم وزیر اعلیٰ سندھ
ممتاز علی بھٹو وزیر قانون جتوئی ڈاکٹر ... اور وزیر تعلیم سندھ سرور ... بھی وزیراعظم کے ساتھ نظر آرہے ہیں

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو لاڑکانہ میں ہائی اسکول ... کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔ اس موقع پر
گورنر اور وزیر اعلیٰ سندھ بھی موجود تھے۔

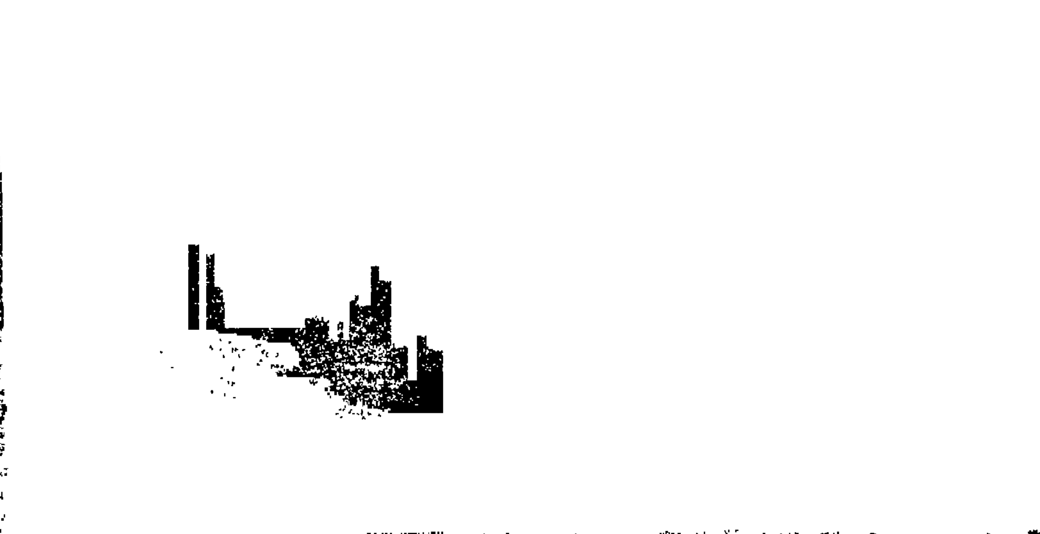


[illegible]
[illegible]

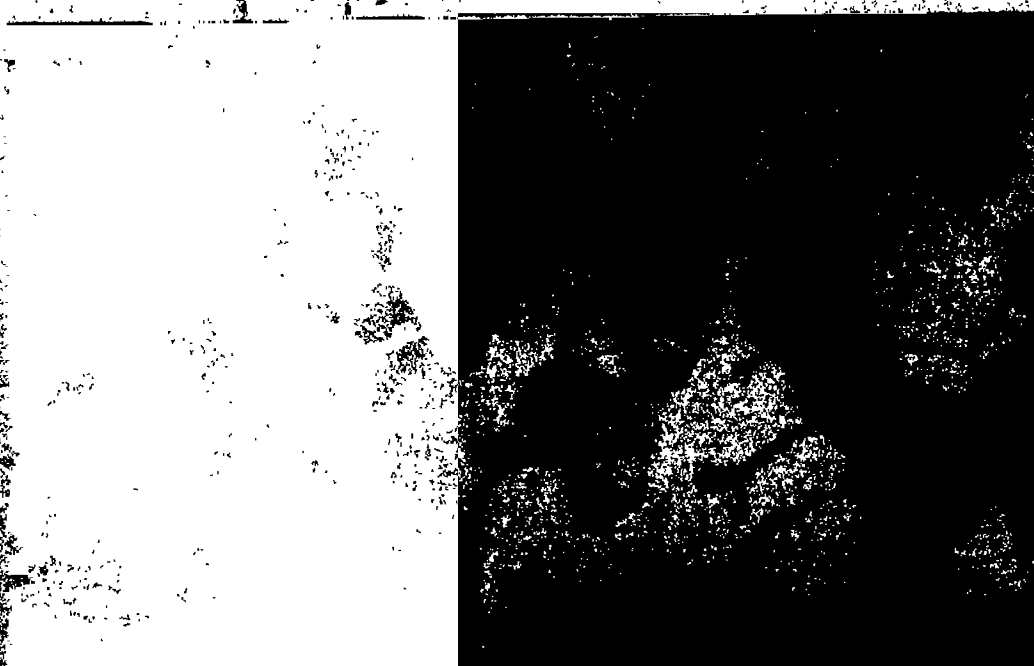
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[redacted]



[illegible] کانفرنس کا خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں [illegible]
[illegible] نظر آ رہی ہیں۔



کی تخلیق کے وقت دنیا اتنی نہیں سمٹ سکی تھی جتنی آج ہے۔ لہٰذا فنکار مجبور تھا کہ اسی تمدن اور تہذیب، انہیں رسم و رواج کو اپنی فکری کاوشش کی اساس بنائے جس میں خود فنکار نے آنکھیں کھولی تھیں اور یہ تمدن امانت کو لکھنوی تہذیب نے عطا کر دیا

جب ہم امانت کی "اندر سبھا" کو دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ تصور میں جان عالم کا لکھنؤ پھرنے لگتا ہے، جہاں چاروں سمت مسرت و شادمانی کی حکمرانی اور دولت کی فراوانی ہے خود جان عالم تخت پر جلوہ گر ہیں۔ پری تمثال حسینائیں انہیں جھرمٹ میں لیے ہیں۔ چہلیں ہو رہی ہیں۔ ارباب نشاط ساز چھیڑ رہے ہیں۔ رقاصائیں پیروں کے گھنگھروؤں سے قیامت ڈھا رہی ہیں۔ درباری مجرا بجا لاتے ہیں

اور حسب مراتب انعامات پاتے ہیں۔ یہی سب کچھ اندر سبھا میں موجود ہے۔ راجہ اندر جو پرستان کا راجہ ہے جہاں خزاں کا گذر نہیں، جہاں ہر سو بہاریں رقصاں ہیں لیکن اس پرستان میں بھی اختر نگر کا ماحول ہے، وہاں پھاگن بھی آتا ہے اور بہار بھی، ہولی بھی کھیلی جاتی ہے اور بسنت بھی منایا جاتا ہے۔ اگرچہ اسٹیج پر ہولی کھیلنے کا ذکر نہیں ہے لیکن ساری پریاں ہولی گاتی ہیں، ہولیاں گانے سے جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ یہی کہ پریاں مختلف رنگ کی پچکاریاں لیے ہوئے "اندر" کے دربار میں حاضر ہیں اور "اندر" ان سب کو چھیڑتا ہے بلکہ جوراجوری بھی کر رہا ہے جیسے گوکل میں کرشن اپنی گوپیوں سے پھاگ کھیل رہے ہوں یا اختر نگر میں جان عالم ہولی کے موقع پر اپنے مخصوص درباریوں کے ساتھ ہولی کا رنگ اڑا رہے ہیں۔ پھر سبھا میں بہار کی رت بھی آتی ہے اور پریاں بسنت راگ چھیڑ کر مست کر دیتی ہیں۔ یہ بسنت بھی خالص لکھنوی انداز کا ہے۔

تیوا پھولے انبوا مورا نے
چمپا کے رد کھ کلین کی بار
رت آئی بسنت عجب بہار

بہار کا موسم آگیا۔ کسم پھول رہی ہے، سرسوں کے زرد زرد رنگ کے پھول قیامت ڈھا رہے ہیں ٹیسو پھول رہا ہے، آم کے درختوں میں بور آیا ہے۔ چمپا کے پودوں میں کلیاں لدی ہوئی ہیں۔ کیونکہ بسنت رُت آگئی ہے۔ اس گیت میں ہمیں جس تہذیب کی جھلک ملتی ہے وہ پرستان کی نہیں ہے بلکہ لکھنؤ کی ہے اور اس ہندوستان کی ہے جہاں یہ تہوار منائے جاتے ہیں۔ ماحول میں انیسویں صدی کے رسوم رچے بسے ہیں۔

سبز پری کا اپنے تخت پر گزرنا اور شہزادہ گلفام پر نظر پڑنا اور یہی جان سے عاشق ہو جانا یہ سب کچھ واقعاتی غلط بیانی ہے بھلا کسی پری کو کیا پڑی ہے کہ وہ انسانی بستی سے گزرے اور پھر اس سے بڑھ کر کسی شہزادے کا کھلی چھت پہ استراحت فرمانا عجیب سی بات ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ کہانی میں ایک معاشقے کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ عاشق کوئی معمولی ہستی نہیں پریوں کی رانی ہے لہٰذا معشوق بھی کوئی شہزادہ ہی ہونا چاہیے۔ اس کوتاہی سے اغماض برت کر جب اس داستانِ عشق پر غور کیجیے تو یہ عشق بھی خالص انسانی نظر آتا ہے۔

اس تمام واقعے میں اس عہد کے تمدن کی جھلکیاں موجود ہیں جب ایک صاحبِ اقتدار شخص کسی حسین پر فریفتہ ہو کر اس سے عرض نیاز نہیں کرتا تھا بلکہ اسے اپنی جبروتی طاقت سے اپنی خوابگاہوں میں کھینچ لاتا تھا اور اپنے عشق کا اظہار کرتا تھا۔ یہاں سبز پری بھی اس معیار پر پوری اترتی ہے وہ اپنے معشوق کو اپنے خلوت کدے میں کھنچوا لیتی ہے۔ یہ وہ عکس ہے جو ہمیں انیسویں صدی کے معاشرے میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے۔ لکھنؤ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

سبز پری اپنے معشوق کو حاصل کرنے کے لیے کالے دیو کی مدد لیتی ہے اور گلفام چشم زدن میں حاضر کر دیا جاتا ہے اور پھر عاشق و معشوق میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ اسی لکھنوی ماحول

کی طرح جب [illegible] آنکھ کھولتی ہے تو شہزادہ بیدار ہو کر حیرت سے سوال کرتا ہے۔ دیو سے مجھے یہاں کون لایا ہے؟ میرے گھر والے کہاں ہیں؟ وہ ادھر کی [illegible] ہیں [illegible] ہوں۔ پری کچھ ہوا اسے بھول جاؤ، تمہارا نام اور [illegible]۔ جواب میں شہزادہ اپنا نام بتاتا ہے اور پری کا نام پوچھتا ہے۔ [illegible] اپنا نام بتا دیتی ہے اور پھر اظہار عشق اور [illegible] کے کلمات [illegible] سرگشی ہوتی ہے آخر شہزادہ پری سے عشق کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے بلکہ وہ اسے اندر تک اکھاڑے یا اندر سبھا میں لے جائے۔ یہاں شہزادے کا جو کردار ہے وہ وہی روایتی کردار ہے جو اکثر افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ ادھر کے شاہی محلوں میں بچوں کی تربیت کا یہی انداز تھا کہ انھیں دنیا کی نگاہ سے بچانے کے لیے اس طرح پروان چڑھایا جاتا تھا کہ وہ تعلقات دنیا تو کیا عمر کے تقاضوں سے بھی پوری طرح واقف نہ ہو پاتے تھے۔ گلفام بھی ایسا ہی نوجوان ہے جو پہلی بار اپنے عزیزوں سے جدا ہوا ہے اور اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ عمر کی کس منزل میں داخل ہو گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پری کی رفاقت سے خوش نہیں اور اپنے گھر والوں کو یاد کر رہا ہے۔

کہانی آگے بڑھتی ہے عشق کے ہاتھوں مجبور سبز پری گلفام کو سنگلدیپ میں لاتی ہے لیکن دیو راجہ کے کان بھر دیتا ہے۔ سزا عاشق و معشوق دونوں کو ملتی ہے۔ پری کے پر نوچ دیے جاتے ہیں اور شہزادہ کنویں میں قید کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک واقعات کو کسی طرح قبول کیا جا سکتا ہے کہ یہ ممکن ہے لیکن اب جو شہزادہ [illegible] سے باہر نکلتی ہے۔ اس کا [illegible] اور [illegible] اور رنگت کالے [illegible] میں شہزادے کو تلاش کرنا، کنویں میں جانا، پھر راجہ تک جوگن کی خبر کا پہنچنا اور دربار میں رسائی حاصل کرنا اور راجہ کا اپنی چہیتی پری کو پہچان لینے سے قاصر رہنا، یہ سب ایک ایسی داستان کا حصہ ہیں جس کے کردار سنجیدگی سے کسی کو نہیں چاہتے بلکہ جو منسوب ہو اسے اس طرح بھلا دیا جیسے کبھی کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔

مذکورہ بالا ماحول لکھنؤ سے مختلف نہیں ہے بلکہ اس عہد کی اکثر ریاستیں اسی نہج پر عمل پیرا تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "اندر سبھا" کی کہانی میں ہمیں کردار اور ماحول کے جو عکس نظر آتے ہیں۔ ان میں انیسویں صدی کی ہندوستانی تہذیب عموماً اور لکھنوی تہذیب خصوصاً جلوہ گر نظر آتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ادبی نقطہ نظر سے "اندر سبھا" کوئی بہت بلند پایہ شاہکار نہیں، اس کی اہمیت محض تاریخی ہے۔ اسے ہم ایک کامیاب رہس سے زیادہ اہم مرتبہ نہیں دے سکتے۔ لیکن اس سے کہانی کی کشش اس کی [illegible] قیمت اور اس کی ہر گیری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ اعتراف اندر سبھا اور امانت کی شخصیت منوانے کے لیے کافی ہے کہ اردو کا کوئی ڈرامہ اندر سبھا سے زیادہ مقبول نہیں ہوا اور اتنے ایڈیشن کسی اور فن پارے کو نصیب نہیں ہوئے۔

غزل

حیات لکھنوی
امامیہ ہال پنچ کوئیاں روڈ
نئی دہلی

میں خال وخد کا سمندر تصورات میں تھا
دھنکتی ذات کا سورج اندھیری رات میں تھا

انا کے دشت میں صدیوں کی دھول اوڑھے ہوئے
نہ جانے کب سے وہ الجھا تعصبات میں تھا

میں شہر شہر کی حیرانیوں سے گزرا ہوں
مرا وجود بھی شاید عجائبات میں تھا

وہ وقت اب بھی نگاہوں میں جگمگاتا ہے
یہ کائنات تھی مجھ میں، میں کائنات میں تھا

تمام شور شرابہ نفس نفس میں ہے
[illegible] ڈوبا ہوا احساس شب برات میں تھا

یہ صبح وشام ملاقات ہے اجیرن سی
کبھی کبھار کا ملنا تبرکات میں تھا

حیات ڈھونڈ رہا ہوں وہ لکھنؤ کہ جہاں
شرافتوں کا اثاثہ تکلفات میں تھا

کمال لکھنوی
[illegible] محمد عباس روڈ، گولہ گنج
لکھنؤ

غزل

کیا حادثہ یہ اے دلِ مجبور ہو گیا
کوئی قریب ہو کے بہت دور ہو گیا

کل میکدے میں ایک تقدس مآب بھی
ساقی سے جام لینے پہ مجبور ہو گیا
جب سے تری نگاہ نے ٹھکرا دیا مجھے
میں زندگی سے دور بہت دور ہو گیا
اس کی نظر بھی آج مجھے جانتی نہیں
جو شخص میری ذات سے مشہور ہو گیا
پھر جلوہ ہائے دوست رہیں گے کہاں قیام
آئینۂ خیال اگر چور ہو گیا
وہ وہم تھا، یقین تھا، کیا تھا خبر نہیں
کچھ تھا جو آج دل سے مرے دور ہو گیا
وہ اک چراغِ رونقِ ہر انجمن جو تھا
کیا جانے کیا ہوا ہے جو بے نور ہو گیا
جینے کو جی رہا ہے بڑے اہتمام سے
انسان زندگی سے مگر دور ہو گیا

پہلے بھی تھا غرور مگر اس قدر نہ تھا
جتنا کمال آج وہ مغرور ہو گیا

بشیر فاروقی
مراد علی لین، لکھنؤ

غزل

شہرِ فصلِ گل ہے چل کر پتھروں کے درمیاں
زندگی آ جا کبھی ہم بے گھروں کے درمیاں

اے ہجومِ غمگساراں تجھ میں کچھ قاتل بھی ہیں
رو رہے ہیں جو سرِ مقتل سروں کے درمیاں

میں ہوں وہ تصویر جس میں حادثے بھرتے ہیں رنگ
خال و خط کھلتے ہیں میرے خنجروں کے درمیاں

پہلے ہم نے گھر بنا کر فاصلے پیدا کیے
اور پھر اٹھی ہیں دیواریں گھروں کے درمیاں

عہدِ حاضر میں محبت کی فضا ہے تو مگر
تذکروں میں، کاغذوں پر، رہبروں کے درمیاں

جانے کس دن جاگ اٹھے میرے اندر کا کبیر
تم پڑا رہنے دو مجھ کو ٹھوکروں کے درمیاں

اڑ گیا تو شاخ کا سارا بدن جلنے لگا
دھوپ رکھ لی تھی پرندے نے پروں کے درمیاں

یہ جو خانہ ہے سکونت کا یہاں لکھ دو بشیر
پھول ہوں لیکن کھلا ہوں پتھروں کے درمیاں

[illegible]

اُردو ڈراما اور انارکلی

اصناف ادب میں ڈراما بڑی اہمیت رکھتا ہے فنی نقطۂ نظر سے یہ ایک منفرد صنف ہے۔ عملی اداکاری کی شکل میں یہ زندگی کی مجسم تصویر و تفسیر، انسانی نفسیات اور زندگی کے مطالعے کا بہترین ذریعہ ہے۔ عمل و حرکت ڈرامے کی روح اور تصادم اس کی جان ہے۔ ڈراما ابتدائی عہد میں ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کرتا رہا۔ جن کے پیچھے مذہبیات اور دیومالائی تصورات کارفرما تھے۔ مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں یونان ڈرامے کے اولین مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان اور یونان میں دیومالائی تصورات کا بیش بہا خزانہ موجود تھا۔ یہی تصورات ڈرامے کے ارتقا میں مدد معاون ثابت ہوئے۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش اور ان کی خوشنودی کے لیے تمثیلی انداز میں خراج عقیدت پیش کیا جاتا تھا۔ ڈرامے کی روایت کو آگے بڑھانے میں عوام نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سنسکرت ڈرامے کی شروعات بھی دیوی دیوتاؤں کی پرستش سے ہوئی تھی۔ ڈرامے کے آغاز کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ تمام دیوتا اپنی بے کیف زندگی سے تنگ آ کر برہما کے پاس گئے اور عرض کیا کہ دل بہلانے اور زندگی کو پرلطف بنانے کے لیے کوئی مشغلہ بتایا جائے۔ برہما نے ان کی درخواست منظور کی اور چاروں ویدوں کے عطر نکال کر ان کی مجموعے سے رقص کے فن کی تشکیل کی اور اسے ناٹیہ وید کے نام سے موسوم کر کے اسے چاروں ویدوں کا تقدس اور عظمت عطا کی۔ مکالمہ رگ وید سے، نقالی یجر وید سے، گانا سام وید سے اور ناچنا اتھروید سے لیا۔

ان روایتوں سے قطع نظر یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان میں ناٹک کے وجود کا سراغ زمانہ قدیم سے ملتا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یورپ سے قبل ہندوستان میں ڈرامے کی ابتدا ہوئی۔ دنیا کا سب سے پہلا ڈراما ... قبل مسیح [illegible] نے لکھا۔ بعد میں کالی داس اور بھوبھوتی نے فن ڈراما کو عروج پر پہنچایا۔ اردو ڈراما بہت دیر سے شروع ہوا۔ ہندوستان میں ڈرامے کی دو ہزار سالہ روایت موجود تھی مگر اردو ڈرامے نے اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ کالی داس اور بھوبھوتی کی اس سرزمین میں جہاں مدتوں پہلے ڈراما اپنی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا اردو ڈرامے نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی اور اس نے وہ مقام بھی حاصل نہیں کیا جو اس کو حاصل کرنا چاہیے تھا۔

اردو ڈراما واجد علی شاہ کے رہس، امانت کے اندر سبھا، پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے دور سے ہوتا ہوا بیسویں صدی کے ربع اول تک کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ اردو ڈرامے کے آغاز کے بارے میں محققین کی رایوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال ہے کہ اردو کا پہلا ڈراما واجد علی شاہ کی تصنیف رادھا کنھیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے راجہ گوپی چند اور جلندھر کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیا ہے۔ جو ۱۸۵۳ء میں بمبئی تھیٹر میں کھیلا گیا۔ ۱۸۵۳ء ہی کا وہ زمانہ تھا جب اندر سبھا بڑے دھوم دھام سے اودھ کے عوامی اسٹیج پر دکھائی جا رہی تھی۔ اندر سبھا نے بہت شہرت پائی۔ اس کا موضوع راجا اندر کا مشہور قصہ ہے۔ جس کا پلاٹ مثنویوں کی طرح جن و پری اور محل وقوع پرستان ہے۔ امانت کے سامنے اندر سبھا کی تصنیف کے وقت شاہی رہس اور قصہ خوانی کی وہ محفلیں تھیں جو امراء کو عزیز تھیں۔ نیز مثنوی سحرالبیان اور گلزار نسیم کی مقبولیت بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اندر سبھا کو بہت پسند کیا گیا۔ اندر سبھا کی شہرت اور مقبولیت لکھنؤ سے نکل کر دور دور تک پھیلنے لگی۔ امانت کی تقلید میں بہت سے لوگوں نے اندر سبھائیں لکھیں لیکن امانت کی اندر سبھا کی مقبولیت کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اسٹیج پر برسوں اندر سبھا چھائی رہی۔ عوام کا بڑھتا ہوا رجحان دیکھ کر پارسیوں نے اپنی منڈلیاں قائم کیں۔ لیکن اردو ڈرامے کو تفریح اور تفنن سے بڑھ کر اپنے تجارتی اغراض و مقاصد کا ذریعہ بنایا۔

بقول عبدالعلیم نامی اردو ڈرامے کی ابتدا ایک مرہٹی تھیٹریکل کمپنی "ہندو ڈرامیٹک کور" نے کی جو ایک سفری کمپنی تھی۔ اس کے بڑودہ چلے جانے کے بعد پارسی ڈرامیٹک کور نے اس کی جگہ لے لی۔ اس نے چند گجراتی تماشے دکھلانے کے بعد اردو ڈرامے دکھلانے شروع کر دیئے۔ مالی منفعت کے امکانات نظر آئے تو پارسیوں نے کافی سرمایہ لگا کر اسٹیج کے لوازمات کو سنوارا۔ مصور پردے استعمال کئے جانے لگے۔ موسیقی سے واقف اداکار ملازم رکھے جانے لگے۔ ان کمپنیوں میں الفریڈ، نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی اور کورنتھین تھیٹریکل کمپنی خاصی مشہور تھیں۔ ان کے علاوہ کئی پارسی کمپنیاں بھی ڈرامے پیش کرتی رہیں۔ رونق بنارسی، حسینی میاں ظریف، طالب بنارسی وغیرہ ان کمپنیوں سے وابستہ تھے۔ آغا حشر نے بھی ان کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے۔ طالب بنارسی نے نکرم ولاس، دلیر دل شیر، نگاہ غفلت، گوپی چند، لیل و نہار، وغیرہ ڈرامے لکھے۔ حسینی میاں ظریف نے بہت سے ڈرامے لکھے۔ جن میں چاند بی بی، حاتم طائی، لیلیٰ مجنوں، بلبل بیمار، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ رونق بنارسی نے طلسم زہرہ، بے نظیر بدر منیر، مسکین بکاؤلی، کے علاوہ اور بھی بہت سے ڈرامے لکھے۔

احسن نے ہیملٹ کا ترجمہ خون ناحق، رومیو جولیٹ کا ترجمہ، گلنار فیروز، کامیڈی آف ایررز کا ترجمہ بھول بھلیاں کے نام سے کیا۔

ان تمام ڈراما نگاروں میں آغا حشر کاشمیری کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھیں اردو کا شیکسپیئر قرار دیا گیا۔ انھوں نے الفریڈ کمپنی کے لیے ڈرامے لکھے بعد میں خود ہی ایک ڈراما کمپنی قائم کی، وہ کمپنی بند ہوئی تو کلکتہ کی ایک اور ڈراما کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے ڈراموں میں شہید ناز، اسیر حرص، خوبصورت بلا، سفید خون، وغیرہ ڈرامے بہت مشہور ہیں۔ مکالمے لکھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کا اسلوب بیان انوکھا اور پُراثر ہوتا تھا۔ انھوں نے ڈراموں کو نئے لوازمات سے آراستہ کیا۔

تھیٹریکل کمپنیوں کی بدولت متعدد ڈرامے وجود میں آئے تھے جن میں بعض طبعزاد ہیں اور بعض ترجمے ہیں۔ ان کمپنیوں نے تجارتی اغراض کے تحت ڈرامے لکھوائے۔ یہی باعث ہے کہ اکثر ڈراموں میں اصول ڈراما نگاری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ رفتہ رفتہ اسٹیج اور تھیٹر کا زوال ہونے لگا تو ادبی ڈرامے پر احسن کے بعد یک بابی، اور ریڈیائی ڈراموں کا فروغ ہوا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بعض ادیبوں نے اسٹیج اور ڈرامے کو نئے رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے ترجمے پیش کر کے اردو کے ڈرامائی ادب کو مالا مال کیا اور طبعزاد ڈرامے بھی لکھے۔ ان میں

سے بیشتر حضرات ایسے تھے جن کی اسٹیج سے واقفیت برائے نام تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اسٹیج کی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھا تھا۔ لہٰذا ان کے ڈرامے جدید طرز کے ہوتے ہوئے بھی ادبی شکل میں صفحۂ قرطاس کی زینت بن کر رہ گئے۔ بعض ادیب ایسے بھی تھے جنھوں نے پرانے اور نئے اسٹیج کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور اسٹیج کا عملی تجربہ بھی رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں لکھے گئے ڈراموں میں عبدالماجد دریابادی کا زود پشیماں، برج موہن دتاتریہ کیفی کا راج دلاری اور مراری دادا، ہادی رسوا کا مرقع لیلیٰ مجنوں، نیاز فتح پوری کا انتخاب کہنہ، چکبست کا کملا، حکیم احمد شجاع کا بھارت کا لال اور باپ کا گناہ، عابد حسین کا پردۂ غفلت، امتیاز علی تاج کا انارکلی، محمد مجیب کا خانہ جنگی اور کھیتی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان تمام ڈراموں میں اپنے موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے امتیاز علی تاج کا ڈراما انارکلی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں انارکلی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

امتیاز علی تاج اردو کے بلند پایہ ادیب، افسانہ نویس اور ممتاز ڈراما نگار تھے۔ انھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے ڈراما نگاری اور اداکاری کا شوق تھا۔ انھوں نے تھیٹر اور ڈرامے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈرامیٹک کلب کے سرگرم رکن اور اداکار تھے۔ انھوں نے اردو ڈراما نگاری کو ایک اعلیٰ معیار، ایک وقار اور ایک تابناکی عطا کرنے کے سلسلے میں جو رول ادا کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کا مقبول ترین ڈراما انارکلی ان کے فکر و فن کا شاہکار ہے اور اردو ڈرامے کی تاریخ میں اس کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ امتیاز علی تاج کے تخیل کی کارفرمائی اور ان کے قلم کی سحر کاری نے ایک بزمی قصے کو المیے کی شکل میں حیاتِ جاوداں عطا کر دی ہے۔ یہ ڈراما ۱۹۲۲ء میں لکھا گیا اور ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت سے اب تک اس سے بہتر ڈراما تخلیق نہیں کیا جا سکا۔ اسٹیج کے حلقے میں جو بے پناہ مقبولیت آئی وہ کسی اور اردو ڈرامے کو نصیب نہ ہو سکی۔ بعض ڈراما کمپنیوں نے انارکلی کو اسٹیج کرنے کے لیے اس میں کچھ تبدیلیاں کرانا چاہیں۔ مگر انھوں نے تجارتی مصلحتوں کی خاطر اپنے فنی شاہکار پر آنچ نہیں آنے دی۔

تاج نے سلیم اور انارکلی کو لے کر مغل تہذیب کے پس منظر میں ایک ایسا خواب آگیں ماحول تخلیق کیا ہے کہ قاری اس میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تخیل کی کارفرمائی اسے اس ماحول میں لے جاتی ہے جہاں رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔ بادشاہ وقت کا لطف و قہر انسانی قسمتوں کا فیصلہ دم بھر میں کر دیتا ہے۔ شمشیر و سناں کی جھنکار کے ساتھ نغمے فضاؤں میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ جہاں شوق کو زنجیریں پہنا دی جاتیں اور شاہی فرمان مقدر پر مہر ثبت کر دیتے ہیں۔ عشق اور رقابت بے شک کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ لیکن تاج نے تاریخی پس منظر میں اس کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس ڈرامے کی کامیابی اور مقبولیت کا راز، مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت اور شاہی محلات کے طرزِ معاشرت کی کامیاب عکاسی، سیاست و محبت کے تصادم، عشق و محبت کی نیرنگیوں، مناظر کی دلنشیں تصویرکشی، واقعات کی دل کش ترتیب، لاجواب مکالموں، کرداروں کی فنکارانہ تخلیق، خود کلامی اور ڈرامائی رمز و کنایہ کے موزوں اور موثر استعمال میں مضمر ہے۔

انارکلی کا پلاٹ بڑا صاف ستھرا ہے۔ ڈراما تین ابواب یعنی عشق، رقص اور موت پر مشتمل ہے۔ ڈرامے کو مجموعی طور پر تیرہ مناظر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چار مناظر سلیم کے ایوان، ایک اندرون زندان اور دوسرا بیرون زندان، بقیہ محل سرا کے مختلف حصوں سے متعلق ہیں۔ باب اور مناظر کے لحاظ سے اس میں ایک سلیقہ، ہم آہنگی، تناسب، دل کشی اور رنگینی و رعنائی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈرامے کا آغاز بارہ دری سے ہوتا ہے۔ جہاں کنیزوں کے معمولاتِ زندگی، ان کی نوک جھونک اور ان کے طرزِ گفتگو پر

[illegible] ہے۔ اس میں [illegible] کی طرف
اشارہ [illegible] کی مناسبت سے رقص اور
[illegible] انار کلی [illegible] اور انعام
[illegible] ۔ [illegible]
میں۔ انار کلی [illegible] حاصل کرتی ہے [illegible] کا حاصل
[illegible] دلارام [illegible] انار کلی کی [illegible]
[illegible] کرتا ہے۔ [illegible] انار کلی کے گرد
[illegible] ایک کو اس کی شکست [illegible] نے
[illegible] کا پیکر بنا دیا ہے [illegible] دوسری کو اس کی شہرت
اور [illegible] نے [illegible] کے اشتیاق ہی سلسلے سے ہمکنار کر دیا ہے۔ یہی
[illegible] جس میں آئندہ پیش [illegible] واقعات اور
[illegible] کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ دلارام کی شکست شکست
نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنا مقصد پا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ انار کلی
کی یہ کامیابی، کامیابی نہیں ہے کیونکہ اس کی تمام آرزوئیں اور تمام
[illegible] کی خوشی میں ختم ہو جاتی ہیں۔

دوسرے منظر میں [illegible] سلیم [illegible] اکبر اور سلیم کے
[illegible] ہوتا ہے۔ سلیم [illegible]
[illegible]
[illegible] ایک باپ کی شفقت اور محبت کا [illegible]
[illegible] سلیم [illegible]
[illegible] اکبر [illegible] سلیم اور انار کلی کی
[illegible] تیسرے [illegible] منظر میں
[illegible] ۲۵ [illegible] آتا ہے۔
[illegible]
[illegible] کامیاب ہو جاتا ہے۔
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] کا [illegible] گی [illegible] اشاروں [illegible]
[illegible] دیکھتی ہے کہ انار کلی اور سلیم کے باہم اشارات و کنایات اکبر کو
دکھائے۔ جب انار کلی رقص کرتے کرتے [illegible]
[illegible] ہے تو [illegible] اور [illegible] جاتا ہے۔ دلارام
ایک طرف انار کلی کرتی ہے تمام میں سلیم کا خیال [illegible] کو اس کے جذبات
کو [illegible] تو دوسری طرف سلیم کو انار کلی سے اشارے
کنایے کرنے پر اکساتی ہے۔ اور انار کلی سے ایک خاص غزل کی
فرمائش کرتی ہے۔ جس پر وہ سلیم کی طرف اشارہ کرنے پر مجبور
ہو جاتی ہے۔

دلارام [illegible] انار کلی اور سلیم کے آپس کے اشاروں کنایوں
کو آئینوں کی مدد سے اکبر کو دکھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔
اکبر انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں محفل رقص و سرود ختم کرنے
اور انار کلی کو زنداں لے جانے کا حکم دیتا ہے۔ یہی نقطۂ عروج
ہے۔

تیسرے باب میں انار کلی کی رہائی کے سلسلے میں ساری
کوششیں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ سلیم [illegible] زنداں سے منت
کر کے انار کلی سے ملتا ہے اور انار کلی کو لے کر فرار ہو جانا چاہتا
ہے۔ جب [illegible] کو سلیم [illegible] کا پتہ چلتا ہے تو وہ اسے
دھوکا دیتا ہے۔ دلارام [illegible]
سے کام لیتے ہیں۔ دلارام نے اکبر سے [illegible]
[illegible] انار کلی سلیم کو [illegible] حاصل کرنے
[illegible] ہے اور [illegible] نے یہ خبر سنا کر کہ سلیم نے خنجر سے
[illegible] زنداں سے انار کلی کو لے جانے کی کوشش کی ہے
[illegible] انار کلی کو
زندہ چنوا دینے کا حکم دیتا ہے۔ انار کلی [illegible]
جاتی ہے۔ [illegible]
[illegible]

سلیم کو اپنے محبوب کی موت بے حد مغموم بنا دیتی ہے۔ اکبر سلیم کا حال دیکھ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ ڈرامے میں تصادم اور کشمکش آخر تک جاری رہتی ہے۔ تاہم پلاٹ کی رفتار سست ہے اور تصادم میں شدت اور اثر انگیزی کا فقدان نظر آتا ہے۔ اکبر کا عزم و حوصلہ، سلیم کی رومانیت اور کمزوری، دلآرام کی عیاری اور چالاکی، انارکلی کی بے بسی و مجبوری اور ثریا کی سادگی و بے باکی ہمارے ذہن پر دیرپا تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔

انارکلی میں خارجی اور داخلی تصادم کی کامیاب مثالیں ملتی ہیں۔ امتیاز علی تاج نے آغاز سے لے کر انجام تک اس ڈرامائی تصادم کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تصادم کی کئی جہتیں ہیں۔ تمام کردار کسی نہ کسی صورت میں ذہنی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

دلآرام اور انارکلی کے مقاصد ٹکراتے ہیں۔ ایک طرف دلآرام، سلیم اور انارکلی کا ایک مثلث ہے تو دوسری طرف دلآرام، اکبر اور انارکلی کا بھی ایک مثلث ہے اور انارکلی نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ جو کبھی اکبر کی نظر میں دلآرام کا تھا۔ انارکلی اور سلیم ایک دوسرے کو باہم چاہنے لگے ہیں۔ دلآرام بھی سلیم سے محبت کرتی ہے انارکلی کو دلآرام سے کوئی بغض نہیں۔ مگر دل آرام کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ جہاں وہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بیتاب ہے۔ وہیں شہزادے کا دل جیت لینے کے لیے بھی بے قرار ہے۔ انارکلی اس کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنی عیارانہ چالوں سے انارکلی کو اپنی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔ مگر خود بھی ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے۔

ایک طرف باپ کے دبدبہ و جاہ و حشم اور ایک ماں کی ممتا میں تصادم ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک شہنشاہ کا اقتدار، اور شہزادے کی رومانیت ٹکراتے ہیں۔ محبت اور فرض کے درمیان کشمکش ہوتی ہے اور فرض کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔

سلیم، اکبر اور انارکلی کا بھی ایک مثلث ہے۔ اکبر سلیم کو ایک عالی مرتبت اور باوقار شہنشاہ کے پیکر میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے مقاصد کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ شہزادے کی اپنے فرائض سے غفلت اور ایک کنیز سے اس کی محبت ہے۔ جن کے درمیان طبقاتی فرق کی ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہے۔

اکبر اور انارکلی میں تصادم ہوتا ہے۔ یہ تصادم اقتدار و اختیار اور حسن و عشق کے معصوم اور نازک جذبہ کے درمیان ہے۔ جس میں اقتدار و اختیار کو فتح اور حسن و عشق کے معصوم جذبے کو شکست ہوتی ہے۔ اکبر اور انارکلی کے کرداروں میں داخلی تصادم کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اکبر کا ایک روپ جلیل القدر شہنشاہ کا ہے۔ جو بڑے جاہ و حشم رعب و دبدبہ شان و شوکت اور جاہ و جلال کا مالک ہے۔ اس کی نظروں میں اتنی قوت ہے جو ہر شخص کو مختار رہنے اور نظریں جھکا لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ بڑا دور اندیش اور بڑا مدبر ہے۔ اس کا دوسرا روپ ایک شفیق باپ کا ہے جو اپنے ولی عہد کو اپنا صحیح اور موزوں جانشین بنانے کے لیے فکر مند ہے۔ شہزادہ کو ایک کنیز پر فریفتہ دیکھ کر اکبر کو اپنے خواب شکستہ ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ وہ اپنے سیاسی وقار کے مقابلے میں کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ انارکلی اس کے قہر کا شکار ہو جاتی ہے۔ اپنے فیصلوں میں ترمیم اس کے آئین کے خلاف ہے۔ وہ بڑا مغلوب الغضب آدمی ہے۔ دلآرام اور دارو غہ کی باتوں میں آ کر انارکلی کو دیوار میں چنوا دیتا ہے۔ جب سلیم کو دلآرام کی زبانی انارکلی کی موت کی خبر ملتی ہے تو وہ غم و غصہ کے عالم میں اکبر سے خودکشی کے لیے ایک خنجر مانگتا ہے۔ اس وقت اکبر میں شفقت کا جذبہ ابھر آتا ہے اور وہ آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ہے اور خود ہی کہتا ہے:

"... خداوندا! کیا معلوم تھا یوں ہوگا۔ شیخو! میرے مظلوم بچے، میرے مجنوں بچے، اپنے باپ کے سینے سے چمٹ جا۔ ... میرے سینے سے چمٹ جا اور تو بھی آنسو بہا اور میں بھی آنسو بہاؤں گا... مجھے چھو مت، ایک دفعہ باپ کہہ دے

صرف اتنا کہہ کر پکارنے میں تجھے خنجر تک لادوں گا...... ...... پھر تو دیکھے گا، اور دنیا بھی دیکھے گی کہ اکبر باہر سے کیا ہے، اور اندر سے کیا ہے۔ اکبر کا قہر، اکبر کا ستم اور اکبر کا ظلم کیوں ہے۔ اس کے خون میں بادشاہ کا ایک قطرہ نہیں۔ ایک بوند نہیں۔ وہ سب کا سب شیخو کا باپ ہے صرف باپ۔ وہ بادشاہ ہے تو تیرے لیے وہ مزدور ہے تو تیرے لیے۔ وہ قاہر اور جابر بھی ہے تو تیرے لیے......"

نادرہ حسن وجمال کا مجسمہ ہے۔ عشق و وفا کا پیکر ہے اس کی ہر ادا جان فزا ہے۔ اکبر کے خطاب "انارکلی" کی بدولت اس کی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ وہ شہرت کی بلندی پر پہنچ چکی ہے۔ مگر بڑی سوختہ اختر ہے۔ اس کی خوش نصیبی محرومی میں، کامیابی ناکامی میں، جیت ہار میں اور فتح شکست میں بدل جاتی ہے۔ اس کا احساس زخمی اور تمنائیں شکستہ ہیں اور وہ ایک انجانے خوف کے تلے دبی جاتی ہے۔ وہ اپنا شکار آپ ہے۔ خود کو طوفان حوادث کے سپرد کر دیتی ہے۔ شمع کے مانند پگھلتی جارہی ہے۔ بہار اس کے سینے ہے۔ مگر وہ تشنہ کام آرزو ہے۔ بھری بہار میں بہار کو ترس رہی ہے۔ سلیم پر فریفتہ ہے، اس کے دل میں محبت کی سچی تڑپ ہے۔ اسے کسی سے حسد نہیں، کسی سے بغض نہیں۔ مگر دوسری کنیزیں خصوصاً دلآرام تو حسد کی آگ میں جل رہی ہے۔ اور انتقام لینے کے درپے ہے۔ انارکلی کے نزدیک ولی عہد اور کنیز کا طبقاتی فرق دونوں کے درمیان خلیج کی طرح حائل ہے۔ جب اس کی الفت کا راز فاش ہوجاتا ہے۔ تو وہ خودکشی پر آمادہ ہوجاتی ہے وہ یہ نہیں چاہتی کہ شہزادے پر آنچ آجائے۔ جذبۂ ایثار خودکشی پر آمادہ کرتا ہے۔ مگر سلیم اسے روک دیتا ہے۔ انارکلی کو ہمیشہ اپنی عزت کا پاس ہے وہ محل سرا میں خوش نہیں ہے۔ اپنے سائے سے بھی خوف کھانے لگی ہے۔ اسے محل سرا کی چہار دیواری میں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ دیواریں اس کی طرف بڑھ رہی ہیں تاکہ اسے پیس ڈالیں۔ اس کی بے بسی اور بے کسی اس کے اطراف ایک ایسا جال بنتی ہے جس سے وہ خود آزاد ہونے نہیں پاتی۔ وہ کھوئی کھوئی سی خیالوں میں غرق یا پھر باغ میں حوض کنارے اکیلی گھٹنوں پر سر رکھے ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ وفور جذبات سے مغلوب ہوکر کہنے لگتی ہے:

"سلیم! تمھیں کیا مل گیا! میری نیندوں کو لوٹ کر، میری راحت کو غارت کر کے۔ تمھیں کیا مل گیا سلیم! پھر تم نے کیوں محبت کے پیغام بھیجے۔ کیوں سلگتی ہوئی چنگاری کو دہکا دیا۔ یہ ہنسی تھی؟ یہ سب ہنسی تھی۔ مگر عالی مرتبت شہزادے کمزور بے بس کنیز سے ہنسی! اس قیامت کی ہنسی! اس نے تمھارا کیا بگاڑا تھا۔"

اسے اس بات کا احساس ہے کہ ایک کنیز شہزادے کے مذاق کا جواب نہیں دے سکتی۔ اس کا کام تو برداشت کرنا ہے۔ خواہ مذاق اس کے دل کے ٹکڑے ہی کر ڈالے۔ آخر کار معصوم، بے بس، حرماں نصیب انارکلی دلآرام کی سازش کا اور اکبر کے قہر کا شکار ہوکر دیوار میں چنوا دی جاتی ہے۔

دلآرام۔ تمام خواصوں اور کنیزوں میں ممتاز ہے۔ بڑی دور اندیش، محتاط، چالاک اور عیار عورت ہے۔ فتنہ انگیزی اور دروغ گوئی میں کمال رکھتی ہے۔ مجبوری کو مختاری میں بدلنے کی قوت رکھتی ہے۔ اکبر کی منظور نظر رہ چکی ہے۔ انارکلی کے عروج سے اس کے جذبات پر ضرب کاری لگی ہے۔ اور انھیں زبردست ٹھیس پہنچی ہے۔ اس کی عزت، منصب، اور وقار سب کچھ آن کی آن میں خاک میں مل گئے ہیں۔

زعفران طنز سے کہتی ہے۔ "اب وہ دن گئے جب کمان چڑھی ہوئی تھی۔ اب بیگموں سے بات تو کر کے دیکھیں۔ کوئی منہ بھی نہ لگائے گا۔ جس قدر ان کے منہ چڑھی تھیں ویسے ہی گر گئی بھی ہیں۔"

مروارید مزید یہ احساس دلاتی ہے کہ اب نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ مگر وہ اپنی شکست کو تسلیم نہیں کرتی۔ حسد سے جل اٹھی ہے۔ عنبر سے جواب میں کہتی ہے کہ "ناگن کی دم پر کوئی پاؤں رکھ دے تو وہ کیا کرتی ہے؟" وہ سلیم سے محبت کرتی ہے۔ انا

اس کی راہ میں روڑا بن کر آتی ہے۔ انارکلی کے عروج نیز سلیم اور انارکلی کی محبت نے اس کے جذبۂ انتقام کو بھڑکا دیا ہے۔ بظاہر وہ انارکلی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ اسے بہن کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ اس سے معافی مانگ لیتی ہے۔ مگر دوستی کے پردے میں سب کچھ کر گزرتی ہے۔ وہ سب کے مزاج سے واقف ہے۔ وہ کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتی۔ ہمیشہ فہم و فراست سے کام لیتی ہے۔ اس کے سینے میں ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جسے بقول خود اگر ظاہر کر دے تو سارا محل قیامت کا نمونہ بن جائے اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ جب اسے جشن نوروز کی تیاری کا حکم ملتا ہے تو اس کے خطرناک منصوبے انگڑائی لینے لگتے ہیں۔۔۔۔ "انارکلی ہوگی۔۔۔۔۔ سلیم ہوگا۔ اور اکبر بھی۔۔۔۔ کاش اگر اکبر دیکھ سکتا۔۔۔۔۔ کاش اگر میں اکبر کو اس کی آنکھوں سے دکھا سکتی۔۔۔۔ آہ! پر یہ ضرور ہوگا اور جشن، ہی کے روز۔۔۔۔ دو تارے۔ دو ہی تارے، مگر ایک دہکتا ہوا اور جگمگاتا ہوا۔۔۔۔۔۔۔ اور دوسرا ٹوٹ کر بجھا ہوا۔۔۔۔ اور کون جانے۔۔۔۔"

وہ سازشی ہے۔ اس کے منصوبوں میں زہرناکی ہے۔ اس کے خطرناک ارادوں سے زمین و آسمان دہل جاتے ہیں۔ جشن نوروز کے موقع پر قیامت برپا کر دیتی ہے۔ انارکلی کے دردناک انجام کی ذمہ دار وہی ہے۔

سلیم۔ اکبر اور رانی کی تمناؤں کا واحد مرکز۔ شہزادہ سلیم اپنے انداز و اطوار، حرکات و سکنات، افعال و اقوال ہر لحاظ سے ایک رومان پسند ہیرو کا پیکر ہے۔ اس کے نقوش تیکھے اور مزاج وارفتہ ہے۔ اس کی دلچسپی کا مرکز صرف انارکلی ہے۔ وہ معاملات کی تہہ تک نہیں پہنچتا نہ وہ مردم شناس ہے۔ نہ اس کی نظریں دوررس ہیں۔ عملی طور پر غیر فعال ہے، اپنے باپ کے خوابوں سے مطابقت نہ رکھنے والا، شاہی فرائض سے غافل، انارکلی پر فریفتہ۔ شہزادہ شکستہ دل ہو کر ایک ملاح کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے کہتا ہے۔۔۔۔ "راوی کے دلشاد ملاح! تو کیوں نہ گائے۔ لہریں نیند میں بہہ رہی ہوں اور کشتی اپنے آپ چلی جا رہی ہو پھر بھی نہ گائے تو کیا جانے جب وقت کی ندی بہتے بہتے سست پڑ جاتی ہے۔ اور امید ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ تو کیا ہوتا ہے۔ آہ پھر کر جا شفق زار لہروں پر گاتا ہوا چلا جا اور خوش ہو کہ تو شہزادہ نہیں ورنہ سنگ مرمر کی چھتوں کے نیچے اور بھاری بھاری پردوں کے اندر تیرے گیت بھی دبی ہوئی آہیں ہوتے۔"

جذبۂ عشق سے مغلوب، راز کی باتیں چھپانے میں غیر محتاط آئندہ پیش آنے والے واقعات سے بے خبر اور انارکلی کو ملکہ بنانے کا خواب دیکھنے والا شہزادہ دلآرام کے دام فریب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ دار و حفظ زنداں سے بھی مات کھا جاتا ہے۔ اس کے دعووں اور عمل میں تضاد ہے۔ اس کے کیے ہوئے دعوے خواب فراموش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ انارکلی اس کی راہ سے ہٹ جانا چاہتی ہے۔ مگر وہ اس کا موقع نہیں دیتا۔ انارکلی کے شعلۂ محبت کو بھڑکانے والا سلیم اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود انارکلی کو موت اور زندگی کی کشمکش سے نجات دلانے، زنداں سے آزاد کرانے اور اسے موت کے بے رحم ہاتھوں سے بچانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ حالات سے مقابلہ کرنے کی اس میں تاب ہے نہ سکت ہے۔

اس ڈرامے میں بہت سے ایسے مکالمے آتے ہیں جن میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں اور جن کی رمزیت بعد میں اجاگر ہوتی ہے۔

تاروں کے ٹوٹنے کا خیال سب سے پہلے دلآرام کو آتا ہے۔ "دو تارے۔۔۔۔ دو ہی تارے۔۔۔۔ مگر ایک دہکتا اور جگمگاتا ہوا۔ اور دوسرا ٹوٹ کر بجھا ہوا۔۔۔ اور کون جانے" اور یہ کشمکش آخر تک جاری رہتی ہے۔ جب تک انارکلی ختم نہیں ہو جاتی۔

سب سے پہلے انارکلی کو طبقاتی فرق کا احساس ہوتا ہے بعد میں خود سلیم کو ہوتا ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ "وہ (اکبر) کہاں

انہیں گے۔ وہ کہہ دیں گے وہ انارکلی ہے محروم سرا کی کنیز — تو سلیم ہے مغلیہ ہند کا شہزادہ...." آخر کار کنیز اور شہزادہ کا یہی طبقاتی فرق اکبر کے نزدیک ایک ناقابلِ عبور خلیج بن جاتا ہے۔

انارکلی کی ماں کو پہلے ہی سے یہ خدشہ ہے کہ محل سراؤں میں بے ساختہ ادائیں کم نصیبی کا نشانہ ہوا کرتی ہیں۔ "دیوار" کا خیال سب سے پہلے انارکلی کو آتا ہے کہ "اس محل میں زندہ نہ بچوں گی اس کی دیواریں میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ کسی روز ٹکرائیں گی اور مجھ کو پیس ڈالیں گی۔" اس کا یہ اندیشہ مستقبل میں پیش آنے والے المیہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور اس وقت حقیقت بن جاتا ہے جب اکبر کے حکم سے انارکلی دیوار میں چنوا دی جاتی ہے۔

تاج نے علامتوں سے بڑا کام لیا ہے۔ شطرنج کی بازی محض شطرنج کی بازی نہیں ہے۔ بلکہ کھلاڑیوں کی چالیں۔ آئندہ آنے والے واقعات کی عکاسی کرتی ہیں۔ کھیل کے دوران سلیم یہی کہتا ہے.... ظلِ الٰہی۔ اب بازی ہو گئی.... آپ کو....

ظلِ الٰہی میرا مات کا نقشہ اور صاف ہو گیا.... ظلِ الٰہی بازی ہو گئی۔ سلیم ہر وقت یہی سمجھتا ہے کہ وہ اکبر کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مگر وہ ناکام ہو جاتا ہے اس کی ہر چال غلط پڑتی ہے۔ اسی طرح اس کو محبت کے کھیل میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ صاحب چال چلتا ہے تو دوسروں کی چال کا خیال نہیں رکھتا —— "اکبر — تم نے ہمارا فرزیں لے لیا..... فرزیں لے لیا۔ بہت خوب پھر اب تمہیں مات بھی یقینی ہو گی —— سنا شیخو۔ شیخو جب خود چال چلو۔ تو اس کے ساتھ دوسروں کی چال کا بھی خیال رکھا کرو........ ادھر دیکھو ... مات ...." اکبر کے ان مکالموں میں کتنی معنویت پوشیدہ ہے۔ انارکلی سے سلیم کی دیوانہ وار محبت، اندلان سے انارکلی کو اپنے ساتھ لے جانے کی سعیٔ ناکام، دلآرام اور دارو غہ پر سلیم کی خوش اعتقادی، غرض ڈرامے کے واقعات پر یہ مکالمے کس قدر صادق آتے ہیں۔ سلیم کی طفلانہ ہٹ دھرمی اور کم ہمتی ہی شطرنج نیز محبت کے کھیل میں اس کی ناکامی کا باعث بنی ہے۔

امتیاز علی تاج اسٹیج اور تھیٹر سے نہ صرف واقف تھے بلکی عملی تجربہ بھی رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے انارکلی میں اسٹیج کی ضرورتوں کا زیادہ خیال نہیں رکھا۔ مناظر کی طوالت اور طویل خود کلامیاں، عمل کی رفتار کو سست بنا دیتی ہیں۔ یہ ڈراما بقول عشرت رحمانی "اگر ایک بار منظم طور پر موزوں ساز و سامان کے ساتھ اسٹیج کی زینت بن جاتا تو بعید نہ تھا کہ ہمارا تھیٹر جدید اسلوب پر از سر نو جلوہ گر نظر آتا۔"

ربابِ رشید
کاریگر محلہ، شاہجہاں پور

رباعیات

تخلیق کی آگ جب بھڑک اٹھتی ہے
شعلوں سے فضا چمک چمک اٹھتی ہے
ایسے ہی میں کچھ پھول بکھر جاتے ہیں
افکار کی انجمن مہک اٹھتی ہے

جذبے کی روشنی ضیائے تحریک
جذبے سے خوش رنگ قبائے تحریک
آنکھوں کی نمی، گداز دل کا یعنی
جذبہ ہی بہر طور بنائے تحریک

احساس مضطرب نمودِ ہستی
احساسِ مضطرب وجودِ ہستی
جو ہے بھی گام زن عمل کی جانب
از عالمِ غیب تا شہودِ ہستی

کب دستِ ہنر میں ارتقائے ہستی
کیا ڈھونڈیں ہوا میں نقشِ پائے ہستی
پانی پانی حدِ نظر تک پانی
بھیگی بھیگی فضا برائے ہستی

اسرارِ بقا کھول رہا ہے کیا کیا
انصاف سے فن تول رہا ہے کیا کیا
غاروں میں اجنتا و الورا کے رباب
محنت کا لہو بول رہا ہے کیا کیا

رئیسہ انصاری
انصاری ہینڈلوم کارنر
نزد پاور ہاؤس۔ امین آباد
لکھنؤ

غزل

دربدر پھرتے ہیں جو آج فقیروں کی طرح
کل کتابوں میں ملیں گے وہ لکیروں کی طرح

جب سے دریا نے سمندر سے بغاوت کی ہے
لوگ سہمے ہوئے رہتے ہیں جزیروں کی طرح

بے خیالی میں زباں سے جو نکل جاتے ہیں
لفظ وہ دل میں اتر جاتے ہیں تیروں کی طرح

یہ زمانہ ترے جینے کی مثالیں دے گا
زندگی کاٹ دے غربت میں امیروں کی طرح

گھر میں آسیب زدہ پھولوں نے دم توڑ دیا
ہم خانقاہوں میں بیٹھے رہے پیروں کی طرح

سازشیں کرتے ہیں اب وہ مرے دشمن سے رئیس
کل تلک ساتھ جو رہتے تھے مشیروں کی طرح

سعادت علی صدیقی
صدر شعبۂ اردو ہاتا گاؤں ڈگری کالج
سنبھل

سیّد احمد حسن ملیحؔ سنبھلی

ایک غیر معروف شاعر

شمالی ہندستان کے جن قصبات نے شعر و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان میں روہیل کھنڈ جیسے تاریخ ساز خطے کا قدیم ترین قصبہ سنبھل نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ سنبھل علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا اہم ترین مرکز رہا ہے۔ ماضی میں یہاں کے گلی کوچے شعر و ادب کی محفلوں سے گونج رہے تھے۔ عظیم الشان مشاعروں اور عدیم المثال شعری نشستوں کا انعقاد یہاں کی قدیم روایت ہے اس مردم خیز خطے نے اردو کو بلغ شاگرد داغ، محمود سنبھلی اور ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے متعدد شعرا، ادیب اور قلم کار دیے ہیں جنھوں نے اپنے فن کا جادو جگایا اور اپنے زمانے میں ملک گیر شہرت حاصل کرکے اپنی جنم بھومی کا نام روشن کیا۔ حسین خاں سرائے اور نوریوں سرائے اس شہر کی قدیم بستیاں ہیں جنھوں نے نابۂ ناز اہل فن شعر و ادب کو دیا اور زبان و بیان پر قدرت کاملہ رکھنے والے شاعر و ادیب پیدا کیے۔ جو زمانے کی ناقدری و بے توجہی کا شکار ہو کر غیر معروف و گمنام رہے، اہل قلم نے بھی انھیں نظر انداز کیا اور ان کے حالات و کلام پر بھی پردہ پڑا رہا۔ حسین خاں سرائے نے جو ماضی میں "ڈھپلیوں کا محلہ" کے نام سے معروف تھا کیسے کیسے لعل و گہر پیدا کیے اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ مشہور سماجی رہنما سر فضل علی اسی بستی سے متعلق تھے۔ ممتاز افسانہ نگار بیگم رضیہ سجاد ظہیر کی ننہیال ہونے کا شرف بھی اسے حاصل ہے اور نہ جانے کتنے معروف و غیر معروف شخصیتوں کی آخری آرام گاہ ہونے کا اعزاز بھی یہاں کے کھنڈرات بستی کی عظمت پارینہ کے مظہر ہیں اور قدیم مکانات اپنے مکینوں کی شوکت و حشمت کے آئینہ۔ شکستہ دیواروں اور خستہ حال کوچوں میں آج بھی شعر و ادب کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے موجود ہیں اور نامساعد حالات اور ناسازگار ماحول کے باوجود یہاں شعر و سخن کی محفلیں بھی آراستہ ہوتی ہیں، مجالس و ماتموں کا اہتمام بھی ہوتا ہے اور گوشۂ تنہائی میں خاموشی کے ساتھ ہوکر ادب کے گیسو سنوارنے کا عمل بھی جاری ہے بزرگ اور قادر الکلام شاعر حضرت معجزؔ سنبھلی کی قیام گاہ پر گذشتہ چالیس برس سے بزم ماتم بھی بڑے اہتمام سے منعقد ہوتی ہے جس میں درجنوں مقامی و بیرونی شعرا شریک ہوتے رہے ہیں۔ ان بستیوں میں سید معجز حسین معجزؔ جیسے کہنہ مشق اور اقبال قاسم کیفی جیسے ان گنت نو واردان ادب خون جگر سے چمنستان ادب کی آبیاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ملیحؔ سنبھلی بھی ان کم نصیب شعرا میں سے ہیں جو گوشۂ گمنامی میں شب و روز گزار کر ہماری نگاہوں سے ہی اوجھل نہیں ہوئے تاریخ ادب کے اوراق سے بھی معدوم ہو گئے جن کی حیات و خدمات بھی پردہ خفا میں ہیں اور تخلیقات و نگارشات بھی منظر عام پر نہ آ سکیں۔ ملیحؔ سنبھلی گرچہ متمول و مشہور اور معزز خاندان کے فرد تھے لیکن نام و نمود سے بے نیازی اور چھپنے چھپانے سے بے تعلقی کی وجہ سے گمنامی کی زندگی بسر کی، شعر و ادب کی خاموش خدمات انجام دیتے رہے اور خاموشی کے ساتھ ہمیشہ کی نیند سو گئے، آج بھی ان کی شخصیت و شاعری پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے نام سے بھی بہت

کم لوگ واقف ہیں۔ ادبی حیثیت یا کلام کی قدر و قیمت کے تعین کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ملیح سنبھلی کے حقیقی پوتے سید علاء الدین نقوی سے جو معلومات فراہم ہو سکیں، اجمالاً پیش کی جا رہی ہیں تاکہ اہل قلم ان کے بچے کھچے کلام سخن وری کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی علمی و ادبی اہمیت اجاگر ہو سکے۔

ملیح سنبھلی ۱۸۶۶ء میں حسین خاں سرائے سنبھل میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام سید احمد حسن تھا اور ملیح تخلص۔ ان کے والد میر فرزند علی اپنے عہد کے عمائدین شہر میں سے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید حسین خاں محتاد شیعہ کے حامل تھے۔ تاریخ سنبھل میں لکھا ہے کہ سید حسین خاں عہد مغلیہ میں منصب دار تھے اور معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ حسین خاں سرائے انھوں نے ہی آباد کی تھی اور انھیں کے نام سے منسوب و معروف ہے۔ میر فرزند علی ان کی گیارھویں پشت میں تھے۔ میر صاحب کے چار بیٹے ہوئے۔ سید امجد حسین انسپکٹر پولیس ہوئے۔ سید باقر حسین ریلوے پولیس میں ہیڈ کانسٹبل، سید علی حسین نے زمینداری اور کاشت کاری کا بار سنبھالا۔ سید احمد حسن سب سے بڑے تھے انھوں نے دستور زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی تھی۔ اس کے بعد عربی، فارسی اور اردو کا مطالعہ کیا بعدہٗ لاہور جا کر منشی، منشی کامل اور مولوی کے امتحانات پاس کیے۔ لاہور میں ان کے ہم جماعت ساتھیوں میں مولوی ابو ذر حارثی بھی تھے جو سنبھل سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں مفتی شہر کہلائے۔ دونوں کی قربت اور دوستی مثالی تھی۔ لاہور سے واپس آکر احمد حسن نے چھپرا ضلع سارن بہار میں سکونت اختیار کی اور ڈپٹی کلکٹر سید ذاکر حسین کے جو سنبھل حسین خاں سرائے کے باشندے تھے، بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ بعد ازاں امروہہ ضلع مرادآباد کے مدرسہ نور المدارس میں نائب مولوی کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ جہاں وہ اردو اور فارسی کی تعلیم دیتے تھے۔

ملیح سنبھلی کی شادی قصبہ کندرکی ضلع مرادآباد کے معزز خاندان میں سید ... علی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کے بطن سے تین اولاد ہوئیں۔ بڑے صاحبزادے سید ... حسین سنبھل میں اور چھوٹے سید ... حسین ... میں مقیم ہیں۔ صاحبزادی جن کی شادی قصبہ ... میں ہوئی

تھی، چند سال پیشتر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ملیح سنبھلی بہت مختصر عمر لے کر آئے تھے۔ نوجوانی میں تپ دق جیسے موذی مرض کا شکار ہوئے۔ ۳۸ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۰۴ء میں راہی ملک عدم ہوئے اور آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

ملیح سنبھلی خداداد ذہانت اور صلاحیت لے کر آئے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق فطری تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی شاعری کا چسکا لگ چکا تھا۔ بہت جلد ماہر فن ہو گئے۔ مشہور شاعر حضرت امیر مینائی جب رام پور میں مقیم تھے تو ملیح سنبھلی نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ امروہہ کے قیام میں انھیں اپنے رفقائے کار خصوصاً سید مرتضیٰ حسن سے، جو ایک اچھے شاعر تھے، مشورۂ سخن کا موقع ملا۔ امروہہ میں ان دنوں شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ ملیح سنبھلی بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے اور داد و تحسین سے نوازے جاتے تھے۔ تلامذہ میں صبری امروہوی، غلام حیدر سنبھلی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ خان بہادر سید ... بیرسٹر، سید صابر حسین ... اور ... فضل علی نے ابتدائی تعلیم ملیح سنبھلی سے ہی حاصل کی تھی۔

ملیح سنبھلی کا کلام بہت کم شائع ہوا۔ عمر نے وفا نہ کی اس لیے مجموعہ کلام بھی اشاعت کا جامہ نہ پہن سکا۔ ان کے پوتے مولانا نقوی نے تلاش و جستجو کے بعد کلام ملیح یکجا کیا ہے۔ راقم الحروف کے اصرار پر جواں سال و خوش فکر شاعر کیفی سنبھلی کلام ملیح کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ تادم تحریر انھوں نے جو کلام اکٹھا کیا ہے اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ملیح سنبھلی کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی، ان میں شعر کے حسن و قبح میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی تھی اور جذبات و احساسات کو شعری پیکر عطا کرنے کا ملکہ بھی۔ انھوں نے متنو... سخن میں طبع آزمائی کی اور غزل، قصیدہ، سلام ... اور حمد وغیرہ میں قادر الکلامی کے جوہر دکھلائے۔ انھیں فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا ان کی فارسی شاعری ان کے رسا ذہن اور خداداد صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔ ملیح سنبھلی کی غزل گوئی کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انھوں نے عام

طور پر مشہور شاعروں کے مصرعوں پر غزلیں کہی ہیں اور بعض غزلوں میں مشکل ردیف کا استعمال کیا ہے۔ اپنے کلام کے بارے میں خود ان کا نظریہ یہ ہے:

کہتا ہے کوئی طرز جدا ایجاد ہے
کہتا ہے کوئی شاعر دیوانہ ہے
میں سبزہ پامال بنا آج ملیح
ہر شخص مرے رنگ سے بیگانہ ہے

نمونۂ کلام یہ ہے۔

نعتیہ خمسہ سے:

دکھوں کریم ہوں قربان محمدؐ
بڑے ہیں ہم پہ احسان محمدؐ
ملائک ہیں ثنا خوان محمدؐ
فلک ہے زیر فرمان محمدؐ
بڑی ہے عرش سے شان محمدؐ

وہ ماہ آسمانِ کبریا ہے
زباں اس کی زبانِ کبریا ہے
دہاں اس کا دہانِ کبریا ہے
بیاں اس کا بیانِ کبریا ہے
کلامِ حق ہے فرمانِ محمدؐ

قصیدہ سے:

پھولا پھلا ہوا چمن روزگار ہے
جس سمت دیکھتا ہوں وہ رشکِ لالہ زار ہے
اس باغ نظم کا مرے گلچیں کو غم ہے
مضمون وہ آبدار ہیں جن پہ بہار ہے
دریائے رحمتِ صمدی بے شمار ہے
چاروں طرف سے جوش پہ ابر بہار ہے
ساقی پلائے بادۂ عرفان کا اب تو جام
نے بلبلیں چہکتی ہیں فصلِ بہار ہے
قلقل سبو سبو کی صدا چار سو سنوں
جنت النعیم کہے کہ عجب بادہ زار ہے

۲۹ اکتوبر ۱۹۰۳ء بمقام امروہہ

قطعہ

ہیہات ختم زندگانی دیکھ لی
قدرداں کی قدردانی دیکھ لی
اے فلک ہم نے دیا پایا کچھ بھی چین
واہ تیری مہربانی دیکھ لی

۱۰ جولائی ۱۹۰۲ء امروہہ

غزلیات سے

چھٹا نہ موسم گل میں بھی قید خانے سے
پڑا ہوں سخت مصیبت میں اک زمانے سے
نصیب لا کے کہو کر دے سجدہ بت کو اگر
نہ سر اٹھے گا مرا ان کے آستانے سے
میں اپنا مر کے بھی قاتل سے عہد ہی ہیں
ملی نہ فرصت انہیں پیار کے بہانے سے

(۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء امروہہ)

گھبرا گئے یا نالۂ محشر نالہائے زار سے
بجلیاں گرتی ہیں مری آہ آتش بار سے
اس قدر لاغر ہوا ہوں کاہش افکار سے
دیں کر کوئی ان کی نسبت میرے جسم زار سے
ہوتے ہیں پیدا نئے مضمون جو بلبل فکر میں
عندلیب خامہ سب چن لیتی ہے منقار سے
یوں ہوا دل سے بیاں نور وحدت جلوہ گر
جیسے یوسف چاہ سے محبوب یزداں غار سے

(یکم اکتوبر ۱۹۰۱ء)

صبر مشکل تھا شب ہجر بسر ہونے تک
چھڑ گئی دست و گریباں میں سحر ہونے تک
جان تو اے ملک الموت میں دیتا ہوں تجھے
دیر کتنی کوچۂ جاناں میں گزر ہونے تک
جلد آراستہ کر منزل دنیا میں تسلیم
کچھ تو ساماں جو میسر ہو سفر ہونے تک

(۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء)

کاروان عدم آباد سے کہہ دو ٹھہرے
ہم بھی تیار ہیں اس ملک میں جانے کے لیے
آنکھیں لڑائی ہیں ہم ابرو و مژہ
دیکھو کوئی مقابلہ تیر و کماں میں ہے

یہ کیسے بال کھولے آئے کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی
جگر میں درد ہے دل مضطرب ہے جان بیکل ہے
مجھے اس بے خودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی
بس اب دیکھا نہیں جاتا ہمارا دم الجھتا ہے
شرارت دیکھیے آپ اپنی زلف برہم کی
مزا اس میں یہی ملتا ہے نمک چھڑکو نمک چھڑکو
قسم ہے تو نہیں حاجت ہے زخموں کو مرہم کی

دلِ پُر درد سے باہر کبھی جو ایک دم ہوتے
خدا جانے میرے نالوں سے برپا کیا ستم ہوتے
نہ ہوتی کاتب قدرت کو گر لکھنی صفت تیری
تو کیوں آراستہ روزِ ازل لوح و قلم ہوتے
نہ کرتے قتل مجھ کو تیرِ مژگاں سے تو نام آور
نہ سفاکوں میں تم ہوتے نہ جانبازوں میں ہم ہوتے

انتخاب کلام فارسی

ایں نہ فریاد کناں ہم نفسے می آید
مژدہ اے قیس کہ صوتِ جرسے می آید
آفریں زاہد نا کردہ گنہ کز دلِ تو
بوسے عشق بت جادو نفسے می آید
از درِ میکدہ برگشتن نا ممکن نیست
شیخ ناحق بہ ہوائے ہوسے می آید
اے ملیح دلِ صد چاک مکن شکوہ چرخ
شکر صد شکر کہ فریادرسے می آید

(۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء)

★

مرزا ثاقب لکھنوی مختصر تعارف: صفحہ ۱۲ کا بقیہ

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے
اگر شکوہ بر لب کبھی ہوئے تو بس یوں سے

تن لاغر ہے اک نقشِ وفا رہنے دو بستر پر
سمجھ لو تم کہ اک تصویر پیدا ہو گئی در پر
مفید اہل عالم ہے بہت کچھ بے حسی دل کی
زمانہ کروٹیں لے گا جو میں تڑپوں گا بستر پر

بے ثباتی دنیا کی توجیہہ کی تو اس طرح سے
گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
دنیا ہوئی بیگانہ رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

اور یہ گوشہ نشین شاعر زمانہ کی تلخیوں کو اشعار میں ڈھال کر اور یہ کہہ کر اسی شہ نشیں میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا کہ

ڈھونڈیں گے بعد میرے مجھ کو چراغ لے کر
وہ محفلیں کہ جن میں ثاقب غزل سرا تھا

★

ڈاکٹر سلمان عباسی
۵۰ - موتی لعل بوس روڈ
لکھنؤ - ۲۲۶۰۰۱

غزل

کچھ بات ہے جو ترے دوانے دنیا میں جدھر جدھر گئے ہیں
شہروں کی چمک دمک بڑھی ہے ویرانے سنور سنور گئے ہیں

ہمراہ سفر کوئی نہیں ہے لیکن رہِ زندگی میں اکثر
آہٹ سی ملی قدم قدم پر چلتے میں ٹھہر ٹھہر گئے ہیں

ہم سست روی سے تنگ آ کر تنہا جو برہنہ پا چلے ہیں
احباب کے پرخلوص چہرے جانے کیوں اتر اتر گئے ہیں

کچھ لوگ وفا کی منزلوں میں ہر بار بنے ہیں میرے ساتھی
ہر بار بنے ہیں میرے ساتھی ہر بار مکر مکر گئے ہیں

مظفر ہاشمی
نو غزل ۱۹۶ زیارت
موسے والی - رام پور

شاد عارفی

اس نے جو دیکھا، کہا، سمجھا جو وہ سمجھا دیا
یعنی ہر چہرہ کو اک الفاظ کا چہرہ دیا

شعر کیا، نقد و نظر ہے یا صدائے احتجاج
طنز کہہ کر یار لوگوں نے مگر جھٹلا دیا

حق بیانی مصلحت کوشی کی ہمسایہ نہیں
اس کی بے باکی نے ہر اک ذہن کو جھٹکا دیا

دیکھ کر ہر کلغئ سلطاں پریشاں ہو گئی
گیسوئے روئے غزل کو اس طرح سلجھا دیا

کوئی مانے یا نہ مانے لوگ کہتے ہیں مگر
شاد نے اردو ادب کو منفرد لہجہ دیا

وہ کہ تھا اک عہد سازِ نظمِ اقلیمِ ادب
جس نے ماضی، حال، مستقبل کو بھی چونکا دیا

کچھ بھی ہو ہاشمی مگر اتنا مجھے تسلیم ہے
شاد نے صورت نما سا اک آئینا دیا

انجم صدیقی بہرائچی
آزاد انٹر کالج بہرائچ

غزل

ہماری زیست وصل و ہجر کے یوں درمیاں کر دی
کبھی صورت عیاں کر دی کبھی صورت نہاں کر دی

ٹپک کر ایک آنسو نے وفا کو ٹھیس پہنچائی
ہماری زندگی بھر کی ریاضت رائگاں کر دی

نہ گرتے اشک دامن پر نہ تشہیرِ وفا ہوتی
ذرا سی بات تھی ان آنسوؤں نے داستاں کر دی

لبوں پر میرے خاموشی تھی آنکھوں میں تکلم تھا
مرے اس حال نے خود داستانِ غم بیاں کر دی

مجھے تاریکیوں کا خوف کیوں ہو خوف کیوں انجم
کہ میں نے زندگی اپنی برائے کہکشاں کر دی

غزلیں

شاہد میر
گورنمنٹ کالج بانسواڑا
(راجستھان)

گھنی تاریکیوں میں غرق ہے میخانہ برسوں سے
نہیں چھلکا سنہری دھوپ کا پیمانہ برسوں سے

اکھڑتے پاؤں اور پھیلا ہوا ویرانہ برسوں سے
مسافر کو نہ مل پایا مسافر خانہ برسوں سے

پسِ دیوارِ مژگاں ہے کوئی دُر دانہ برسوں سے
اسے بھیجا نہیں ہے پیار کا نذرانہ برسوں سے

جہاں تاریکیاں ہیں خوف ہے ہر گام خطرہ ہے
گزرتے ہیں اسی رستے پہ ہم "ورانہ" برسوں سے

دھنک، خوشبو، ہوا، آنسو کبھی یکجا نہ کر پائے
ہے زیرِ غور اپنی ذات کا افسانہ برسوں سے

بھرے شہروں میں جب آتا ہے وہ افسردہ رہتا ہے
کہ اس کی روح میں آباد ہے ویرانہ برسوں سے

زبانِ خلق پہ کیوں تذکرے "مخلص لوگوں" کے
سلگتی ریت کا ہم سے بھی ہے یارانہ برسوں سے

رو پہلی روشنی کے خواب اس گھر میں اتر آئے
جہاں روشن نہیں ہوتا چراغِ خانہ برسوں سے

گوربخش سنگھ بہار
گاندھی نوشکشا کالج
گنگا گھاٹ اناؤ

بڑے غیور تھے ہم عرضِ حال کیا کرتے
ہم ان کے سامنے کوئی سوال کیا کرتے

چلے تو تھے تری جانب کہ گردشِ دوراں
قدم قدم پہ بچھائے تھی جال کیا کرتے

چہار سمت بھٹکتے ہیں غم کے صحرا میں
تمھاری یاد کے وحشی غزال کیا کرتے

کسی مقام پہ رکتی نہیں نظر جن کی
مری وفا کا بھلا وہ خیال کیا کرتے

کہانی اپنی ہوئی ختم جن کے نام کے ساتھ
انہی کے سامنے اظہارِ حال کیا کرتے

بہارؔ جل ہی دیے جب کہ سربکف ہو کر
تو راہِ عشق میں فکرِ مآل کیا کرتے

سہیل اشفاق
۲۵ تارین گلی
شاہجہانپور

(افسانہ)

تھکن

تصدیق کے جوان بیٹے کی لاش اس کی کوٹھری کے سامنے چادر سے ڈھکی دیر سے رکھی ہوئی ہے اور گلی میں کھڑے لوگوں کو تصدیق کا انتظار ہے۔ رکشہ چلانے والے احمد حسین کے بیان کے مطابق تصدیق اس کو راستے میں ملا تھا، جب وہ کفن خریدنے بازار جا رہا تھا۔ گلی میں اب محلہ کے چند ذی حیثیت لوگ بھی جمع ہو چکے ہیں اور وہ لوگ بھی احمد حسین سے اس بات کو دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی تصدیق اس کو راستے میں ملا تھا۔ اور کیا اس نے اس حادثے کی اطلاع بھی تصدیق کو دے دی تھی مگر احمد حسین اس وقت گلی میں موجود نہیں تھا وہ موقع ملتے ہی غالباً سواری لے کر کہیں چلا گیا تھا۔

گلی کے واحد دو منزلہ مکان کے سامنے لگا پانی کا سرکاری نل صبح سے خراب ہو گیا ہے اور راستہ میں جا بجا کیچڑ پھیلی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

آسمان پر گہرے بھورے بادل چھا گئے ہیں اور گلی میں ابھی سے اندھیرا چھا گیا ہے۔ بارش کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ شاید اسی اندیشے کے پیش نظر ایک معمر شخص فیصلہ کن لہجے میں کہتا ہے کہ کچھ بھی ہو میت مغرب کی نماز کے بعد ضرور دفن کر دینا چاہیے۔ ورنہ ایسے موسم میں رات گئے قبرستان جانا دشوار ہو جائے گا۔

اس شخص کی یہ بات سن کر گلی میں کھڑے لوگوں کے چہروں پر اطمینان کی جھلک نمودار ہو جاتی ہے اور پھر گنتی کے چند لوگوں کو چھوڑ کر یکے بعد دیگرے سب کے سب نہایت خاموشی کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔

کافی دیر سے ایک جگہ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں دکھنے لگی ہیں اور بے خیالی میں سستانے کے لیے میں تصدیق کی کوٹھری کی باہر والی شکستہ سیڑھی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اب مجھے یقین سا ہونے لگا ہے کہ تصدیق ابھی واپس نہیں آئے گا۔

یوں تصدیق اکثر بے کار رہتا ہے لیکن جس روز بھی اسے کام مل جاتا ہے وہ رات گئے ہی گھر لوٹتا ہے۔ لیکن آج جب کہ اس کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا اکلوتا جوان بیٹا حادثہ کا شکار ہو گیا ہے تو اس کو جلد واپس آ جانا چاہیے تھا۔

یوں میں ایسا کچھ زیادہ جذباتی آدمی نہیں ہوں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ماحول کی اداسی مجھے گھیر لیتی ہے۔ تنگ راستے کے کنارے رکھی سفید چادر سے ڈھکی ایک نوجوان شخص کی لاش کتنی عجیب سی لگ رہی ہے۔ میرے علاوہ گلی میں دو تین اور لوگ بھی مجھ سے کافی فاصلے پر اکڑوں بیٹھے اونگھتے دکھائی دے رہے ہیں ——— جوان موت پر کسی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا، کوئی چیخ بلند نہیں ہوئی اور سب کو عجلت ہے کہ لاش کو جلد از جلد ٹھکانے لگا دیا جائے۔ چاہے تصدیق

آ سہاتا ہے۔ میں سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیتا ہوں۔ گلی میں اس وقت خلاف معمول بچوں کا شور و غل بالکل نہیں ہے۔ شاید وہ سفید چادر میں لپٹی لاش سے خوف زدہ ہو کر دور کہیں کسی دوسری گلی میں کھیلنے کے لیے نکل گئے ہیں۔

"بے چاری مر گئی ـــ مزے میں رہی"۔ مجھے یاد ہے کئی برس پہلے جب اچانک تصدیق کی اپاہج بیوی ہیضہ کا شکار ہو گئی تھی تو اسی شکستہ سیڑھی پر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھ کر تصدیق نے یہ جملہ کہا تھا۔

یہ جملہ وہ جب بھی کسی کی موت کی خبر سنتا ہے تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ ضرور سنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کا چھوٹا لڑکا پاگل کُتّے کے کاٹنے کی وجہ سے کُتّے کی طرح ہی بھونکتا ہوا مر گیا تھا تو اس نے یہی جملہ اسی جگہ بیٹھ کر بڑے ہی غیر جذباتی انداز میں دہرایا تھا۔ اس وقت یہ بات صرف میرے ذہن میں آئی تھی۔ مگر میں اُس سے کہنے کی جسارت نہیں کر سکا تھا کہ اگر وقت پر اس کے لڑکے کے انجکشن لگوا دیئے جاتے تو شاید وہ بچ جاتا۔

تصدیق سیڑھیوں پر اس انداز سے بیٹھتا ہے کہ اس کی تہبند گھٹنوں تک سمٹ آتی ہے۔ گھٹنے کے پاس سے اس کا ٹوٹا ہوا پیر جو غلط جڑ گیا ہے آگے کی جانب بھدے پن سے پپیتے کے خشک ڈنٹھل کی طرح نظر آتا ہے۔ اس کو اپنے اس کمزور پیر سے کوئی شکایت نہیں ہے وہ کسی نہ کسی طرح کودتا پھاندتا جہاں چاہے بہرحال جا سکتا ہے۔ برسوں پہلے ایک عمارت پر پلاسٹر کرتے ہوئے وہ پاڑھ سے نیچے آ گرا تھا اور جب اسپتال میں ہوش آنے کے بعد اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے پیر کو دیکھا تھا تو البتہ بری طرح رو پڑا تھا۔

کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھتا ہوں۔ نہ جانے کتنی دیر سے چارپائی کے نیچے وہ لیٹا ہوا تھا۔ میری نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی۔ کتا فقیر کو دیکھ کر چارپائی کے نیچے سے نکل آیا ہے اور لگاتار بھونکے جا رہا ہے۔ فقیر کو کتے کے بھونکنے کی ذرہ برابر پرواہ نہیں معلوم ہوتی ہے اور نہ ہی چادر کے نیچے پڑے ہوئے مردہ آدمی کی ـــ وہ حسب معمول ٹھہر ٹھہر کر صدا لگاتا ہوا گلی کے اگلے موڑ کی جانب بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کتا اب خاموش ہو گیا ہے اور چارپائی کے ایک پائے سے لگ کر اپنی پچھلی ٹانگ اٹھا لیتا ہے ـــ "دھت ـــ دھت"۔ دور بیٹھے لوگوں میں سے کوئی اُسے بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔

اب لوگ واپس آ چکے ہیں اور لاش کو اٹھانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ گلی میں اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے اور کھمبے پر لگے بلب کی روشنی مدھم اور زرد معلوم ہو رہی ہے۔ تصدیق ابھی تک نہیں آیا ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ ابھی آئے گا بھی نہیں۔ پچھلے کتنے دنوں سے شدید طلب اُسے تنگ کر رہی تھی اور آج اتفاقیہ طور پر اسے ایک جگہ کچھ کام مل گیا ہے۔

لاش دفن کرنے کے بعد لوگ دھیرے دھیرے قبرستان سے جانے لگے ہیں اور جب میں قبرستان سے باہر نکلتا ہوں تو ایک جانب تصدیق کو اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہوں۔ لوگ نفرت آمیز نگاہیں اس پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تصدیق کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے اس کا ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

چھوٹی چھوٹی بوندیں میرے جسم کے اوپر اور اردگرد گرنا شروع ہو جاتی ہیں اور اس وقت تصدیق شاید کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اتنا زیادہ نشے میں ہے کہ اس کے الفاظ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتے اور جب ایک شخص گیس کا ہنڈا لیے قبرستان سے باہر نکلتا ہے تو اس کی روشنی میں تصدیق کے سپاٹ چہرے پر ہلکی سی تھرکن دوڑتی محسوس ہوتی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ تھرکن ایک بے نام ہنسی کا روپ دھارے، میں وہاں سے چلا آتا ہوں۔

★

ترجمہ: قطب اللہ

جینے کی سزا

تقریباً رات کا نصف حصہ گزر چکا تھا۔ سیاہ اندھیری رات اُوپر سے ابر آلود آسمان، ایسے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا بارش بھی ہلکی ہلکی ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ تنہا [illegible] کے ایک پرانے شراب خانے میں بیٹھا جام کا آخری گھونٹ اتار رہا تھا۔

وہ بڑے اطمینان کے ساتھ اٹھا اور کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کر کے بوجھل قدموں کو گھسیٹتا ہوا باہر بھیگی سڑک پر آ گیا بارش ہو جانے کی وجہ سے ہوا میں کافی رطوبت آ گئی تھی۔ اسے کچھ عجیب سی مستی کا احساس ہوا، اس کے قدم بھاری ہونے لگے۔

اس کا پورا نام ابو جہاد تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی سر کے بال تیزی سے سفیدی کی طرف مائل تھے۔ جسم پر پرانا بوسیدہ لباس جس پر جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔ پیٹروں کی مدت ہو گئی مگر جوتا نصیب ہی نہیں ہوا۔ دنیا اس کے لیے واقعی بڑی بیکار سی چیز تھی۔ وہ اکثر دنیا اور اہل دنیا کا ذکر کر کے گھنٹوں ہنستا رہتا۔ اسے کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔ صرف بھوک اسے سب کچھ کرا لیتی تھی۔ اس وقت بھی اسے بھوک بڑی شدت سے ستا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ [illegible] ایک بار پھر اسے اس دنیا کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ [illegible] کا بھی خیال آیا جو اس سستے شراب خانے میں اس کے ساتھ بیٹھ کر

گھنٹوں قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ [illegible] کیا بگڑتا ہے ...... آنے والے سالوں کو برباد ہونے دو۔ ان شریعت آنے والوں میں ایک صاحب کو لوگ "انسانیت" کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن وہ حضرت جب شراب خانے سے [illegible] تو ساری انسانیت نالی میں بہتوں کو سونپ جاتے۔

ایک امریکن موٹر کار اس کے پاس سے پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی زناٹے کے ساتھ گزری۔ اس کے کپڑے بھیگ گئے۔ اس نے ایک شدید سی گالی دی، اور کپڑے جھاڑ کر آگے بڑھ گیا وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ چل رہا تھا پھر [illegible] بلند آواز میں وہ ایک ادبی نظم گنگنانے لگا۔

"ایک ..... صرف ایک پیرو چاہیے۔

جس سے خریدوں شراب۔

دو ..... کل کو دھتکار دو

اور تین ..... بیروت کی شاہراہ پر

یہ رات کتنی حسین ہوتی ہے۔"

اب وہ خاموش تھا کہ سوچ رہا تھا اپنے آپ پر [illegible] کا جہاد۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے ساتھ آزاد ہو سکتی ہے۔

یا اللہ ..... لوگوں کو آج کیا ہو گیا ہے۔ میں نے کتنی بار بھلا [illegible] والوں کو اپنی خدمات پیش کی ہیں، لیکن انھوں نے مذاق میں ٹال دیا۔ اب میں کیا کروں؟ یہ سراسر ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ ان سب نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ اسی لیے اب میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ چاہے وہ انتہائی گھٹیا قسم کی شراب ہی کیوں نہ ہو۔

° ارے او بے وفا زمانے...

خیر چھوڑو اپنے کو کیا لینا دینا ہے۔ اس کی رفتار برابر سست ہوتی جا رہی تھی۔ پیٹ کی آگ اور بھڑک اٹھی تھی۔ جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو گلی میں اسے تعفن کا احساس ہوا۔ اس کا دم گھٹنے لگا، گلی موت کے سناٹے سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا محلہ مر گیا ہو ..... آج کتے بھی نہیں بھونک رہے تھے۔

اس نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک لات ماری، دروازہ چرچرا کے کھل گیا اور وہ لڑکھڑا کر ایک تاریک کمرے میں جا پہنچا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر میز سے ماچس اٹھائی اور چراغ جو شاید گھر میں صرف ایک ہی تھا روشن کر دیا۔ کمرے میں ایک نحیف روشنی بھاری بھرکم اندھیرے سے برسرِ پیکار ہو گئی۔ اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو سامنے نظریں جم کر رہ گئیں۔ اسے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ جلدی سے اس نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھنا شروع کیا، یا خدا یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ..... نہیں ..... نہیں ..... شاید میں نے آج زیادہ پی لی ہے ..... نشے میں ہر چیز الٹی سیدھی نظر آتی ہے .. لیکن ..... یہ تو میری ہی گھر والی ہے، آخر اتنی رات کو وہ [illegible] کس کا انتظار کر رہی تھی [illegible] اب تک نہیں گیا [illegible] ہوا جا رہا تھا۔ [illegible] اس کا دماغ [illegible]

کیا ہوا ہے بیوی؟ اس نے سکوت توڑا ...!

بیٹا ..... و ..... ا ..... و ..... وہ رو پڑی تھی۔

اے روتی کیوں ہے۔ کچھ بتائے گی بھی؟

میرا بچہ، میرے جگر کا ٹکڑا ...

کیا ہو گیا اسے، کہاں ہے وہ کمبخت؟

اب وہ نہیں رہا۔

ایں ..... کیا کہہ رہی ہے تو؟ وہ اٹھ کر بیوی کے قریب پہنچ گیا۔

آج شام اسپیشل پولیس آئی تھی، گھر کی تلاشی لی اور میرے بچے کو پکڑ لیا۔ گلی میں لے جا کر اسے گولی مار دی ...

رونے کی وجہ سے اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا ...

ہچکیوں کی وجہ سے الفاظ صحیح طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے اور آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو رہا تھا۔ جہاد نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔

اس کی بیوی رونے پر قابو حاصل کر کے پوری قوت سے چیخ پڑی۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے، تمھارا صرف نام ہی جہاد ہے ... تم کسی کام کے نہیں ہو، اس لفظ کا مطلب تم نہیں سمجھتے۔ اس کے تقدس سے نابلد ہو، شراب نے تمھارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تمھارے پاس عزت نام کی کوئی چیز نہیں۔ جاؤ جاؤ اور پی پی کر خوب لڑکھڑاؤ، تمھیں گھر اور وطن سے کیا مطلب؟

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی، شراب نے مجھے بزدل اور ناکارہ بنا دیا ہے ... اُف ..... وہ گراں قدر رشتے جو میرے اجداد کی امانت تھے، انھیں میں نے گنوا دیا ... اف ... اب میں کیا کروں؟

وہ غم سے نڈھال ہو کر تنہا کونے میں کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو رہا تھا۔ اچانک جہاد کو اپنی بیوی کے آنسوؤں کی گرمی کا احساس ہوا۔ اس کا نشہ نہ جانے کہاں ہرن ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کہ نشے نے اس کا برا حال کر رکھا تھا، اب اس کا بھی احساس اسے

نہیں رہا۔ اس کے دماغ میں جوان بیٹے کے قتل کا المیہ ہتھوڑے مارنے لگا۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے پیشانی کو اس طرح پونچھا جیسے ایک جہان کو نچوڑ کر پھینک دینا چاہتا ہو۔

وہ سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نہ جانے ان تھکے ہوئے قدموں میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ "خدا تجھ پر رحم کرے۔ جہاد! تو کب تک ان مظالم کا خاموش تماشائی بنا رہے گا؟ کب تک ان گلیوں کے اجڑے ہوئے گھروں کی تلاشیاں اور جھونپڑوں کو جلائے جانے کا سلسلہ جاری رہے گا؟" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا۔

اس کا سرد، کمزور جسم ایک شعلہ بن چکا تھا، اس نے گھر میں رکھی شراب کی خالی بوتلیں زمین پر دے ماریں۔ شیشے کے سینکڑوں ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ اسے بڑا سکون محسوس ہوا، آنکھوں میں جد و جہد اور عزم مصمم جھانکنے لگا۔ اپنے اسلاف یاد آئے۔ اور شدت جذبات سے وہ چیخ پڑا.....!!

وہ ہاتھ اور پیر جو ہمارے اوپر ظلم کی لعنت بن کر چھا گئے ہیں۔ میں انہیں قلم کر دوں گا۔ پھر اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ دھڑ سے دروازہ کھولا اور تیز قدموں کے ساتھ، کسی زخمی شیر کی مانند، انتقام کی آگ سینے میں بھڑکائے ہوئے گلی میں بھاگتا چلا گیا۔

گھر میں ننھے ننھے بچے بیدار ہو چکے تھے ماں نے جلدی سے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا اور خدا کا شکر ادا کر کے بچوں کو ایک نئی صبح کی خوش خبری دینے لگی۔

منظور ندیم
بالاپور ضلع اکولہ
مہاراشٹر

غزل

زندگی دھوپ کی مانند کڑی ہے بابا
موت بھی فرض نبھانے پہ اڑی ہے بابا

کوئی دستک سی درِ دل پہ دیا کرتا ہے
میرے پیروں میں تو زنجیر پڑی ہے بابا

درد غیروں کا چھلکتا ہے تری آنکھوں سے
موتیوں کی تری آنکھوں میں لڑی ہے بابا

دل پہ رکھوں تو علاجِ غمِ دوراں ہو جائے
ہاتھ تیرا ہے کہ جادو کی چھڑی ہے بابا

ہم نے اک عمر گزاری ہے وہاں ہنس ہنس کر
موت ہر لمحہ جہاں سر پہ کھڑی ہے بابا

طبعِ خود دار نے جھکنا نہیں سیکھا ہے ندیم
ورنہ منزل مرے قدموں میں پڑی ہے بابا

دسمبر ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا
[illegible]
پرنٹر: اشوک [illegible]
[illegible]

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
سالانہ: پانچ روپے

[illegible]

[redacted] [illegible]

[illegible] اقدامات کے [illegible] ریاست [illegible] صنعت کاروں کی [illegible] کیے ہوئے پروگرام شروع کیے گئے ان کے مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں [illegible] کے علاوہ ماہی تحفظ کے سلسلے میں بھی قابل ذکر [illegible] ہوئی ہے۔

ریاست کے کسانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک نئی زرعی پالیسی نافذ کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی صنعتی پالیسی کا اعلان بھی کیا گیا۔ جس کے تحت ہر بلاک میں کم سے کم دو لاکھ روپے کی لاگت سے ایک چھوٹی صنعت قائم کرنے کا [illegible] کیا گیا ہے۔

پسماندہ طبقوں کی فلاح و ترقی کے لیے بھی ریاستی حکومت نے خصوصی کوششیں اور موثر اقدامات کیے ہیں۔ اس سلسلے میں [illegible] نافذ کی گئی، جس کے تحت ۱۰۷٫۰۲ کروڑ روپے گزشتہ برسوں کے دوران خرچ کیے جا چکے ہیں۔ [illegible] ہریجن بستیوں کی بجلی کاری کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ۶۱۹۹۰ ہینڈ پمپوں اور ۲۲۴۹ ڈگیوں کی تعمیر [illegible] پانی کی سہولت دستیاب ہے۔ قبائلی منصوبہ بندی کے [illegible] کے لیے [illegible] سے زیادہ مکانات [illegible]

[illegible] اسکیم تمام ریاست میں نافذ کر دی گئی ہے جس سے [illegible] لاکھ خاندان اب تک مستفید ہو چکے ہیں۔ [illegible] شدہ زمین پر قبضہ دلایا جا چکا ہے اور پندرہ لاکھ خاندانوں کو مکان کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ [illegible] روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنے کے لیے [illegible] سے زیادہ دیہی اور صنعتی [illegible] قائم کیے گئے۔

ضروری اشیا کی تقسیم کے نظام کو بہتر اور مستحکم بنانے کے لیے بھی اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سستے غلے کی دکانوں کی تعداد میں [illegible] اضافہ کیا گیا ہے۔ ایسی دکانوں کی مجموعی تعداد ایک ۱۰۹۰۰ ہے۔ اس کے علاوہ دور دراز علاقوں کے لیے [illegible] دکانوں کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ [illegible] ضروری اشیا [illegible] والوں [illegible] دستیاب ہیں۔ [illegible] ڈیری ترقیاتی اسکیم کو ترقی دینے کے لیے ریاست میں آپریشن فلڈ ۲ شروع کیا گیا ہے جس [illegible] دودھ کی پیداوار بڑھی ہے۔ بلکہ اس کی دستیابی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

[illegible] وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے نئے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت وزیر اعلیٰ [illegible] کی رہنمائی میں [illegible] ترقی کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ جس کی تابناکی سے معاشی نابرابریوں کا اندھیرا دور ہوتا جا رہا ہے۔

—— ایڈیٹر

[illegible] بنارسی
[illegible]

جھانسی کی رانی

گھن گرج توپوں کی آوازوں کا شور اٹھا دھواں
شہر بندوقوں کا جنگل گولیوں کی شائیں شائیں
جس طرف دیکھو ادھر حد نظر تک خون خون
لاش آگے لاش پیچھے لاش دائیں لاش بائیں
اس قدر رستے پہ ہے رانی کا گھوڑا گر پڑے
سورما بھی اک نظر دیکھیں تو چھکے چھوٹ جائیں
اک بھیانک خامشی ہر اک طرف گاتی ہوئی
موت کا خونی اندھیرا کر رہا ہے سائیں سائیں
راج ماتا کی نگاہوں میں اندھیرا چھا گیا
غوث خاں رخصت ہوا لیتا ہوا سر کی بلائیں
اپنا ننھا سا کنور سینے سے لپٹائے ہوئے
نے خیال اس کا کہ انگریزوں کی نظریں کھا نہ جائیں
آ نہ سکتی تھی مگر گھوڑا اڑا کر آ گئی
حکمران جھانسی کی اب جھانسی کے باہر آ گئی

دیش کے سارے فدائی زور دکھلاتے ہوئے
آخری دم تک ہر اک طوفاں سے ٹکراتے ہوئے
ایسے پیاسے تھے کہ پانی پی گئے تلوار کا
ایسے بھوکے تھے کہ ہنس ہنس گولیاں کھاتے گئے
جو فرنگی سامنے آیا دیا پورا جواب
جتنا بل ماتھے پہ دیکھا اتنا بل کھاتے گئے
لکشمی بائی کے ساتھی بھی بہادر کم نہ تھے

ہر ستم پر مسکراتے جھومتے گاتے گئے
جس طرح مارے کوئی ٹھوکر سر غدار پر
اس طرح ہیروز کا ہر حکم ٹھکراتے گئے
اپنے خون گرم سے رکھ کر گئے بنیاد چمن
ہر قدم پہ پھول کھلاتے پھول برساتے گئے
جائیے قرباں شہیدان وطن کی آن کے
چڑھ گئے سولی پہ بھی ساون کا جھولا جان کے

یاد تو ہوگا تجھے اے سرزمین گوالیار
آئی تھی اک شیرنی جب چھوڑ کر اپنی کچھار
کر رہی تھی موت کا سواگت اٹھی شان سے
ساتھ اپنے لے کے اپنی بیوگی کی یادگار
جس کے دم کے ساتھ دل ٹوٹا تھا ہندوستان کا
جان جس دیوی نے دی لڑتے ہوئے مردانہ وار
کہتی ہے جس کی سمادھی سر اٹھا کر آج بھی
میں ہوں کاشی کی امانت میں ہوں جھانسی کا وقار
کہہ رہی تھی دیکھ کر ہنستے ہوئے زخموں کے پھول
واہ رے رنگ گلستاں واہ رے رنگ بہار
اپنی ہی تلوار کا آئینہ رکھ کر سامنے
اپنے ہاتھوں اپنے بہتے خون سے کر کے سنگار
اوڑھ کر چندری لہو کی پھر سے دلہن بن گئی
جنگ کے میدان میں بیوہ سہاگن بن گئی

حریت اور شجاعت کا پیکر

رانی جھانسی

ونا یہ جیالے ہندوستان کی تاریخ کی قسم، دیارِ ہند سے ہر دور میں ایسے ایسے پیکرِ شجاعت و جانبازِ وطن اٹھے جنہوں نے اپنی جواں مردی کا بیش بہا، دلیری کے کارناموں بھرے افسانے چھوڑے ہیں جن پر ہر ہندوستانی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

ایسی ہی ایک شخصیت رانی جھانسی کی ہے جنہیں ہم سب لکشمی بائی کے نام سے جانتے ہیں، جو دورِ غلامی کی صد سالہ تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ رانی جھانسی کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب انگریز دل صفت ملک کے طول و عرض میں اپنی سازشوں کا جال بچھا کر تمام راجوں مہاراجوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیا تھا۔ بیشتر ریاستی حکمراں سالانہ پنشنوں پر گزارا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بنارس کے ایک والیٔ ریاست چمن اپا بھی اسی طرح کے حکمرانوں میں تھے۔ ان کے ایک مصاحب موری پنت تانبے تھے۔ ۱۹ نومبر ۱۸۳۵ء کو موری پنت تانبے کی اہلیہ بھاگیرتی بائی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جس کا نام منو بائی رکھا جاتا ہے۔ برہمن زائچہ کھینچتے ہیں تو ماں باپ کو یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ یہ بچی ایک روز سارے دیش میں آفتاب کی طرح چمکے گی، مگر ہوتا یہ ہے کہ بچی کی ولادت کے بعد ہی والدین کے ستارے گردش میں آ جاتے ہیں۔ چمن اپا ایک روز اچانک دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن بند ہو جاتی ہے اور نوکر چاکر تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے چمن اپا کے ایک دوست جو باجی راؤ پیشوا ریاست بٹھور میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے، سارے متعلقہ لوگوں کو اپنے یہاں بلا لیتے ہیں۔ باجی راؤ پیشوا اس بچی کو بہت چاہتے تھے اور پیار سے اسے چھبیلی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ بچی بڑی نٹ کھٹ، شوخ و شنگ اور ایک خوبصورت گڑیا لگتی ہے۔ اب وہ محل کے اندر پیشوا کے اکلوتے لڑکے نانا صاحب کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کر رہی ہے۔ رکشا بندھن کے مبارک موقع پر ہر سال محل کے اندر ایک جشن کا اہتمام ہوتا ہے اور منو بائی اپنے بھائی نانا صاحب کے راکھی باندھتی ہے۔

منو بائی سنِ بلوغت میں قدم رکھ رہی ہے اس کے حسن اور شہسواری کا چاروں طرف شہرہ ہے۔ اسی زمانے میں جھانسی کے راجہ گنگا دھر راؤ کی پہلی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے اور وہ پیشوا کی خدمت میں حاضر ہو کر منو بائی سے شادی کا پیغام دیتا ہے۔ جو منظور ہو جاتا ہے اور نتیجہ میں منو بائی رانی جھانسی کے روپ میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ منو بائی کا نام گنگا دھر راؤ نے لکشمی بائی رکھ دیا۔ جو بعد میں سارے دیش میں عورت احترام، عزم و حوصلہ، شجاعت و جانبازی اور حریت کی ایک مقدس علامت بن گیا۔

گنگا دھر راؤ کے نہ تو پہلی بیوی سے کوئی اولاد ہوئی نہ ہی

رانی لکشمی بائی ہے. ظاہر ہے ولی عہد سلطنت کا خیال راجہ کو پریشان کرتا ہوگا جس کا حل اس نے ایک بچے کو گود لے کر نکالا اور گورنر جنرل سے یہ طے بھی ہوگیا کہ راجہ کے بعد یہ لڑکا وارث تخت و تاج ہوگا۔

۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی ہندستان میں نیا گورنر جنرل بن کر آیا جس نے ایک ایسا قانون وضع کیا جس کے تحت گود لیے بچوں کو تخت و تاج کا وارث نہیں بنایا جا سکتا تھا اس قانون کے ذریعہ ایسی تمام ریاستوں کو حکومت انگلشیہ میں شامل کرنے کا بندوبست بھی کیا گیا۔

راجہ کی رحلت کے بعد حکومت انگلشیہ نے جھانسی کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور گود لیے دامودر راؤ نیز رانی جھانسی کے لیے سالانہ پنشن مقرر کر دی. پنشن کی ادائیگی میں حکومت نے بے ایمانی سے کام لیا ادھر بٹھور کے نانا صاحب کے ساتھ بھی انگریزوں نے اپنی روائتی بد دیانتی کا مظاہرہ کیا۔ نانا صاحب بھی غیرت مند تھا وہ پہلے ہی اپنی بہن کے ساتھ فرنگیوں کی زیادتیوں کے سبب غصہ میں بھرا بیٹھا تھا دوسرے اس پر بھی وار کیا گیا۔ جب اس نے جانباز سپہ سالار تانتیا ٹوپے سے صلاح لی تو اس کو ٹوپے نے دو ٹوک لفظوں میں سمجھا دیا کہ جنگ کے سوا کوئی دوسرا راستہ ان ظالموں سے نپٹنے کا نہیں ہے۔ تانتیا ٹوپے کی بات نانا صاحب کے دل کو لگ گئی اور اس نے اپنی بہن کو اس سلسلے میں لکھا۔ رانی جھانسی کا جواب اثبات میں ملا۔ اور اپنا سب کچھ دیش پر وار دینے کا یقین دلایا گیا۔ انگریز دل سے جو پہلے سے ہی باخبر تھے۔ مختلف حربوں سے رانی جھانسی کو پریشان کرنا شروع کر دیا مگر قدرت نے رانی کو چٹان جیسا حوصلہ عطا کیا تھا جس سے ٹکرا کر بڑے بڑے طوفان دم توڑ دیتے ہیں۔

اس وقت نتھے خاں نامی ایک پیشہ ور لیٹرا تھا جس کو انگریزوں نے بھڑکا دیا اور اس نے جھانسی پر حملہ بول دیا۔ رانی نہیں چاہتی تھی کہ آپس میں خوں ریزی ہو اس نے نتھے خاں سے پوچھا کیا چاہتا ہے؟ نتھے خاں نے تین لاکھ کا مطالبہ کیا. رانی نے رفع شر کے خیال سے کسی طرح وہ مطالبہ پورا کر دیا اور وہ واپس چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہی سامراجیوں نے رانی پر بغاوت کا الزام لگا دیا۔ اور جواب طلب کیا۔ رانی شیرنی کی طرح گرج اٹھی اور اس نے الزام بغاوت کا کوئی باضابطہ جواب نہیں دیا۔ جس کے نتیجہ میں انگریزی فوج رانی کو قید کرنے کے لیے جھانسی کی طرف بڑھنے لگی۔ رانی نے فوجی لباس زیب تن کیا اور عوام سے کہا کہ وقت آگیا ہے کہ یا تو ہم انگریز سے ٹکر لیں یا عزت کی موت مر جائیں۔ سب نے ایک زبان ہو کر عہد وفاداری کیا۔ افواج انگلشیہ کے سالار نے پیغام بھجوایا کہ رانی خود کو ہمارے حوالے کر دے. رانی کا جواب تھا کہ ہندستانی عورت خود کو صرف اپنے شوہر کے حوالے کرتی ہے دوسرے کی کیا مجال کہ اس کی زندگی میں اس کے ہاتھ لگا سکے، اس کے ساتھ ہی جھانسی کے قلعہ سے توپیں گرجنے لگیں۔ دوسری طرف تانتیا ٹوپے اور نانا صاحب نے مورچہ سنبھال لیا اور ایک گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ انگریز فوجیں اپنے حلیفوں کے ساتھ بھی کسی طرح کی کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں۔ اسی اثنا میں رانی کو تانتیا ٹوپے کی شکست کا حال معلوم ہوا اور وہ اداس ہوگئی۔ رانی نے سوچا کہ ہمارے مٹھی بھر جانباز سپاہی کب تک ٹکر لے سکیں گے۔ ادھر انگریزی فوج نے قلعہ کے قریب مورچے بنا لیے اور رانی کو زندہ جلا دینے کے لیے چاروں طرف آگ لگا دی۔ رانی اپنے گود لیے بیٹے کو گھوڑے پر بٹھا کر کسی طرح شہر سے نکل گئی۔ برق رفتار گھوڑے نے چوبیس گھنٹہ میں ایک سو دو میل کا فاصلہ طے کر کے رانی کو صحیح سلامت کالپی پہنچا دیا۔ جن فوجیوں نے اس کا پیچھا کیا ان میں بیشتر رانی کے ہاتھ سے مارے گئے باقی بھاگ گئے۔ کالپی میں نانا صاحب نے اپنی بہن کا شاندار استقبال کیا۔ مگر دوسرے دن پیشواجی کی فوج ہار گئی اور منتخب جاں نثاروں کے ساتھ دونوں بھائی بہن گوالیار کی طرف بڑھ گئے۔

گوالیار کا راجہ جیاجی راؤ سندھیا انگریزوں کا دوست

اور دغا باز تھا۔ عوام چاہتے تھے کہ راجہ بھی اس موقع پر جنگ کا اعلان کرے مگر راجہ نے انکار پر وطن دوست عوام نے راجہ کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا۔ ناناصاحب اور تکشمی بائی جب گوالیار پہنچے تو عوام نے ان کا زبردست خیر مقدم کیا۔ راجہ خود کر انگریزوں کی پناہ میں بھاگ گیا۔ دوسرے دن کرنل اسمتھ نے گوالیار پر چڑھائی کر دی۔ رانی جھانسی خود میدان جنگ میں کود پڑی اور گشتوں کے پشتے لگا دیے فتح قریب تھی کہ غدار دیوان دنکر راؤ انگریزوں سے مل گیا اور میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ رانی نے یہ دیکھ کر ہوشیاری سے گھوڑا موڑا اور اپنے ایک وفادار سپاہی کے ساتھ ایک سمت چل پڑی۔

مصت درجن سپاہیوں نے تعاقب کیا۔ شاید رانی اُن کے ہاتھ نہ آتی مگر درمیان میں ایک نالا آجانے سے گھوڑا اڑ گیا اور اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں وہ سپاہی پہنچ گئے جن تو رانی کے ہاتھ سے موت کی وادی میں پہنچ گئے۔ ایک سپاہی نے رانی پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ گال سمیت داہنی آنکھ باہر نکل آئی۔ مگر شیر دل رانی تلوار چلاتی رہی اور اس نے ایک اور سپاہی جہنم رسید کر دیا۔ دو ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ رانی گھوڑے سے اتر پڑی اور اپنے سپاہی رام چندر راؤ سے کہا کہ خبردار میرے جسم کو انگریز ہاتھ نہ لگانے پائیں۔ پھر وہ گر پڑی اور ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ رام چندر راؤ نے وہیں چتا تیار کی ۔۔ تھوڑی دیر میں افق پر سرخ دھاریاں ابھرنے لگیں جو اس کی غماز تھیں کہ ملک کے لیے جان دینے والے کبھی مرتے نہیں۔ زمین پر گرا ہوا ان کا لہو قیامت تک کے لیے شفق کے رنگ کا حصہ بن جاتا ہے جو ہر دور میں نئی نسل کو پیغام دیتا رہے گا کہ حریت انسان کا ابدی حق ہے جو لازوال ہے اور لازوال رہے گا۔

✖

پروفیسر حفیظ بنارسی
مہاراجہ کالج آرہ۔ بہار

غزل

ہمارے عہد کا منظر عجیب منظر ہے
بہار چہرے پہ، دل میں خزاں کا دفتر ہے

ہر ایک لمحہ شکست حیات کا ڈر ہے
یہ زندگی ہے کہ بوسیدہ کانچ کا گھر ہے

اسی سے لڑتے ہوئے ایک عمر بیت گئی
مری انا ہی مرے راستے کا پتھر ہے

تمام جسم ہیں جس کے خیال سے لرزاں
وہ تیرگی کا نہیں روشنی کا خنجر ہے

میں ایک قطرہ ہوں لیکن مرا نصیب دیکھ
کہ بیقرار مرے غم میں اک سمندر ہے

اسی کے پیچھے رواں ہوں میں پاگلوں کی طرح
وہ ایک شے جو مری دسترس سے باہر ہے

اسی خیال سے ملتا ہے کچھ سکوں دل کو
کہ نامجبوری تو اس دور کا مقدر ہے

کبھی تو اس سے ملاقات کی گھڑی آئے
جو میرے دل میں بسا ہے جو میرے اندر ہے

عقاب ظلم کے پنجے ابھی کہاں ٹوٹے
ابھی تو فاختۂ امن خون میں تر ہے

ہزار بار یہ ٹوٹا ہزار بار لٹا
دلِ حفیظ مگر آج بھی تو نگر ہے

حضرت حاجی وارث علی شاہ

از تیغ پرتاب گڑھی
بیم وارڈ پرتاپگڈھ

وہی پیشانی پہ تہذیبِ محبت کی چمک — وہی انفاس میں گلزارِ اخوت کی مہک
وہی سینے میں ہی خواہیِ انساں کی للک — سلسلہ خواجۂ اجمیر سے پہنچا تجھ تک
اب وہ بھگوان کے بندے ہوں کہ ہوں رب والے
معتقد ہیں ترے ہر فرقہ و مذہب والے

مدرسے میں تھے خود داریٔ انساں کا سبق — جس میں تہذیبِ مساواتِ بشر ایک ورق
تھا پئے تزکیۂ نفس ترا "نعرۂ حق" — واہمہ تیرے لیے زخمِ سفر خونِ شفق
کوئی صورت ہو مگر ایک ہی جلوا دیکھا
تو نے کثرت میں بھی وحدت کا تماشا دیکھا

رام و رحمٰن کے قضیوں کے لیے غیر رہا — جہل کی ساری ہی شکلوں سے تجھے بیر رہا
ذہن آسودہ رہا اور نظر سیر رہا — وجہِ برکت رہا، پیغامبرِ خیر رہا
پریم کا لفظ تھا اور پریت کی آواز تھا تو
جس میں سب راگوں کا سنگم ہو وہ اک ساز تھا تو

کون سمجھے ترے اقوال کہاں تک پہنچے — جادۂ دل سے چلے، منزلِ جاں تک پہنچے
اب وہ اپنوں میں رہے یا دگراں تک پہنچے — "تیرا پیغام محبت تھا جہاں تک پہنچے"
تو رسومات و فروعات سے بیگانہ رہا
روحِ مذہب کا سدا طالب و دیوانہ رہا

سارے انسانوں کو الفت کی طرف لے کے چلا — تو ہمیں صدق و صداقت کی طرف لے کے چلا
قوم کو گوشۂ راحت کی طرف لے کے چلا — ملک کو منزلِ عظمت کی طرف لے کے چلا
شعلۂ عشق دیا ٹھٹھری ہوئی جانوں کو
واقفِ حسن کیا سوختہ سامانوں کو

نہ رکھیں بغض نہ آمادہ پئے جنگ رہیں — ہم نہ افسردہ رہیں اور نہ دل تنگ رہیں
تیری کوشش تھی کہ جذبات ہم آہنگ رہیں — تو نے چاہا تھا سبھی آدمی یک رنگ رہیں
رائیگاں جا نہ سکا ایک بھی لمحہ تیرا
عمر بھر درس دیا لوگوں کو یک جہتی کا

سیکڑوں شاخیں تو ہوں پر شجر ایک رہے — ان گنت کرنوں سے مل جل کے سحر ایک رہے
زاویہ ایک ہو، اندازِ نظر ایک رہے — سارے جھگڑوں سے الگ ہو کے بشر ایک رہے
اسی پیغام سے ہم اپنا نفس مہکائیں
کام یہ پایۂ تکمیل تک پہنچائیں

غلام ربانی گردش
معرفت علی رضا مختار صاحب
سیدواڑہ، محمد آباد گوہنہ
اعظم گڑھ

ساغر مہدی

ساغر مہدی کا ایک خط :

" احسان منزل، سیدواڑہ، بہرائچ، ۱۰ اپریل ۶۶ء

اسیر گردشِ چشمِ غزالاں، گردشِ دوراں
تمہارا آٹھ اپریل کا لکھا مکتوب آیا
پڑھا ـــــ جی خوش ہوا
یہ جان کر
اس عہدِ تنہائی میں بھی تم کو
بہ ایں فہم و فراست، عقل و بینائی نہیں تم کو
نگاہوں کا غلط انداز ہونا
راس آیا
کوئی خوشبو کا جھونکا پاس آیا ـــ
مگر یہ کب لکھا تم نے
کہ کنارہ کش ہوا "
یہ پڑھ کے مجھ کو
سخت حیرت ہے
کہ یہ مردانگی پر ایک تہمت ہے
چلو سب ٹھیک ہے ـــ
اچھا ہوا ـــ ؟
تم اس سے بچ نکلے
اور اس سے چھوٹ کر
مضمون بے مجانی پر لکھا
بہت خوش ہوں گی
نجمی اور سلمیٰ ـــ رضیہ آپا !!

سوچا تھا مکمل خط منظوم ہو جائے گا مگر ابھی اچانک کچھ لوگ آگئے اور یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا ـــ "

۶۵ء کی برسات، امین آباد لکھنؤ کے سندھ ہوٹل میں تعارف، دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے، ایک دوسرے میں کھو گئے ـــ ذرا سنبھلا تو سامنے ایک دل نواز شخصیت تھی ـــ ایک سجیلا نوجوان ـــ موزوں قد، بھرا بھرا جسم، کھلتی ہوئی رنگت، ترشے ہوئے خوبصورت بال، کشادہ پیشانی گھنے ابرو، کچھ ٹٹولتی ہوئی اور متجسس آنکھیں، کھڑی سی ناک جو سرے پر چپٹی ہو گئی تھی، قدرے موٹے ہونٹ، چھوٹا سا دہانہ، مضبوط جبڑے جن سے چہرے پر ورم ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ خوش لباس، خوش اطوار، خوش گفتار ـــ نوجوانی کے عالم میں چہرے پر بزرگوں کا سا وقار اور سنجیدگی ـــ متوازن اور گمبھیر۔
اداؤں میں سحر، آنکھوں میں سحر، باتوں میں سحر ؎
ریشم کا الجھاؤ تھا اس کی باتوں میں
دو چار ملاقاتوں میں چھننے لگی، موسلا دھار بارش میں لکھنؤ کی سڑکوں پر مجھے ساتھ لے کر وہ نکل پڑتا، بھیگتے برساتی کا نہ سے شوق، نہ بچنے کا، پانی میں شرابور کپڑے، بھیگے ہوئے جسم ـــ ایک ہوٹل سے دوسرا ہوٹل ـــ ایک غزل کے بعد دوسری غزل ـــ ایک نظم کے بعد دوسری نظم ـــ ایک لطیفہ کے بعد دوسرا لطیفہ ـــ ایک پڑاؤ سے دوسرا پڑاؤ ـــ اور آخری پڑاؤ شاہجہان بانو یاد دہلوی کا گھر! شاید اس طرح وہ اپنے جسم میں جلتی ہوئی چتاؤں کی آگ کو بجھانا چاہتا تھا ؎

میں جس کو گنگنا نہ سکا دل میں راگ ایسا تھا
کہ جگ جگ چھاؤں کی آگ ایسا تھا

ممکن ہے اس طرح دن دن بھر پانی میں بھیگنے سے اس کی روح کی تشنگی بجھ جاتی ہو

ندیا ہر ایک سوکھ گیا ہم کو دیکھ کر
کہنے کو سر پہ شیو کی جٹائیں ملیں ہمیں

یہ بھی ممکن ہے کہ میری طرح اسے اپنے گھر کی بے سر و سامانی کا شدت سے احساس رہا ہو گا

گرتی چھت ہلتی دیواریں ساتھ رہیں
کیا گھر کیا آنگن، جیون بیت گیا

اگر سردیوں یا گرمیوں میں ملتا تو رات کے پچھلے پہر تک سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔۔۔ کبھی عبداللہ ہوٹل۔ کبھی قومی آواز کا دفتر۔۔۔ کبھی خیالی گنج والے گھر میں تھوڑی دیر کے لیے جھانک آتا۔۔۔ ایک غزل کے بعد دوسری غزل۔۔۔ ایک نظم کے بعد دوسری نظم۔۔۔ ایک لطیفہ کے بعد دوسرا لطیفہ۔۔۔ اگر بھانپ لیتا کہ میری جیب میں کوئی مضمون ہے تو بار بار اصرار کرتا سنا دو۔۔۔ شہر کے سارے ہوٹل بند ہو گئے۔۔۔ دو گھڑی چین سے بیٹھنے کی جگہ نہیں۔۔۔ مگر مرغ کی ایک ٹانگ کے مصداق وہی رٹ لگی ہوئی ہے۔۔۔ سنا دو بھئی سنا دو۔۔۔ کسی پارک میں ہی سنا دو۔۔۔ کسی لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ہی سنا دو۔

۱۱ ستمبر ۷۶ء کے خط میں لکھتا ہے۔۔۔ "تمہارا پیارا سا معصوم خط ملا۔ ویسے تم کئی روز سے برابر یاد آ رہے تھے اور مسئلہ کشمیر بھی۔۔۔ باقر مہدی کے خط کی داد تم کو کرسچین کالج والی ویران سڑک کے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں بھی بھر کے دے چکا ہوں" چونکہ میرا گھر قیصر باغ بس اسٹیشن کے پاس تھا۔۔۔ اس لیے وقت ناوقت وارد ہوتا۔۔۔ "بس چھوٹنے میں دیر تھی، سوچا تم سے مل لوں"۔۔۔ مصافحے سے جی نہیں بھرتا۔۔۔ معانقہ کرتا۔۔۔ اور پہروں گلے لگائے رہتا۔۔۔ گرم جوشی۔۔۔ خلوص۔۔۔ محبتوں کے خزانے۔۔۔ جو اس نے سرِ راہ لٹا دیئے!

ایک میں ہی کیا، وہ ہر دوست پر جان چھڑکتا تھا، دوست مل گیا گویا کوئی دولت ہاتھ لگ گئی۔ دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر مدد کے لیے تیار۔۔۔ ہر تقاضوں کے لیے حاضر۔ ایک عزیز پرور، علم دوست، درد مند، یار باش، مخلص و شفیق کے پیکر میں ایک فرشتہ صفت انسان!

ساغر ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ء کو سید واڑہ، بہرائچ میں سید خورشید حسن زیدی کے گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ابھی ڈیڑھ سال کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کی شخصیت میں جو ایک عجیب سی بیچارگی کا احساس تھا وہ اسی یتیمی کی دین تھی۔ پرورش و پرداخت ماموں کی محبت کی گھنی چھاؤں میں ہوئی جو علم دوست اور ادب نواز تھے اور ذیابیطس جیسے مہلک مرض میں مبتلا۔ بائیس سال کی عمر میں وہ اس چھاؤں سے بھی محروم ہو گیا۔۔۔ اب زندگی کا تپتا ہوا ریگ زار تھا اور اس کا حساس شاعرانہ وجود۔۔۔

"۱۹۵۸ء میری زندگی کا بڑا اہم سال ہے۔ انٹرمیڈیٹ کا فائنل ایر تھا۔ امتحانات ہو رہے تھے کہ ایک روز جب کہ میں انگریزی کا پرچہ کر رہا تھا اطلاع ملی کہ ماموں جان ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں کسی مقدمے کی بحث کے دوران اچانک بیہوش ہو گئے ہیں۔ پرچہ نامکمل چھوڑ کر امتحان گاہ سے سول کورٹ پہنچا تو تمام عدالتیں بند کر دی گئی تھیں اور بار ایسوسی ایشن کے تمام ایڈووکیٹس، ججز اور دیگر اہل کاران کچہری کے سوگوار ازدہام میں ایک چارپائی پر ماموں جان لیٹے تھے۔ خاموش، بے حس و حرکت، مردہ، بے جان۔ بس نہ پوچھیے کہ میرے ذہن و دل کی کیا کیفیت ہوئی۔ مجھے اس دن پہلی بار اپنی یتیمی کا شدید احساس ہوا۔ اب مردوں کی صف میں تنہا میں تھا۔ ذمہ داریوں کا ایک زبردست بوجھ اٹھائے ہوئے"

باپ اور ماموں سے بچھڑنے کے بعد تیسرا کاری زخم ماں کی موت کا تھا جو دق کی مریضہ تھیں۔۔۔

"تعلیم کا سلسلہ پھر شروع ہی کیا تھا کہ ۱۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو والدہ کا انتقال ہو گیا جس نے کئی سال تک ذہنی طور پر شدید

[illegible] پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی ہمارے [illegible] مستقل رہے کے ہیں ایک خوابیدہ [illegible]
ہے۔

"جیسے کے فوراً بعد کشمیر یاد نہیں ہوا گویا عید ہیں آپ لوگ ابھی تک مناتے ہیں، خوش قسمت ہیں، یہاں گزشتہ پندرہ برسوں میں شاید ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جس پر عید کا گمان ہوا ہو۔" مامتا کے بازو تصور کی حسین چھاؤں میں اس کی طرف اب بھی پھیلے جھلکتے ہیں ؎

میں رخت سفر باندھ کر جیسے ہی
گھر کے آنگن میں آیا
میرے کانوں میں آئی صدا
مڑ کے دیکھو مرے لال بیٹے مرے
میں مڑا —
شفقت مادری اپنی آنکھوں میں آنسو لیے
اپنا کولہے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے لڑکھڑاتی ہوئی
میری جانب بڑھی

الوداع — الوداع کہہ کے رخصت کیا
میں کھڑا سوچتا ہی رہا
میرے گھر میں تو کوئی نہیں
ایک ماں تھی
وہ عرصہ ہوا مر چکی!

ساغر کے سینے میں چوٹ کھا رہتا ہوا زخم بچپن سے محرومی کا تھا ؎

پھر اس باغ میں مانند برگ آوارہ
شمیم گل نے مگر پائمال بھی نہ کیا
مری سرشت میں وہ لاشریک تھا کہ مجھے
خدا لگے صاحب اہل و عیال بھی نہ کیا

وہ اپنی محرومیوں اور اداسیوں کو لطیفوں اور قہقہوں کی اوٹ میں چھپائے رہتا ؎

[illegible] تھا ہر اک محفل میں
گھر میں وہ شخص اداسی کا جزیرہ نکلا

ساغر زندگی سے ہر ہر قدم پر نبرد آزما تھا۔ ناساعد حالات کے جوکھم سہتے ہوئے بھی اس نے کسی نہ کسی طرح ۱۹۶۰ء میں تعلیم مکمل کرلی اور بہرائچ کے مہاراجہ سنگھ کالج کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گیا اور تادم آخر اسی "مقدس فرض" کو انجام دیتا رہا۔ اپنے ذہنی سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"بچپن میں میر انیس کے مرثیے اور سلام و سوز والدہ مرحومہ یاد کراتی تھیں اور ہر روز آموختہ سنانا پڑتا تھا۔ اس طرح طبیعت میں ایک خاص قسم کی موزونیت اور سوز و گداز پیدا ہوگیا جس کی بیشتر مثالیں جابجا آپ کو میری شاعری میں مل جائیں گی۔ میرے یہاں ایک حزنیہ لہجہ اور اداسی ملے گی اس کے لیے نہ میں میر تقی میر کا مرہون منت ہوں نہ فانی و جذبی کا اور نہ ہی ناصر کاظمی وغیرہ کا۔ میں نے خود اپنے حالات میں اپنی آواز تلاش کی ہے . . . ."

ساغر کی اس آواز میں صدیوں کی صحت مند شعری و ادبی روایات کی بازگشت شامل ہے ؎

کیا پتھروں کے شہر میں دوکان شیشہ گر
اک شمع جل رہی ہے غضب کی ہوا کے ساتھ
صدیوں سے پھر رہا ہوں سکوں کی تلاش میں
صدیوں کی بازگشت ہے اپنی صدا کے ساتھ

ساغر کو دنیا میں اپنا تخلیقی عمل سب سے زیادہ عزیز تھا اور اس نے سب کچھ گنوا کر بھی فن کی آبرو نہیں بیچی۔

"میں نے کبھی زبردستی شعر کہنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ کے طور پر میری شاعری میں بہت طویل وقفے، ایک تخلیق سے دوسری تخلیق کے درمیان کئی لمبے فاصلے موجود ہیں۔ اکثر احباب کو مجھ سے یہ شکایت بھی رہی ہے۔ مگر دوستوں کی پرخلوص شکایات اور جذبۂ ہمدردی سے زیادہ مجھے اپنا ذہنی سفر اور تخلیقی عمل عزیز رہا ہے کہ میرے پاس احباب کے لیے یہی بہترین سوغات ہے۔"

آج ہم دیوانگی، جوشِ عمل، اور تحریر و تخلیل کی سوغات لیے
شہروں شہروں اپنے نوجوان مرگ شاعر کے لیے مست ماتم کیا
ہوئے ہیں۔

زرد چہرے، ڈوبے ہوئے گیت، ترو تازہ غزلیں
ہم فقیروں کی یہ سوغات ہے شہروں شہروں
یاد اک ساتھ لیے پھرتی ہے بستی بستی
اپنے ہاتھوں میں کوئی پاس ہے شہروں شہروں

ساغر معاشی ضروریات کے تحت مشاعروں میں بھی شرکت کرتا تھا جس سے اس کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا تھا۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں ملک کے طول و عرض کے بیشتر مشاعروں میں شرکت کی تھی لیکن وہ حقیقت سے بھی اچھی طرح آشنا تھا —

"مشاعرہ اب صرف ایک ہلکی موسیقی کے پروگرام سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میں نے خود کئی حضرات کو صرف مشاعروں کے لیے ترنم کی بہت چلتی ہوئی دھنیں تیار کیں اور مشاعروں سے کئی شعرا بن کے لوٹا۔"

مزاج کا یہی تیکھا پن اکثر تحریروں میں بھی جھلکتا ہے ایک خط میں مجھے لکھتا ہے۔

"ہاں میاں — یہودی، ہنگامہ، ادبی چوپال، آئیں بائیں شائیں، ڈومنی، ۲۳ ر جون، اچھا خاصا آغا حشر مارکہ ڈرامہ ہے۔ صرف چونکانے کی کوشش ..."

ساغر کی سحر انگیز شخصیت میں ایک فلسفی چھپا ہوا تھا جس نے زندگی کے حقائق کو جا بجا بے نقاب کیا ہے —

"ہر سچ کی بنیاد میں جھوٹ کا خمیر شامل ہے۔ جھوٹ سے ہم نے اتنے سمجھوتے کر رکھے ہیں کہ سچ ایک سماجی برائی بن کر رہ گیا ہے اور کئی سچائیاں ایسی ٹوٹ کر گری ہیں کہ جھوٹ بھی شرمندہ ہے۔"

ساغر کے کلام کی پہلی خصوصیت عصری آگہی ہے :-

"میں نے جس عہد میں آنکھیں کھولی ہیں وہ سخت ٹوٹ پھوٹ تبدیلی، انتشار اور بے یقینی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ نارسائی کا احساس

تنہائی، شکست [illegible] عہد کا المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی جس سے [illegible] کی شراب بھی کشید کی اور زخموں کے گلاب بھی کھلائے۔ ان گلابوں کی مہک سے اردو کے شعری سرمایہ میں اضافہ ہوا ہے۔ ع

جلتے ہوئے مکان کی کھڑکی سے جھانک کر
دیکھا تو وہ بھی شہر کے بلوائیوں میں تھا
دیوار و در سے جھانک رہی تھیں نحوستیں
آسیب کس [illegible] کا یہ انگنائیوں میں تھا

[illegible] سے [illegible] کے ہم [illegible]
تہذیب کی وہ [illegible] کتابیں [illegible]
جو وقت کہہ رہا تھا وہ پڑھنے کی چیز تھا
کاغذ پہ یوں تو لاکھ کتابیں لکھی گئیں

کل کتب خانوں کی ہم لوگ بھی زینت ہوں گے
ہر حقیقت کے مقدر میں فسانہ ہے یہاں
ہر طرف سوچ میں [illegible]
جیسے ہر چار طرف آئینہ خانہ ہے یہاں

کر رہا ہے جو رقم وقت وہ محسوس کرو
آسمانوں سے صحیفہ تو اترنے کا نہیں
لب جو بیٹھ کے کیا سوچ رہے ہو ساغر
بہتے پانی پہ کوئی نقش ابھرنے کا نہیں

ساغر کے کلام کی دوسری خصوصیت اس کی امیجری ہے۔ اس کی تشبیہوں، استعاروں اور لفظی پیکروں کی یہ دنیا انتہائی حسین و جمیل ہے۔ ع

نہ پتیاں ہیں نہ کلیاں نہ پھول پھر بھی بچھاؤں تو دیکھا
سنا ہے میں نے کہ غم کا شجر اکیلا ہے

جبیں پہ چاند کو ہاتھوں سے ڈھک کے بیٹھا تھا
بینا پہ ایک شکستہ مکان خالی تھا

بچھڑے ہیں جو لگے ہے کہ معمول ہے اپنا
بیٹھے ہوئے دیکھیں تو پرندوں کو اڑا دیں

ہماری آنکھ بھی میلی تھی وہ بھی تھا خاموش
ندی کے دونوں کناروں پہ جاگ ایسا تھا
اداس شام کی باہوں میں ڈوبتا سورج
ہمارا جاگ تمہارا سہاگ ایسا تھا
گھٹا پہ موقع پرستی کی چھا گیا کوئی
ہمارے دور کے رشیوں کا تیاگ ایسا تھا

مطلع صبح پہ چھائی ہے سیاہی کیسی
شہر زدہ رہ کے یہ لیتا ہے جماہی کیسی
مدتیں گذریں وہ گھر چھوڑ چکا ہے پھر بھی
ان دریچوں میں ہے بیتاب نگاہی کیسی
کتنی محدود تھیں مظلوم سروں کی فصلیں
قتل گاہیں تھیں مگر لامتناہی کیسی

ساغر کے کلام کی تیسری خصوصیت ندرت و شگفتگی ہے۔ وہ ہندی اور انگریزی کے نازک اور رنگین الفاظ اس خوبصورتی سے استعمال کرتا ہے جیسے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا گیا ہو۔ ع

بیٹھا ہوں کب سے محفلِ غم ناشناس میں
خود اپنی حسرتوں کا لہو ہے گلاس میں
استادِ شاہ نے بھی بہت غور سے سنا
غالب پڑھا رہا تھا میں اردو کلاس میں

سب بجھ گئے چراغ تو شب کی فصیل پر
سر پیٹتی ہوئی یہ ہوائیں ملیں ہمیں

ہے بولنا درست مگر ہر جگہ نہیں
بچوں کو ڈانٹتی ہوئی مائیں ملیں ہمیں
جلتے ہوئے درخت کا ساتھی کوئی نہ تھا
لپٹی ہوئی شجر سے لتائیں ملیں ہمیں

ساغر کے کلام کی چوتھی خصوصیت اس کی تلمیحات ہیں۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے شاندار ورثے سے بخوبی واقف تھا۔ ع

آدرشوں کے رام کے ہاتھوں مرا نہیں
اچھاؤں کا راون، جیون بیت گیا

بنسی کی تھی صدا نہ کہیں کرشن کی چھٹا
گوکل میں چیختی ہوئی گائیں ملیں ہمیں

کتنے دل ٹوٹ چکے کتنے دھنش ٹوٹ چکے
فیصلہ کیا ہو کہ سیتا ہی سوئمبر میں نہیں

کسی کے جسم کی چھایا میں مون بیٹھا ہوں
مرے وجود کا گوتم خود اپنے دھیان میں ہے
ملا نہ تیشہ تو خود ہی چٹک کے ٹوٹ پڑی
بلا کا زور ابھرتی ہوئی چٹان میں ہے

ساغر کے کلام کی پانچویں خصوصیت طنز و مزاح کی چھوٹ ہے گو وہ یہ رنگ شاذ و نادر اختیار کرتا ہے۔ ع

تم اب کے خط میں یہ لفظوں کا سلسلہ رکھنا
ہر ایک لفظ کا مفہوم دوسرا رکھنا
تمہارے لب کی مہک [illegible] فاش کرے گی
لفافہ بھیجو نہ کرنا یونہی کھلا رکھنا
عجیب دورِ نمائش ہے کیا کہوں ساغر
مجھے محال ہوا گھر میں بوریا رکھنا

دلوں میں صدیوں کے فاصلے تھے ملن کی دو زلف کمان بھرتی
خدا ہے برتر خدا ہے واحد یہ گنگ لب اذان بھرتی

ساغر کے کلام کی چھٹی خصوصیت فقر و قناعت کے مضامین ہیں ؎

کرم کی بھیک نہ مانگی فقیر کی صورت
کلاہ کج رہی اپنی بھی میر کی صورت

رہن کرتے جاکے ہم اپنا ضمیر خواہش جام و سبو ایسی دکھی
شعلۂ رخ سے بجھی آنکھوں کی پیاس آگ میں پانی کی خو ایسی نہ تھی

ساغر کے کلام میں جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے احساس ہوتا ہے کہ جیسے اسے اپنی ناوقت موت کا یقین ہو چلا تھا ؎

نہیں حسین مگر حریت حق تو زندہ ہے
مرا خیال بھی اے دشت کربلا رکھنا
کل ہر اک حرف بتائے گا حقیقت اپنی
آج تم نقش بہ دیوار بنا دو ہم کو
ہوائیں لے گئیں آخر اڑا کے خاک مری
زمین تنگ سہی آسمان خالی تھا
سفینہ ڈوب چکا تھا کھلی جو آنکھ مری
بھنور میں جلتا ہوا بادبان خالی تھا
مر چکے ہم جو کئی بار تو دنیا نے کہا
اتفاقات ہیں یہ تو ابھی مرنے کا نہیں
جل بجھے دامن فانوس تن من پھونک جائے
تو چراغوں کی مگر کوئی کترنے کا نہیں

موت سے دو ماہ قبل اسپتال میں غزل کہی تھی ؎

اس کارگاہ شیشہ گراں سے نکل چلیں
آ، اے دل شکستہ یہاں سے نکل چلیں
اب جی یہ چاہتا ہے یہاں سے نکل چلیں
اندیشہ ہائے سود و زیاں سے نکل چلیں
آنکھیں ترس رہی ہیں کھلے آسمان کو
اب قید و بند چارہ گراں سے نکل چلیں

۱۷ دسمبر ۱۹۸۰ء کی شب میں اپنے مکان پر طرحی بزم مسالمہ کی نشست میں سلام پڑھتے ہوئے جب وہ اس مصرعہ پر پہونچا ؎

صداقتوں کا امیں موت کے دیار میں ہے

تو شدید قلبی دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور قید و بند چارہ گراں سے نکل چلنے کی حسرت پوری ہو گئی۔

انتقال کے وقت میں بمبئی میں تھا — !

واپس لکھنؤ آیا تو ہر شخص یہی کہہ رہا تھا — ساغر مر گیا میں دل ہی دل میں سوچتا — جھوٹ ہے — یہ جھوٹ ہے — ایسا نہیں ہو سکتا — !

اور اب مسلسل دو سال تک خود کو دھوکا دینے کے بعد میں نے بچاؤ کے سامنے ہتھیار پھینک دیے ہیں ؎

داغ ہے تاباں علیہ الرحمۃ کا چھاتی پر تیر
ہو نجات اس کو بیچارہ ہم سے بھی تھا آشنا

ساغر نہیں رہا — لیکن اس کی آواز کی "گونج" میں اب بھی سن رہا ہوں ؎

گم ہوا جاتا ہے آفاق میں
دھیرے دھیرے
میرا نغمہ
مرے لہجہ کا مقدس انداز
بازگشت اس کی مگر
اب بھی ہے قید
سماعت کے حسین زنداں میں !

ادھر کئی سال سے اس کی بس ایک ہی رٹ تھی — بہرائچ آؤ — کبھی بہرائچ آؤ — اس کی جیسے آخری تمنا یہی تھی !

اور اب میری تمنا ہے کہ اس کے مزار پر حاضری دے کر کہوں "ساغر — میں آگیا !"

★

حرمت الاکرام
رام باغ، مرزاپور، یوپی

شعلوں کا درپن

یہ نہ پوچھو کہ مرا آگ سے رشتہ کیا ہے ؟
میں نہ زرتشت نہ لذت کشِ ذوقِ نمرود
پھر یہاں کوئی شرارہ ہو تو جل اٹھتا ہوں
جانے کس شمع کی لو سینۂ ویراں میں ہے آسودۂ خواب
منصبِ دیدہ وری نورفشاں رکھتا ہے
یہ نہ پوچھو کہ مرا آگ سے رشتہ کیا ہے ؟
آگ اوروں کو جلا دیتی ہے لیکن مجھے دیتی ہے جِلا
یہ ہے صیقل مرے آئینے کا
گرد جل جاتی ہے — میں اور دمک اٹھتا ہوں
تابِ معنی نے افق تاب بنا رکھا ہے
یہ نہ پوچھو کہ مرا آگ سے رشتہ کیا ہے؟
کھلتا ہے شعلوں کے درپن میں سراپا میرا
سوزِ انفاس نے ہیولیٰ سا کیا ہے روشن
مجھے قندیلوں کا مینار بنا ڈالا ہے
یہ نہ پوچھو کہ مرا آگ سے رشتہ کیا ہے ؟
آگ کا راگ ہے سامانِ تفاخرِ شبستاں میرا
کتنے فانوسوں کی تانیں لئے جاگ اٹھا ہے
تپش اندوزِ ازل ہوں کہ یہ ہے جشنِ چراغاں میرا
فرق تا پا شجرِ خشک کی مانند سلگتا ہے بدن
ذہن کی جوت — تخئیل کی حرارت کے لئے

کوئی موسم — کوئی عالم ہو مجھے جلنا ہے
یہ نہ پوچھو کہ مرا آگ سے رشتہ کیا ہے ؟

کاظم علی خاں
لکچرر شعبۂ اردو
شیعہ کالج لکھنؤ

آغا حجو شرف کا غیر متداول کلام

خواجہ حیدر علی آتش کے صاحب دیوان شاگرد آغا حجو شرف کا دیوان پہلی بار ۲۰ مارچ ۱۸۹۶ء کو مطبع جعفری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ دیوان شرف کی تقریظ میں منشی فدا علی عیش نے لکھا ہے:

"..... شرف مرحوم کے زمانۂ وفات سے اب تک یہ دیوانِ بلاغت بنیان زاویۂ خمول و دیرانۂ گمنامی میں گنج آسا پنہاں پڑا رہا کسی کو اشاعت کا خیال نہ آیا ....." [دیوان شرف ص ۳۶۵]

فدا علی عیش کے اس بیان سے انکشاف ہوتا ہے کہ آغا حجو شرف کا دیوان شرف کی زندگی میں نہ چھپ سکا تھا اور یہ شرف کی وفات کے برسوں بعد شائع ہوا تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس دیوان میں شرف کا تمام و کمال کلام شامل نہ ہو سکا۔ مجھے آغا حجو شرف کا کچھ ایسا غیر متداول کلام دست یاب ہوا ہے جو دیوانِ شرف طبع اول میں شامل نہیں ہے۔ شرف کا یہ غیر متداول کلام درج ذیل ہے:

انکھڑیوں سے تری تشبیہ میں دوں دور از حال
روگ ہے نرگسِ گلزار کو بیماری کا

خوش معرکۂ زیبا طبع لکھنؤ ۱۹۰۱ء ص ۴۴۴ سے منقول آغا حجو شرف کا یہ غیر متداول شعر دیوانِ شرف ص ۱۴ کی غزل نمبر ۱ پر اضافہ ہے۔

(۲) (۳)

مسیحا تجربہ مردوں پہ کرے اپنی حکمت کا — نہیں ہوگا مداوا تجھ سے بیمارِ محبت کا
حق و ناحق کبھی اس عاشق پہ کرتے ہو ستم جس کو
دو نیرنگی کا دعویٰ ہے دکھ بیل پہ حمایت کا

شرف کے یہ دونوں غیر متداول اشعار خوش معرکۂ زیبا ص ص ۴۴۴ نیز ۴۴۵ سے ہی ماخوذ ہیں اور ان دونوں اشعار سے دیوانِ شرف ص ص ۵۴ تا ۵۵ کی غزل نمبر ۹، خالی ہے۔

(۴) (۵)

ملتیں نہ خاک میں جو پری زاد صورتیں
نشو و نما گلوں کا یہ ہوتا زمیں سے کب
انگشتریِ مہرِ سلیماں کو دی تو ہے
نام اس کا اب مٹائیے گا اس زمیں سے کب

اس زمین میں دیوانِ شرف میں غزل تو موجود ہے مگر اس غزل میں یہ دونوں اشعار موجود نہیں [دیوانِ شرف میں ۸۶ کی غزل نمبر ۱۱۶ ملاحظہ ہو۔] شرف کے یہ دونوں غیر متداول اشعار گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۸۹۰ء ص ۳ سے ملے ہیں۔ ان میں سے پہلے شعر کا مضمون شرف نے اپنی ایک مطبوعہ غزل کے اس شعر میں بھی پیش کیا ہے:

پری سی صورتیں تم جو نہ پیوند زمیں کرتے
گلوں کا خاک سے ہرگز نہ پھر نشو و نما ہوتا

یہ شعر دیوانِ شرف ص ۵۴ کی غزل نمبر ۶۵ میں موجود ہے۔ شرف کے دونوں ہم مضمون اشعار کا مضمون غالب کے اس شعر کی آوازِ بازگشت محسوس ہوتا ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(۶) (۷)

سوچتا ہوں جو سنا اُن کے لیے ہستی ہے
یہ بھی ہوتی ہے مرے لختِ جگر کی صورت
رنگ کیا رنگ ہے کیا حسن ہے اللہ اللہ
حوریں مشتاق ہیں ایسی ہے بشر کی صورت

گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۲۹ جنوری ۱۸۶۰ء ص ۳ میں شامل شرت کے یہ دونوں غیر متداول اشعار دیوانِ شرت مرص ۸۸ تا ۸۹ کی غزل نمبر ۱۲۰ میں موجود نہیں البتہ شرت کے منقولہ بالا دوسرے غیر متداول شعر کے ہم مضمون یہ شعر دیوانِ شرت ص ۸۹ میں ضرور مل جاتا ہے :

حسن کیا حسن ہے کیا نور ہے اللہ اللہ
غش کرے حور بھی دیکھے جو بشر کی صورت

(۸) (۹)

منزلِ دشت اکیلے طے کرنی ہے اے دیوانو
لڑکھڑا جاؤگے کھڑکاتے ہو زنجیر عبث
یاوری کرکے شبِ وصل میں ممتاز کیا
پاس سے کرتے تھے ہم شکوۂ تقدیر عبث

شرت کے یہ دونوں اشعار دیوانِ شرت ص ص ۹۲ تا ۹۳ کی غزل نمبر ۱۲۵ پر اضافہ ثابت ہوتے ہیں اور یہ مجھے گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء ص ۲ سے دستیاب ہوئے ہیں۔

(۱۰) (۱۱)

یاں درد مند صدمے اٹھانے کا ہے مزہ
گھبرائیں غم سے یہ نہ کرے احتمال رنج
مرنا ہمیں قبول ہے اس سے ملیں گے ہم
چھڑوا دے یار سے یہ فرحی کیا مجال رنج

گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۶ مئی ۱۸۶۰ء ص ۲ سے منقول شرت کے ان دونوں غیر متداول اشعار سے دیوانِ شرت ص ۹۵ کی غزل نمبر ۱۲۸ محروم ملتی ہے۔

(۱۲)

کیا میرا حال ہوگا حسینوں کی بزم میں
اک ناز میں پہ آتا ہے رہ رہ کے پیار کچ

دیوانِ شرت ص ص ۹۴ تا ۹۵ کی غزل نمبر ۱۲۷ پر شرت کا یہ غیر متداول شعر بھی اضافہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ شعر گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۸۶۰ء ص ۲ سے منقول ہے۔

الٰہی قہر تیرا اس خزاں پہ ہو نازل
ملادی خاک میں نسرین نسترن کی بہا

گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۸۶۰ء کے ضمیمے سے منقول شرت کے اس غیر متداول شعر سے دیوانِ شرت ص ص ۱۱۰ تا ۱۱۱ کی غزل نمبر ۱۴۹ خالی ہے۔

(۱۴) (۱۵)

کس نے یہ اس ستم کا اک شے دیا تھا چرکا
روزِ ازل سے میرا دل ہے فگار اب تک
یہ وجہ ہے جو مرکر آنکھیں کھلی ہوئی ہیں
دیدار کی تمنا باقی ہے یار اب تک

دیوانِ شرت ص ص ۱۳۹ تا ۱۴۰ کی غزل نمبر ۱۸۲ شرت کے ان دونوں غیر متداول اشعار سے خالی ہے جو گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۱۰ فروری ۱۸۶۱ء ص ۲ سے نقل کیے گئے ہیں۔

(۱۶)

مر گئے تیرا دہن تنگ دیکھ کر دل ہم سے تنگ تنگ ہوئے اپنی جان سے ہم

خوف مرکز دنیا ص ۲۴ سے منقول شرت کا یہ غیر متداول شعر دیوانِ شرت ص ص ۱۴۷ تا ۱۴۸ کی غزل نمبر ۱۹۰ میں موجود نہیں۔

(۱۷) تا (۱۹)

(۱۷) خطائے عشق پہ آتا ستم نہ ڈھا جاتا
معاف ہو متحمل نہیں ہوا جاتا

(۱۸) تمہارے تشنۂ دیدار کی یہ حالت ہے
کہ ملے کے پانی بھی اب! تو نہیں پیا جاتا

(۱۹) شہید ناز کی پھر قدر و منزلت ہوتی
برائے دفن جنازہ جو کربلا جاتا

آغا حجو شرف کے یہ تینوں غیر متداول اشعار دیوانِ شرف ص ۱۹ کی غزل نمبر ۲۵ پر اضافہ ہیں۔ یہ اشعار دیوانِ شرف کے ایک قلمی نسخے میں ہیں جو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں موجود ہے [بحوالہ تذکرۂ مخطوطات ادارہ ادبیاتِ اردو (جلد پنجم) مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدرآباد طبع ۱۹۵۹ء ص ۲۱۳]

(۲۰)

گلہ کیتے ہیں شہرہ ہے جہاں میں لن ترانی کا
ہوا ہے یار کو شاید غرور اپنی جوانی کا

شرف کا یہ شعر دیوانِ شرف طبع ۱۸۹۶ء کی ص ۱۹ تا ۲۰ کی غزل نمبر ۲۶ میں موجود نہیں۔ یہ شعر بھی شرف کے قلمی دیوان نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ [بحوالہ تذکرہ مخطوطات جلد پنجم ص ۲۱۳]

آغا حجو شرف کے غیر متداول ادبی آثار میں بعنوان شکوۂ فرنگ و افسانۂ لکھنؤ میں دو طویل اردو مثنویاں بھی ملی ہیں جن سے دیوان شرف خالی ہے۔ ان میں سے شکوۂ فرنگ تو لاہور سے شائع ہو چکی ہے لیکن مثنوی افسانہ لکھنؤ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ آغا حجو شرف کی اس غیر مطبوعہ مثنوی افسانۂ لکھنؤ کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

مثنوی افسانۂ لکھنؤ کے آغاز میں سولہ اشعار پر مشتمل حمد ہے۔ جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کرم چاہتا ہوں ترا، اے کریم
عنایت کر اے عفو را رحیم
کہ رزاق و خلاقِ عالم ہے تو
ہر اک شے میں موجود ہر دم ہے تو
فقط شانِ وحدت میں ہے تیری ذات
خود آماد خود موجد کائنات
دو عالم میں ہر سمت ہے تیرا نور
ہر شے سے ہے تیری قدرت ظہور
کیا خلق انسان کو خاک سے
نوازا اسے علم و ادراک سے
بدن میں جو یہ روح انساں کی ہے
یہ بو باس تیرے گلستاں کی ہے

(مثنوی افسانۂ لکھنؤ از آغا حجو شرف قلمی نسخہ مملوکہ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی ص ۱)

افسانۂ لکھنؤ میں شرف نے اپنے استاد آتش کو جگہ جگہ یاد کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں چند شعر نقل ہیں ؎

مزہ دل کو ہے ذوق بر عشق ہوں میں
ہمیشہ سے شاگرد آتش ہوں میں
وہ آتش جو تھے خواجہ حیدر علی
خدا بخشے ان کو، وہ تھے اک ولی
وہ فردوسیِ وقت سے تھے لاجواب
خدا نے کیا تھا انہیں انتخاب
ہمیشہ ہی اشعار وہ وہ کہے
جنھوں نے سنے وجد میں وہ رہے
وہ خوش گوئی کی فکر ان کو رہی
کہ افسوں ہوئی وہ غزل جو کہی

(ص ص ۶ تا ۷)

افسانۂ لکھنؤ میں شرف نے اپنے متعدد معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ شاگرد ناسخ مرزا محمد رضا برق کے بارے میں "افسانۂ لکھنؤ" سے چند شعر ملاحظہ ہوں: ؎

جو یہ فتح دولہ بہادر ہیں ساتھ
وفا سے نہ ہرگز اٹھائیں گے ہاتھ
یہ ایسے ہی رکن ابکار دل میں ہیں

کہ خدام کے جان نثاروں میں ہیں

. . . .

. . . .

بڑے شاگردوں میں یہ ہیں منتخب
تخلص ہے برق اور سنئے لقب

. . . .

. . . .

محمد رضا نام تھا مر گئے
وہ قلعہ میں جا کے قضا کر گئے

(صفحہ ۴۳۔۴۴)

" افسانۂ لکھنؤ " میں مرزا محمد رضا برق کے بڑے بھائی برزبرالدولہ مرزا آغا جان کا ذکر بھی موجود ہے : ۔

ہزبر برالدولہ ہے جن کا خطاب
وہ جرأت میں ہیں آغا جان انتخاب

وفا و اطاعت ہی میں مر گئے
رفاقت نہ چھوڑی قضا کر گئے

ہوئے ان کے فرزند چھر کامیاب
ملا ان کو آشفتہ دولہ خطاب (ص ۴۴، ۴۵)

افسانۂ لکھنؤ میں مرزا محمد رضا برق کے چھوٹے بھائی مہتمم الدولہ مرزا جعفر خاں بہادر کا ذکر بھی موجود ہے ۔
(ص ۴۵ تا ۴۶)

افسانۂ لکھنؤ (ص ۱۳۵ تا ۱۳۶) شرف نے اپنے ایک شاگرد نواب بہادر کا بھی ذکر کیا ہے : ۔

لکھیں لفظ " نواب " اہل قلم " بہادر " کریں پھر برابر رقم
ہویدا ہو نام ایک سردار کا سنو سال اب ان کی سرکار کا
رہے ہیں یہ سردار مسند نشیں زمانے میں مشہور ہیں شمس دیں
زیارت کو تشریف یہ لے گئے محل میں زر و مال سب دے گئے

. . . .

یہ خوش فکر شاعر ہیں شستہ زباں
مصنف کے شاگرد ہیں خوش بیاں

شرف کے شاگرد نواب بہادر کے متعلق مزید معلومات کی ضرورت ہے۔ اس مثنوی میں شرف نے اپنے ہم زلف نواب باقر علی خاں کا بھی حال لکھا ہے۔ (ص ۱۴۳)

مثنوی افسانۂ لکھنؤ میں شرف نے اپنے دادا محمد حمید خاں مشہدی کے متعلق لکھا ہے : ۔

محمد حمید اور خاں مشہدی میں پوتا ہوں وہ تھے جد امجدی
نمودی نمائندے ایران کے یہ دہلی میں طالع تھے قرآن کے
وہ سنہ بارہ سو چند رہتے عیاں تو دہلی سے آئے اودھ میں یہاں
ہوئے بارہ سو پر جو چوبیس سال
تو اس لکھنؤ میں کیا انتقال (ص ۱۵۰)

ان اشعار سے انکشاف ہوتا ہے کہ شرف کے دادا محمد حمید خاں پہلے مشہد ایران کے باشندے تھے۔ حمید خاں دہلی میں آ گئے تھے اور پھر ۱۲۱۵ھ میں حمید خاں دہلی سے اودھ منتقل ہوئے۔ شرف کے دادا محمد حمید خاں نے ۱۲۲۴ھ میں بہ مقام لکھنؤ وفات پائی تھی۔ یہ تمام اطلاعات اسلاف شرف کے باب میں اہمیت سے خالی نہیں۔

افسانۂ لکھنؤ سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ آغا حجو شرف کے حقیقی نانا کلب علی خاں کے فرزند تھے۔ شرف کے نانا ۱۲۱۳ھ میں دہلی سے لکھنؤ آئے اور یہاں انھوں نے عقد کیا۔ شرف کے نانا کا سنہ وفات ۱۲۲۲ھ ہے۔ شرف کے نانا نواب قطب الملک کے پوتے تھے۔ اور ان کا نام غالباً نواب عبداللہ خاں تھا۔ شرف نے اپنے حقیقی دادا کے ایک بھائی فضل علی خاں کا بھی ذکر کیا ہے جو دہلی میں مقیم تھے۔ شرف کے والد سید محمد نے چھ ماہ کی علالت کے بعد لکھنؤ میں وفات پائی۔ سید محمد کی تاریخ وفات ۲۶ رجب ۱۲۷۹ھ تھی جو جمعہ ۱۹ دسمبر ۱۸۶۲ء کے مطابق ہے۔ (افسانۂ لکھنؤ ص ۱۵۸ تا ۱۶۲)

شرف کے بزرگوں کے متعلق یہ تمام معلومات حالات شرف پر اہم اضافہ ہے۔

★

نصر قریشی
۳۶۶ - بیٹیا بہادر گنج
الہ آباد - ۳

دیارِ گنگ و جمن - الہ آباد

صوفی، سنتوں کا شہر ہے یہ، بھگتی میں ڈوبی وادی ہے
یہ رام، رحیم کے متوالوں کی پیار بھری آبادی ہے
مندر میں بھجن، مسجد میں اذاں، ہر مذہب کو آزادی ہے
گنگا جمنا کے سنگم نے ہر دل کی دوری مٹا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

گردوارے شانتی کا مرکز، گرجے کے گجر میں مستی ہے
مندر کے کلس، مسجد کے میناروں میں ڈوبی ہر ہستی ہے
ہر دل ہے یہاں بھگوان کا گھر، ہر بستی خدا کی بستی ہے
نفرت کو مٹا کر الفت نے ہر دل میں جوت جگا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

شاعر، دانشور، مہاکوی، اس کی دھرتی پر بستے ہیں
پت جھڑ، ساون، ہر موسم میں افکار کے غنچے ہنستے ہیں
احساس بداماں، سب پہ کھلے اس شہر کے سارے رستے ہیں
گلیوں گلیوں میں پیار پلے، محلوں میں حسیں شہزادی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

اک علم کا مرکز، گیان کا گھر، یک جہتی کا یہ شوالا ہے
یاں پنت، فراق، مہادیوی، اکبر اور کوی نرالا ہے
اردو، ہندی کا میل یہاں، بچن کی یہاں مدھوشالا ہے
ہر ویرانہ گلزار یہاں، ہر سو اک جشنِ شادی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

سر تیج بہادر اردو ادب کے چہرے کی مسکان بنے
ٹنڈن جی ہندی بھاشا کو پھیلانے کا اعلان بنے
اس شہر کی عظمت و رفعت کی ہندو مسلم پہچان بنے
جب ملک کبھی خطرے میں پڑا، پھر جان کی بازی لگا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

آنند بھرا آنند بھون یادوں کے خزانے رکھتا ہے
یہ کمپنی باغ بھگت سنگھ کی ہمت کے فسانے رکھتا ہے
یہ وقت کا وہ سنگم ہے جو ملنے کے بہانے رکھتا ہے
اس شہر نے اپنی عظمت کی تاریخ پہ مہر لگا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

ہر دور میں رہبر بن کے اٹھا، یہ شہر سیاست دانوں کا
ہر راہ میں سر دینے والے جانبازوں کا، دیوانوں کا
یہ نہرو، لال بہادر اور اندرا جیسے فرزانوں کا
اس شہر نے قربانی دے کر اس ملک کی شان بڑھا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

اس شہر میں غم کے مارے ہوئے گنگا کے کنارے آتے ہیں
امرت جیسا اس کا پانی، جیون ہی نیا سب پاتے ہیں
ذہن و دل کو اجلا کر کے ہر پاپ یہاں دھو جاتے ہیں
اپنے ہی گناہوں پر گریاں بھگوان کا ہر فریادی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

یہ صنعت و حرفت کے میدانوں میں آگے بڑھتا جائے
نہروں کے ساتھ رواں ہو کر کھیتوں کی قسمت چمکائے
مزدوروں اور کسانوں کے جیون میں خوشحالی لائے
اس شہر نے محنت سے سب کی سوئی تقدیر جگا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

گنگا جمنا کا یہ سنگم، اک پیار کا سنگم ہے دیکھو
قطرہ قطرہ دریا اس کا، شعلہ بھی شبنم ہے دیکھو
ہر کمبھ کے موسم میں اس کا کچھ اور ہی عالم ہے دیکھو
خوشبو میں بسی اس دھرتی پر بھگتوں نے بھیڑ لگا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

میں گنگ و جمن کا شاعر ہوں، اس شہر وفا کا گیت لکھوں
تہذیبوں کے سنگم پہ کھڑا، گنگا جمنا کا گیت لکھوں
نظروں سے چھپی تربینی کی بہتی دھارا کا گیت لکھوں
ہر موجِ رواں نے دنیا کو مکتی کی راہ دکھا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

اس شہر کے دل میں بہتی ہوئی، عظمت سے بھری گنگا کو سلام!
ہر موج میں جس کی آبِ شفا، الفت کی ردا جمنا کو سلام!!
نظروں سے پوشیدہ بہتی تربینی کی دھارا کو سلام!!
جن کی موجوں نے دنیا میں اک پیار کی گنگا بہا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

یہ شہر سدا آباد رہے، اس ملک کی بڑھتی شان رہے
ہر دل میں گیتا، رامائن، ہر سینے میں قرآن رہے
انسان پرستی کے جذبے میں ڈوبا ہر انسان رہے
اس شہر کے پیار کی گنگا نے ہر دل میں راہ بنا دی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے
یہ گنگ و جمن کی وادی ہے

غزل

عالم فتح پوری

یہ دَور ایک جہنم کدہ لگے ہے مجھے
ہر ایک لمحہ سلگتا ہوا لگے ہے مجھے

میری نظر میں ہے انجام خندۂ گل کا
کوئی ہنسے ہے تو روتا ہوا لگے ہے مجھے

بہت قریب تھے وہ مجھ سے دور تھے جب تک
وہ پاس آ گئے، تو فاصلہ لگے ہے مجھے

غموں نے شکل بدل دی ہے کس قدر میری
کہ آئینے میں کوئی دوسرا لگے ہے مجھے

سنا ہے چاند پہ رکھا ہے آدمی نے قدم
یہ شاہکار بھی اک حادثہ لگے ہے مجھے

شباب آپ کا بے مثل و بے نظیر سہی
مگر یہ خواب تو دیکھا ہوا لگے ہے مجھے

مصیبتوں نے عجب حال کر دیا میرا
مزاج پوچھنے والا بُرا لگے ہے مجھے

کرم کیے ہیں مرے دوستوں نے کچھ ایسے
کہ اپنے سایہ سے بھی خوف سا لگے ہے مجھے

خلوصِ بوم محبت گناہ ہے عالمؔ
کوئی یہ کان میں کہتا ہوا لگے ہے مجھے

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
قطب پور ڈالی گنج لکھنؤ

غزل

والے دنیا، تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
زندگی اپنی ہی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

"سانس کیا لیں! ہوا دہر کی زہریلی ہے"
آدمی زاد پہ مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

اب تو آنکھوں سے نکلتا نہیں آنسو بھی کوئی
بے بسی تھی مگر اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے کے خوابوں کی رسد کوئی جہاز آتا ہے
بھیڑ ورنہ لبِ ساحل، کبھی ایسی تو نہ تھی

اب دعاؤں پہ بھی ایمان اُٹھا جاتا ہے
بندگی کے لیے مشکل، کبھی ایسی تو نہ تھی

اے خدا کیسے کہیں تجھ سے کہ تیری رحمت
ہم گنہ گاروں سے غافل کبھی ایسی تو نہ تھی

آج وہ رندِ بلا نوش کہاں ہیں ساقی
سونی سونی تری محفل، کبھی ایسی تو نہ تھی

ہاشمی، ہر قدم اب ایک کڑی منزل ہے
دُور ورنہ کوئی منزل، کبھی ایسی تو نہ تھی

عرفان عباسی
۹۱، باغ منو، نیا گاؤں لکھنؤ

مظفر حسین خاموش غازی پوری

جانے کب ٹوٹ کے آجائے تمہارا خاموش
اپنی محفل کو اسی طرح سجائے رکھنا

۱۹۳۴ء ۱۹۸۱ء

خاموش ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور فضا میں نغمے بکھیر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔

میانہ قد، توانا جسم، سڈول بازو، متوازن اعضا، دلکش و دیدہ زیب خد و خال، پرکشش شخصیت، داڑھی مونچھ سے محروم، بشاش چہرہ، اس پر سنجیدگی، متانت اور معصومیت، چوڑی پیشانی، سر پر الٹے انگریزی تراش کے بال، ستواں ناک، شگفتہ دہانہ، بھینچے ہونٹ، گھنے بیضاوی ابرو، غلافی پپوٹے، روشن تابناک اور پرکار آنکھیں، خاموشی پسند، شخصیت پر تخلص کی چھاپ، جچا تلا شیریں انداز گفتگو، نرم خو، سادہ مزاج، سادہ لباس، کرتے پیجامہ میں ملبوس، ہونہار نوجوان شاعر، پر اثر کلام اور مخصوص ترنم سے دلوں کو گرمانے والا، مشاعروں کا مرد میدان، غیر معمولی مقبولیت کا مالک، مظفر حسین خاموش غازی پوری کی یہی پہچان ہے۔

اتر پردیش کے مردم خیز ضلع غازی پور کے متوسط الحال گھرانے میں ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی گھریلو تعلیم کا آغاز مسلم گھرانوں کے رواج کے مطابق قرآن مجید سے ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔ اس کے بعد غازی پور کی مشہور درس گاہ "چشمۂ رحمت" میں داخلہ لے کر فارسی، اردو اور عربی کی تعلیم حاصل کی اور وہیں معلم رہے پھر جامعہ اردو علی گڑھ کا نصاب پڑھ کر انٹرمیڈیٹ تک پہنچے اس کے بعد معاشی تگ و دو میں لگ گئے اور سلسلۂ تعلیم منقطع ہوگیا۔

شروع سے ہی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ شعری نشستوں اور مشاعروں میں بحیثیت سامع شرکت کرتے اور صاحبان کمال تک رسائی حاصل کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ خود بھی شعر موزوں کرنے لگے۔ مادر فطرت نے ذوق سخن کے ساتھ منفرد بے پناہ ترنم اور مسحور کن گلا بھی بخشا تھا۔ غور و فکر اور مشق نے شعر و فن کی ابتدائی منزلوں میں رہنمائی کی پھر وہ نظموں کو زیر و زبر کرنے لگے۔

خاموش کی شہرت نے وطن کی حدیں پار کر کے انھیں دور دراز بڑے مشاعروں تک پہنچایا اور وہ مشاعروں کے مرد میداں بن کر دماغوں میں رچ بس گئے۔

جذبات کو شعری جامہ پہنانے کی بھرپور صلاحیت رکھنے والے خاموش جملہ اصناف شاعری پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے کلام میں زور اور لہجہ میں معصومیت تھی۔ غزلوں میں جلوہ حسن، فلسفۂ عشق، سیاسی بصیرت، جدت و رومانیت، سادگی و رنگینی، تغزل کی پاکیزگی اور شگفتگی۔ نظموں میں حب وطن، جوش و خروش، عزم و حوصلہ، اخلاقی اقدار و انسانی [illegible] کے اچھے نمونے موجود ہیں۔

خاموش ساری زندگی خوش حالی و فارغ البالی سے محروم

اور معاشی مسائل سے نبرد آزما رہ کر گیسوئے اردو سنوارتے رہے حیات کے پیچ و خم طے کرتے ہوئے فضاؤں میں نغمات بکھیرتے رہنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، یہی ان کا مقصدِ حیات بن گیا تھا جس پر نہ فکرِ معاش حاوی ہو سکی نہ غمِ روزگار سدِ راہ بن سکا۔ وہ شاعری کو فن کی خدمت سمجھتے تھے اور یہ خدمت آخری سانس تک انجام دیتے رہے۔ انھوں نے اپنے تخلص کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں کے درمیان اپنا سفرِ حیات انتہائی خاموشی سے طے کرتے رہے۔ بلند بانگ دعووں سے انھوں نے اپنا دامن کبھی آلودہ نہیں کیا۔ اندر ہی اندر گھٹنے والا یہ حساس شاعر جلد ہی دنیا کی کشاکش سے اکتا گیا اور ۲۷ ستمبر ۱۹۸۱ء کو گلشنِ ہستی کی صرف ۷۴ بہاریں دیکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ سہ

دیر و کعبہ سے ابھی لوٹ کے میں آتا ہوں
بادہ خوارو مرے حصّے کی بچائے رکھنا

۲۸ ستمبر ۱۹۸۱ء بروز دوشنبہ تدفین غازی پور میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے اہلِ وطن نے اپنے شاعر کو خراجِ تحسین اس طرح پیش کیا کہ اس کے جنازے میں ادیبوں، شاعروں کے علاوہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اتنی کثیر تعداد میں شریک ہوئے کہ اس کی مثال شہر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کاش اس کی ادبی و جذباتی یادگاروں کا بھی کوئی پرسانِ حال"

نمونۂ کلام

نعت

میری بھی عرض سن لے اے عز و شان والے
کہتے ہیں لوگ تجھ کو کون و مکان والے

بھر دے کرم سے اپنے یہ کاسۂ گدائی
بیکس کی لاج رکھ لے رحمت کی شان والے

اے کارسازِ عالم طیبہ ہمیں بلا لے
کب سے ترس رہے ہیں ہندوستان والے

تیرا مزارِ اقدس زینت ہے اس زمیں کی
حیرت سے دیکھتے ہیں سب آسمان والے

کہتے رہیں گے ہم تو خاموش التجائیں
کب تک نہ ہیں سنیں گے دونوں جہان والے

غزل

ہم نغمۂ بہار سنائیں تو جرم ہے
سوئے ہوئے چمن کو جگائیں تو جرم ہے

وہ آشیاں میں آگ لگائیں تو کچھ نہیں
ہم آشیاں کی آگ بجھائیں تو جرم ہے

وہ جرم بھی کریں تو کوئی پوچھتا نہیں
ہم ان کے جرم کو بھی بتائیں تو جرم ہے

کانٹوں کو ہم گلے سے لگائیں تو کچھ نہیں
پھولوں سے اپنا باغ سجائیں تو جرم ہے

اندھیر ہے چمن میں اجالے کے واسطے
ہم اپنا آشیاں بھی جلائیں تو جرم ہے

ہم کو اگر وہ یاد نہ رکھیں تو باوفا
انکی طرح ہم ان کو بھلائیں تو جرم ہے

ساحل کے بھیس میں ہے تلاطم چھپا ہوا
دنیا کو ہم یہ راز بتائیں تو جرم ہے

آبروئے شبِ ہجراں کو بچائے رکھنا
شمع بجھ جائے گر، دل کو جلائے رکھنا

راز کھل جائے نہ ساقی کی تہی دستی کا
جام خالی سہی ہونٹوں سے لگائے رکھنا

ان سے ملنے میں بھی اشکوں کی ضرورت ہوگی
اس خوشی کے لیے کچھ اشک بچائے رکھنا

صرف صہبا سے نہ بجھے گی نہ میری تشنہ لبی
تھوڑی مستی بھی ان آنکھوں کی ملائے رکھنا

غیرتِ دل کا تقاضہ ہے کہ رودادِ وفا
سب سے کہہ دینا مگر ان سے چھپائے رکھنا

دیر و کعبہ سے ابھی لوٹ کے میں آتا ہوں
بادہ خوارو مرے حصّے کی بچائے رکھنا

جانے کب لوٹ کے آ جائے تمھارا خاموش
اپنی محفل کو اسی طرح سجائے رکھنا

قطعۂ انتقال سے

کون کون سنوار کے، چمن چمن نکھار کے
گزر نہ جائیں پھر کہیں یہ قافلے بہار کے

گلوں کو چھیڑ چھیڑ کر لطافتوں کو چوم لوں
محبتوں کی سیج پر میں بے خودی میں جھوم لوں

یہ رنگ و بو یہ نکہتیں　　یہ زندگی کا بانکپن
یہ دھڑکنوں کے ساز پر　　یہ نغمگی کا بانکپن
اڑا نہ لے کہیں خزاں　　کلی کلی کا بانکپن

کلی کلی کی انکھڑیوں میں رات کا خمار ہے
تمہارا انتظار ہے

نظر سے پھر نظر ملے تو میں نئی غزل کہوں　　حسین ہم سفر ملے تو میں نئی غزل کہوں
گزر گئی جو فصل گل تو لوٹ کر نہ آئے گی　　اگر برس کے کھل گئی تو پھر گھٹا نہ چھائے گی

لبوں کی وہ تراوشیں　　نہ وہ صباحت نظر
نہ کوئی شہر آرزو　　نہ کوئی جنت نظر
وہ جلوہ ہائے رنگ رنگ　　اور حسرت نظر

صبا کی یہ سبک روی مزاج گل پہ بار ہے
تمہارا انتظار ہے

سبک سبک مراحی خیال کے یہ میکدے　　شفق کی حسن کاریاں جمال کے یہ میکدے
نشاط و انبساط کا ہزار اہتمام ہے　　شراب کم نہیں مگر سرور نا تمام ہے

اڑا کے رنگ پیرہن　　صنم کدہ سنوار لوں
بساط حسن و عشق پر　　میں کہکشاں اتار لوں
جو کھو گئی ہے چاندنی　　ذرا اسے پکار لوں

ابھی یہ والہانہ پن جنوں کو ناگوار ہے
تمہارا انتظار ہے

نظم:۔

"وقت آیا ہے کہ تاریخ کو پھر دہرادو"

ورغلہ زادوں کی طرف چین سے آنے والے
گولیوں اور دھماکوں سے ڈرانے والے
امن کا تاج محل جنگ سے ڈھانے والے
آگیا ہے تو ذرا گردش ایام بھی دیکھ
ہم کو چھیڑا ہے تو پھر چھیڑ کا انجام بھی دیکھ

جانتے ہیں تیری ناپاک تمنا کیا ہے
حوصلہ تو نے ہمارا ابھی دیکھا کیا ہے
ہم بھی کمزور نہیں ہیں ہمیں سمجھا کیا ہے

دوستوں کے لیے مخلص ہیں وفادار ہیں ہم
اور دشمن کے لیے قہر کی تلوار ہیں ہم

ہم ترے عزم کی بنیاد ہلا سکتے ہیں
تیرے گلشن ترے خرمن کو جلا سکتے ہیں
تجھ کو ہم صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں

ہم نے اب جان لڑانے کی قسم کھائی ہے
تیری شامت تجھے لداخ میں لے آئی ہے

تیری تحریک کو ناکام بنادیں تو سہی
خاک میں تیرے ارادوں کو ملادیں تو سہی
سر اٹھاتے ہوئے فتنے کو دبا دیں تو سہی

حق کے آگے تیری تنظیم کی قوت کیا ہے
رام کے سامنے راون کی حقیقت کیا ہے

عظمت تاج و اجنتا کے نگہبان ہیں ہم
نہ ہلے جو کسی طاقت سے وہ چٹان ہیں ہم
نہ الجھ ہم سے کہ ٹھہرا ہوا طوفان ہیں ہم

جو کبھی طوفاں سے الجھتا ہے کچل جاتا ہے
جو بھی چٹان سے لڑتا ہے مسل جاتا ہے

تو بھی ٹکرائے گا ہم سے تو مسل جائے گا
جنگ کی آگ سے کھیلے گا تو جل جائے گا
سارا کس بل تری فوجوں کا نکل جائے گا

دیکھ لیں گے یہ تماشا بھی زمانے والے
کیا لڑیں گے بھلا افیون کے کھانے والے

تیغ ہندی کی بلا خیز روانی کی قسم
چندر گپت اور اشوکا کی نشانی کی قسم
ٹیپو سلطان کی اور جھانسی کی رانی کی قسم
تجھ کو گلشن کی کوئی شاخ نہیں دے سکتے

جان دے سکتے ہیں لداخ نہیں دے سکتے

نوجوانو! اٹھو حیا بنا نہ بنو دکھلا دو
وقت آیا ہے کہ تاریخ کو پھر دہرا دو
دشمن امن کو تم خون میں یوں نہلا دو
زندہ بچ جائے تو ہر فرد وطن کو ترسے
اور مر جائے تو ہر لاش کفن کو ترسے

قطعات

در و دیوار سے گلچیں چمن کے صدا آتی ہے
قافلہ گم ہے مگر بانگ درا آتی ہے
سامنے سے کوئی گذرا تھا زمانہ گزرا
آج تک دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

اٹھے یہ زلف پریشاں دیکھ کر
میں چھلکتا جام کیسے چھوڑ دوں
یا تو اس کالی گھٹا کو روک دو
یا اجازت دو کہ توبہ توڑ دوں

ہرائی ہوئی زلف کا انداز نہ پوچھ
برہم بھی یہ ہوتی ہے تو برہم نہیں ہوتی
ساقی تری آنکھوں کی یہ صہبا بھی عجب ہے
ہر روز چھلکتی ہے مگر کم نہیں ہوتی

★

خلیق الزماں سحر
دلساگر وارڈ
سیونی۔ ایم پی

اقبال

دے کے گنجینۂ معنی کا سراغ
حق نے بخشا تجھے آگاہ دماغ
جن پہ سایہ بھی خزاں کا نہ پڑے
وہ لگائے ہیں مضامین کے باغ
تونے ہر ذہن کیا ہے روشن
تونے ہر دل میں جلائے ہیں چراغ
خیرہ ہوتی ہے تفکر کی نظر
گویا اشعار کے روشن ہیں چراغ
آگہی تیرے تفکر پہ نثار
کیوں نہ تشریح پہ حیراں ہوں دماغ
نہ کرے تجھ سے تقابل کوئی
نہ جلے سامنے سورج کے چراغ

غزل

احتشام مرزا تنہا
۲۴۴ ۹/۹۲، اصطبل بیبی گنج لکھنؤ

ہم ترک وفا رکھیں تم شوق جفا رکھنا
ہم اس کو روا رکھیں تم اس کو روا رکھنا

سیکھا یہ چلن کیسا اے جانِ غزل تونے
اپنوں کو بھلا دینا غیروں کا پتا رکھنا

نہ جانے کب آ جائے ملنا کوئی نظروں کا
میخانہ کھلا رکھنا پیمانہ بھرا رکھنا

دنیا کو بھلانا ہے غم اور بڑھانا ہے
ساقی میری خاطر بھی تھوڑی سی بچا رکھنا

محبوب کے کوچے سے ہو جب بھی گزر تیرا
آہستہ قدم اپنا اے بادِ صبا رکھنا

غزلیں

انجم عرفانی
شعبۂ اردو ایم ایل کے پی جی کالج
بلرام پور

جو سربلند چلے ہو تو سربلند آنا
سفر سے لوٹ کے آنا تو فتح مند آنا

یہ نارسائی ہے یہ اپنی کم نصیبی ہے
کہ سنگ باری کے موسم میں زخم چند آنا

اے جو ہو تو ہو اس کی نہیں خبر ہم کو
کہ ہو چکا ہے صحیفوں کا اب تو بند آنا

نہ یہ کسی نئے طوفاں کا پیش خیمہ ہو
عقابِ تازہ فضا کا تہہِ کمند آنا

ہے آزمائشِ نگہیں میں مبتلا سقراط
یہ اس کے سامنے طشتِ نبات و قند آنا

یہ فالِ نیک ہے یہ ہے دلیلِ خوش بختی
رہِ وفا میں دل و جاں پہ کچھ گزند آنا

وہ پھر بھی دہشت ہی رہتا اگر نہ وہ آتا
دمِ اخیر ستم ہے برائے پند آنا

لباسِ زخم کی سج دھج بہت ہی خوب مگر
ہے شرطِ اول و آخر اسے پسند آنا

جو ہو سکے تو کبھی آخرایۂ دل میں
یہ کیا کہ دلّی و شیراز و تاشقند آنا

تو خود ہی دیکھ لے تجھے اپنی دلبری کی قسم
کہ بے سبب ہے مرے لب پہ زہر خند آنا

سبھی کو نقش بہ دیوار کر گیا انجم
ہمارا یوں سرِ مقتل بیک زقند آنا

ایم۔ اے کاوش
معرفت زبیر فاروقی
محلہ برگدا۔ سیتاپور

چمک رہی ہے یہ بجلی جو گلستاں کے قریب
پہنچ نہ جائے کہیں میرے آشیاں کے قریب

مری دعاؤں میں شاید ابھی اثر کم ہے
جو لوٹ آئی ہیں جا جا کے آسماں کے قریب

یقین ہے ہم کو قضا آ کے لوٹ جائے گی
جو آپ بیٹھے رہے یونہی نیم جاں کے قریب

تو اب بھی مجھ کو نہ پہچانے تو خطا ہے تری
بنا لیا ہے مکاں جب ترے مکاں کے قریب

فسانہ وامق و عذرا کا سن کے وہ بولے
یہ داستاں بھی ہے میری ہی داستاں کے قریب

یہ گمرہی بھی ترے کام آ گئی کاوش ہے
بھٹک بھٹک کے رہا اپنے کارواں کے قریب

غزلیں

ساغر وارثی
امین زئی
شاہجہانپور۔

گرمیٔ شدتِ احساس سے جلتے کیوں ہو
پاؤں ننگے ہیں تو پھر دھوپ میں چلتے کیوں ہو

خواب جھوٹے ہیں تو خوابوں سے بہلتے کیوں ہو
سبز کائی پہ جو چلتے ہو پھسلتے کیوں ہو

کیوں اسے اپنے خیالوں میں لیے پھرتے ہو
لمس کی آنچ سے ہر لمحہ پگھلتے کیوں ہو

وہ کبھی اپنا لگے ہے تو کبھی غیر تمہیں
اپنا اندازِ نظر روز بدلتے کیوں ہو

کس لیے بھیڑ میں کھو جانے کا ہے خوف تمہیں
اتنا ڈرتے ہو تو پھر گھر سے نکلتے کیوں ہو

لاکھ بے نطق سہی آتش لیکن ساغر
اپنے سینے کا ہر اک راز اگلتے کیوں ہو

ام ہانی
اقبال منزل
وزیر گنج، نزد سٹی اسٹیشن
لکھنؤ۔

آزمائش سے سب کو مفر چاہیے
پھر بھی ہنگامۂ خیر و شر چاہیے

غم کا بھی گاہے گاہے گزر چاہیے
زندگی پُر مسرت اگر چاہیے

ہیں تو گلہائے رنگیں چمن میں مگر
حظ اٹھانے کو ذوقِ نظر چاہیے

زندگی کی مسافت بڑی سخت ہے
اس سفر میں بھی اک ہمسفر چاہیے

شمعِ سوزاں کا افسانہ اب ختم ہے
اشکِ شبنم کو بزمِ سحر چاہیے

رہروِ راہِ ملکِ عدم! سوچ لے
ہر مسافر کو زادِ سفر چاہیے

ذہن میں ہو تصور، لبوں پر ہو نام
یہ ریاضت مگر عمر بھر چاہیے

ہو رسائی تو کیونکر درِ حسن تک
جذبۂ عشق کو بال و پر چاہیے

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: **نشانِ منزل**

مصنف: پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ قیمت: چالیس روپے

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹۔ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

پیشِ نظر کتاب پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے چودہ مضامین اور نو نشریات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے دو تین تو بہت مختصر ہیں (مثلاً ایک خط کا جواب جوش ملیح آبادی کی دو نظمیں، رام لعل کا فن خورشید احمد جامی) اور انہیں مضمونچے کہا جا سکتا ہے۔ بقیہ مضامین کی فہرست یہ ہے: حسرت موہانی اور اقبال۔ ہندستان کے تہذیبی عناصر اور اردو۔ جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ۔ ترقی پسند شاعری۔ فرحت کی رباعی۔ ارسنگھ منصور۔ جدید اردو شاعری۔ ہندستان میں اردو کا مسئلہ آزادی کے بعد۔ عالمی معیار اور اردو۔ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟ —— نشریات میں درج ذیل عنوانات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے: ——

ادب اور ادبی تخلیق۔ انشا پردازی۔ فکر اور جذبہ۔ اردو زبان اور اس کا صحیح استعمال۔ اردو شاعری میں جدید رجحانات۔ مخدوم کا فی البدیہ کلام۔ غالب اور اقبال۔ اقبال عالمی کانگریس۔ کچھ یادیں دوسرے فنکار کی۔

پروفیسر جگن ناتھ بحیثیت شاعر اور بحیثیت ماہر اقبالیات تو اردو دنیا میں عرصے سے معروف ہیں۔ لیکن پیشِ نظر مجموعہ مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ وہ ایک متوازن تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں اور ان کی رائیں بغیر کسی ملمع کے صحیح ادبی پس منظر پیش کرنے کے بعد قائم ہوتی ہیں۔ مثلاً اپنے مضامین "ترقی پسند شاعری" اور "جدید اردو شاعری" پر جن سنجیدہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور متوازن رائیں دی ہیں وہ قابلِ قدر بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ "فرحت کی رباعی" کی جو ادبی خوبیاں انھوں نے بیان کی ہیں اس سے ان کے گہرے مطالعے کے علاوہ یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ایسی اچھی مثنوی ہمارے ادب میں موجود تھی اور اس کی طرف ہمارے نقادانِ فن نے خواطر خواہ توجہ نہیں دی تھی۔ اسی طرح "جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ" بھی نہرو کی خدمات ادب کا ایک اچھا جائزہ ہے جس کو پیش کر کے پروفیسر آزاد صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ اردو داں عوام کو موقع دیا ہے کہ وہ نہرو کی عظیم شخصیت کے ادبی پہلو سے بھی متعارف ہو سکیں۔ اپنے مضمون "عالمی معیار اور اردو" میں اگرچہ پروفیسر آزاد نے حکیم الدین صاحب کے ان اعتراضات کا مدلل جواب دے دیا ہے جو انھوں نے کلامِ اقبال پر کیے تھے لیکن اردو میں کئی ایسی اور قد آور شخصیتیں ہیں جو عالمی ادب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ ان کے نام تو پروفیسر صاحب نے لیے ہیں مگر ان پر ذرا اور تفصیل سے لکھنا چاہیے تھا۔ مضمون "اقبال۔ صرف مسلمانوں کے شاعر؟" نہایت اچھا اور قابلِ قدر مضمون ہے اور آزاد صاحب نے بہت مدلل طریقے پر ثابت کر دیا ہے کہ اقبال صرف مسلمانوں کے نہیں، انسانیت کے شاعر تھے۔

اس مجموعہ مضامین میں ریڈیو سے نشر کیے گئے مضامین اگرچہ مختصر ہیں لیکن بہت کارآمد اور قابلِ مطالعہ ہیں اور ہر ادب کے طالب علم کی معلومات میں ان سے کچھ نہ کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال بحیثیت مجموعی نشانِ منزل ایک قابلِ قدر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس سے تنقیدی بصیرت مستفید ہو سکتی ہے۔ ✱✱

نام کتاب: **آنکھیں ترستیاں ہیں**

مصنف: پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ قیمت: چھتیس روپے

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

اس کتاب میں پروفیسر آزاد نے اپنے ان بائیس دوستوں، اُستادوں اور بزرگوں کے سوانحی خاکے پیش کیے ہیں جو اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کی فہرست یہ ہے: تاجور نجیب آبادی۔ صلاح الدین احمد۔ ابوالکلام آزاد۔ عبدالمجید سالک۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ مولوی عبدالحق۔ شیخ سر عبدالقادر۔ سروجنی نائیڈو۔ عبدالقادر سروری۔ مہندر ناتھ۔ سلیمان ادیب۔ عرش ملسیانی۔ محمد دین تاثیر۔ درگا پرشاد دھر۔ بنّے بھائی۔ کرشن چندر،

شاعری کے تار و پود ہیں۔ رومانی اور شخصی رنگوں سے تیار ہوئے ہیں جو وجود کی انفرادی سطح کی میراث ہیں ــــــ

میں ان خیالات کا اظہار اپنے نظریہ کی وضاحت کے سلسلے میں آپ کے سامنے کیا ہے جن کے بغیر میری بات نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو میں ان نشاطیہ عناصر کا ذکر کروں گا۔ جن کے سلسلے میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ ساحر بنیادی طور پر رومانی مزاج کا شاعر ہے اور یہی اس کا اصل شعری مزاج ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اس کی مشہور نظم پرچھائیاں کے دو شعر پیش کرتا ہوں: ؎

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسم نازنیں کی طرح

ان اشعار میں ایک بھرپور خوبصورت لہریا ماحول ہے جس میں حسنِ فطرت کو جسم نازنین کی لچک اور تابندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ساحر کی یہ پوری نظم پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ نشاطِ عشق سے بھرپور نشاطیہ کس طرح جنگ سے پیدا ہونے والے عذاب سے متاثر ہوتا ہے۔ جو ایک عصری حیثیت ہے۔ کہاں تو عشق و محبت کی مستی میں نہلائے ہوئے لمحات اور کہاں دھوئیں کے ہیبت و سیاہ بادلوں کی فضا۔

مگر ساحر ان دونوں کیفیتوں کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے کہ کہ اس عصری کرب کے ساتھ ساتھ نشاطیہ ساعتیں بھی سفر کرتی رہتی ہیں اور نظم اس بند پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ ؎

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیں بھی جل جائیں

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ سچا فن کار ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی شخصیت کے نہاں خانوں سے اس کا رشتہ قائم رہے۔ اور وہ عمل جو اس کی ذات کے اندرون میں مسلسل جاری ہے اس کا سلسلہ ختم نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اس کا یہ اندیشہ حق بجانب ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے باطنی رشتے ٹوٹ جائیں اور ہم زندگی کی تمام لذتوں سے محروم ہو جائیں۔

اپنے معاصرین میں ساحر ہی ایک شاعر تھا جس نے نظم کو ایک نئی ہیئت اور نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا۔ اس کا اسلوب بیان اتنا دل پذیر اور سحر آفریں تھا کہ وہ خصوصی طور پر نوجوانوں کا شاعر کہا جانے لگا

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ساحر ایک قنوطی شاعر ہے اور اور اس کی شاعری میں قنوطیت کی لہریں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات کسی حد تک صحیح ہو، لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس پر کسی قسم کا لیبل چسپاں کریں، ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس قنوطیت کا سرچشمہ کیا ہے۔ ساحر کے حالات زندگی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ساری عمر نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہا اگر یہ کہہ کر اس کے فن پاروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں غزل کی سحرت کیفیت اور رنگینی خیالی کا بھرپور لطف ساحر کی رومانی نظموں میں ملتا ہے۔ مثلاً اس کی مشہور نظم خودکشی سے پہلے کے یہ دو بند پیش کر کے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ پر ان بھرپور کیفیتوں کو واضح کر دوں جو اس کے فن پاروں کا خاصہ ہیں پہلا بند ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں بیان کے تسلسل کے ساتھ غزل کی کیفیت بھی موجود ہے۔

اف یہ بیدرد سیاہی یہ ہوا کے جھونکے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تاب نظر ہو کہ نہ ہو

پورے بند میں شب ہجراں کی تمام تر آہ و بکا یاں موجود ہیں۔ جو قدیم رنگ غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

شب ہجراں کی طوالت کا ذکر بھی ہے اور پھر محبوب کے دریچے کی طرف دیکھنے کی خواہش بھی ہے جس کی تمنا ہر عاشق کو ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو آخری لمحہ تصور کرتا ہے۔ پھر اس نظم کا وہ بند آتا ہے جس میں قنوطیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ؎

سرد ہوتی ہوئی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ
ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
کون پونچھے مری آنکھوں سے سلگتے آنسو
کون الجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے

یہ صحیح ہے کہ یہ بند یاس کی کیفیتوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے مگر میں نے جب جب ساحرؔ کی نظموں کا مطالعہ کیا ہے تو صرف یہی محسوس کیا ہے کہ اس کے مائل بہ قنوطیت ذہن سے نکلنے والے اشعار بھی نشاط و انبساط کے رنگوں کی پھواروں میں غسل کرتے ہیں۔ مثلاً اس کی نظم 'کبھی کبھی' کے یہ اشعار دیکھئے۔

عجب نہ تھا کہ میں بے گانۂ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن تیری نیم باز آنکھیں
انھیں حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں جو مجھے تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

ان اشعار میں یاس انگیزیت کے ساتھ ہی نشاطیہ رنگ بھی اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ قدم قدم پر موجود ہے اور یہی ساحرؔ کا اصل شعری مزاج ہے۔ وہ جب اپنے شعری عمل سے گزرتا ہے تو خواہ فضا کتنی ہی یاس انگیز کیوں نہ ہو ایک طلسمی ماحول کے زیر اثر اس کا نشاطیہ لہجہ الفاظ کو گرفت میں لیتا ہے جس سے اس کے مزاج کی شناخت ہوتی ہے۔

وہ غم زمانہ کی پرواہ کئے بغیر عشق کی تمام کیفیتوں، لذتوں اور حلاوتوں سے بہرہ مند ہوتا چاہتا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ساحرؔ کے شعری نگار خانے کی موجوالذکر تصویر کے شعلہ بار رنگوں پر کچھ گفتگو کی جائے۔ اس سلسلے میں میں اپنے اس خیال پر قائم ہوں کہ ساحرؔ بنیادی طور پر رومانی مزاج کا شاعر ہے۔ لیکن اس کے یہاں عصری تقاضوں کا احساس بھی ہے اور اس کرب سے آنکھیں ملانے کی کوشش بھی جو نہاں خانۂ ذات میں پل رہا ہے وہ اس معرکۂ بلا خیز میں بھی شریک ہوا ہے۔ جو حقوق انسانی کی پامالی اور طریقۂ حیات کے استحصال کے خلاف برپا ہے۔ یہاں وہ للکارتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور اس کی زبان پر یہ پیغام ہوتا ہے۔

آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

یا کہیں کہیں پر یہ لہجہ انتہائی باغیانہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً ؎

انسان الٹ رہا ہے رخ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمام فسوں پرورش کی خیر

کسی موڑ پر وہ اپنی گرجدار آواز کے ساتھ یوں نمودار ہوتا ہے:

رواں ہے قافلۂ ارتقائے انسانی
نظام آتش و آہن کا دل ہلائے ہوئے
بغاوتوں کے دہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جوان مشعلیں جلائے ہوئے
تمام ارض جہاں کھولتا سمندر ہے
تمام کوہ و بیاباں ہیں تلملائے ہوئے

ان اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ساحرؔ کے یہاں عصری کرب کی حیثیت کیا ہے اور وہ کون سی آگ ہے جو اس کے سینے میں روشن ہے۔ جنگ سے اس کی نفرت کا جذبہ اس قدر شدید ہے کہ اس سلسلے میں پوری ایک نظم تخلیق ہو گئی ہے جس کے دو مصرعے یوں ہیں ؎

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی

آگ اور خون آج بخشا ہے
بھوک اور احتیاج کل دے گی

کہیں پر وہ تمام فضاؤں کو اپنی زبان اور ذہن عطا کرتا ہے تب یہ اشعار وجود میں آتے ہیں۔ ؎

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے
خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکستِ تمنا وہی غمِ ایام
نگارِ زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا

پھر وہ حیات کے طویل ولا متناہی سفر کو یوں پیش کرتا ہے ؎

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریم شاہد رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہ گزر ختم ہو گئی لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

چونکہ مسافت کا منتہا نامعلوم ہے اس لیے نظم کے اختتامیہ بند میں وہ کہتا ہے۔

سفر نصیب رفیقو قدم بڑھائے چلو
پرانے راہ نما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوع صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے

اس بند کے تیسرے مصرعے میں ستاروں کی موت اور طلوع صبح اس بات کی علامت ہیں کہ سفر کی منزل قریب ہے نیز یہ خیال بھی ابھرتا ہے کہ شبوں کے راج دلاروں کی موت ان گمراہ کن نظریات کا خاتمہ ہے جو جنگ کو نسل انسانی پر مسلط کرتے ہیں۔

ساحر کی شاعری کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے کے بعد بھی اس نے اپنی شناخت اور امتیازی شان قائم رکھی اور اپنے باطن سے اس کا رشتہ ہمیشہ استوار رہا۔ اس نے اپنے نظریہ کے مطابق شاعری کو شخصیت کے اظہار سے الگ نہیں کیا۔ علاوہ ازیں ۴

منیر السحری صدیقی
معرفت آستانہ موہن
گلی بابا نازری۔ گوبر پورہ
بھوپال

غزل

تری بزم بزمِ تماشا نہیں ہے
یہاں کوئی نذرِ تمنا نہیں ہے
ابھی تو جنوں پر بھروسا نہیں ہے
ابھی پیرہن پارا پارا نہیں ہے
مجھے ناصحو تم سے شکوا نہیں ہے
وہ سمجھائے کیا، خود جو سمجھا نہیں ہے
سلامت رہے آپ کی بے نیازی
یہ طرزِ ستم ناز بیجا نہیں ہے
چمن میں تڑپتی ہے کیوں برق سوزاں
ابھی تو نشیمن بنایا نہیں ہے
جو پینے تو مشکل نہ پینے تو مشکل
کہ فریادِ غم کوئی نغما نہیں ہے
ابھی تک محبت میں کچھ خامیاں ہیں
ابھی دل نے تجھ کو پکارا نہیں ہے
خبر ہے تمہیں اے منیر اس کی کچھ بھی
غمِ دل کا کوئی مداوا نہیں ہے

۴۔ اگر اس نے کہیں ترقی پسند تحریک کی نام نہاد نعرے بازی کو جگہ دے بھی دی ہے تو اسے اس کے فن کا المیہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ فن کار اس ماحول سے بھی جڑا ہوتا جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ پھر بھی روحانی اور باطنی رشتہ کی سطح پر بھی اس کے وجود کی اساس ہوتی ہے۔

★

علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو سینٹ جانس کالج آگرہ

عبدالحلیم شرر اور منشی نولکشور

منشی نول کشور اور عبدالحلیم شرر کی عمر میں تقریباً پوری ایک نسل کا فرق تھا۔ ایک کی پیدائش ۱۸۳۲ء کی ہے اور دوسرے کی ۱۸۶۰ء کی۔ نول کشور کا شہرت یافتہ اخبار بھی شرر کی پیدائش سے تقریباً دو سال قبل شائع ہوا۔ شرر نے جس وقت ہوش سنبھالا اودھ اخبار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اردو کے تمام حلقوں میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور کیونکر نہ بناتا اس کے مالک و ناشر منشی نول کشور جو پیدا تو متھرا میں ہوئے لیکن ذہن کی تعمیر آگرہ میں ہوئی اور یہیں سے مضمون نویسی کا بھی آغاز ہوا۔ آگرہ سے ہی وہ لاہور گئے اور وہاں کے اخبار کوہ نور سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد وہ لکھنؤ آ گئے کیونکہ ان دنوں لکھنؤ تہذیب و ادب کا مرکز بن چکا تھا اور یہیں سے انھوں نے پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں اودھ اخبار کا اجرا کیا اور پھر اتنی تیزی سے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی جو اس عہد کے کسی اخبار کو نہ حاصل ہو سکی۔ گارساں دتاسی ستمبر ۱۸۶۸ء کے خطبہ میں لکھتا ہے "اردو کے سب اخباروں میں بہترین اخبار خیال کیا جاتا ہے"۔ اس عہد کے چوٹی کے شعرا و ادبا اس اخبار میں شائع ہونا باعث افتخار سمجھتے تھے، جب شرر نے قلم پکڑا سرشار کا فسانہ قسط وار شائع ہو کر عام قارئین کے دل و دماغ میں رچ بس چکا تھا۔ طلسم ہوش ربا، نور افشاں اور امیر حمزہ جیسی داستانیں اسی اخبار کے ذریعہ عوام تک پہنچی تھیں۔ غالب، انیس، دبیر، حاتم علی خاں مہر، ہرگوپال تفتہ، سرسید احمد خاں اور محسن الملک جیسے ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور ان کے سلسلے میں دیگر معلوماتی باتیں چھپا کرتی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر اودھ اخبار کا مطالعہ اس وقت کی اردو دنیا اور خصوصاً لکھنؤ کے اردو کے قارئین کا روز کا معمول بن چکا تھا — ایک طرف روز بروز اودھ اخبار کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دوسری طرف ابتدا ہی سے تاریخ اور صحافت کی طرف بڑھتا ہوا شرر کا دلچسپ اور نیرنگ ذہن — پھر ان کے کچھ ابتدائی حالات — پیدائش لکھنؤ میں، پرورش مٹیابرج کلکتہ میں، وہاں کا خوبصورت داستانی ماحول، [illegible] چیزوں کے علاوہ مذہب اور تاریخ کا شوق، [illegible] شادی۔ دلی کو روانگی اور پھر لکھنؤ کو واپسی ۷۶-۱۸۷۵ء کا زمانہ اور اودھ اخبار کی چوٹی پر پہنچی ہوئی مقبولیت۔ لکھنؤ میں شرر مولانا عبدالحی کی صحبت میں رہنے لگے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق کلکتہ سے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ خاکی قزلباش نے ایک مضمون میں لکھا ہے "کلکتہ کے دوران قیام ہی مولانا کو اخبارات کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور اودھ اخبار میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے" لکھنؤ میں منشی احمد علی کسمنڈوی سے بھی تعلقات قائم ہوئے اور پھر بڑھتے چلے گئے۔ وہ اکثر اخبارات وغیرہ میں مضامین بھیجا کرتے تھے۔ ان کی صحبت

میں شرر کے اس شوق کو اور حوصلہ ملا، شاعری بھی شروع کردی تخلص شرر رکھا۔ لیکن ان سب چیزوں سے پیٹ نہیں بھرا کرتا لہٰذا لکھنؤ واپس آتے ہی فکرِ معاش ہوئی اور ادھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ منشی عبدالحی نے منشی نولکشور سے رابطہ قائم کرنے کی رائے اور ساتھ ہی ایک سفارشی خط لکھ کر بھی دیا۔ خط لے کر شرر منشی جی کے پاس پہنچے۔ منشی جی ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار شخص تھے، پہلے سے واقف بھی تھے۔ گفتگو سے شرر کی ذہانت اور صلاحیت کا اندازہ لگا لیا۔ بڑی ایمانداری سے بولے۔ "صیغۂ تصحیح آپ کے لیے مناسب نہیں (جس کی سفارش مولوی صاحب نے کی تھی) اس میں رہ کر آپ کسی قسم کی ترقی نہ کرسکیں گے اگر ممکن ہو سکے تو اودھ اخبار میں مضامین لکھا کیجیے" [1] ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل لکھتے ہیں: "منشی نول کشور کی نگاہیں بڑی مردم شناس اور ان کی طبیعت بڑی وسیع المشرب اور نکتہ رس تھی جہاں کہیں جوہر قابل نظر آجاتا تھا وہ اس کا [illegible] کرتے تھے اور اپنے مطبع سے اس کو متعلق کرنے [illegible] تے تھے۔ شرر کی اودھ اخبار سے وابستگی اس کا ایک بین ثبوت"۔

اور اس طرح شرر اودھ اخبار سے وابستہ ہوگئے۔ اور جلد ہی سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ خاکی قزلباش نے اودھ اخبار میں ملازمت کا سن ۱۸۸۰ء لکھا ہے اور یہی تاریخ بعض دوسری جگہوں پر بھی ملتی ہے۔ شرر کی شادی ۱۸۷۹ء میں ہوئی اور شادی کے فوراً بعد وہ دہلی چلے گئے۔ ڈھائی سال کا عرصہ دہلی میں گزارا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۱۸۸۲ء کے کسی حصہ میں لکھنؤ واپس آئے۔ کچھ دن یہاں بھی مصروف رہے لہٰذا اودھ اخبار میں ملازمت کا سنہ ۱۸۸۳ء زیادہ قرین قیاس ہے۔ سر عبدالقادر سروری اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں

"IN 1883 SHARAR BEGUN HIS JOURNALISTIC CAREER BY MAKING LITERARY CONTRIBUTION TO THE COLUMS OF AVADH AKHBAR" کی

اودھ اخبار کی وابستگی نے شرر کے پوشیدہ جوہر نکھار دیے۔ منشی نول کشور سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو اس وقت وہ زیادہ آشنا نہ تھے۔ اس وقت شرر نے منشی جی سے کہا۔ آپ کوئی موضوع بتائیں میں اس پر مضمون لکھ کر پیش کرتا ہوں۔ منشی جی نے ایک سیاسی موضوع بتا دیا۔ مولانا شرر نے دوسرے ہی دن اودھ اخبار کے دو صفحوں کا ایک مضمون لکھ کر پیش کیا جسے منشی جی نے بہت پسند کیا۔ اب ان کے مضامین باقاعدہ اودھ اخبار میں شائع ہونے لگے جو زیادہ تر علمی، مذہبی اور فلسفیانہ مذاق کے ہوتے تھے۔ اسلوب میں اچھوتا پن ہونے کی وجہ سے ان کے مضامین بہت پسند کیے جاتے۔ چاروں طرف ان کے مضامین اور اسلوب نگارش کی دھاک پھیلنے لگی اور تمام ملک میں [illegible] مچ گئی۔ سر سید نے ان کے ایک مضمون [illegible] کی بہت تعریف کی اور اس مضمون سے خیالات لینے کی اجازت چاہی۔ منشی جی نے مولانا شرر سے دریافت کرکے انھیں اجازت دیدی۔ اس زمانے میں شرر نے مولانا عبدالباسط صاحب کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس کا نام محشر رکھا۔ اس کے مضامین کے سلسلے میں صاحب سیر المصنفین لکھتے ہیں:

"اس میں اول سے آخر تک کل مضامین مولانا ہی کے قلم کے ہوتے۔ محشر رنگینی اور شاعرانہ مذاق کا پرچہ تھا جس میں بہت سی نازک قسم کی خیال آرائیاں ہوتی تھیں۔ ایک زمانہ تک اس میں 'زمانہ کا جائزہ' کے عنوان سے ایک نرالے مضمون کا سلسلہ جاری رہا۔ اردو میں یہ نیا اور اچھوتا ڈھنگ

تھا۔ سب لوگوں نے عموماً انگریزی خوانوں نے اسے پسند کیا۔"[6]

دو سال کے بعد منشی نول کشور نے شرر کو خاص نامہ نگار بنا کر حیدر آباد بھیجا جس کی وجہ سے محشر بند ہو گیا۔ حیدر آباد میں خواجہ محسن الملک نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا اور ملازمت کی بھی پیش کش کی لیکن شرر نے اس کو خلاف وضعداری تصور کیا۔ اتفاق سے انھیں دنوں حیدر آباد کے مشہور اخبار ہزار داستان کے ایڈیٹر کو ایک سب ایڈیٹر کی ضرورت تھی ——— انھوں نے اس عہدے کے لیے شرر کو دعوت دی۔ شرر اس شرط پر راضی ہوئے کہ پہلے وہ لکھنؤ جائیں گے اور وہاں سے اودھ اخبار سے اپنا تعلق ختم کر کے اس ملازمت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اڈیٹر نے ان کی یہ شرط منظور کر لی اور ان کو آمد و رفت کا کرایہ بھی دیا۔

لکھنؤ پہنچتے ہی انھوں نے منشی نول کشور کو ترک ملازمت کے سلسلے میں درخواست دی۔ منشی جی ابتداً تو برہم ہوئے لیکن پھر بادل ناخواستہ اس کو منظور کر لیا لیکن حساب پورے طور پر صاف نہیں کیا کچھ روپے باقی رکھے اور شرر کو تمام روپیوں کو حاصل کرنے کی جلدی تھی چونکہ وہ جلد از جلد حیدر آباد واپس جانا چاہتے تھے تاکہ ہزار داستان سے منسلک ہو سکیں۔ کافی دوڑ دھوپ اور کچھ کبیدہ خاطری کے بعد منشی جی نے روپے ادا کیے اور شرر حیدر آباد کو روانہ ہی ہونے والے تھے کہ وہاں سے اڈیٹر کا خط آ گیا "میں نے اخبار اور پریس فروخت کر دیا ہے اب آپ آنے کی زحمت نہ کریں۔"[7] شرر کو سخت افسوس ہوا۔ حصول زر کے سلسلہ میں منشی نول کشور سے کچھ ایسی باتیں ہو گئیں کہ شرر نے دوبارہ ان کی طرف رخ نہ کیا۔ اس حادثے کے تحت شرر ادھر سے بھی گئے اور ادھر سے بھی۔ اس طرح دو ڈھائی سال کی اودھ اخبار کی وابستگی سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ ہر چند کہ دو ڈھائی سال کا وقفہ بہت بڑا وقفہ نہیں ہوتا لیکن اس مختصر سے وقفہ میں ہی شرر نے اپنے ذہن قلم اور اسلوب کی ایسی گل افشانیاں دکھا دیں کہ ان کا نام تاریخ اودھ اخبار سے وابستہ ہو گیا۔

ڈاکٹر عبد السلام خورشید اپنی کتاب "صحافت ہند و پاک" میں لکھتے ہیں ؎

"اس میں (اودھ اخبار) بڑے بڑے ادیب شاعر اور انشا پرداز کام کرتے تھے مثلاً غلام محمد تپش شاگرد غالب۔ سرشار۔ احمد حسن شوکت۔ شرر۔ امجد علی۔ حیرت دہلوی وغیرہ"[8]

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی بھی لکھتے ہیں۔

"اس کے ایڈیٹر ملک کے بڑے لائق اور فاضل لوگ رہے ہیں جن کی علمی قابلیت اور زباں دانی ہر لحاظ سے مسلم تھی۔ اپنی بانوے سالہ زندگی میں اس کے متعدد ایڈیٹر ہوئے جن کی تعداد تیس چالیس کے درمیان ہوگی۔ ان میں منشی امیر اللہ تسلیم، قدر بلگرامی، سرشار، نسیم دہلوی، شرر لکھنوی، مرزا حیرت دہلوی، شیو پرشاد، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد افق، پنڈت بشن نرائن در، یاس یگانہ چنگیزی، پیارے لال شاکر، پریم چند۔ مرزا محمد عسکری، شوکت تھانوی، امین سلونوی جیسے معروف ادیب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔"[9]

وقتی طور پر شرر کو اس بیکاری سے تکلیف پہنچی لیکن وہی بیکاری ان کے عظیم ناول نگار ہونے کا پیش خیمہ بن گئی۔ بے روزگاری سے پریشان ہو کر انھوں نے منشی نثار حسین ایڈیٹر پیام تعلیم سے یہ طے کیا کہ وہ ایک ناول لکھیں اور منشی جی اسے شائع کریں اور جو آمدنی ہو وہ آدھی آدھی

(باقی ص ۴۴ پر)

غزلیں

ایمن جعفری
۳۳ چولا پاڑہ مسجد لین
ہوڑہ ۷۱۱۱۰۱

نفس نفس میں تپش کا دباؤ کیسا ہے
ہمارے جسم کے اندر الاؤ کیسا ہے

تمام جسم چٹکتا ہے روح گھائل ہے
وجودیت کا یہ خاموش گھاؤ کیسا ہے

نگاہ ملتی ہے لیکن زباں نہیں کھلتی
ہمارے درمیاں حائل تناؤ کیسا ہے

بہت دنوں سے کوئی جب ادھر نہیں آیا
یہ خوشبوؤں کا فضا میں رچاؤ کیسا ہے

پہنچ سکی نہ کوئی موجِ صبح ساحل تک
ہجومِ شب کی ندی میں بہاؤ کیسا ہے

ہر ایک شخص یہاں سر بریدہ لگتا ہے
مگر ہے مطمئن یہ رکھ رکھاؤ کیسا ہے

جھلک رہی ہے حقیقت غزل کی لے میں بھی
تمہارے شعر میں ایمن گھماؤ کیسا ہے

شائستہ جعفری
۱۵ سیتا محل بی۔ پیٹٹ روڈ
بمبئی ۔ ۴۰۰۰۳۶

دردِ غمِ الفت کو مٹانے کے لیے آ
گلشن میں نئے پھول کھلانے کے لیے آ
آنکھوں میں نئے خواب بسانے کے لیے آ
ایوانِ محبت کو سجانے کے لیے آ
کیا گزری جدائی میں ہمیں یہ نہیں معلوم
وہ قصۂ پر درد سنانے کے لیے آ
برسوں کی جدائی کی خلش کم تو نہ ہوگی
ہاں دل کی کسک اور بڑھانے کے لیے آ
پیمانِ وفا، جذبۂ دل یاد نہیں مگر
الفت کے چراغوں کو بجھانے کے لیے آ

کچھ نقش ہیں ایسے جو ابھر آتے ہیں اب بھی
ہم سے نہ مٹے تو ہی مٹانے کے لیے آ

ضیاء احمد خان
شعبۂ اردو ایس۔ پی کالج۔ دمکا، بہار

مرزا رسوا اور ان کا ناول

"شریف زادہ"

شریف زادہ مرزا محمد ہادی رسوا کی وہ تصنیف ہے۔ جسے انھوں نے فنی طور پر ناول سے زیادہ عابد حسین کی آپ بیتی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ ناول آج سے بیاسی سال قبل ۱۹۰۰ء میں تصنیف ہوا۔ مرزا رسوا نے اردو ادب کو کئی ناول دیے۔ اور ان کے ناولوں نے اردو داں معاشرے کو بہت کچھ عطا کیا۔

رسوا کا اصل نام جیسا کہ اوّل ذکر ہوا مرزا محمد ہادی تھا۔ مرزا رسوا بھی ان کے ایک ناول ہی کا عطیہ ہے۔ ان کے ناول افشائے راز کی کہانی مرزا اور رسوا ہی کے گرد گھومتی ہے۔ ابتدا میں مرزا ہادی نے مرزا رسوا کو اس ناول میں ایک افسانوی کردار کی حیثیت سے پیش کر کے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ مرزا ہادی نہیں بلکہ ان کے ایک قریبی دوست ہیں۔ لیکن جب اس کے چند سال بعد انھوں نے اپنے ناول امراؤ جان ادا، ذات شریف اور شریف زادہ تصنیف کیے تو اپنے تخلیق کردہ اس کردار (مرزا رسوا) کو ان ناولوں کا مصنف بنا کر پیش کیا اس طرح ظاہر ہے کہ مصنف کا مزاج خود کو بھی کسی افسانوی کردار کی شکل میں پیش کرتا رہا اور اپنے قارئین کو ایک مدت تک یہی باور کرانے کی کوشش کی۔ ان کی اسی افتادِ طبع نے ان سے ایسے قصے لکھوائے جو بظاہر سو فیصد حقیقی اور سچے واقعات پر مشتمل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں امراؤ جان ادا کو شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ جب یہ ناول چھپا اور لوگوں نے مطالعہ کیا تو اس کے واقعات کی دروبست کو حقیقت سے قریب پا کر انھیں بالکل سچ سمجھ لیا گیا اور انتہا یہ ہوئی کہ لکھنؤ کی گلیوں میں امراؤ جان ادا کا گھر تلاش کیا جانے لگا ـــــ ناول کے فن کی معراج یہی ہے کہ مصنف کی چھاپ قاری کو محسوس نہ ہونے دے اور واقعات کا تسلسل حقیقت سے اتنا قریب ہو کہ اس پر افسانویت کا شبہہ نہ ہونے پائے۔ مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" میں اس نزاکت کا پورا لحاظ رکھا اور کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے۔

رسوا کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ وہ بہ یک وقت شاعر بھی تھے، ناول نگار بھی، انجینئر بھی اور سائنس داں بھی، حکیم وقت اور واعظ خوش بیان بھی۔ ان کی شخصیت کے یہ تمام پہلو شریف زادہ میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہ ناول (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) بظاہر مرزا عابد حسین کی سوانح عمری ہے لیکن دراصل یہاں بھی مرزا رسوا ہی عابد حسین کے لباس میں جلوہ گر ہیں۔ اس ناول کے بیشتر واقعات خود ان کی زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کی کمسنی میں ہی ان کے والدین داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ جس سے ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ خاندانی جائداد بھی کچھ ایسی نہ تھی جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر کفالت کا ذریعہ بنتی۔ جو کچھ تھا وہ بھی گویا ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ والدین کی رحلت کے وقت مرزا کی عمر "پندرہ سولہ" کے لاابالی دور سے گزر رہی

تھی۔ وقت، ماحول اور سن کے تقاضوں نے مرزا کو بے فکری" آزادی اور رنگین مزاجی کی طرف مائل کیا۔ بزرگوں نے یہ دیکھ کر شادی کی بیڑی پہنا دی کہ شاید اس سے ذمہ داریوں کا احساس ہو اور براہ راست پر آجائیں۔ نتیجہ خاطر خواہ بر آمد ہوا۔ بیوی بچوں کی پرورش کے خیال نے مرزا کو محنت اور معروفیت کی زندگی بسر کرنے کا سبق دیا۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف اپنی تعلیم پوری کرلی بلکہ جہاں، جب اور جیسا موقع ہاتھ آیا خود کو اسی کے مطابق ڈھال لیا۔ اس ناول کا شریف زادہ مرزا عابد حسین بھی کم و بیش انہی منزلوں سے گزرتا ہے اور اپنی محنت و کاوش سے اپنی جنت تعمیر کر لیتا ہے۔ زندگی کی ناؤ کو تنہا کھینا بڑا ہی عزم شکن اور دشوار ہے۔ بقول اقبال۔ ؎

شنع را تنہا تپیدن سہل نیست

اسکے لیے کسی ہمدرد، کسی مونس و غمگسار اور کسی شریک کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا عابد حسین کو ایک باوفا، نیک شعار، عقل مند، اور قناعت پسند شریک حیات کی شکل میں یہ نعمت حاصل ہے۔ مستقبل کی تعمیر کے لیے یہ دونوں میاں بیوی مشترکہ طور پر کوشاں ہیں۔ اور آخرش انھیں وہ گوہر مقصود حاصل ہو جاتا ہے جس سے حیات انسانی خوشگوار اور مسرت بداماں ہوتی ہے۔

مرزا رسوا کا تعلق شہر لکھنؤ سے تھا۔ انھوں نے وہیں آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے۔ یہ انیسویں صدی کا ربع آخر تھا۔ .... حکومت چھن چکی تھی۔ لکھنؤ اقتصادی اور تمدنی دونوں اعتبار سے زوال آمادہ تھا۔ اب نہ دولت کی فراوانی تھی اور نہ وہ عیش و عشرت کی گرما گرمی۔ البتہ مزاج کی نخوت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ دولت و نخوت لازم و ملزوم ہیں۔ مگر یہ بات عجیب ہے کہ دولت تو ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ لیکن نخوت آسانی سے نہیں جاتی اور اس کا یوں رہ جانا بڑی مصیبتیں لاتا ہے۔ یہ نخوت محنت سے گریز سکھاتی ہے اور کسی پیشے کو اپنانا اس کے نزدیک باعث ہتک اور وقار و تمکنت کے منافی ہوتا ہے۔ رسوا کے عہد کا لکھنؤ انہی امراض میں مبتلا تھا۔ نکما پن آوارہ منشی اور ..... واہی پن کو معیار شرافت سمجھا جاتا تھا۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی اور اسی طرح کی دوسری لغویات کا ہر طرف زور تھا۔ نوجوانوں کو کام سے نفرت، محنت سے بغض اور بیکار باتوں سے انس تھا۔ ایسے معاشرے کی کیا صورت ہوگی اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ شریف زادہ میں اس بات کی عکاسی بھی خوبی سے کر دی گئی ہے کہ گھروں کے اندر نکبت و افلاس کا ڈیرا اور فاقوں کا بسیرا ہونے کے باوجود کوئی پیشہ اختیار کرنا یا کسی کی ملازمت قبول کرنا کسر شان تصور کیا جاتا تھا۔

معاشرے کی اس زوال آمادگی نے انہیں پوری طرح متاثر کیا۔ جس کے نتیجے میں وہ چپکے نہ بیٹھ سکے۔ انھوں نے چاہا کہ اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کے لیے ہر ممکن کوشش کریں اور ایسا ہی کیا بھی۔ شریف زادہ ان کی ایسی ہی ایک کوشش ہے۔ عابد حسین کی سوانح عمری لکھنا، یا قاری کو کہانی کی دلچسپیوں میں سامان عیش مہیا کرنا ان کا مقصد ہرگز نہ تھا۔ ان کی غرض ڈپٹی نذیر احمد کی طرح اصلاح معاشرہ تھی اور بس۔ شریف زادہ کا مقصد تخلیق یہی تھا۔

جہاں تک ناول اور اس کے فنکارانہ عناصر کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ شریف زادہ بہت سی فنی خامیوں سے پُر ہے۔ لیکن جہاں تک مقصدیت کا تعلق ہے بلاشبہ رسوا نے جو تاثر پیدا کرنا چاہا ہے اس میں انہیں پوری طرح کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

شریف زادہ کہنے کو تو ایک مختصر سا ناول ہے۔ لیکن اس میں رسوا نے کرداروں کی بھرمار کر دی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اس کہانی میں شروع سے آخر تک منطقی ربط برقرار رکھنے میں ناکام ہوئے ہیں۔ یوں خود مصنف بھی اس بات پر مصر نہیں کہ یہ کتاب ناول ہی کے زمرے میں رکھی جائے۔ مصنف کو خود اعتراف ہے کہ اس نے شریف زادہ کی شکل میں کوئی ناول نہیں لکھا بلکہ انھوں نے اپنے دوست مرزا عابد حسین کی سوانح عمری قلم بند کی ہے۔ یہ

بنت لگتا ہے کہ رسوا کے جادو نگار قلم نے اسے کہانی کا روپ دے دیا ہے۔ اس طرح مرزا عابد حسین اس کہانی کے مرکزی کردار ثابت ہوتے ہیں۔ مرزا کا کردار پڑھنے والے کے سامنے اس کتاب کی پہلی ہی سطر میں آجاتا ہے جو کتاب مذکور کی آخری سطر تک سامنے رہتا ہے۔ مرزا عابد حسین کے علاوہ اس کتاب کے اہم کردار مرزا کی بیوی رقیہ بیگم اور بیٹا باقر حسین ہیں۔ مرزا کے بعد جو کردار خاص طور پر قاری کو متاثر کرتا ہے اس میں مرزا فدا حسین، ان کی بیوی سکینہ بیگم اور ان کا بڑا لڑکا ذاکر ہے۔ کتاب کی ابتدا میں کچھ دور تک مرزا عابد حسین اور ان کی بیگم رقیہ کا اکثر و بیشتر ذکر آیا ہے۔ یہ دونوں اسی لکھنوی معاشرے کے افراد ہیں۔ جہاں آزادہ روی کو شرافت اور کسی شغل کو کمتر درجے کی چیز تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن رسوا نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ان دونوں کا کردار اس رنگ سے جداگانہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کرداروں کی انفرادیت کہانی کی پوری فضا پر اس طرح حاوی رہتی ہے کہ قاری کے ذہن میں یہ کردار مثالی بن جاتے ہیں۔ مرزا کی ازدواجی زندگی مفلسی اور بے کسی کے ماحول سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن ان کا عزم جواں انھیں محنت پر اکساتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی مجبوریاں دور ہو جاتی ہیں۔

مرزا کی بیوی رقیہ بیگم ایک شریف خاتون ہیں جو ہر قدم پر ہر حال میں پورے خلوص سے مرزا کا ساتھ دیتی ہیں۔ عام ناعاقبت اندیش عورتوں کی طرح وہ اپنے شوہر کو طعنے نہیں دیتیں کہ انھیں اس تنگ دستی اور مفلسی کی حالت میں کیوں لا رکھا ہے یا کبھی وہ حالات کی ان بے مہریوں سے بیزاری کا ذرا بھی اظہار نہیں کرتیں جس کے نتیجے میں مرزا کی ہمت اور طاقت دونوں ان کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں اور یہ دونوں مل کر اپنی محنتوں سے اپنی راہ کے ایک ایک کانٹے چن لیتے ہیں۔ زندگی خوشگوار اور باوقار بن جاتی ہے۔ مرزا عابد حسین جنھیں ایک طرف روٹی کی فکر تھی اور دوسری جانب اپنی تعلیم کو پورا کرنے کا خیال دامن گیر تھا، اپنی تعلیم مکمل کر کے انجینئر بن جاتے ہیں۔ انجینئر بننے سے پہلے انھیں بہت سارے چھوٹے موٹے کام محنت مزدوری کے کرنے پڑتے ہیں۔ انتہا یہ کہ لوہار کی بھٹی پہ ہتھوڑے چلانے کا کام بھی کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے نہ کسی محنت سے منھ موڑا اور نہ کسی کام کو نگاہ حقارت سے دیکھا، نہ کسی پیشے کو معیوب جانا اور نہ ہی وقت کا کوئی لمحہ بیکار گزرنے دیا۔ ان کے کردار کی انھی خوبیوں نے انھیں دولت، عزت تعلیم اور پرسکون زندگی عطا کی۔ مرزا کے کردار کو اس مقام پر پہنچا کر مصنف فدا حسین، ان کی بیوی سکینہ بیگم اور ان کے بیٹے ذاکر کا کردار صرف اس لیے سامنے لایا ہے کہ ان کی موجودگی میں مرزا عابد حسین، رقیہ بیگم اور باقر حسین کے کردار کی خوبیاں زیادہ نکھر کر سامنے آسکیں۔ رسوا نے ان تینوں کرداروں کا اول الذکر تینوں کرداروں سے بھرپور موازنہ کیا ہے۔ ان کرداروں کے بعد کچھ نمایاں ہو کر جو کردار شریف زادہ میں آتا ہے وہ میاں فدوی کا ہے۔ ان کا پورا نام فدا علی ہے لیکن ان کی شہرت فدوی کے نام سے ہے جسے وہ اپنا تخلص بتاتے ہیں۔

فدوی کا کردار زوال آمادہ نظام سرمایہ داری کے عہد کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ عیش و عشرت اور تفاخر بیجا میں پھنس کر اس عہد کے رئیسوں، نوابوں اور جاگیرداروں کی تباہی خود ان کے ملازموں کی منشیوں اور پٹواریوں کے ہاتھوں ہوا کی۔ لیکن وہ بے جان مہروں کی طرح چپ چاپ سب کچھ دیکھا کیے اور کچھ نہ کر سکے۔ میاں فدوی کا کردار اسی طبقے کا نمائندہ ہے۔ ان کی ساری جائداد یہاں تک کہ گھر بار بھی ان کے کارندے شیورتن کا تصرف مالکانہ تھا۔ محض نام کو صرف ایک موضع شیورتن نے میاں فدوی کے تصرف میں رہنے دیا تھا۔ اس طرح شیورتن کا کردار بھی اگرچہ چھوٹا ہے لیکن اہم ہے کہ اس سے اس طبقے کی نمائندگی بخوبی ہو جاتی ہے جو کبھی نوابوں اور زمینداروں کے عملے میں شمار ہوتا تھا لیکن دراصل رفتہ رفتہ ان کی جائدادوں کا غاصب ہو کر خود مالک بن بیٹھا تھا اور ان کے مالک اپنی عیش پرستی اور غفلت سرشتی کے شکار ہو کر مجبوری و مظلومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مرزا عابد حسین کا تعلق میاں فدوی سے اس وقت ہوتا ہے۔

جب وہ پہلے پہل ملازم ہو کر اودھ کے ایک ضلع میں جاتے ہیں۔ میاں فدوی اور شیو رتن کے معاملات جب رفتہ رفتہ ان پر منکشف ہوتے ہیں تو انھیں فدوی سے یک گونہ ہمدردی ہو جاتی ہے۔ وہ ہر لمحہ میاں فدوی کی مجبوری کو مختاری سے بدلنے کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ تقریباً پوری جائداد کا مالک ہونے کے باوجود شیو رتن کا میاں فدوی سے دبنا مرزا عابد حسین کو یہ شک دلاتا ہے کہ یقیناً دال میں کالا ہے۔ جب وہ حقیقت حال جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا یہ شبہ رفتہ رفتہ یقین بننے لگتا ہے اور آخر ش یہ راز کھلتا ہے کہ شیو رتن کی چوٹی ولایت علی خاں نامی ایک شخص کے ہاتھ میں ہے جو لکھنؤ میں رہتا ہے اور زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ اس مقام پر خود مصنف کتاب مرزا رسوا کا کردار بھی سامنے آتا ہے جو کسمپرسی میں پڑے ولایت علی خاں کی بروقت مدد کر کے ان سے وہ کاغذات حاصل کر لیتا ہے جو شیو رتن کی جعل سازیوں کے امین تھے اور جن کے بنائے جانے کا سہرا ولایت علی خاں کے سر تھا۔ اس طرح یہ کردار بھی اگرچہ محض چند لمحوں کے لیے سامنے آتا ہے پھر بھی قاری سے اپنی اہمیت منوائے بغیر نہیں رہتا۔ جہاں تک رسوا کے کردار کا تعلق ہے یہ باضابطہ طور پر اگرچہ بہت بعد میں سامنے آتا ہے لیکن اپنی موجودگی کا احساس اپنے اسلوب نگارش میں اوّل سے آخر تک قاری کو دلاتا رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی حیثیت ایک وقائع نگار سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ ولایت علی خاں سے شیو رتن کے کاغذات حاصل کر لینا اپنی جگہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن یہ کام بھی چونکہ مرزا عابد حسین کی رہنمائی اور ہدایت کے تحت ہوتا ہے اس لیے رسوا کا کردار یہاں ثانوی درجے کا رہ جاتا ہے۔ مرزا عابد حسین کا کردار پوری کہانی پر اوّل تا آخر چھایا رہتا ہے۔ اختتام سے پہلے مرزا رسوا نے مرزا عابد حسین کی زندگی کے روزمرہ معمولات کی تفصیل پیش کی ہے جو کسی ناول یا سوانح حیات کا حصہ نہیں بلکہ کسی روزنامچے کا ایک صفحہ معلوم ہوتی ہے۔ آخر میں مرزا رسوا نے عابد حسین کے بیٹے (باقر) اور اس کے بعض احباب کے خطوط نیز مرزا عابد حسین کی طرف سے ان خطوط کے جوابات شامل کر دیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خط کسی ایک مسئلے یا متعدد مسائل کا حامل ہے جن کے جوابات مرزا عابد حسین کی جانب سے دیے گئے ہیں۔ یہ مسائل سماجی، سیاسی، معاشی، تعلیمی اور نظریات سے تعلق رکھتے ہیں جن کے جوابات سے ان امور میں مرزا عابد حسین کے انداز فکر و نظر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصنف نے اس کردار کو واضح طور پر قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے تاکہ شخصیت کا کوئی گوشہ تاریک یا کوئی پہلو تشنۂ تعارف نہ رہ جائے۔

ان خطوط میں ایک خط مہادیو پرشاد نام کے ایک شخص کا ہے۔ اس خط سے اور اس سے متعلق مرزا عابد حسین کے جواب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرزا موصوف نے منجملہ کئی کتابوں کے ایک کتاب مرزا رسوا کی فرمائش پر "روزانہ زندگی" کے نام سے بھی لکھی تھی جسے مرزا رسوا نے "شاعرانہ ستائش اور دوستانہ نوازش" کے ساتھ دلچسپ افسانہ بنا دیا۔

اس طرح مرزا رسوا نے اس کتاب کو افسانہ ہوتے ہوئے بھی حقیقت بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

تفصیلات بالا سے ظاہر ہے کہ "شریف زادہ" میں مرزا عابد حسین کا کردار ہی مرکزی حیثیت کا حامل ہے بقیہ تمام کردار ضمنی ہیں۔ جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، رسوا نے اپنے مخصوص انداز میں تمام کرداروں کو پیش کیا ہے اور یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ رسوا کا "شریف زادہ" بعض فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے اصلاحی مقاصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔

★

غزلیں

حبیب الرحمٰن راہی
ایم۔ او (۱) لیڈیز ہوسٹل - بالاگھاٹ
مدھیہ پردیش

تم تو خوشبو ہو گلابوں سے نکل کر آؤ
جسم بن جاؤ تو خوابوں سے نکل کر آؤ

قید تحریر میں تقریر میں الفاظ میں ہو
ہو مسیحا تو کتابوں سے نکل کر آؤ

تم اگر ایک ہو تقسیم کی حد سے نکلو
دل میں آؤ تو حسابوں سے نکل کر آؤ

تم نشہ ہو تو سما جاؤ مری رگ رگ میں
شیشۂ دل میں شرابوں سے نکل کر آؤ

تم مرے سامنے آؤ تو کوئی بات کروں
اب جو آؤ تو نقابوں سے نکل کر آؤ

جمیل صدیقی
ہمدرد دواخانہ - نظیر آباد
لکھنؤ

زر دیتے ہیں فقط حاصلِ تدبیر ابھی
جانے کس موڑ پہ ہے موسمِ تقدیر ابھی

ہم حقیقت کے تمنائی ہیں خوابوں کے نہیں
اپنا کردار ہے آئینۂ تدبیر ابھی

آگ برساتی ہوئی دھوپ مبارک ہے مجھے
میری رگ رگ میں ہے اک لذّتِ تنویر ابھی

دعوتِ کوہ کنی مل تو رہی ہے لیکن
زندہ رہنے کی تمنا ہے عناں گیر ابھی

کس کو فرصت کہ جو اس راہ سے اس راہ چلے
لمحہ لمحہ ہے یہاں بستۂ زنجیر ابھی

اک مقدس سے صحیفے کی طرح رکھی ہے
آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ابھی

ندیم اشرف جائسی
جائس ضلع رائے بریلی

رُت جو بدلی تو ہر اک شاخ پہ تحریر ہوئی
بے لباسیٔ شجر لکھنے کی تفسیر ہوئی
شوخ رنگوں کی دھنک دیکھ کے تکلیں آنکھیں
آغوشِ کہنہ روایت ہی بغل گیر ہوئی

چھوڑنا گھر کا تھا افسوس کا باعث نہ مجھے
جانے کیا چیز تھی ایک لمحہ کو زنجیر ہوئی
میرے احباب مجھے لوٹ کے لوٹے ہیں ابھی
میرے دشمن تجھے اس بار بھی تاخیر ہوئی
ریت، موسم و شجر، سایہ و دیوار، مکاں
استعاروں سے مکمل کوئی تصویر ہوئی

ڈاکٹر سید تقی احمد نقوی
۱۷، کوہن ٹولہ رانی منڈی الہ آباد

سورج مُکھی پھول

سورج مکھی پھول کو کون نہیں جانتا ہے؟ یہ ہندستان میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں تو اس کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ جیسا کہ نام سے عیاں ہے اس پھول کی شکل سورج سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس پھول کی گولائی تقریباً چائے کی طشتری کے برابر ہوتی ہے۔ رنگ زرد یا نارنجی ہوتا ہے۔ اس پھول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا رخ بالکل سورج کی جانب ہوتا ہے۔ دن میں جیسے جیسے سورج مشرق سے مغرب کی جانب بڑھتا ہے۔ اسی طرح اس پھول کا رخ بھی مشرق سے مغرب کی طرف گھومتا رہتا ہے۔ جب تک سورج ڈوبا ہوا رہتا ہے تب تک اس پھول کا رُخ زمین کی جانب جھکا رہتا ہے۔ اور جیسے ہی سورج نکلتا ہے ویسے ہی یہ پھول بھی اپنا سر اٹھا کر سورج کی جانب کر لیتا ہے۔ اس کے پودے کی لمبائی تقریباً سات آٹھ فٹ ہوتی ہے۔ پھول دیکھنے میں خوبصورت ہوتا ہے اس لیے اکثر شائقین اسے اپنی پھلواری کی زینت کے لیے بھی لگاتے ہیں۔

یہ پھول جس قدر خوبصورت ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ خدا وند عالم نے اسے مفید بنایا ہے۔ جدید تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پھول کے بیج (SEEDS) بے شمار طبی فوائد پنہاں ہیں۔ انسانی جسم کے لیے جن ضروری اور اہم حیاتین (VITAMINS) کی ضرورت ہوتی ہے وہ سبھی حیاتین اس پھول کے بیج میں موجود ہوتی ہیں۔

جیسے پروٹین، کیلشیم، فاسفورس، لوہا، تانبہ، آیوڈین، بی کمپلکس، پوٹاشیم، وٹامن اے، ای، ڈی، وغیرہ۔

یہ سبھی حیاتین انسان کے جسم کو صحت مند بناتی ہیں، امراض دور کرنے نیز عمر کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

سورج مکھی کے بیج میں نصف سے زیادہ روغن ہوتا ہے جو حیوانی چکنائی (ANIMAL FAT) سے کہیں زیادہ مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ دودھ، گھی، مکھن، انڈا، گوشت وغیرہ کے استعمال سے انسان کے جسم میں زیادہ چربی (FAT) پیدا ہو جاتی ہے۔ خون کی رگوں کے اندر ایک قسم کی چربی جس کو کولیسٹرول کہتے ہیں۔ جم جانے سے رگیں سخت اور تنگ ہو جاتی ہیں۔ جس کے سبب خون کے دوران میں دقت ہو کر فشار الدم قوی (HIGH BLOOD PRESSURE) کی بیماری لاحق ہو کر حرکت قلب بند ہونے نیز فالج کے مرض میں مبتلا ہونے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ لیکن سورج مکھی کے بیج کے تیل کے استعمال سے دودھ، گھی، مکھن، انڈا وغیرہ سے زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے اور ساتھ ہی رگوں کے اندر جما ہوا کالیسٹرول بھی خارج ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں خون کی رگیں نرم اور لچکیلی ہو جاتی ہیں اور انسان بڑھاپے میں بھی

غذا کی لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔

سورج مکھی کے بیج میں بکثرت حیاتین (VITA MINS)، پروٹین (PROTEIN) اور معدنی اجزا (MINERALS) ہوتے ہیں۔ جس کے استعمال سے انسان کے پورے جسم میں ایک نئی روح پیدا ہوجاتی ہے۔ نظام ہضم کی جملہ خرابیاں دور ہوجانے سے کھل کر بھوک لگنے لگتی ہے۔ قبض کی شکایت دور ہوکر جملہ امراض شکم ختم ہوجاتے ہیں۔ اس کے مسلسل استعمال سے مردانہ طاقت عود کر آتی ہے۔ آنکھوں کی بینائی بڑھ جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ چشمہ کے استعمال کی ضرورت بھی رفتہ رفتہ کم ہوجاتی ہے۔ بال سیاہ اور چمکدار پیدا ہونے لگتے ہیں اور وقت سے پہلے سفید ہونا گرنا بند ہوجاتے ہیں۔ جب زیادہ عمر ہوجانے کے سبب جسمانی طاقت زائل ہونے لگے اور تکاوٹ کا جلد احساس ہونے لگے تو سورج مکھی کے بیج کے استعمال سے محنت سے سخت کام کرنے پر بھی تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ بدن میں پھرتی اور چستی آجاتی ہے۔

سورج مکھی پھول کے بیج (SUN FLOWER SEED) تمام بڑے شہروں میں مل جاتے ہیں۔ یہ کالے رنگ کے ہوتے ہیں اس کے بیج کو کوٹ کر اوپر کا کالا چھلکا نکال دیا جاتا ہے۔ اس کا مغز کھانے میں لذیذ ہوتا ہے۔ کم سے کم ایک تولہ دن میں دو بار خوب چبا کر کھایا جا سکتا ہے۔ یا اگر اور بھی خوش ذائقہ بنانا ہے تو شہد، دودھ یا دہی کے ہمراہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص حتیٰ کہ چھوٹے بچے اور حاملہ عورتیں بھی اس کو استعمال میں لا سکتی ہیں۔ اس کے استعمال سے کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ اس کے استعمال سے دودھ گھی، انڈا، گوشت اور بادام سے بھی زیادہ طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے روغن کو اگر کھانا پکانے میں استعمال کیا جائے تو جملہ فوائد کے ساتھ ساتھ انسان بدہضمی، تیزابیت (ACIDITY)، فشار الدم قوی (HIGH BLOOD PRESSURE) کے ہمراہ پتے (GALL BLADDER STONE) میں پتھری وغیرہ سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ شہروں میں اس کا تیل آسانی سے دستیاب ہوجاتا ہے۔

★

غزل

شعیب نظام
رودولی گاؤں
بارہ بنکی

اپنی حد سے گزر گیا وہ شخص
ریزہ ریزہ بکھر گیا وہ شخص

سرِ شب کاٹ دی ٹھٹھر کے مگر
دھوپ نکلی تو مر گیا وہ شخص

رفتہ رفتہ بڑھیں ملاقاتیں
چہرہ چہرہ اتر گیا وہ شخص

بارشِ سنگ ہر مکاں سے ہوئی
خواب لے کر جدھر گیا وہ شخص

نکہتِ گل تھا خواب تھا کیا تھا
سب کے دل میں اتر گیا وہ شخص

جس نے سورج پہ ڈال دی تھی کمند
کیوں اندھیروں سے ڈر گیا وہ شخص

پھر رہا تھا فصیلِ شہر کے پاس
اب نہ جانے کدھر گیا وہ شخص

میری کمزوریاں بتا کے نظامؔ
مجھ پہ احسان کر گیا وہ شخص

غزلیں

عارف نجمی
۲۴-۱-اے
کوچہ ابو تراب خاں
لکھنؤ - ۳

دیکھنا ہے مجھے اب تیرے جوابات کا رخ
تیری ہی سمت ہے اب تیرے سوالات کا رخ

راست انداز میں جب خود کو بیاں کر نہ سکا
میں نے لفظوں کو دیا رمز و کنایات کا رخ

کیا خبر تھی اُسے حالات بدل ڈالیں گے
وہ تو اُٹھا تھا بدل دینے کو حالات کا رخ

جھوٹے لفظوں کی گواہی پہ مجھے قید ہوئی
اور وہ دیکھا کیا رسم و روایات کا رخ

بس یہی سوچ کے مجھ سے نہ ہوا شکوہ بہ لب
حسبِ عادت وہ بدل دے گا مری بات کا رخ

مبارک شمیم
احمد پور شاہجہانپور

جس کو نظروں کے پرکھنے کا سلیقہ ہے بہت
جان کر میں نے اسی شخص کو دیکھا ہے بہت

ان دنوں ذہن خیالات میں اُلجھا ہے بہت
سوچتا کیا ہوں اسی بات کو سوچا ہے بہت

میرا ادراک غمِ ذات میں کھویا ہے بہت
غور مجھ پہ بھی کیا آپ کو سوچا ہے بہت

میں بھی پھیلا تھا کبھی دن کے اُجالے کی طرح
اب مجھے وقت کے ہاتھوں نے سمیٹا ہے بہت

اس نظر سے تری یادوں کی جلا لی قندیل
کوئی دیکھے کہ مرے گھر میں اُجالا ہے بہت

راستہ روکنے والے اسے گمراہ نہ کر
میری بے راہ روی کو ابھی چلنا ہے بہت

اس میں اب اور کسی غم کی کشاکش نہ رہی
دل کی وسعت کو ترے درد کا صحرا ہے بہت

ذکرِ تنہائیٔ شب کا نہ کرے دل سے کوئی
مقتلِ شب کے تصور سے لرزتا ہے بہت

کاش وہ خواب کسی دن تو حقیقت بنتا
سنگِ حالات سے جو میں نے تراشا ہے بہت

آج تک ڈھال سکا ہے کوئی پیکر نہ شمیمؔ
ورنہ جذبات کو اشعار میں ڈھالا ہے بہت

(افسانہ)

[illegible]

فرشتہ تو نہ تھا

خود غرضی، ریاکاری، مطلب براری اور عیاری کے اس دور میں اس کی ذات اس قدر بے غرض تھی کہ اس کا ہلکا سا سایہ بھی نظر نہیں آتا۔ جس جگہ گنتی کے ہی ڈاکٹر ہوں اور عطائیوں اور بے ضرورت منڈوں کی کثرت ہو، وہاں کسی ایسے آدمی کا مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ہر ایک مرد اور عورت کے ذہن پر نقش قائم کر دے جو مرنے سے ڈاکٹر نہ ہو کر بھی اسم با مسمّٰی ہو جائے۔ تو تعجب نہیں ہوتا ہے۔ واقعی وہ ایسا ہی ایک بے لوث، خدمت گزار، بے غرض اور ایماندار شخص تھا۔ نام تو اس کا کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس بعض بزرگوں کو اس قدر معلوم تھا کہ وہ پانی پت سے اپنے لڑکپن میں ہی ادھر آگیا تھا اور پتہ نہیں کس منچلے نے اس کا نام ڈاکٹر تجویز کر دیا تھا جو شروع شروع میں اس کے لیے بے حد تکلیف اور پریشانی کا سبب بنا تھا اور اپنے نئے نام کو سن کر چڑھنے اور لڑنے لگا تھا۔ مگر شہر کے ہر گلی کوچے سے ڈاکٹر ڈاکٹر، کا غوغا بلند ہونے لگا۔ تو اس نے شاید زندگی میں پہلی بار یہ خود غرضی اپنائی تھی کہ اس نے اپنے نئے نام کو قبول کر لیا تھا۔ اور چڑھنا اور لڑنا چھوڑ کر عوامی خدمت کو اپنا فرض اور ذمہ داری سمجھ لیا تھا۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کا اصل سبب بھی یہی تھا ورنہ اس جیسے سیدھے سادے، سپاٹ اور گمنام بے نام و نشان وجود کو لوگ شاید پاگل بنا کر ہی چھوڑتے ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن وہ لوگوں کے خط پڑھنے کے سارے کام آسانی سے انجام دے لیتا تھا۔ گھریلو کام ہوں یا کسی تقریب کی نوید پہنچانا ہو یا کسی الیکشن کا جلسہ ہو، بازار سے سودا سلف منگوانا ہو، حقے کی چلمیں بھروانا ہو، آموں کے باغ کی رکھوالی کرانا ہو، پردہ نشین بیبیوں کی ڈولی و رکشہ کا بندوبست کرانا ہو یا شادی بیاہ کی دعوتیں اور مہمانوں کی تواضع کا معاملہ ہو، ڈاکٹر ہر جگہ پیش پیش ہی نہیں مستعد اور چاق و چوبند طور پر حصہ لیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

ڈاکٹر کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ڈاک خانے سے اپنے علاقے کی عورتوں اور مردوں کی چٹھیاں لانا تھا۔ وہ ہر صبح پوسٹ آفس سے باہر کلرکوں کی کھڑکی سے لگا اندر بیٹھے پوسٹ مینوں کو اس انداز میں تاکتا رہتا، جیسے کوئی خوبانِ شہر کو دزدیدہ نظروں سے تکتا رہے۔ جب علاقہ کا پوسٹ مین باہر آتا بے حد بے تابی سے ڈاکٹر اس کے پاس پہنچ جاتا اور اس سے لدے پھندے راستوں اور تھیلے سے ڈاک کے بڑے پیکٹ اپنی حراست اور تحویل میں لے لیتا، اپنی ذمہ داری اور ڈیوٹی سمجھتا۔ یعنی اس عمل میں اگر کوتاہی کی تو گویا تھا جیسے اسے کسی سزا اور سرزنش سے دوچار ہونا پڑ جائے گا۔ حالانکہ وہ کسی کا نہ ملازم تھا، نہ مطیع تھا نہ کسی کا دست نگر تھا اور نہ کسی مخصوص بڑی یا اہم شخصیت سے متعلق۔ مگر جوں ہی ڈھیر سارے خطوط پوسٹ مین ڈاکٹر کو تھماتا وہ لپک جھپک کر بازار کی بھیڑ کو چیرتا، خوشی سے لبریز، چاق و چست ہو کر اپنی بوسیدہ چپلوں کو گھسیٹتا، سر پر دھری سفید کپڑے

کی ٹولی کو جاتا تو کہ دم اپنے محلے میں ڈاک کی تقسیم کا کام تیزی سے انجام دینا نہ بھولتا ۔ پتہ نہیں اسے سبھی شمار خطوط اور لفافوں پر لکھے نام ایک بار پوسٹ مین سے سن کر کیسے ازبر ہو جاتے تھے اور وہ ان کی تقسیم اور ترسیل میں کبھی غلطی نہ کرتا۔ پوسٹ مین بھلے ہی کوئی غلط نام اور پتے پر خط پہنچا دیتا ہو لیکن ڈاکٹر سے یہ احتمال اور امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ علین کا خط غنین کے ہاتھوں میں دیدے۔ خوشی کی محفل ہو یا غم کی مجلس، ڈاکٹر ہر جگہ موجود رہنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

وہ کسی کا عزیز تھا نہ رشتہ دار، مگر سبھوں سے اس کا ناطہ اور تعلق تھا۔ جس نے بھی اسے کوئی کام، کوئی ذمہ داری سونپ دی، ڈاکٹر اسے انجام دے کر ہی دم لیتا۔ اپنی ان خدمات، بھاگ دوڑ، جانفشانی اور محنت کا وہ کبھی کسی سے کوئی معاوضہ طلب نہ کرتا۔ کسی قسم کا لالچ، سودے بازی کا حریصانہ انداز کبھی اختیار نہ کرتا۔

اپنے مختصر سے وجود اور محدود دنیا میں وہ تقریباً نصف صدی تک لوگوں کی خدمت انجام دیتا رہا اور اپنے بے داغ مردانہ کردار اور بے لوث چال چلن اور شخصیت کی چھاپ چھوڑ دی۔ بچوں، بڑوں، عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بزرگوں، سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں کے اہل کاروں و اراکین کے ذہنوں پر اپنی مخصوص امیج، گو اپنائے وہ جیتا رہا نہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں حریص تھا، نہ رہن سہن کے معاملے میں شوقین تھا۔ معمولی کپڑوں میں ہی مگن رہتا جو مل جاتا اسے غنیمت جانتا، وہ دکھی ہوتا نہ ملول ۔۔۔ وہ معمولی معمولی کام انجام دے کر ہی خوش ہوتا۔ کوئی شکوہ کوئی گلہ اسے نہ زمانے سے کبھی ہوا نہ کسی سے۔ اپنے دل و دماغ کی باتیں کسی کو سناتا جبکہ وہ پردہ نشین عورتوں کے سربستہ رازوں کو قریب سے جانتا تھا مگر کبھی کسی کا راز افشا بھی نہیں کیا۔ اس نے نہ خود نوجوانی میں عشق کیا اور نہ کسی کے معاشقے میں مددگار ثابت ہوا۔ اس کا وجود تو

لیکن شخصیت کا [illegible] کی [illegible] شکن اور [illegible] داغ [illegible] اور [illegible] اس کا [illegible] تک [illegible] پہنچے اس کا [illegible] اور [illegible] دلچسپ رہا۔ اس کی ذات حقیقی معنوں میں ایک ایسے مسیحا کا روپ اختیار کر چکی تھی جو دوسروں کے دکھوں اور پریشانیوں کو دور کرنے میں ہی دل چسپی رکھتی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا اپنا کوئی نہ تھا مگر وہ سب کا تھا۔ اس کی نہ کوئی ماں تھی نہ بہن اور نہ بھائی ہی اس کے درمیان تھا۔ عورتوں کے درمیان رہا تو بھی اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی، جس سے پتہ چلتا کہ وہ اپنے حلیہ اور شکل و صورت اور مردانہ اوصاف کی فطری ضرورت اور جبلت کے تحت ہی ڈگمگا گیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عجیب قلندرانہ ذات و صفات کو وہ اپنے وجود پر جیسے منڈھے تھا۔ وہ زاہد خشک بھی نہ تھا، واعظ بھی نہ تھا، ناصح بھی نہ تھا، آوارہ گرد اور صحرا نورد بھی نہ تھا نہ وہ کسی کے مال و دولت سے متاثر و مرعوب تھا، عزت و شہرت سے، جوانی سے لیکر ادھیڑ عمر تک وہ جوش و ولولے اور خدمت کے جذبے سے مالا مال رہا۔ دوسروں کا کام انجام دینا ہی اس کا پہلا اور آخری مشغلہ تھا۔ یوں تو اس کی ذات سے بھی وابستہ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے واقعات و واردات مبہم ہوں گے مگر اس کی بے لوث ایمانداری، بے غرضی، دنیا داری، خدمت گزاری کی داستانیں، لوگوں کے ذہنوں سے کبھی محو نہ ہو سکیں گی کیونکہ اس نے بے غرض ہی خدمت کرنا اپنا فریضہ بنا لیا تھا۔

ڈاکٹر کی زندگی میں سپاٹ پن نہیں تھا۔ لیکن کوئی ہنگامہ خیز ہلچل بھی نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ہر ایک کی دلچسپی اور توجہ کا باعث رہا۔ اس نے نہ کسی کو دکھ پہنچایا یا نہ دھوکہ اور فریب ہی دیا۔ نہ وہ غیبت کا شکار ہوا، نہ کسی کا قصیدہ خواں بنا، نہ وہ بھکاری تھا نہ گداگر، نہ خدائی فوجدار اور ٹھیکیدار، مگر ہاں وہ سبھوں کا ہمدرد تھا۔ سبھی سے رغبت، و الفت روا رکھتا تھا نہ کسی سے اختلاف، نہ دوستی، نہ مصاحبت اس نے اختیار کی، یہی وجہ ہے کہ وہ ہم لوگوں کے درمیان رہ کر بھی اپنی الگ ہی شناخت رکھتا تھا۔ اپنی ہی ذات اور شخصیت میں جیتا رہا۔ اس کے ذہن،

(باقی صفحہ پر)

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: چراغ منزل (شعری مجموعہ) شاعر: [illegible]
قیمت: پچیس روپے۔ ناشر: بزم ادب رام پور

فراق گورکھپوری نے جن کے کلام کے بارے میں یہ فرمایا ہو کہ "آپ کے کلام سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں" وہ ڈاکٹر راہی ہندستان کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کی ادبی فضا لسانی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ راہی صاحب ہندی میں بھی اتنے ہی کامیاب ہیں جتنے اردو میں۔

بعض مختصر کتابچوں کے علاوہ اردو میں ان کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا دیوان "منزل کی طرف" پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ "چراغ منزل" ان کا دوسرا کارنامہ ہے جو ان کے ادبی افکار کا آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر راہی کی اہم شاعرانہ صداقت یہ ہے کہ ان کے یہاں تصنع نہیں اور ان کی غزلوں میں جدتِ خیال اور خلوص فکر کی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے۔

رامپور جو ہمیشہ سے زبان و ادب کا شہر رہا ہے اس کی فضائیں ان کے موسم راہی صاحب کی شاعری میں جھلک رہے ہیں۔ ممتاز اکابرین فکر کی آرائیں بھی شامل ہیں۔

بہت اچھی رائے دی ہے ڈاکٹر [illegible] (گورکھپور یونیورسٹی) نے کہ "[illegible] ان کی موزونی کو صرف ایک شعر نے [illegible] اور ان [illegible] کا کلام [illegible] ایسے کتنے ہی اشعار ہیں۔"

میری [illegible]
[illegible]

ان کے مطالعے سے یقیناً ایک روشنی حاصل ہوگی۔

تسنیم فاروقی

نام کتاب: خوشبو کا کرب (شعری مجموعہ)
شاعرہ: نکہت خان، قیمت: پانچ روپے
ناشر: شالیمار پبلی کیشنز۔ نیا ملک پیٹ۔ حیدرآباد ۳۶

"خوشبو کا کرب" کی شاعرہ نکہت خان صاحبہ ناگپور کی ہیں اور بقول خواجہ عبدالغفور صاحب ایر فورس سے وابستہ ہیں۔

نکہت شاعری کے اعتبار سے بھی نو عمر ہیں لیکن ان کے کلام میں جذبے کی صداقت اور شاعرانہ کیفیت موجود ہے۔ بقول غیاث بارہ بنکوی صاحب "اگر نکہت صاحبہ نے اسی لگن اور خلوص سے مشق جاری رکھی تو وہ ادبی دنیا میں اپنے لیے ایک ممتاز مقام بنا لیں گی"۔

نکہت کے چند منتخب اشعار پیش خدمت ہیں :-

بچھڑنا تم سے مرے واسطے عجیب نہ تھا
کہ پیار پانا تمہارا مرا نصیب نہ تھا
ہر ایک سمت مرے دوست ہی تو بکھرے تھے
تمام شہر میں میرا کوئی رقیب نہ تھا

میں پھر فریب کھانے کو تیار ہوں مگر
چہرے کو تم اپنے کوئی تازہ نقاب دو
اب ہم میں ان کے واسطے کوئی کشش نہیں
موسم کے ساتھ ساتھ ہی رشتے بدل گئے

(ڈاکٹر) ذکی کاکوروی

★

عبدالحلیم شرر اور منشی نول کشور، صفحہ ۲۵ کا بقیہ

تقسیم ہو جانے سے ان معاملت پر شرر نے اپنا ناول [illegible] دلچسپ ۹۶-۱۸۹۵ء کے درمیان لکھا جو خاصا مقبول ہوا اس کے فوراً بعد ۱۸۹۶ء میں ناول دلکش ہے اور ملک العزیز ورجینا [illegible] اللہ [illegible] ہی شرر نے اپنا اخبار دلگداز بھی [illegible] سے شرر کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے

۱ شخصیات نمبر نقوش صفحہ ۱۱۲ ۲ بزم المصنفین صفحہ ۲۰۵ ۳ نول کشور نمبر بیاد دور صفحہ ۴۴

[illegible]

۵ بزم المصنفین صفحہ ۲۰۶ ۶ بزم المصنفین صفحہ ۲۰۵ ۷ دلگداز مارچ ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۵

۸ نول کشور نمبر بیاد دور صفحہ ۴۴ ۹ نول کشور نمبر بیاد دور صفحہ ۶۳

*

فرشتہ تو نہ تھا، صفحہ ۱۴۹ کا بقیہ

جذبات، محسوسات، رد عمل، دکھ، تکلیف اور ضروریات، خواہشات، تمنائیں اور آرزوئیں کوئی بھی نہ جان سکا۔ نہ وہ ان کا اظہار ہی کبھی کسی سے کر سکا، شاید وہ اپنے دل کی باتیں دوسروں پر ظاہر کرنے میں اپنی ہتک سمجھتا ہو کیونکہ وہ بے حد غیور اور خود دار بھی تھا۔ اس لیے وہ ایک ایسا سربستہ راز بھی تھا جو اپنے سینے میں ہزاروں رازوں کے گھاؤ لیے جیتا رہا اور اپنے ساتھ ہی ان کو بھی دفن کر گیا۔ کیا بشر کی پہچان اس کے کردار کی سچائی ہے۔ بے لوث خدمات تھیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر کو بس ایک بار ہی بے حد دکھی اور ملول، بلکہ شکستہ خاطر دیکھا تھا۔ انھوں نے پایا تھا کہ جو تھوڑا سا اثاثہ جمع کیا تھا اس کو جب یہ پتہ چلا کہ جس کو وہ اپنے اثاثہ کا امین سمجھتا تھا وہ اس کو غصب کر گیا تو وہ بھی چپ چاپ اس صدمے اور حادثے کو جھیل گیا تھا مگر اس کا مسکراتا چہرہ اور بشاش دل اس کے اندرونی کرب کو چھپا نہ سکا تھا [illegible] بار اس کی آنکھوں سے چھلکے گئے تھے مگر لوگوں کی تسلیوں اور تشفیوں اور استفسارات کے جواب میں ڈاکٹر نے اپنا مخصوص کلمہ [illegible] اپنی قدر کہا تھا "... کچھ ... کچھ ... [illegible] ... [illegible] کی کھٹ [illegible] انسان زندہ تھا اسی وجہ سے اس کے دل کے بھیدوں کو [illegible] نہیں تھا۔ [illegible] غریبوں اور غریب [illegible] کے بیچ سے ہمیشہ کے لیے [illegible] گیا اور چلا گیا ہے تو احساس [illegible] کر دیا کہ [illegible] کے کام آتا ہو کسی سے اور قریب کا نہ خواہش مند [illegible] چپ گار ہی رہا۔

*



جنوری ۱۹۸۳ء
یوم جمہوریہ نمبر

جلد ۳۷ | نمبر ۱۰

جنوری سنہ ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا
[illegible]
پرنٹر: اشوک ڈر
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
[illegible]
قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے
[illegible]
[illegible] پوسٹ باکس نمبر [illegible]
[illegible]

عنوانات

[illegible]

اپنی بات

۲۶ جنوری ہندستان کی تاریخ میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ۱۹۵۰ء میں ۲۶ جنوری کو ہی ہمارے ملک میں ہمارے جمہوری آئین کا نفاذ عمل میں آیا تھا، جس کے تحت ہمارے ملک کی حیثیت باقاعدہ طور پر ایک عوامی جمہوریہ کی ہو گئی تھی۔ یعنی اس ملک میں جمہوری نظام باقاعدہ طور سے ۲۶ جنوری سے ہی نافذ ہوا۔ اس طرح اس سال ہم اپنی جمہوریت کی ۳۳ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ گزشتہ ۳۲ برسوں کے دوران ہمارے ملک میں جمہوریت کا جو ارتقا ہوا ہے، جمہوریت جتنی مستحکم ہوئی ہے اس کا جائزہ لینے پر جو تصویر سامنے آتی ہے وہ بڑی امید افزا اور حوصلہ مندانہ ہے۔ جمہوریت نے ہمارے ملک میں اپنی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط کر لی ہیں کہ ہندستان کو جمہوریت کے راستے سے اب کبھی ہٹایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں ان عناصر کو کڑی نگاہ رکھنی ہے، جو جمہوریت کے دشمن ہیں اور اس ملک کو جمہوریت کی راہ سے ہٹا کر تباہی کے راستے پر لے جانا چاہتے ہیں۔

آئیے اس موقع پر یہ عہد کریں کہ ہم ان عناصر سے ہوشیار رہیں گے اور ہر شعبۂ حیات میں ہر سطح پر ہر قدم پر جمہوری طرز عمل کا ثبوت دیں گے۔

● اتر پردیش میں ہمارا پنچایتی نظام بھی ریاست کی صنعتی ترقی میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ گاؤں سبھاؤں کے مالی وسائل میں اضافہ کرنے کے لیے گاؤں سبھاؤں کی مشترکہ انجمنوں کی جانب سے ہر ریاست میں ۶۱ - ۱۹۶۰ء سے پنچایت صنعتوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اس وقت ان صنعتوں نے گزشتہ مالیاتی سال تک یعنی ۲۱ سال کی مدت میں ۲۶ کروڑ ۳۴ لاکھ روپئے سے زیادہ کی لاگت کا مال تیار کر کے ۲۷ کروڑ ۲۳ لاکھ سے زیادہ کا سامان فروخت کیا اور اس طرح پنچایت صنعتوں کو ایک کروڑ ۵۶ لاکھ روپئے سے زیادہ کا منافع ہوا۔ ان پنچایت صنعتوں میں ۱۲۳۶۹ گاؤں سبھاؤں نے سرمایہ کاری کی ہے جن کا ۸۲ر ۶۵ لاکھ روپئے بطور سرمایہ حصص لگا ہوا ہے۔ ان پنچایت صنعتوں میں آٹھ ہزار سے زائد ہنرمند اور غیر ہنرمند کاریگروں کو روزگار کے مواقع حاصل ہیں۔ ان صنعتوں نے سال ۸۲ - ۱۹۸۱ء میں چھ کروڑ روپئے کی مالیت کا سامان تیار کرنے کا نشانہ مقرر کیا تھا۔ مالیاتی سال رواں کے دوران ساڑھے چھ کروڑ روپئے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے جس کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ان پنچایت صنعتوں میں لکڑی اور اسٹیل وغیرہ کا فرنیچر، زرعی آلات، سیمنٹ سے تیار کردہ سامان، جوٹ کی ٹاٹ پٹیاں، ڈنلپ گاڑیاں، اناج رکھنے کی بکھاریاں تیار کرنے اور پرنٹنگ پریس چلانے کا کام کیا جا رہا ہے۔

آہ حفیظ جالندھری

اردو میں نظم گوئی کی روایت کو ایک نیا موڑ دینے والے پرانی نسل کے ایک آخری ممتاز اور عظیم شاعر حفیظ جالندھری بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کا انتقال لاہور میں ۲۱ دسمبر ۸۲ء کو ۸۳ سال کی عمر میں ہوا۔ انھیں سب سے زیادہ شہرت "شاہنامۂ اسلام" کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" بھی بہت مشہور و مقبول ہوئی۔

حفیظ جالندھری اپنی نظموں کی بنا پر پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے بڑے البیلے گیت اور خوبصورت غزلیں بھی لکھے ہیں۔ وہ مشاعروں کے بھی انتہائی مقبول شاعر تھے۔ اپنے مخصوص انداز اور اپنے دلکش ترنم کے ذریعہ بھی وہ مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔ ان کے دو شعری مجموعوں "سوز و ساز" اور "نغمہ زار" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ان کے انتقال پر ادارہ نیا دور گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور انھیں خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

ایڈیٹر

کیفی اعظمی

سومنات

بُت شکن کوئی کہیں سے بھی نہ آنے پائے
ہم نے کچھ بُت ابھی سینے میں سجا رکھے ہیں
اپنے سجدوں میں بسا رکھے ہیں

دل پہ یہ سوچ کے پتھراؤ کرو دیوانو
کہ یہاں ہم نے صنم اپنے چھپا رکھے ہیں
وہیں غزنی کے خدا رکھے ہیں

بُت جو ٹوٹے تو کسی طرح بنا لیں گے انھیں
ٹکڑے ٹکڑے سہی دامن میں اُٹھا لیں گے انھیں
پھر سے اُجڑے ہوئے سینے میں سجا لیں گے انھیں

گر خدا ٹوٹے گا ہم تو نہ بنا پائیں گے
اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑے نہ اٹھا پائیں گے
تم اُٹھا لو تو اٹھا لو شاید
تم بنا لو تو بنا لو شاید

تم بناؤ تو خدا جانے بناؤ کیسا
اپنے جیسا ہی بنایا تو قیامت ہوگی
پیار ہوگا نہ زمانے میں محبّت ہوگی
دشمنی ہوگی عداوت ہوگی
ہم سے اس کی نہ عبادت ہوگی

وحشتِ بُت شکنی دیکھ کے حیراں ہوں میں
بُت پرستی مرا شیوہ ہے کہ انساں ہوں میں
اک نہ اک بُت تو ہر اک دل میں چھپا ہوتا ہے
اس کے سَو ناموں میں اک نام خدا ہوتا ہے

○○

پروفیسر عبدالقوی دسنوی
ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف اردو
سیفیہ کالج۔ بھوپال

سید فضل الحسن حسرت موہانی

"قد چھوٹا، لاغر بدن، رنگ صاف، آنکھیں بڑی، چہرے پر چیچک کے داغ کافی نمایاں، گول چھدری داڑھی، عمر کے لحاظ سے کسی قدر کچی، فراخ پیشانی، باریک آواز، جو جوانی میں کافی مترنم تھی، چھوٹی تال کی عینک، بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی، گھسی پسی چپل، موزہ سے کوئی سروکار نہیں، کھدر کی کاواک کی شیروانی، جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب، شرعی پاجامہ جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے، ہاتھ میں بدرنگ ساجوٹ کا ایک جھولا، چھتری، دری، تکیہ اور موٹی گلی چادر کا مختصر بستر، ٹیڑھا میڑھا پچکا، چھوٹا سا ایک ٹرنک..."[1]

یہ ساری باتیں جب یکجا ہو جائیں تو مولانا حسرت موہانی کی شکلی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس کے نیچے اُردو کے تین عظیم فن کاروں ——— پروفیسر رشید احمد صدیقی، نیاز فتحپوری، اور سجاد حیدر یلدرم کے نام ابھرتے ہیں۔ گویا اس تصویر کے نقاش یہی حضرات ٹھہرے، پھر نیاز فتحپوری نے اس تصویر میں مزید رنگ بھرنے کی کوشش اس طرح کی ہے:

"اُن کی زندگی درویشانہ بلکہ قلندرانہ قسم کی تھی، مزاج میں حد درجہ استغنا تھا، انھوں نے کبھی لیڈر بننے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے مرعوب ہوئے ——— دنیاوی لحاظ سے وہ بڑی مختصر تمنائیں رکھنے والے تھے، اس لئے کبھی ان پر مایوسی کی کیفیت طاری نہیں ہوئی، وہ بڑے مرد انسان تھے اور سخت سے سخت مصائب کو نہایت خوش دلی سے جھیل جاتے تھے۔ اپنی ضرورت کے لئے کسی سے اعانت و امداد کی خواہش کرنا ان کے یہاں کفر تھا۔"[2]

اُن کے کردار کی ان خوبیوں نے ان کا ایک خاص مزاج بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے ساری زندگی وہ سچائی کا دامن مضبوطی سے تھامے رہے۔[3]

---

[1] کچھ حسرت کے بارے میں، رشید احمد صدیقی۔ نگار حسرت نمبر، جنوری فروری ۱۹۵۲ء ص ۲۲۔ [2] تذکرۂ حسرت، نیاز فتحپوری۔ نگار حسرت نمبر، جنوری فروری ۱۹۵۲ء ص ۸۔ [3] حسرت ایک قدرداں کی نظر سے، خانی خاں (سجاد حیدر یلدرم)، بحوالہ حسرت موہانی قید فرنگ میں، عتیق صدیقی ص ۳۹-۴۰۔
[4] تذکرۂ حسرت، نیاز فتحپوری نگار، حسرت نمبر جنوری فروری ۱۹۵۲ء ص ۸

عہد سیم سے انھوں نے کبھی منہ نہیں موڑا، اور بڑی سے بڑی مخالف طاقت ان کو راہ سے ہٹا نہ سکی، نہ واپس لوٹا سکی۔ چنانچہ وہ عزم کے پکے بات کے سچے، وطن کے فدائی، حریت کامل کے شیدائی، ساری زندگی آزاد ہندوستان کی تلاش میں سرگرداں، پریشاں، مگر قید فرنگ کے مصائب کو مسکرا کر جھیلتے اور اس کی اذیتوں کی گرمی سے حوصلوں میں "مضبوطی"، ارادوں میں پختگی اور امنگوں میں تیزی پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، انھوں نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ اس راہ میں کیا کھویا کیا پایا۔ اگرچہ وہ اپنا سب کچھ کھوتے رہے اور غلام وطن کو آزاد مملکت کی سرحدوں کے قریب پہنچانے میں کامیاب ہوتے رہے۔

حسرت کی قربانیوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا، جب وہ اسکول کی تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ پہنچے، جہاں طلباء نے ان کی اس وقت کی حالت و کیفیت، شکل و صورت اور وضع و قطع کو دیکھ کر برجستہ "خالہ جان" کی پھبتی کسی۔

لیکن "خالہ جان" نے کوئی برا نہیں مانا، نہ گھبرائے، نہ کترائے، نہ کسی سے الجھے، نہ کسی پر بپھرے بلکہ نہایت خاموشی کے ساتھ حصول تعلیم میں لگ گئے، لیکن بہت جلد تعلیم کے ساتھ انگریزوں کے خلاف باغیانہ راہ پر چل نکلے، جس کی ابتداء اس وقت ہوئی جب علی گڑھ کالج کی کرکٹ ٹیم نے ایک موقع پر شملہ میں انگریز کلب کو شکست دی تھی، جیسے ہی انگریزوں پر اس فتح کی خبر کالج کے طلباء کو ملی، وہ رات کے وقت ہی اپنے کمروں سے باہر نکل پڑے اور تھالی، گلاس، اور دوسرے برتنوں کو بجا بجا کر خوشی منانے لگے۔ اس وقت "خالہ جان" بھی یعنی سید فضل الحسن حسرت موہانی اپنے کمرے سے بے اختیار نکل پڑے، لیکن کس انداز سے ذرا ملاحظہ کیجیے:

"ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تیل کو حوالۂ خاک کر کے، سب آگے آگے اپنا کوس بجاتے ہوئے کچھ فیلسوں حتیٰ کہ نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے، نتیجہ یہ ہوا کہ فرد سیاہ میں، جو پرنسپل کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے، ان کا نام لکھ لیا گیا۔"[۱]

اس کے بعد حسرت کی زندگی میں ۱۹۰۳ء بہت اہم ہے، اس لئے کہ اسی سنہ میں وہ ایک مشاعرہ کی وجہ سے کالج سے نکالے گئے، اسی سنہ میں بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی، اسی سنہ میں وہ سیاست میں باضابطہ داخل ہوئے۔ اور اسی اہم سنہ میں انھوں نے اپنا اہم ماہنامہ "اردوئے معلیٰ" جاری کر کے پہلے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا، پھر سیاست کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہو گئے۔

مشاعرہ کا واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ ۱۹۰۳ء کے اوائل میں انجمن "اردوئے معلیٰ" کے زیر اہتمام جس کے خود حسرت ناظم تھے، ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں ہندوستان کے بعض مشہور شعراء شریک ہوئے تھے جن میں مرزا غالب کے شاگرد میر مجروح اور امیر مینائی کے شاگرد گستاخ رامپوری کے نام نمایاں تھے۔ مشاعرہ نہایت کامیاب ہوا۔ گستاخ رامپوری نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع تھا:

یہ مرض گستاخ کیسا تجھ کو پیدا ہو گیا
جس کی صورت اچھی دیکھی اس پہ شیدا ہو گیا

لیکن اس کا افسوسناک پہلو یہ ظاہر ہوا کہ کسی نے کالج کے پرنسپل مسٹر ماریسن کو یہ اطلاع دے دی کہ مشاعرہ میں مخرب اخلاق اشعار پڑھے گئے اور گستاخ رامپوری کے اشعار اس سلسلے میں پیش کئے۔ ماریسن بہت ناراض ہوئے اور حسرت موہانی سے جواب طلب کیا۔ حسرت نے پہلے ماریسن صاحب کو سمجھانے اور حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب ان کا غصہ کم ہوتا نظر نہ آیا تو ان سے صاف صاف کہہ دیا:

---

۱ حسرت موہانی قید فرنگ میں، عتیق صدیقی ص ۲۹

۲ حسرت کے سیاسی رجحانات، ارادت خان شیروانی: "آج کل" دہلی۔ جون ۱۹۲۹ء ص ۵

"ممکن ہے کہ آپ کے معیار اخلاق سے ایسا ہی ہو،
ہمارے معیار اخلاق سے تو شاعرے میں کوئی خلاف
تہذیب بات نہیں ہوتی ہے"

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کالج سے نکال دیئے گئے، چنانچہ انھوں نے مجبوراً شہر میں مکان لے کر رہنا شروع کر دیا۔ لیکن اس سلسلے میں پرنسپل سے کسی قسم کی خوشامد یا سفارش پسند نہیں کی اور نہ ہی کسی قسم کے سمجھوتہ ہی کو مناسب سمجھا۔ یہ حسرت موہانی کی زندگی کا دوسرا اہم واقعہ تھا جس سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ صاف گو، کھرے اور خوددار و آزاد خیال انسان تھے، جس بات کو سچ سمجھتے تھے اس کے اظہار میں نہ پس و پیش کرتے تھے اور نہ ہی دوسروں کی خفگی سے گھبراتے تھے چاہے دوسرا شخص کیسا ہی بڑے سے بڑا کیوں نہ ہو۔

حسرت موہانی نے علی گڑھ ہی سے ۱۹۰۳ء میں "اُردوئے معلیٰ" نام کا ماہنامہ جاری کیا، جس کے ذریعہ ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندستانیوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی تابڑ توڑ کوشش کی۔ چنانچہ "اُردوئے معلیٰ" کے پہلے ہی شمارے میں "پولیٹکل سائنس" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا۔ دسمبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں ایک مراسلہ "کیا مسلمانوں کو کسی پولیٹکل ایسوسی ایشن کی ضرورت ہے" شامل تھا۔ جنوری ۱۹۰۴ء کے شمارے میں حسرت موہانی نے تحریر کیا تھا:—

"اس ضمن میں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ آئندہ
مسلمانوں کے لئے کانگریس میں شامل ہونے کی
ضرورت پر اہم خیالات ظاہر کریں گے" [1]

"اُردوئے معلیٰ" میں بعض دوسرے سیاسی مضامین اس طرح کے شائع ہوئے ہیں:—

مسلمانوں کی کانگریس سے علاحدگی — مارچ ۱۹۰۴ء
نیشنل کانگریس اور پولیٹکل ایجی ٹیشن — ستمبر ۱۹۰۴ء
مسلمان اور کانگریس — نومبر ۱۹۰۴ء
مسلمان اور پالیٹکس — ستمبر ۱۹۰۴ء
سودیشی تحریک اور بائی کاٹ — جنوری ۱۹۰۷ء
فریق نرم کی بعض غلط فہمیاں — ستمبر ۱۹۰۷ء
نیشنل کانگریس کا خاتمہ — دسمبر ۱۹۰۸ء

وغیرہ۔

یہ وہی زمانہ ہے جس میں وہ ملکی سیاست سے دلچسپی لینے لگے اور کانگریس سے متعلق ہو گئے تھے۔ اور اس کے گرم دل کے ماننے والوں — بال گنگادھر تلک، اروبندو گھوش، بپن چندرپال اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ کو اپنا رہنما تصور کرنے لگے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں وہ بمبئی کانگریس میں بحیثیت ڈیلی گیٹ شریک ہوئے، دسمبر ۱۹۰۵ء میں آل انڈیا انڈسٹریل کانفرنس بنارس میں شرکت کی اور غیر ملکی مال کے عملی بائیکاٹ میں حصہ لیا، اور سودیشی تحریک کے علمبردار بن گئے۔

۱۹۰۸ء کو حسرت کی زندگی کا نہایت اہم سال اس لئے قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس سال پہلی بار ۲۳ جون کو ایک سیاسی مضمون ... "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" مطبوعہ "اُردوئے معلیٰ" علی گڑھ بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۰۸ء کی وجہ سے وہ نظر بند کر دیے گئے۔ اس لئے کہ اس مضمون میں انگریزوں پر سخت تنقید کی گئی تھی، حسرت پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور مقدمہ چلایا گیا۔ حسرت نے اس موقع پر بلند کرداری کا ثبوت اس طرح دیا کہ باوجود کوشش کے انھوں نے مضمون نگار کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ۲ جون ۱۹۰۸ء کو اُردوئے معلیٰ پر مقدمہ قائم کیا گیا اور ۴ اگست ۱۹۰۸ء کو چند ہی پیشی کے بعد دو سال قید سخت کی سزا سنا دی گئی اس کے ساتھ پانچ سو روپے جرمانہ بھی کیا گیا۔ (مشاہدات زنداں اُردوئے معلیٰ ۱۹۰۸ء)۔ حسرت نے اس قید و بند اور مصائب کی زندگی کو بہ خوشی قبول کیا اور اسے جیل گئے [2]

---

[1] حسرت موہانی: مجنوں گورکھپوری، حسرت نمبر۔ اُردو ادب علی گڑھ ص ۸۱
[2] حسرت موہانی۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر احمد لاری ص ۲۹۰-۲۹۱

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حسرت میں مصائب اور مشکلات سے گزر جانے کی ہمت پیدا کرنے والوں میں ان کی شریک حیات نشاط النساء بیگم کا بہت بڑا ہاتھ تھا، جن کے بارے میں عتیق صدیقی مرحوم نے صحیح لکھا ہے:

"اس تاریخی حقیقت کا آج شاید کم ہی لوگوں کو اعتراف ہوگا کہ بیسویں صدی میں جو ہندوستانی خواتین جہدِ آزادی کے میدانِ کارزار میں اتریں ان میں نشاط النساء بیگم کو اوّلیت کا فخر تھا۔ وہ اس میدان میں بی اماں (والدۂ علی برادران) اور بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کی پیش رو تھیں۔ اُن کی سیاسی زندگی کا بالواسطہ مگر عملاً آغاز ۱۹۰۸ء میں اس وقت ہوا جب حسرت پہلی بار جرمِ بغاوت میں سزایاب ہوئے۔ اس موقع پر یکہ و تنہا ہونے کے باوجود انھوں نے حسرت کی ہمت افزائی کی اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی انھیں تلقین کی۔"[1]

چنانچہ "مشاہداتِ زنداں" میں حسرت موہانی تحریر کرتے ہیں:

"گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیرخوار لڑکی نعیمہ صدمۂ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدۂ نعیمہ اور ایک خادمہ کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا، لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت پر، بربنائے ہدایت و تائیدِ ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بہ ذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کارپردازانِ زنداں متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہٖ امرِ حق کی پیروی کے باعث یوں بھی قوی تھا، لیکن ان کی یہ تحریر کہ،

"تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو، میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو"

تقویتِ مزید کا باعث ہوا۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا، ہر ہفتہ آیا کیں، اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔"[2]

لیکن حسرت کے والد مرحوم کو حسرت کی اس طرح کی گرفتاری اور پریشانیوں کا بڑا احساس تھا۔ وہ جیل میں اپنے لختِ جگر سے ملنا چاہتے تھے لیکن اجازت نہیں دی گئی، چنانچہ وہ ناکام گھر لوٹے اور اس غم کی تاب نہ لاکر دنیا سے چل بسے۔ حسرت موہانی نے مشاہداتِ زنداں میں لکھا ہے:

"........ دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا، اور وہ ناکام واپس آئے، مجھے اس واقعہ کا کسی قدر افسوس ہوا ......

والد مرحوم کو میرے اس طرح گرفتارِ مصیبت ہونے کا بے انتہا قلق تھا، چنانچہ جیل سے واپس آنے کے بعد اکثر اعزہ کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعہ کے بعد ان کی صحت کبھی ٹھیک نہیں رہی اور آخرکار میری عدم موجودگی ہی میں انھوں نے انتقال فرمایا۔"[3]

اس بات کا تو سب کو علم ہے کہ حسرت بال گنگادھر تلک کو نہ صرف اپنا سیاسی رہنما مانتے تھے بلکہ وہ ان کے جان و دل سے شیدائی و فدائی تھے۔ اس دوران میں حسرت کی گرفتاری کے

---

[1] بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، مرتبہ عتیق صدیقی، پیش لفظ ص ۱ [2] مشاہداتِ زنداں، حسرت موہانی قیدِ فرنگ میں۔ مرتبہ عتیق صدیقی
[3] مشاہداتِ زنداں، حسرت موہانی قیدِ فرنگ میں مرتبہ عتیق صدیقی ص ۶۸-۶۹

ذکو ہی دن بعد وہ بھی گرفتار ہو گئے تو حسرت کو ان کی گرفتاری کا ایسا رنج ہوا کہ اپنی گرفتاری کی تکلیفیں بھول گئے، خود تحریر کرتے ہیں۔

" دو ہی روز بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس میں ایڈریس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی اور مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہو جائیں گے لیکن جسٹس داور کے فیصلے نے ساری امیدوں کا خون کر دیا۔ اسی کیفیت کی خاطر کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی، وہ نذر ناظرین ہے؛

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور
کیا خاک انھیں دادگری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا داور ہے لقب
برعکس نہند نام زنگی کافور[۱]

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں کے مصائب مختلف تھے، تلک اگرچہ گرفتار کر لیے گئے تھے لیکن انھیں ان تکلیفوں اور ذلتوں کا سامنا نہیں تھا جن میں حسرت موہانی مبتلا تھے "مشاہداتِ زنداں" کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں، جن کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی جیل میں کس قدر بے رحمانہ اور بہیمانہ سلوک کے شکار ہوئے تھے، انھیں پڑھتے پڑھتے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ لیکن شاباش حسرت موہانی! حریتِ وطن کی ایسی شراب پی تھی کہ فرنگیوں کے ان ظالمانہ سلوک کے باوجود حبِ وطن کا نشہ نہیں اترا۔

ذرا جیل خانے کا کھانا ملاحظہ فرمائیے؛ ——

" کالوں کے لئے صبح کو آدھ پاؤ چنے بطور ناشتہ دیے جانے کا حکم ہے لیکن عموماً قیدیوں کو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے۔ ناشتہ کے بعد کام پر جانا ہوتا ہے، کھانے میں جوار، باجرہ، ماش اور گیہوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں ہوتی ہیں جس میں گیہوں کی مقدار سے کچھ ہی کم مٹی یا آٹا ملا ہوتا ہے۔ جیل کی سخت مشقت سے مٹی تو کیا کنکر پتھر بھی ہضم ہو جائیں ورنہ کسی آزاد شخص کا معدہ اس روٹی کو قبول نہیں کر سکتا۔ ان روٹیوں کو کچی رکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ اوّل تو پکانے کے لئے پتھر کے کوئلے اس قدر کم ملتے ہیں کہ نئے دفعیوں (قیدی باورچی) کو کچی روٹی پکانے پر مجبور رہنا پڑتا ہے دوسرے یہ کہ کچی روٹی کے بھاری ہونے کے سبب سے مقررہ وزن کی روٹیاں کم آٹے میں تیار ہو جاتی ہیں۔ بچا ہوا آٹا دوسرے لوگوں کے کام آتا ہے،....... روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے دوپہر کو اُبلی ہوئی سبز دال اور سبزی عموماً بے روغن و بے مرچ ملتی ہے اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ پھینک دیے جانے پر کتے بھی اسے نہیں سونگھتے ....."

پوشاک کے بارے میں لکھتے ہیں، ——

" کالے قیدیوں کو ایک لنگوٹ، ایک جانگیہ، ایک کرتا، ایک ٹاٹ، ایک کمبل، ایک ٹوپی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ جن میں سے ٹاٹ کمبل سالہا سال کے لیے ....

عام قیدیوں کی پوشاک میں جانگیہ کی لمبائی اس قدر کم ہوتی ہے کہ جسم ران تک بالکل کھلا رہتا ہے اور اس طرح نماز کے لئے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی....... راقم حروف مجبوراً اسی ساتھ

۱ے مشاہداتِ زنداں؛ حسرت موہانی قیدِ فرنگ میں۔ مرتبہ عتیق صدیقی ص ۹۸-۹۹

نیم برہنگی میں نماز پڑھا کرتا ہے۔"

کالوں کے مقابلے میں گورے قیدیوں کے لباس، رہن سہن اور نشست و برخاست پر بھی حسرت موہانی نے روشنی ڈالی ہے، جس کے مطالعے سے کالوں کے ساتھ بدسلوکیوں کا شدت کے ساتھ تکلیف دہ احساس ہوتا ہے۔ ذرا آپ بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

"....گوروں کے ناشتہ میں ڈبل روٹی، چار شکر کھانے کے لیے گھی، گوشت، ترکاری، چاول، دودھ غرض کہ سب کچھ ملتا ہے اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔"

"....گوروں کو بوٹ کے کئی جوڑے مع موزوں کے ملتے ہیں، پہننے کے لیے متعدد سوٹ جن کے دھونے کے لیے علاحدہ ہندوستانی قیدی کا دھوبی کام کرتے، بیٹھنے کے لیے مسہری کا اس پر گدا اور چادر غرض کہ آرام کی تمام چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔"

"....گوروں کے قیدی کو کسی ایک کو علاحدہ ملتا ہے، جس میں ایک آہنی پلنگ گدے دار، ایک میز، ایک صندوق، ایک لیمپ اور ایک کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ اور ایک پاخانہ موجود رہتا ہے غسل خانہ میں تولیہ، صابن، ہر شے موجود رہتی ہے، رات کو لیمپ کی روشنی میں اور دن کو فرصت کے اوقات میں گورے قیدی کتابیں اور کبھی کبھی اخبار بھی دیکھتے ہیں، ان کے لکھنے کو دوات قلم ہر وقت موجود رہتا ہے۔ حالانکہ کالوں کے لیے کتاب دیکھنا تو درکنار اگر ان کے پاس کاغذ کے ایک پرزے کا بھی شبہ ہو تو قیامت آجائے...."

"....سب سے بڑا تماشا یہ ہے کہ ہر یورپین قیدی کے کمرے پر دو ہندوستانی قیدی کا رات بھر پنکھے کا کام دیتا ہے...."

آزادئ وطن پر قربان ہونے والے سیاسی قیدیوں کے ساتھ اس قدر بے رحمانہ، اذیت ناک اور ناروا سلوک کہ ایک بار کے بعد دوسری بار کی ہوس باقی نہ رہے لیکن حسرت موہانی ان تمام تکلیفوں کو خاموشی کے ساتھ جھیلتے رہے اور پیشانی پر بل پڑنے نہیں دیا بلکہ اسے وطن کی خاطر جھیلنے میں لذت محسوس کرتے رہے اس دوران میں رمضان کے مبارک مہینہ بھی آئے تو وہ روزے بھی رکھتے رہے۔ عبادت بھی کرتے رہے اور ختم ہونے پر "الوداع" بھی کہتے رہے۔

الوداع اے ماہ رمضان الوداع
الوداع اے مونسِ جاں الوداع

تجھ سے روشن تھا سوادِ ملک و جاں
اے چراغ نور و ایماں الوداع

اے زمانِ رحمتِ حق الفراق
اے محبِ اہلِ عصیاں الوداع

اے نشانِ شانِ صبر و فقر عشق!
شاہِ عشاقِ حیراں الوداع

لذتِ افطار اے لطفِ سحر
تم میں تھا عیشِ فراواں الوداع

عین راحت تجھ سے تھی تکلیفِ قید
اے انیسِ اہلِ زنداں الوداع

قدر جانی کچھ نہ تیری اے عزیز
تجھ سے حسرت ہے پشیماں الوداع

ایک جگہ یہ اعلان بھی کیا۔

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

اور فرنگیوں سے مخاطب ہو کر یہ بھی کہا۔

روح آزاد ہے خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بے کار

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

اور یہ بھی کہتے ہیں ؎

خوشی سے ختم کرے سختیاں قیدِ فرنگ اپنی
کہ ہم آزاد ہیں بیگانۂ رنجِ دل آزاری

اور جب قیدِ فرنگ سے رہائی کے دن قریب آئے تو بے اختیار ان کے منھ سے نکلتا ہے ؎

بڑھ گیا جوشِ آرزوئے حسرت
ختم ہونے کو آئی قیدِ فرنگ

حسرت موہانی ۱۹۰۹ء کو جیل سے رہا ہوئے تو "مشاہداتِ زنداں" اور غزلوں کا تحفہ ساتھ لائے گویا چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن کو بھی جاری رکھا اور اس طرح فرنگیوں کے مظالم کے دکھ درد کو خیالِ یار کی رعنائی اور کیف و مستی سے بھلاتے رہے۔ ان کا یہ سارا کلام دیوانِ حسرت موہانی حصہ اول، جس میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک کا کلام جمع ہے ملتا ہے، چونکہ ان غزلوں کے ساتھ تاریخ اور سنہ درج نہیں ہے اس لئے یہ معلوم کرنا بڑا دشوار ہو گیا ہے کہ کون سا کلام قیدِ فرنگ کا ہے اور کون سا قید سے پہلے یا بعد کا ہے میں نے ایسی غزلوں کو الگ کرنے کی کوشش کی تو مشکل سے سولہ سترہ ایسی غزلیں مل سکیں جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قید کے زمانے ہی میں کہی گئی ہیں، حالانکہ اُن سے بہت زیادہ غزلیں حسرت نے ایامِ اسیری میں کہی ہوں گی۔

ان غزلوں کا مطالعہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ حسرت پہلے اُردو کے غزل گو شاعر ہیں جن کا عملی سیاست سے اس قدر گہرا لگاؤ تھا، وہ پہلے مدیر تھے جنھوں نے اپنے رسالہ "اُردوئے معلّٰی" کو ادب کے ساتھ سیاسی شعور بیدار کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جس کی پاداش میں انھیں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ ان کی سیاست سے گہری وابستگی کی وجہ سے وہ اُردو غزل کے تنہا شاعر نظر آتے ہیں جن کی غزلوں میں سیاست کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ حسرت نے نہایت سلیقے سے اپنے سیاسی شعور کو غزلوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ وہ بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں جس کا نتیجہ ہوا ہے کہ غزل کا دامن وسیع ہوا ہے۔ ان کی

اس دور کی غزلیں جو سیاسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں ملاحظہ کیجئے :—

جور پیہم نہ کرے شان توجہ پیدا
دیکھو بدنام نہ ہو نام ستم گاری کا

خوبیٔ دو روزہ کو عشرتِ جاوداں نہ جان
فکرِ معاش سے گزر حوصلہ معاد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

اُٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت بھی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
کہیں صلح دنیا سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

ہے غضب ہنگامۂ فصلِ بہار اب کی برس
دل پہ کاہے کو رہے گا اختیار اب کی برس
ہے جنونِ شوق ابھی سے بیقرار اب کی برس
کیا غضب ڈھائے گا طوفانِ بہار اب کی برس
کامیابی جلد ہوگی آکے پابوسِ امید
کھینچ ڈالیں اور رنجِ انتظار اب کی برس

آزاد ہیں قید میں بھی حسرت
ہم دل شدگان خود فراموش

بے کار تو اے دولتِ حسرت کو نہ دے لالچ
ہے تیرے بکھیڑوں سے وہ خاک نشیں واقف

مغموم نہ ہو خاطرِ حسرت اکہ تلک تک
پیغامِ وفا بادِ سحر لے کے گئی ہے

ہر چند ہے دل شیدا، حریتِ کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیمبر میں ہے

لیکن قید خانے کی اس تکلیف دہ تپتی دھوپ میں حسرت موہانی یا مجاہدِ آزادی، محبت کا راگ بھی الاپتے ہیں، عشق کی کیف و مستی سے سرشار بھی نظر آتے ہیں۔ محبوب کو یاد بھی کرتے اور اس کی پیکر تراشی سے لطف بھی اٹھاتے ہیں، اس کے حسن و جمال کے تذکرے سے خود محظوظ ہوتے ہیں اور فضا کو بھی حسین و جمیل بناتے ہیں، جس سے خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کے بھی ہوش اڑا دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اردو غزل میں عام طور سے محبوب کی ایسی پاکیزہ تصاویر کہاں دیکھنے کو ملتی ہیں، اور وہ بھی آہنی سلاخوں کے پیچھے۔

رنگِ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

لطف کر لطف اے سراپا ناز
دلِ عشاق میں امید کے جام
اے تیری ذات مجمع ضدین

تجھ پہ رنگینیِ بہار نثار
بادۂ اشتیاق کے سرشار
حسن سب نور ہے، تو خوب سب نار

غمزۂ دلفریب کو اور بھی جانفزا بنا
پیکرِ نازِ حسن پر رنگِ حیا زیاد کر

اس عشوۂ نازنیں کے جلوے
ہیں دشمنِ عقلِ مصلحت کوش

روشن خیالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

ہے نازِ حسن سے جو فروزاں جبینِ یار
لبریز آبِ نور ہے چاہِ ذقن تمام

دل بس کہ ہے دیوانہ اس حسنِ گلابی کا
رنگیں ہے اسی رو سے شاید غمِ فرقت بھی

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی
اے حسنِ حیا پرور، شوخی بھی شرارت بھی

اس دورِ قید و بند کے چند اشعار اور ملاحظہ کیجئے جن میں حسن و عشق کے معاملات کی ترجمانی نہایت سچے، اچھے اور سادہ جذبات کے ساتھ کی گئی ہے۔ اسلوب میں سادگی کے ساتھ دل نشینی اور ایک خاص قسم کی لطافت محسوس ہوتی ہے ؎

عشق کی روحِ پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر
اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر

جاں کو محوِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر

فرقتِ ساقی میں ہم حسرت کشانِ بادہ سے
دل کے رویا خوب ابرِ بہار اب کی برس
مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر اے عجب
یادِ یار آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس

پیمانِ وفا نہ کر فراموش!
اے حسرتِ بے قرار خاموش
دیوانۂ حسنِ پاک داماں
ہے پردۂ دل میں عشق روپوش
پوشیدہ سکوں یاس میں ہے
اک محشرِ اضطرابِ خاموش

عہدِ مستی کے اب کہاں وہ رنگ
ساغرِ بادہ ہے نہ کاسۂ بنگ
ایسی پھر شب نصیب ہو کہ نہ ہو
ساقیِ ماہ وش کرے نہ درنگ
خوب تھا وہ زمانِ رسوائی
خوب تر تھی وہ عشق و عقل کی جنگ
آہ وہ شہرِ کانپور کی شام
وہ لبِ نہر وہ کنارۂ گنگ
ہیں طلب گارِ شوقِ گونا گوں!
حسن کے جلوہ ہائے رنگا رنگ

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
دل خون ہو چکا ہے جگر ہو چکا ہے خاک
باقی ہوں میں مجھے بھی کرائے تیغ زن تمام
اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام
گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

وفا سے دشمنی رکھ کر میسر دل کی طلب گاری
بہت مشکل ہے اس جنسِ گراں کی خریداری
ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں، رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹیں ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری
وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغازِ محبت میں
نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری
نہیں غم جیب و داماں کا مگر ہاں فکر ہے اتنی
نہ اٹھے کام میرے دستِ جنوں سے رنجِ بیکاری
نہ چھوڑا مرتے دم تک ساتھ بیمارِ محبت کا
قسم کھانے کے قابل ہے ترے غم کی وفاداری!
وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے مجرم ہوں اقراری
چلا برسات کا موسم نہ چھوٹے قید ہم سے ہم
بڑی بے لطفیوں میں اب کی گزرا وقتِ مے خواری

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی
بادل جو نظر آئے بدلی میری نیت بھی
عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

اب ذرا، ان حسن و عشق سے بھرپور اشعار کو پڑھتے ہوئے علی گڑھ ڈسٹرکٹ جیل، اور نینی سنٹرل جیل کی سلاخوں کے پیچھے جھانک کر دیکھیے، وہی حسرت موہانی ہیں، نہ پیشانی پر بل، نہ چہرے سے خوف و ہراس کا اظہار، نہ تکان کا احساس' — یادِ محبوب میں کھوئے ہوئے حبِ وطن میں مست و سرشار — نجاتِ ہند کی آرزو میں ڈوبے ہوئے، اور ہر طرح کی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے تیار لنگوٹ باندھے، چکی چلانے میں مصروف اور لب پہ حرفِ غزل ہے

اچھلے ہے اہلِ جور کہے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِ وطن تمام

گیت وطن کا

بیکل اُتساہی
بلرامپور۔ ضلع گونڈہ
(یو۔پی)

یہی بہاروں کی جنت یہی سکوں کا چمن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

اسی کو کہتے ہیں اہلِ قلم غزل کی زمیں
یہی گلاب کی دھرتی یہی کنول کی زمیں
کلی کلی ہے یہاں رنگ روپ کا درپن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

یہ کوہسار کسی سنت کی دُعا جیسے
مچلتی ندیاں ہریشچندر کی وفا جیسے
یہیں پہ چومے ہے آکاش پربتوں کا چرن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

ٹپکتے ہیں لعل و گہر جنگلوں کے دامن میں
ہے فصل جیسے دلہن کھیتیوں کے آنگن میں
انوکھی اُوشا کی باہوں میں کنمناتے سپن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

یہ رُت بسنت نئی فصل کی سہیلی ہے
جوان سرسوں کی مہندی لگی ہتھیلی ہے
سجائے گوری کا جوڑا یہیں چمپے کی پھبن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

دہکتے کھیتوں میں گیہوں کی بالیاں لہکیں
سلگتے پیڑوں کی ڈالوں پہ کوئلیں چہکیں
گلال ملتی ہوئی پھاگنی ہوا کی چبھن !
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

لپکتے کوندھا کی انگڑائیوں میں اُرکا بھرم
اَجانی راہ میں پُروا کے لڑکھڑاتے قدم
گھٹائیں جام پئیں نشے میں رہے ساون
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

یہ گنگناتی نشیلی سی شام پنگھٹ کی
یہ بانسری سے حسیں چھیڑ چھاڑ نٹ کھٹ کی
سہیلیوں کی یہ کلکاریاں لجاتے نین !
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

برات آئی ہے دُوارے سنگار رقص میں ہے
مچل رہی ہیں نفیریں بہار رقص میں ہے
بیاہو گاتی ہیں سکھیاں سسک رہی ہے دلہن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

یہ اپسرائیں فضاؤں میں رات رانی کی
سمٹتی لاج کو گھونگھٹ میں نوجوانی کی
دمکتا دیوی کا مکھڑا کہ دیوتا کے چرن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

یہ لوریوں کے ہنڈولے میں سوئی انگنائی
کہ چاندنی بھی کٹورے میں دودھ بھر لائی
کھلونا پانے کو گودی میں کھیلتا ہے للن
یہی وطن ہے مرا یہی ہے میرا وطن

سکندر علی خان
ایم اے
تلہر۔ شاہجہاں پور

جمہوریت

ہماری زندگی، ہماری پہچان

ہماری تہذیب گنگا جمنی تہذیب، ہمارا سماج رنگ رنگ کے پھولوں کا مجموعہ، ہمارا مزاج قومی یکجہتی کا آئینہ دار، کتنی زبانیں کتنے لباس جیسے دھنک کا تصور اور روئے زمین پر اس کا عملی روپ۔ ایسے ملک میں اگر کوئی طرزِ حکومت پنپ سکتی تھی تو وہ جمہوریت کے سائے میں ہی پنپ سکتی تھی۔ رشیوں منیوں سادھو سنتوں نے جو روحانی فضا تیار کی اور بے پناہ ریاضت کے بعد جو عرفان حاصل کیا، اس کے فیضان نے شاہ و گدا کو ایک ہی صف میں لاکھڑا کیا۔ ہندوستان دنیا کا عظیم ترین جمہوری ملک ہے۔

اس سال ہم اپنی جمہوریت کی تینتیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس فخر و انبساط کے جذبے کے ساتھ کہ اکابرین کا فیصلہ بہرحال درست ثابت ہوا۔ انھوں نے اس ملک کو جمہوری ملک بنانے کا خیال چند ساعتوں میں نہیں کیا۔ اس وسیع و عریض خطۂ زمین کا ماضی و حال ان کے پیش نظر تھا۔ یہاں کی زبانیں، یہاں کی تاریخ اور یہاں کی تہذیبیں اسی کی متقاضی تھیں کہ سب کو ایک ایسی ڈور میں باندھ دیا جائے کہ سارے رنگ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ایک ایسا انوکھا رنگ اختیار کرلیں جو اتحاد و اتفاق کا سنگم کہلائے۔ ظاہر ہے کہ یہ رنگ جمہوریت ہی سے آسکتا تھا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خدانخواستہ مخالف ہواؤں کے دباؤ سے اگر کوئی ایسا قدم اٹھ جاتا جو جمہوریت کی راہ پر نہ ہوتا تو یہ عظیم دیش انتشار اور بدامنی کا ایسا گہوارہ بن جاتا جس سے تاریخ کے صفحات سیاہ ہوجاتے اور آج ہم سب نوحہ خوانوں کی صف میں نظر آتے۔

جب بھی باہر سے سربراہانِ مملکت یہاں آتے ہیں اور بھارت کے طرز حکومت سے متاثر ہوکر کلمات خیر ادا کرتے ہیں تو بے اختیار باپو کی عظمت، نہرو، آزاد، ڈاکٹر انصاری اور امبیدکر جیسے صد دانشوروں کی رفعت، چشم تصور سے اوج ثریا کو چھوتی نظر آتی ہے اور اس قافلے کے ہر فرد کو دل خراج عقیدت پیش کرتا ہے جس نے نہ صرف غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا بلکہ ایسا دستور مرتب کر گیا جو آنے والی نسلوں کو روشنی دیتا رہے گا اور جس پر کاربند رہ کر ہندوستان دنیا میں ہمیشہ سربلند و سرخرو رہے گا۔ ویسے جمہوری نظام اس ملک میں پہلے بھی تھا۔ آریوں کے آنے سے پہلے یہاں گاؤں پنچایتوں کا رواج تھا۔ یہ پنچایتیں گاؤں کے ہی منتخب لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں جو گاؤں والوں کے مسائل کا حل ڈھونڈتی رہتی تھیں اور ان کے مفاد میں سرگرم عمل رہتی تھیں۔ یہ پنچایتیں تعمیری کاموں کے لیے گاؤں والوں سے محصول بھی لیا کرتی تھیں۔ آریہ جب شمالی ہند میں آئے تو انھوں نے کچھ ترمیم کے ساتھ اس نظام کو برقرار رکھا۔ جنوبی ہندوستان میں بھی ۱۸ ویں صدی تک ۱۱

پنچایتوں کا رواج رہا۔ دیہات پوری طرح آزاد اور خود مختار ہوتی تھیں۔ وہ گاؤں والوں سے مالگزاری وصول کر کے خود ہی شاہی خزانے میں جمع کرا دیتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مقدمات کا فیصلہ وہ خود کرتی تھیں اور جو کام دوسرے گاؤں سے متعلق ہوتے تھے انھیں یہ متعلقہ علاقوں کی پنچایتوں کے اشتراک سے انجام دیتی تھیں۔ جب انگریزوں کا پوری طرح تسلط ہو گیا تو انھوں نے اس طریقۂ کار پر ضرب لگائی اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ مالگزاری وغیرہ کی وصولیابی کرنے لگے۔ اس طریقے نے کاشت کاروں کو بے حد نقصان پہنچایا اور جو کام وہ خوش گوار فضا میں بہ آسانی انجام دیتے تھے اب وہی کام زور زبردستی اور ظلم و تشدد کا پیش خیمہ بن گیا۔ کاشتکاروں کا استحصال ہونے لگا اور تعلقہ داروں کی رسی دراز ہوتی گئی۔

پھر وہ ساعت مسعود بھی آئی جب ملک آزاد ہوا، انگریز چلے گئے اور ظلم و ستم کا ایک طویل دور ختم ہوا۔ ایک سات رکنی کمیٹی جس کے سربراہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر تھے، دستور سازی کے لیے مقرر کی گئی۔ آخرکار مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آئین مرتب ہوا اور ۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو اسے شائع کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ماہرین قانون نے اپنے اپنے نقطۂ نظر پیش کیے۔ دستور کی خامیوں اور خوبیوں کو خوب پرکھا گیا۔ دستور ساز اسمبلی میں سیر حاصل بحث ہوئی۔ اس طرح اس اہم کام کی تکمیل میں دو سال گیارہ ماہ اور اٹھارہ دن صرف ہوئے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے آئین کا نفاذ کر دیا گیا ـــــ دنیا میں جتنے بھی ممالک ہیں اور ان کے جو آئین ہیں، دستور ہند ان سب سے ضخیم ہے۔ اس کی تیاری میں ۶۲ لاکھ ۹۶ ہزار ۷سو ۲۹ روپئے خرچ ہوئے۔

اپنے ملک کی جمہوریت ایک امانت ہے جسے نسل در نسل منتقل ہونا ہے، اس لیے جب بھی یوم جمہوریہ آئے، یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ جمہوریت کیا ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے فوائد کیا ہیں۔؟ کیا اس طرز حکومت کی غیر موجودگی میں ان سہولتوں کا تصور کیا جا سکتا تھا جو پچھڑے طبقوں کو دستور ہند کے فیض سے حاصل ہوئی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جمہوریت کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ صدیوں سے کچلے ہوئے مجبور و نادار افراد کو باوقار طریقے سے جینے کا حق مل گیا۔ سچ کہا تھا معمار قوم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک انگریز فلم ساز سے جو گاندھی جی پر ایک فلم بنا رہے تھے، کہ فلم ضرور بناؤ مگر یہ خیال رکھنا کہ باپو کو دیوتا نہ بنا دینا وہ ایک عظیم انسان تھے، اس نقطہ پر ہمیشہ نظر رکھنا۔ جب جب قوت کا استحصال ہوا، ظلم و زیادتی کی حدیں ختم ہو گئیں، نابرابری کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں، بغض و نفرت کی آندھیاں تیز سے تیز تر ہو گئیں، اپنے جیسے انسانوں کو جانوروں سے بدتر سمجھا گیا تب باپو جیسے لوگ پیدا ہوئے جن کے پاس نہ افراد کی طاقت تھی نہ مادی وسائل۔ مگر وہ روحانیت کا ایسا جوہر لے کر آئے تھے جس کے سامنے بڑی سے بڑی دنیاوی قوت سر بہ خم ہو گئی۔ ہندوستان میں جمہوریت کی بات باپو کا ذکر کیے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔

جمہوریت کی بنیاد انسانی قدروں پر رکھی گئی ہے، اس میں جیو اور جینے دو کے حق کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ جمہوریت ہی ہے جو فرد کی اہمیت تسلیم کرتی ہے اور سماج کا تصور بھی محفوظ رکھتی ہے۔ یہاں عدلیہ کو انتظامیہ سے علاحدہ رکھا جاتا ہے۔ جمہوریت میں حکومت عوام کی نمائندہ ہوتی ہے جس کے احتساب کا حق عوام کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں آئے دن اس طرح کی مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں کہ حکومت کے خلاف عدالتیں فیصلہ سنا دیتی ہیں اور حکومت اسے بسر و چشم تسلیم کر لیتی ہے۔ اس ضمن میں ایک امر کی طرف ضرور نظر جاتی ہے اور وہ ہے اپنے مطالبات کے سلسلے میں ہڑتالیں، تخریب کاری اور توڑ پھوڑ۔ جمہوری آزادی کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم جوش میں، دیوانگی کی حد تک پہنچ جائیں۔ بسوں کا جلانا، کارخانوں کا بند کر دینا، یہ رجحان نہ صرف گمراہ کن ہے بلکہ سارے ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔

ہم سب کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ملک کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں ہے جو جمہوری قدروں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ جمہوریت کے پیامی ہیں اور اسی راستے سے ملک کو آگے لے جانا

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

آفتاب نقوی سہسوانی
آدرش انٹر کالج، کوڑا جہان آباد
ضلع فتحپور۔ یوپی

جلوۂ جمہوریت

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
اس کا ہر ایک ذرہ رشکِ مہِ درخشاں
اس کا ہر ایک گوشہ اک خیرگی کا ساماں
شرمائے کہکشاں بھی آکر اس انجمن میں

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
گھر گھر میں نور پھیلا ہے اک نئی سحر کا
چمکا نصیب گویا ہر ایک بام و در کا
وہ ظلمتِ شبِ غم اب ہے کہاں گگن میں

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
گرجا میں ہو رہی ہیں انجیل کی دعائیں
مندر سے آرہی ہیں ناقوس کی صدائیں
گونجی اذاں سحر کی ہر چار سو گگن میں

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
ہندو ہیں یا مسلماں، باسی اسی زمیں کے
عیسائی اور سکھ سب پالے ہوئے یہیں کے
عنوانِ فصلِ گل ہے ہر پھول اس چمن میں

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
ہر حوصلہ نیا ہے ہر آرزو نئی ہے
اب اہلِ کارواں کی ہر جستجو نئی ہے
ملنے لگی ہے راحت اب راہ کی تھکن میں

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
صدیوں سے جو دبے تھے اب سر اٹھا رہے ہیں
سعیِ گراں سے اپنی خود کو بنا رہے ہیں
بجلی سی بھر گئی ہے گویا ہر اک بدن میں

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
اپنی اہمیت کو مزدور جانتے ہیں
محنت کو اپنی گویا اک فرض مانتے ہیں
تسکینِ جان و دل ہے ہر کام کی لگن میں

جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں
کتنی حسین و دلکش دنیائے رنگ و بو ہے
اہلِ چمن کی کچھ ہے، تو بس یہ آرزو ہے
یہ فصلِ گل ابد تک باقی رہے چمن میں
جمہوریت کی دیوی ہے ضوفشاں وطن میں

OO

ساجدہ واحدی
اسپیشل ایکزیکیوٹیو مجسٹریٹ
مقام املنیر ضلع جلگاؤں
مہاراشٹر

غزل

انسان جی رہا ہے مگر بے دلی کے ساتھ
کتنا عجب مذاق ہے یہ زندگی کے ساتھ

آنکھوں میں اشک آتے ہی ہم مسکرا دیے
غم کی ہنسی اڑائی ہے کس سادگی کے ساتھ

افسردہ دل، اداس نظر، حال مضطرب
کیا کیا ہمیں ملا ہے تیری دوستی کے ساتھ

منزل کا دور دور نہیں ہے کہیں پتہ
انساں بھٹک رہا ہے نئی روشنی کے ساتھ

اہلِ خرد بھٹک کے گئے کس طرف نہ پوچھ
اچھا ہوا کہ رہ گئے ہم بے خودی کے ساتھ

اے ساجدہ ہے یوں ہی نباہ دنیا کے ساتھ
جس طرح اجنبی ہو کوئی اجنبی کے ساتھ

حسین امین
نہرو بھون۔ قیصر باغ
لکھنؤ

رانی جھانسی تقریبات

انیس سو بیاسی عیسوی کے اکتوبر کا سولہواں دن سرزمین بندیل کھنڈ کے مشہور تاریخی شہر جھانسی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ بن کر آیا جب ۱۶۰ روزہ "رانی جھانسی سماروہ" کی اختتامی تقریب میں وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی سمیت ہندوستان بھر کے ہزاروں افراد پر مشتمل ایک نمائندہ مجمع نے جھانسی کے پر شکوہ قلعہ کے سامنے اکٹھا ہو کر اس "جواں مرد" خاتون رانی لکشمی بائی کو نذرانہ عقیدت پیش کیا جس نے سوا سو برس قبل ۱۸۵۷ء میں صرف وطن عزیز کی آزادی کے لیے فلک شگاف نعرہ بلند کیا، بلکہ میدان عمل میں کود کر برطانوی حکمرانوں سے مردانہ وار لوہا لیا اور ان شہیدان وطن کی صف میں شامل ہو گئی جن کا خون بالآخر آزادی کی شکل میں رنگ لا کر ہی رہا۔

سنہ ۱۶۱۰ء میں جب اورچھا کے راجہ ویر سنگھ بندیلا نے جھانسی کے قلعہ کی تعمیر کرائی تھی جس کے ساتھ ہی جھانسی کا شہر بھی وجود میں آیا تو اس وقت قلعے کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہوگا کہ ایسا بھی ایک وقت آئے گا کہ وہ حب الوطنی، رواداری، قومی یکجہتی اور اتحاد کی مثالی علامت بن جائے گا اور اس کے اندر سے ہندوستان کی آزادی کے لیے پرچم بلند کرنے والی رانی لکشمی بائی کا نام ابھرا جو لفظ کے ہم معنی بن جائے گا جو شجاعت، وطن پرستی، اتحاد، مذہبی ہم آہنگی اور استقلال کے اظہار کے لیے ہو۔ آج "رانی جھانسی" ایک ضرب المثل بن چکی ہے اور واقعاتی ضرب الامثال میں اس کی ایک امتیازی حیثیت ہے۔ رانی جھانسی کا آج بھی جھانسی پر راج ہے۔ اور ان کا نام ہر فرد کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

بچپن کی چھبیلی، نوجوانی کی منو اور شادی کے بعد کی لکشمی بائی سنہ ۱۸۵۳ء میں اپنے شوہر گنگا دھر راؤ کے انتقال کے بعد راج پاٹ سنبھال کر رانی جھانسی ہو گئیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے جھانسی کا قلعہ حاصل کرنے کی کوشش کی جس کے جواب میں رانی جھانسی نے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کا بگل بجا دیا۔ غلام غوث خاں توپچی، کنور خدا بخش، موتی بائی اور نہ جانے کتنے جاں نثار اور وفادار حرکت میں آ گئے اور "کڑک بجلی"، "گرجن"، "بھوانی شنکر" اور "مہا کالی" کے منہ سے دشمنوں پر آگ کے گولے برسنے لگے۔ رانی جھانسی کے ساتھیوں میں بلا تفریق مذہب و ملت اور ذات پات سبھی لوگ شامل تھے اور اس اتحاد اور رواداری کی فضا آج بھی وہاں برقرار ہے۔ لیکن رانی جھانسی کے ساتھیوں میں کچھ ایسے "میر جعفر" بھی تھے جن کی غداری نے رانی کو قلعہ سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا، اور ان کی ہریجن خادمہ

جھلکاری کو موت سے ہاتھ ملا کر یہ معاہدہ کرنا پڑا کہ وہ رانی کو بہ حفاظت قلعے سے نکل جانے دے۔ چناں چہ جھلکاری نے رانی کا بھیس دھار لیا اور اس وقت تک اپنے کو دشمن کے سامنے رکھا جب تک رانی دُور نہ نکل گئیں۔ اور آخرکار اس دلیر کا انجام وہی ہوا جو پہلے سے معلوم تھا۔ انگریز "بہادر" نے جھلکاری کو توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا۔ ادھر رانی جھانسی نکلنے کو تو نکل گئیں لیکن ان کی وہ تلوار مرتے دم تک میان کے اندر نہیں گئی جس نے انگریز "بہادر" کو دہلا رکھا تھا۔ رانی لکشمی بائی کا "لے پالک بچہ" بھی ان کے ساتھ ہی شہید ہو گیا جسے وہ اس وقت بھی اپنی پیٹھ پر باندھے ہوئے تھیں، جب انگریز "بہادر" ان کو اپنے گھیرے میں لے کر تلواروں کی ضرب لگا رہے تھے۔ وطن پر مردانہ وار قربان ہو جانے کا یہی عظیم کارنامہ ہے جس نے جھانسی کے قلعہ کو وہ وقار بخشا جو کم ہی قلعوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ قلعے کے تحت لکشمی بائی پارک میں ایک بلند ستون پر وہ شاندار مجسمہ جس میں رانی کو ایک باوقار گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں تلوار اور پیٹھ پر باندھے ہوئے ننھے بچے کو دکھایا گیا ہے، لکشمی بائی کے مکمل کردار کی عکاسی کر رہا ہے۔

رانی جھانسی آج بھی ایک آدرش شخصیت ہیں۔ قومی یک جہتی کا میدان ہو، یا ذات پات اور چھوت چھات کا ہو، یا خواتین کا ہو، ان کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔

قربانی کے اس عظیم واقعہ کو یاد کرنے اور اس سے وطن کی سالمیت اور ایکتا نیز کثرت میں وحدت کے نظریے کو عملی طور پر برقرار رکھنے کے لیے تحریک حاصل کرنے کی غرض سے عوامی سطح پر اتنی بڑی تقریب اس واقعہ کے ایک سو پچیس برس بعد شاید پہلی بار منعقد ہوئی تھی۔ لیکن اپنی نوعیت اور اپنے انداز کی یہ دوسری تقریب تھی۔ پہلی بار اس انداز کی تقریب شہنشاہ اکبر کی "صلح کل" پالیسی کی یادگار کی شکل میں ۱۹۸۰ء میں فتحپور سیکری اور آگرہ میں دیکھنے میں آئی تھی۔ اس تقریب میں بھی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی خصوصی مہمان تھیں۔ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے سلسلہ میں ماضی کے ورثے سے مستفید ہونے کے لئے ایسا عظیم اور سبق آموز طریقہ کی بنا یوپی کے وزیر قومی یکجہتی شری [illegible] عمار رضوی کی فعالی ہوئی ہے جنھوں نے ان تقریبات کا اہتمام کر کے اور ان عالیشان محلوں اور قلعوں کو جو محض سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز بن کر رہ گئے ہیں۔ "سماروہ" کی زبان دے کر ان کے "منہ" سے وہ داستانیں سنوائی ہیں جو عرصہ دراز تک ایک مضبوط گارا بن کر ہندوستان کی نو تعمیر میں استعمال ہوتے والے "بھانت بھانت" کے "اینٹ اور پتھر" کو جوڑنے میں کام آتا رہے گا اور اسی طرح کی اور تقریبات "اس گارے" کی پیداوار بڑھاتی رہیں گی۔

رانی جھانسی سماروہ ۱۰ر مئی سنہ ۱۹۸۲ء کو شروع ہوا تھا، اور ۱۶ر اکتوبر کو اختتام پذیر ہوا۔ اس دوران "آواز اور روشنی" کے ذریعہ جھانسی کی تاریخ پر ایک پروگرام ہوا جسے لاکھوں افراد نے دیکھا۔ جون کے مہینے میں ایک آل انڈیا کوی سمیلن اور مشاعرے کے انعقاد پر جس کا اہتمام یوپی کی نظامت اطلاعات و رابطہ عامہ نے کیا، تقریب کا دوسرا مرحلہ ختم ہوا، اور تیسرے مرحلے میں اختتامی تقریب ہوئی جس کی صدارت گورنر یوپی شری چندر لیشور پرشاد نرائن سنگھ نے کی۔ وزیر اعلیٰ شری سری پت مسرا، ممتاز مؤرخ پروفیسر ستیش چندرا اور یوپی کے متعدد وزرا اس تقریب میں شریک تھے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس موقع پر پانچ ہزار مربع میٹر کے رقبے پر تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ۴۸ ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کیے جانے والے جھانسی میوزیم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جو یوپی راجکیہ نرمان نگم لمیٹڈ کے زیر اہتمام تعمیر ہوگا۔ یہ میوزیم جھانسی کی تعمیری سرگرمیوں میں ایک شاندار کارنامہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح جدوجہد آزادی میں جھانسی نے اپنا ایک نمایاں مقام بنایا اسی طرح آج وہ ملک کی ترقیاتی سرگرمیوں میں بھی اپنا ایک مخصوص مقام بنا رہا ہے۔ آئندہ سال جھانسی ہندوستان

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

جوشِ عمل اور بیس نکات

سید کرار حسین رضوی رفعت لکھنوی
رسول پور سادات، ڈاک خانہ چھٹ
ضلع لکھنؤ

یقیں کو ساتھ لیے فکرِ معتبر کی طرح
چلا ہوں جادۂ تخیل پر نظر کی طرح
کہیں پہ شور ہے ہنگامۂ سحر کی طرح
کہیں سکوت ہے سنسان رہگذر کی طرح
اس ایک راہ کا ہر زاویے سے رشتہ ہے
پیامِ جوشِ عمل، امن کا فرشتہ ہے
تفکرات، اور الفاظ کے سمندر میں
تحیرات، اور آئینۂ سکندر میں
تغیرات، اور اس دور کے مقدر میں
تاثرات، اور اب تک جہانِ ششدر میں
دلوں کو خام خیالی نے آکے گھیرا ہے
سوادِ شام لیے زیست کا سویرا ہے
قدم قدم پہ ٹھہر کر پکارتے چلیے
دلوں میں جذبۂ الفت ابھارتے چلیے
لباسِ کہنہ نفرت اتارتے چلیے
عروسِ وقت کی زلفیں سنوارتے چلیے
بغیر جوشِ عمل، زیست کامیاب نہیں
جو قسمتیں نہ بدل دے وہ انقلاب نہیں

وہ دل بھلا کوئی دل ہے جو دردمند نہ ہو
خوشی کے نام سے رغبت ہو غم پسند نہ ہو
خیال پست رہے حوصلہ بلند نہ ہو
خرد کے بام پر ادراک کی کمند نہ ہو
جلائے آئینہ انسانیت کا جوہر ہے
جو ان صفات کا حامل نہیں وہ پتھر ہے
نفس نفس پہ حوادث کو ٹال ٹال کے ہم
یہاں تک آئے ہیں کتنے قدم سنبھال کے ہم
نگاہِ مصلحتِ وقت دیکھ بھال کے ہم
خیال لائے ہیں گلشن سے یہ نکال کے ہم
روش بدل دو گلستاں کی زندگی کے لیے
گلوں کو وقف کرو مستقل ہنسی کے لیے
مخالفت کی ہوائیں بھی چل رہی ہیں مگر
ہم اپنی راہ نہ بدلیں گے اور نہ عزمِ سفر
عمل سے کرنا ہے طوفاں کو آج زیر و زبر
زمانہ دیکھ لے کتنا ہے اختیارِ بشر
ہر انقلاب کے دھارے کا رخ بدل دیں گے
اٹھا جو شورِ تلاطم تو سر کچل دیں گے
ہمارے سامنے طوفاں ابھر نہیں سکتے
ہم اژدہامِ حوادث سے ڈر نہیں سکتے
پیامِ امن کے جذبات مر نہیں سکتے
بغیر منزلِ مقصد ٹھہر نہیں سکتے
عمل کے جوش میں اک جنگ کرکے طوفاں سے
خراج لینا ہے ہر موجِ حشر ساماں سے

قدم قدم پہ سنبھالی ہے زندگی ہم نے
ہر انقلاب میں پالی ہے زندگی ہم نے
خزاں کی زد سے بچا لی ہے زندگی ہم نے
سدا بہار بنا لی ہے زندگی ہم نے
یہ امتحاں جو نہ سر سے گزر گئے ہوتے
ہم اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے ہوتے

پیام جوشِ عمل لے کے آئے بیس نکات
نئے سماج میں ڈھلنے لگا نظامِ حیات
غموں کے ماروں کو ملنے لگی غموں سے نجات
گزرتے وقت کے لمحے بھی کہہ رہے ہیں یہ بات
سحر قریب ہے منزل کے فاصلے کم ہیں
اب آزمائشِ جوشِ عمل ہے اور ہم ہیں

جو بے خبر تھے اُن انسانوں کو خبر تو ہوئی
طویل رات صعوبت کی مختصر تو ہوئی
ملک تھی جس کی اس امید کی سحر تو ہوئی
صدا یہ بیس نکاتی کی کارگر تو ہوئی
اسی سحر سے ہے تنویر رہ گزر کے لیے
اس آفتاب کی کرنیں ہیں ہر بشر کے لیے

مآلِ زیست، مداوائے غم ہیں بیس نکات
ہر ایک شہر کا جاہ و حشم ہیں بیس نکات
ہر ایک گاؤں پہ ابرِ کرم ہیں بیس نکات
یہ ہم سمجھتے ہیں کتنے اہم ہیں بیس نکات
اس انقلاب کے سائے میں کام کرنا ہے
اسی کی چھاؤں میں اب زندگی گزرنا ہے

عدو کے واسطے شمشیر ہیں یہ بیس نکات
نئے سماج کی تصویر ہیں یہ بیس نکات
عظیم خوابوں کی تعبیر ہیں یہ بیس نکات
ہمارے ملک کی تقدیر ہیں یہ بیس نکات
یہ بیس نکتوں کا پیغام اقتصادی ہے
انھیں نے قسمتِ ہندوستاں بنا دی ہے

زمیں کو چرخ کا تارا بنا دیا جس نے
ہر ایک قصرِ بغاوت کو ڈھا دیا جس نے
نئے اصول کا سکہ چلا دیا جس نے
ہمیں سلیقے سے جینا سکھا دیا جس نے
کہے نہ کس لیے رفعت جہان زندہ باد
وقار و عظمتِ ہندوستان زندہ باد

*

غزل

شفیق شاہ پوری

رشتے سب توڑ دیے آ کے قضا نے میرے
شمع جلتی رہی کہنے کو فسانے میرے
ان کی تصویر کو سینے سے لگا لے نہ کوئی
آئینے توڑ دیے رنگِ جفا نے میرے
میرے زخموں میں ہیں یادوں کے خزانے محفوظ
چھو کے نشتر بھی بجے زخم پرانے میرے
اس طرح سے تری یادوں نے مجھے گھیر لیا
لوٹ کر نیند بھی آئی نہ سرہانے میرے
یہ اُجالے مرے زخموں کو نہ دے پائے حیات
تیرگی آئی ہے زخموں کو منانے میرے

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
قطب پور۔ ڈالی گنج۔ لکھنؤ

چند نقوشِ طاقِ نسیاں

آدمی ساٹھ سے اوپر کھسکا نہیں کہ سب سے پہلے اور سب سے بڑی خامی اس میں یہ نمودار ہونے لگتی ہے کہ حافظہ جواب دینے لگتا ہے، زندگی سے دل چسپی کم ہونے لگتی ہے۔ زندگی کے بہت سے واقعات اب اس شخص کے لیے اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں اس لیے ذہن انھیں ایک فضول کا بار جان کر محو کر دینا چاہتا ہے۔ یہ نسیانی کیفیت زیادہ بڑھ جائے تو بعض اوقات روزمرہ کی باتیں بھی بھول جاتی ہیں۔ کل کیا کھایا تھا، پرسوں کس کس سے ملاقات ہوئی تھی کوشش کرنے پر بھی یاد نہیں آتا۔ شدید صورتوں میں تو بعض لوگ اپنے قریبی عزیزوں، اور دوستوں کے نام فراموش کر بیٹھتے ہیں اور دوسروں سے پوچھ کر اپنی یادداشت تازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر سخت شرمندگی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کوئی ملاقاتی پوچھ بیٹھتا ہے کہ کہیے حضرت آپ نے مجھے پہچانا۔؟ اسی یا اس سے زائد عمر پر پہنچ کر تو بعض لوگ کبھی کبھی اپنا نام تک بھول جاتے دیکھے اور سنے گئے ہیں۔

بہرحال، میری حیاتِ مستعار بھی ساٹھ سے کافی اوپر کھسک چکی ہے اور بہت سی باتیں فراموش ہو چکی ہیں یا اب وہ میرے لیے اہمیت نہیں رکھتیں۔ پھر بھی کئی باتیں ابھی نقش و نگارِ طاقِ نسیاں نہیں ہوئی ہیں۔ حافظے کو کرید کر ان میں سے چند ایسی یادداشتیں پیش کر رہا ہوں جو میرے لیے ابھی تک دلچسپ ہیں۔

غالباً سنہ ۱۹۱۹ء یا سنہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ ہے۔ میری عمر ۸۔ ۹ سال کی ہے خلافت کمیٹی اور کانگریس کی طرف سے انگریزوں کے خلاف ہنگامے شروع ہو چکے ہیں اور صرف شہروں ہی میں نہیں، دیہات اور قصبات میں بھی زور و شور سے پھیل گئے ہیں۔ میرا مکان قصبہ سندیلہ میں ہے۔ اپنے مکان کے کوٹھے سے گزرنے والے جلوسوں کے گیت اور نعرے ایک برآمدے کے کھمبے پر ٹکا ہوا سن رہا ہوں اور خاص طور سے یہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

کی دھن بہت پسند آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجمع تو گزر جاتا ہے لیکن میرے بڑے بھائی جو مجھ سے انیس سال بڑے ہیں، مجھے ایک گوشے میں بیٹھا کچھ لکھتا ہوا پاتے ہیں، پوچھتے ہیں کیا لکھ رہے ہو۔؟ میں کچھ شرما کے بتاتا ہوں کہ شعر لکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" والا گیت بہت پسند آیا ہے اسی طریقے پر لکھ رہا ہوں۔ کہا، سناؤ۔ میں کچھ جھینپتا ہوا دو تین شعر انھیں سناتا ہوں جو اب بالکل فراموش ہو چکے ہیں۔ وہ سن کر کہتے ہیں کہ موزوں تو ہیں، ردیف بھی ٹھیک ہے لیکن قافیے

غلط ہو گئے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ردیف اور قافیہ کیا چیزیں ہیں۔ وہ مثالیں دے کر ردیف اور قافیہ کا مفہوم سمجھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد سے میں اس سبق کو کبھی نہیں بھولا اور ساری عمر اگرچہ باقاعدہ شاعری [illegible] لیکن موزونیِ طبع برقرار رہی۔

جولائی ۱۹۲۰ء میں میں نے جوبلی کالج لکھنؤ میں نویں درجے میں داخلہ لیا۔ میاں حامد اللہ افسر صاحب، علی عباس حسینی صاحب اور اختر علی تلہری صاحب کالج کے مشہور اساتذہ تھے اور اُردو ادب میں اپنا مقام [illegible] رہے تھے۔ میرا قیام وہاں کے ہاسٹل میں تھا اس زمانے کا ایک خاص واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہاسٹل میں ایک مشاعرہ ہوا۔ غالباً دسمبر ۱۹۲۰ء میں۔ صدارت جوبلی کالج کے صدر شعبۂ فارسی مولوی کاظم حسین موسوی صاحب کر رہے تھے۔ موصوف ایک برگزیدہ شخص تھے اور عربی و فارسی کے فاضلوں میں ان کا شمار تھا۔ طرح پر میں نے بھی ایک غزل کہی تھی اور سند دکھا کر اپنے بڑے چچا سے اصلاح لے آیا تھا (موصوف اگرچہ بیرسٹر تھے لیکن اُردو شاعری کا بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے، اور لکھنؤ دبستانِ شاعری کے دلدادہ ہونے کے باعث تاسخ کے بڑے مداح) چند اشعار خود انھوں نے کہہ کر شامل کر دیے تھے۔ میرا قد اس وقت بہت چھوٹا تھا اور آواز اس وقت بھی بہت مہین تھی۔ مشاعرے میں اپنی غزل کا میں نے جب یہ شعر پڑھا۔

ترے قربان اے گل، پھر اسی انداز سے کٹ کے
مری مہندی کی رنگت شوخ ہے خونِ شہیداں سے

تو اودھم مچ گیا۔ متعدد بار پڑھوایا گیا۔ خالص لکھنوی رنگ کا شعر تھا، اس لیے بہت پسند کیا گیا۔ مگر سب ہی نے یہ رائے قائم کی کہ یہ شعر یہ صاحبزادے نہیں کہہ سکتے۔ عرصے تک اس کا چرچا رہا۔ کئی دفعہ کوئی مصرع دے کر فی البدیہہ مصرع لگانے کا امتحان بھی میرے سینیئر ساتھیوں نے لیا۔ ان میں وقار عظیم صاحب بھی شامل تھے۔ موزونیِ طبع تو تھا ہی، ان امتحانوں میں کامیاب رہا۔ پھر بھی لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ شعر میرا نہیں ہو سکتا، اور واقعہ بھی یہی تھا، مگر مجھے تو اپنی لاج رکھنا تھی۔ میں برابر یہی جواب دیتا رہا کہ میں نے اپنی غزل پر اصلاح لی ہے۔

آخر جب میٹرک بھی میں نے جوبلی کالج ہی سے پاس کیا، اسی زمانے میں اپنا سب سے پہلا تنقیدی مضمون "شاعری کا اعلیٰ معیار" کے عنوان سے لکھ ڈالا اور رسالہ نگار میں چھپنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ نیاز فتح پوری صاحب اس وقت لکھنؤ آ چکے تھے اور نظیر آباد کی سڑک پر واقع ایک مکان میں رہتے تھے۔ دفتر بھی وہیں تھا، مضمون چھپ گیا اور میں بہت خوش ہوا کہ نگار جیسے با وقار رسالہ میں میرا مضمون شائع ہوا۔ شائع ہونے کے چند روز بعد میں نیاز صاحب سے ملنے گیا۔ تعارف کرانے پر چونک پڑے اور کہنے لگے کہ میں تو سمجھا تھا کہ آپ کوئی سن رسیدہ شخص ہوں گے۔ یہ میرے لیے بہت ہمت افزا بات تھی اس لیے اب تک یاد ہے۔

دن گزرتے چلے گئے اور میں لکھنؤ اور علی گڑھ دونوں جگہ سے ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں دہلی کالج، دہلی میں اُردو کا لیکچرر مقرر ہوا۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں سے وہاں اسی سال اُردو کے درجات بی۔ اے میں کھولے گئے تھے۔ کلاس میں کوئی چالیس پچاس طالب علم تھے۔ زیادہ تر خالص دہلوی۔ ان میں سے ایک صاحب جمیل الدین عالی تھے جو آجکل غالباً انجمن ترقی اُردو پاکستان کے سکریٹری ہیں۔ انھوں نے خود یا دوسروں کی شہ پر مجھے آزمانا چاہا۔ طلبا میں ایسی شوخیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں ایک دن کلاس میں کھڑے ہو کر پوچھنے لگے کہ اُردو میں فارسی کے عدد "دو چند" اور "سہ چند" استعمال ہوتے ہیں، کیا "دو چنداں" بولنا بھی صحیح ہے۔؟ میں نے کہا صحیح ہے۔ پوچھا، کوئی مثال؟ اتفاق سے مجھے عرصے سے ایک شعر بیت بازی میں دلچسپی رکھنے کے باعث یاد تھا، جس میں "دو چنداں" کی ترکیب کا استعمال ہوا ہے۔ میں نے فوراً کہا، سنیے،

ماہِ تاباں سے کہ خورشیدِ درخشاں عارض
بلکہ دونوں سے چمک میں ہے دو چنداں عارض

اور یہ بھی بتایا کہ یہ شعر مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد فضلِ رسول واصلی کا ہے۔ عالی صاحب خاموشی سے بیٹھ گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بچپن کی بیت بازی کی مہارت آج مجھے کام آ گئی۔ اور ایسا

رہ گئی۔

دلی کالج میں میری تقرری کا واقعہ بھی میرے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ اس جگہ کے لیے انٹرویو اواخر ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا۔ بہت سے امیدوار تھے۔ انٹرویو لینے والوں میں کالج کے پرنسپل چشتی صاحب وہاں کے سینیر ٹیچر مرزا محمود بیگ صاحب اور موسوی صاحب وغیرہ کوئی سات آٹھ آدمی تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب صدارت کر رہے تھے۔ یہ انٹرویو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی واقع دریا گنج میں ہوا تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر بھی وہیں تھا۔ جب میری باری آئی تو جو سوالات مجھ سے موسوی صاحب موصوف نے اردو ادب کے متعلق پوچھے میں نے سب کے قابلِ اطمینان جواب دیے۔ آخر کا سوال انھوں نے میر کی زبان کے متعلق پوچھا کہ وہ آسان زبان کیوں لکھتے تھے۔ میں نے کہا کہ میر کی تربیت صوفیوں کے ڈھنگ پر ہوئی تھی اور صوفی حضرات عوام کی گفتگو ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ ساتھ میں میر کا یہ شعر بھی پڑھا ؎

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

موسوی صاحب نے دو تین مرتبہ پوچھا اور کوئی وجہ بتلائیے میں اسی قسم کا جواب دیتا رہا مگر موسوی صاحب مطمئن نہیں ہوئے۔ اس زمانہ میں میری طبیعت بھی بہ تقاضائے سن زوروں پر تھی، مجھے بھی کچھ تاؤ سا آگیا اور میں نے گستاخانہ کہا، اچھا مولوی صاحب آپ ہی کوئی اور وجہ بتا دیجیے! میں ممنون ہوں گا اور میری معلومات میں اضافہ ہوگا۔ مولوی صاحب نے اس کا کچھ جواب دیا تھا مگر اب مجھے یاد نہیں ہے کہ کیا بتایا تھا۔ بہرحال اس کے بعد جب مجھے رخصت کیا گیا تو میں سیدھے دلی اسٹیشن پہنچا، اور پہلی گاڑی سے واپس ہوگیا۔ یہ سمجھ کر اب کچھ ہونا نہیں ہے۔ کوئی ۳-۴ ہفتوں کے بعد مجھے پرنسپل صاحب دلی کالج کا خط ملا کہ میرا تقرر بحیثیت لیکچرر منظور ہوگیا ہے مجھے فوراً آ جانا چاہیے۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ بہرحال میں وہاں پہنچ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھ سے وہیں کے دیگر اساتذہ نے بتایا کہ آپ کے انٹرویو کے موقع پر واقعی ہم لوگ آپ کی بدتمیزی کے خلاف تھے لیکن مولوی صاحب نے اسے ناپسند نہیں کیا تھا اور یہ کہہ کر درگذر کر دیا تھا کہ کم از کم اس کو اپنی رائے پر اعتماد تو ہے۔

ایک دوسرا لطیفہ سنیے۔ فروری ۱۹۴۵ء سے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں آگیا تھا۔ ایک دفعہ وہاں رام بابو سکسینہ صاحب مؤلف تاریخ ادب اردو، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تشریف لائے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک مصور تذکرہ چند قدیم اردو شعرا کا شائع کرایا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں۔ کہا نہ پوچھیے کہاں سے اور کن دقتوں سے حاصل کیں۔ مجھے ان کے اس کارنامے کا بہت کچھ حال معلوم تھا۔ چنانچہ جب وہ مسعود صاحب اور سرور صاحب وغیرہ سے مل کر رخصت ہونے لگے تو میں کمرے کے باہر جا کر ان سے ملا اور کہا کہ سکسینہ صاحب کہیے تو میں بتا دوں کہ یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں۔ کہا ضرور بتائیے۔ میں نے کہا کہ یہ تصویریں لالہ سری رام دہلوی کے کتب خانہ سے ایک صاحب نے غائب کر دی تھیں، پھر وہ سندیلہ میں ایک صاحب کے پاس رہیں۔ ان کے انتقال کے بعد آسی الدنی صاحب ان تصویروں کو چھ سات روپے میں خرید کر لکھنؤ لے آئے۔ ان سے آپ نے تین سو روپے میں خریدیں اور پھر انھیں شائع کرا دیا۔ میرا یہ انکشاف سن کر متحیر رہ گئے۔ کہنے لگے اچھا کسی سے کہیے گا مت۔ میں مسکرا کر چپ ہو رہا۔ مجھے یہ سب تفصیلات عبدالعلی شوق سندیلوی صاحب سے معلوم ہوئی تھیں۔

لکھنؤ میں ہمارے استاد پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب مرحوم بھی صحبتوں میں بہت شگفتہ اور پُر از معلومات گفتگو کرتے تھے۔ ان کو ادبی گفتگو کرنے کا شوق بھی تھا اور انھیں اس کا گر بھی معلوم تھا کہ کس ڈھنگ سے گفتگو کی جائے کہ سننے والا اکتا نہ جائے۔ ان کی گفتگو میں ۳-۴ گھنٹے لگ جانا معمولی بات تھی۔ باتیں ہی وہ اتنی پُرلطف اور پُر از معلومات کرتے تھے کہ ان کے پاس سے اٹھنے کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ اگر کبھی خیال آتا بھی کہ اب رخصت کی اجازت مانگی جائے تو اتنے عرصے میں دوسری بات پہلے سے زیادہ اہم چھڑ جاتی اور جب اٹھتے تو معلومات سے گراں بار اٹھتے تھے۔ مگر

پہنچتا تو شریکِ حیات پہلا سوال یہی کرتیں کہ کیا مسعود صاحب کے یہاں چلے گئے تھے۔!!

اسی سلسلے میں ایک واقعہ سُنیے۔ محترمی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب بھی بڑی لمبی بات کرنے والے بزرگ تھے۔ جب کبھی الٰہ آباد سے لکھنؤ تشریف لاتے تو بربنائے خلوص مسعود صاحب کے یہاں ہی قیام فرماتے تھے اور وہ جب کوئی بات چھیڑتے تو مسعود صاحب اس وقت بہت توجہ اور ادب کے ساتھ سنتے تھے۔ ایک دن عجب اتفاق ہوا۔ میں بھی ان دونوں بزرگوں کے درمیان موجود تھا۔ میں نے مسعود صاحب سے چپکے سے عرض کیا کہ صدیقی صاحب کی تاریخ ولادت کسی جگہ لکھی نظر نہیں آئی، آپ پوچھیے تو شاید بتا دیں، میں یہ ہمت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مسعود صاحب نے بعنوانِ شائستہ ان سے تاریخ ولادت دریافت کی۔ بس صدیقی صاحب نے جو اپنے خاندانی حالات بیان کرنا شروع کیے تو دس بارہ منٹ اسی میں لگ گئے، اور تاریخ ولادت کا کہیں پتہ نہیں۔ میں نے مسعود صاحب کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ وہ سمجھ گئے اور انھوں نے صدیقی صاحب کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے دبی زبان سے فرمایا کہ صدیقی صاحب وہ تاریخ۔ انھوں نے فرمایا کہ ابھی آتی ہے۔ چنانچہ پانچ چھ منٹ اور گزر گئے۔ آخر بعد انتظار بسیار یہ نتیجہ نکلا کہ تاریخ ولادت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہے، غالباً ۱۸۸۵ء ہے۔

انہی ڈاکٹر صدیقی صاحب کی آخر عمر میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب ان کے بیٹے محمود زبیر اپنے والد کو دیکھنے الٰہ آباد آئے تو وہ انھیں پہچان نہ سکے، اور خود انھیں سے پوچھنے لگے:

"کیا آپ میرے بیٹے زبیر کو جانتے ہیں، وہ بھی لاہور میں ہے۔"!

★

جمہوریت ــــــ صفحہ ۱۵ کا بقیہ

چاہتے ہیں۔ ایسی منزل تک جس کا خواب باپو نے دیکھا تھا نہرو نے دیکھا تھا اور سارے دانشورانِ قوم نے دیکھا تھا۔

آج ملک کو اسلحہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قوم کا یک جہتی، اتفاق و اتحاد، پیار محبت، اخوت اور رواداری کے جذبے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ جذبہ پوری طرح کارفرما ہو گیا تو یقین مانیے کہ ہم بڑھتے ہی جائیں گے، فاصلے گھٹتے ہی جائیں گے، اور منزل ہمارے قدموں میں ہو گی۔

جمہوریت نئی نسل کی امانت ہے، آنے والوں کی امانت ہے۔ اس امانت کو اُن تک پہنچانا صرف ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ وقت کا تقاضا بھی ہے۔

★

رانی جھانسی تقریبات ــــــ ص ۱۸ کا بقیہ

کے نقشے پر ایک اور نیا پرچم لہرائے گا جب بیتوا ندی کے کنارے اس کے ایک چھوٹے سے گاؤں پاریچھا میں ۱۶۲ کروڑ کی لاگت کا وہ شاندار حرارتی بجلی گھر جھانسی اور بندیل کھنڈ کے آس پاس کے علاقوں کو منور کر دے گا جس کی تعمیر اس وقت زور و شور سے جاری ہے اور جس میں ہندوستان کے انجینئر، سائنس داں اور مزدور اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ اس بجلی گھر میں اسپیس (خلائی) ٹکنالوجی کا استعمال ہو رہا ہے۔

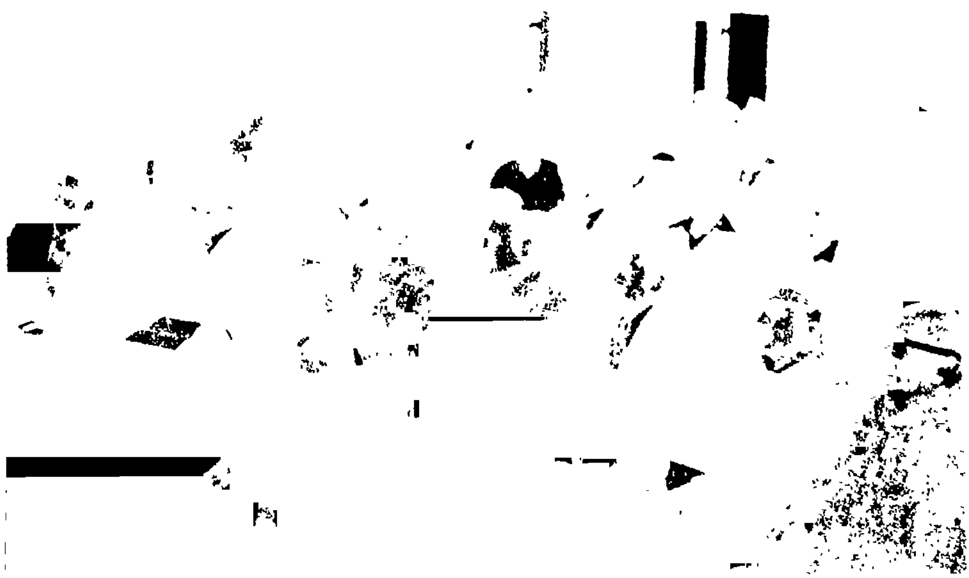
جھانسی کے لوگ آج اس ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے وہی تیور دکھا رہے ہیں جو رانی جھانسی نے اسے بیرونی طاقت سے آزاد کرانے کے لیے اپنی قربانی دے کر دکھائے تھے۔

★★



وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۱۰ دسمبر ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں جشن قومی یکجہتی مہینہ سے متعلق جلسے میں اظہار خیال کرتے ہوئے

جشن قومی یکجہتی مہینہ سے متعلق جلسے کے حاضرین کا ایک منظر۔



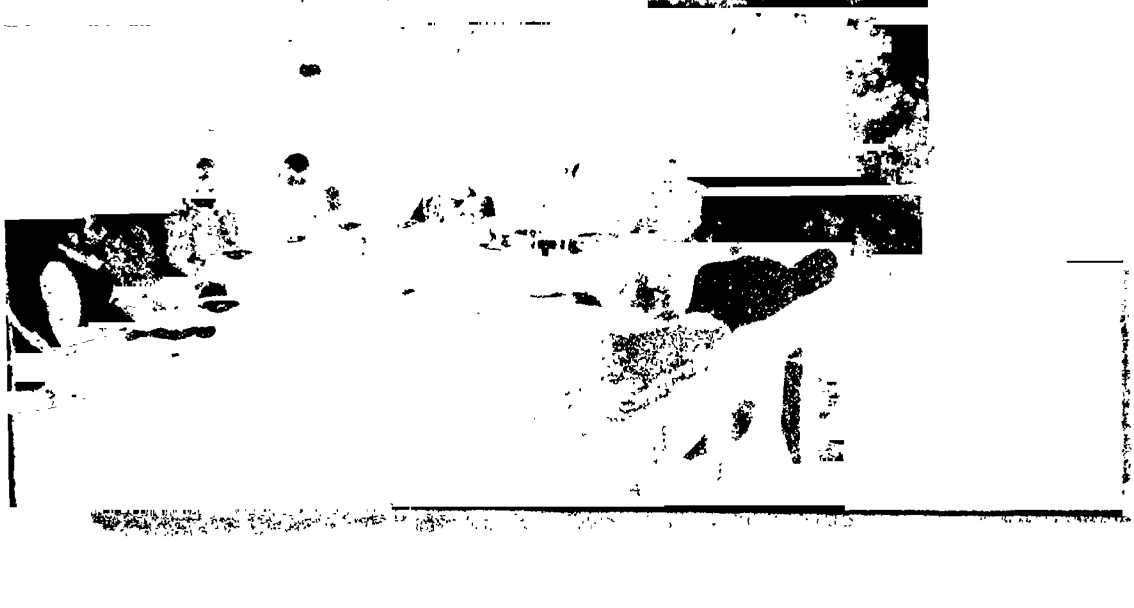


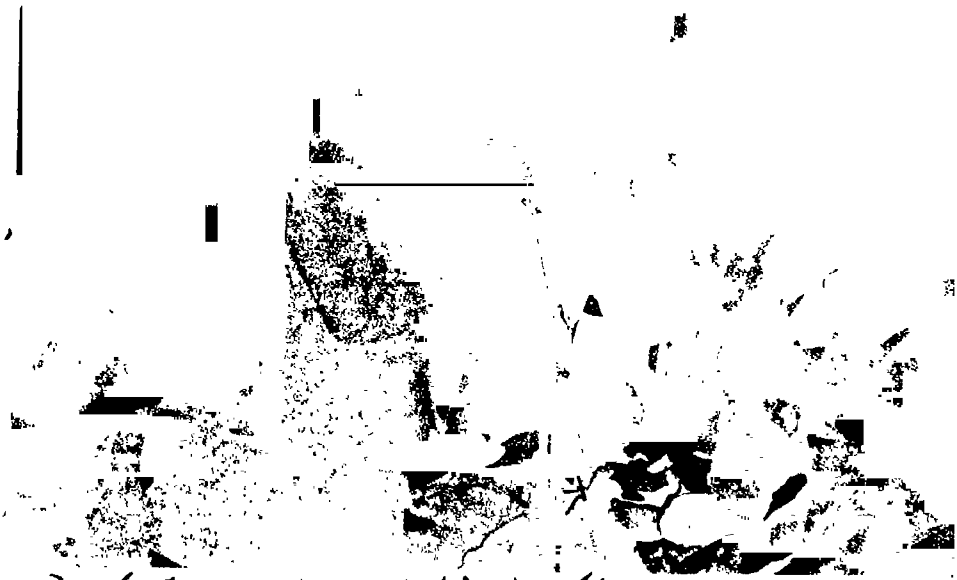
وزیر اعلیٰ اترپردیش شری سری پت مشرا ۲۲ر نومبر ۱۹۸۳ء کو لکھنؤ میں منعقدہ ہندی اُردو ادب ایوارڈ کمیٹی کی تقریب میں جناب خمار بارہ بنکوی کو ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔

وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا [illegible] کو لکھنؤ میں [illegible] کے سامنے ممتاز شاعر مسٹر [illegible]
[illegible] کرتے ہوئے۔



وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا نے ریاست کو درپیش مسائل کے سلسلے میں گزشتہ ماہ لکھنؤ میں حزب مخالف کے رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔





وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری سری پت مشرا ۱۸؍ دسمبر ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں اترپردیش اُردو اکادمی کے ہال میں منعقدہ جناب بلدیو پرشاد ستنگلو کے
شعری مجموعے "لالہ زار" کی رسم اجرا کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے۔

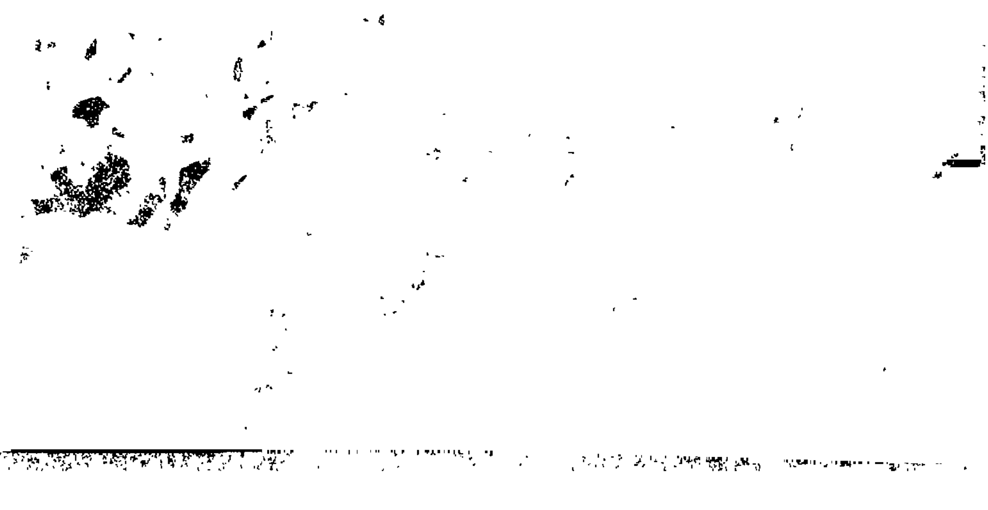
وزیر قومی یک جہتی ڈاکٹر عمار رضوی "لالہ زار" کی رسم اجرا کے موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔





چھوٹے اور درمیانی درجے کے اخبارات کی کل ہند فیڈریشن کا اجلاس لکھنؤ میں ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو ہوا۔ وزیر اعلا شری سری پت مشرا اجلاس میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے

اجلاس کے حاضرین کا ایک منظر۔



غزل

کوثر جائسی
۱۲۵/۱۵ کرنیل گنج، کانپور

کتابِ زندگی کی جدولوں میں رنگ، ہم سے ہے
صحیفہ آرزو کا سربسر ارژنگ ہم سے ہے

دلِ شبنم پہ رکھا ہے ہمیں نے دستِ غم خواری
دروں بینی حریفِ افسر و اورنگ ہم سے ہے

ہمارے حوصلوں سے نور لے لے گلستاں جب تک
سحر کا قافلہ پیچھے، کئی فرسنگ ہم سے ہے

ہمیں سے دجلۂ خوں کو ملیں موجیں تبسم کی
جگر داری کی عظمت، عزم کا نیرنگ ہم سے ہے

فریبِ حسن کی زد پر ہمارا دل نہیں آتا
تجھے معلوم پندارِ تغافل تنگ ہم سے ہے

الجھتا ہے بظاہر ہر چمن سے ہر خرابے سے
مگر در پردہ طوفانِ بلا کی جنگ ہم سے ہے

تصادم کی کبھی جرأت ٹوٹنے کی بھی ہمیں ہمت
وقارِ شیشہ ہم سے ہے، عیارِ سنگ ہم سے ہے

ہمارے اک اشارے کے ہیں لاکھوں معنوی پہلو
ادب کے دائرے میں وسعتِ فرہنگ ہم سے ہے

خزاں میں بھی رہا کوثر شگفتہ حوصلہ اپنا
بہارِ نغمہ، سازِ درد کا آہنگ ہم سے ہے

○○

ڈاکٹر ثمینہ شوکت
ریڈر شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد
بیت ثمین
تلک نگر، حیدرآباد ۴۴

تحقیق کے مسائل

دہکتے ہوئے انگارے کو تحقیق کے نام پر ہاتھ میں پکڑ لینا تحقیق نہیں عقل کی تحقیر ہے کیونکہ ظاہر، بدیہی یا نمایاں چیز کے بارے میں غیر ضروری انکشاف کی سعی سوائے تضیع اوقات اور ترددِ بیجا کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ اسی طرح نامعلوم کے بارے میں سُراغ لگانا فلسفہ اور سائنس کا جائز مطمح نظر تو ہو سکتا ہے، ادبی تحقیق کا ہدف نہیں ہو سکتا۔ کانٹ کا "The Critic of Pure Reason" یا خالص انتقادِ عقل فلسفیانہ تحقیق کی عمیق ترین صنف ہے تو آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافیت (The Theory of Relativity) سائنٹفک تحقیق کا اعلیٰ ترین نمونہ۔ انھیں ایجاد و اختراع بھی کہا جاتا ہے اور ان میں ایک لطف ہوتا ہے اور ایک اہتزازِ روحانی۔ یا (Thrill)۔ بھی، لیکن ادبی تحقیق سنگلاخ غلط فہمیوں یا کلیتہً بے خبری کی چٹان کو کاٹ کر جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، اس میں عرق ریزی تو ہے کرشمہ کاری نہیں اور نہ ہونی ہی چاہیے۔

سب سے پہلے تحقیقی مسائل کا ادراک ہونا چاہیے۔ بعد میں تحقیق کے موضوع پر تحقیق ہونی چاہیے تاکہ نامناسب موضوعات کو موضوعِ تحقیق نہ بنایا جائے، اس کے لیے وسعتِ مطالعہ ضروری ہے اور مطالعہ بھی محض اندھا دھند ورق بینی کے طور پر نہیں بلکہ ایک باشعور اور ناقدانہ نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے، چاہے وہ کسی ہو یا چھپی ہوئی کتاب کا مطالعہ ہو یا مستور یا نمایاں سماجی، تاریخی اور تہذیبی حقیقت یا شخصیت کا مطالعہ ہو۔ مسئلہ کے تعین کے بعد ہی تحقیق کے دوسرے مراحل پیش آتے ہیں اور یہ مراحل اپنی نوعیت کے لحاظ سے متنوع بھی ہوتے ہیں اور دقیق بھی۔ دس بیس کتابوں کے پڑھ لینے اور ان سے اقتباسات کو جوڑ کر ذرا سی حاشیہ آرائی کے بعد نئی کتاب تیار کر لینے کا نام تحقیق نہیں ہے۔

سچی طلب اور تڑپ جب تک کارفرما ہو، لیلائے منزل تک رسائی ممکن نہیں ہوتی کیونکہ منزل تک رسائی کے بعد بھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ منزلِ منزلِ شوق نہیں، بلکہ منزلِ دار و رسن بن جاتی ہے۔ سچ بولنے یا انا الحق کہنے کے جرم میں منصور حلاج کی طرح دار پر چڑھنا بھی ہوتا ہے کیونکہ تحقیق کی شرطِ اوّل ہی حق گوئی ہے، اور اس سے سرِمو انحراف نہیں کیا جانا چاہیے۔

طباعت (Printing) کے وجود میں آنے سے قبل تصانیف عموماً مخطوطات کی شکل میں ہوتی تھیں اور یہ مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہی تصنیف کی کتابت یا نقل مختلف افراد کرتے تھے اور اصل کتاب کھو کر کچھ ہو کے رہ جاتی تھی، پھر اس کا بھی امکان تھا کہ اصل تصنیف سے پہلے اس کی دوسری یا تیسری بار کتابت کردہ نقل منظرِ عام پر آئے اور اس نقل ہی کو اصل کتاب سمجھ لیا جائے یا

سنہ کتابت کو سنہ تصنیف اور کاتب کو مصنف مان لیا جائے۔ اس صورت میں اصل کتاب کے دستیاب ہونے پر حقیقی سنِ تصنیف اور اصلی مصنف کے بارے میں شکوک و شبہات کا ایک طوفانِ عظیم اٹھ کھڑا ہو۔ اب محقق کا کام یہ رہ جاتا ہے کہ وہ کتابت کردہ نقلوں کو محض نقل ثابت کرے اصل کو اصل اور مصنف کو کاتبوں کے جمِ غفیر سے نکال کر اس کے اصلی مسند پر متمکن کرے۔ حضرت امیر خسرو کی خالق باری اور حضرت گیسو دراز کی تصانیف اسی زمرے میں آتی ہیں جہاں خالق باری کے مرتبین نے اپنے زمانے کے الفاظ کا الحاق کر کے حقیقت کی بازیافت کو مشکل بنا دیا ہے وہیں حضرت گیسو دراز کی تصانیف بھی جنھیں آپ کے کاتب لکھا کرتے تھے، کاتبوں کے اسی ہجوم کی بدولت نقاب اندر نقاب ہو گئی ہیں۔

طباعت کی ایجاد کے بعد اس قسم کے مسائل کم ہو گئے ہیں اگر مسئلہ ہے تو پہلے اور بعد کے ایڈیشنوں کا، کیونکہ طباعت سے پہلے کتاب کو کتابت کی منزل سے گزرنا ہی پڑتا ہے اور اس کا امکان ہے کہ کاتب یا مرتب عمداً یا سہواً عبارت آرائی کر گزرے یا پھر مصنف ہی تصحیح یا ترمیم کو ضروری سمجھے۔ اس صورت میں محقق کا کام یہ معلوم کرنے تک محدود ہوتا ہے کہ یہ مصنف کی اپنی ترمیم ہے یا کاتب کی غلطی۔ ترمیموں اور اصلاحوں کی خوب صورت پیوند کاری مرتب کی تمام نیک نیتی کے باوجود جائز نہیں ہوتی کیونکہ اس طرح اصلیت زیرِ نقاب ہو جاتی ہے۔

تدوینِ متن کی شرطِ اول یہ ہے کہ اس کے تمام نسخوں کی تلاش کی جائے۔ مقدم اور مؤخر نسخوں کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور سنِ تصنیف کا لحاظ کرتے ہوئے دیکھا جائے کہ کیا اس زمانے میں زبان کا نمونہ یہی تھا۔ پھر دوسرے معاصر قلمی مخطوطات کی مدد سے اس کی بھی صورت حال کا جائزہ لیا جائے کیونکہ تدوینِ متن میں لب و لہجہ کے صحیح اظہار کے لیے ایک نقطے یا شوشے کی بھی تحریف، تخفیف یا اضافہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ محقق کا کام یہ ہے کہ وہ ان سب امور کی چھان بین کر کے ایک صحیح فوٹوگراف پیش کرے چنانچہ کوئی نثری تصنیف ہو یا شعری مجموعہ، تحقیق کا فریضہ یہ ہے کہ ایک صحیح اور مستند متن مرتب کیا جائے۔ محقق وہ ہے جو اندھیرے سے اجالے کی طرف لے جائے، جو الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھائے اور راز سے پردہ اٹھائے۔ تدوینِ متن اسی شخص کے بس کی بات ہوتی ہے جس کا مزاج تحقیقی ہو جو سہل پسندی پر عرق ریزی کو ترجیح دیتا ہو، جو سائنسی اور منطقی ڈھنگ سے نتائج اخذ کر سکتا ہو اور جو لسانی کسوٹی پر کھوٹے اور کھرے کی پہچان کر سکتا ہو۔ اس کے علاوہ دواوین کی ترتیب کے سلسلے میں کبھی چوری سے یاری تک کے مراحل کی بھی تحقیق بلکہ تفتیش کرنی پڑتی ہے۔ اُمراء و سلاطین کے دواوین اس کی مثال ہیں۔ ان کی تدوین کے وقت کاتب اور مصنف کے باہمی تعلق کے بارے میں معلوم کرنا پھر غیر معتبر اور الحاقی اشعار کو نکال کر صحیح متن مرتب کرنا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔

جہاں تک مواد کی تلاش کا تعلق ہے تو یہ ریسرچ اسکالر کی ذاتی ذمہ داری ہونا چاہیے۔ جب تحقیق کا نقطۂ آغاز ہی شک ہو تو نہ روایات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے نہ تیسرے شخص کے مکتوبات اور منقولات پر یقین۔ اسی لیے اپنے مقام پر بیٹھ کر یہ ذمہ داری کسی غیر کو سونپی نہیں جا سکتی کیونکہ نقل کرنے والے نے اگر اپنی طرف سے نقطے اور شوشے بھی غلط لگا دیے تو یہ متنی ترتیب غلط ہو جائے گی اور غلطیوں کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا اب اتنی بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ معتبر حوالے کسی بھی تحقیق کو مستند بنانے کے ضامن ہوتے ہیں۔ ادب میں نا روا شخصیت پرستی بھی غلط ہے، اور نا روا شخصیت نگاری بھی نامناسب۔ تحقیق کو عمل صالح ہونا چاہیے۔

مروجہ تحقیق کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ زندہ شخصیتوں پر لکھا جا رہا ہے۔ یہ ایک شگونِ بد سے کم نہیں ہے کیونکہ جس شخص کے کام کا سلسلہ ابھی جاری ہے اور جس سے آئندہ بھی امید ہو اس کے بارے میں تحقیق مکمل کس طرح کی جا سکتی ہے۔ بہت ہوا تو چند حقائق کی یافت یا بازیافت ہو جاتی ہے تاہم ناتمامی کا احساس اپنی جگہ اٹل رہتا ہے۔ ایسی تحقیق یا تو تحسین ہوتی ہے جو

شخصیت کو عظمت کا پیکر ٹھہرا کے دم لیتی ہے یا یہ تفتیش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی تحقیقات سے ایک خواہ مخواہ کی بدگمانی بھی پیدا ہوتی ہے کہ اس کے در پردہ کچھ مراعات حاصل کرنے کی آرزو، یا رسوخ یا منصب اور ملازمت کا حصول مقصود ہے۔ حالی جیسے فرشتہ خصال انسان نے حیات جاوید اور یادگار غالب لکھ کر اپنے زمانے کے مشاہیر پر لکھنے کی روایت قائم کی تھی۔ لیکن مولانا حالی کے بارے میں یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سرسید احمد خاں اور غالب دونوں اپنے زمانے میں معتوب تھے اور مولانا حالی کو ان سے کسی طرح کی طلب یا طمع نہیں تھی۔

بذات خود شخصیت نگاری یا سوانح نگاری اپنی جگہ ایک مستحسن صنف ادب ہے اس کی ایک افادیت بھی ہوتی ہے۔ تحقیق کا یہ عمل ایک لائحہ عمل ہوتا ہے کیونکہ افراد کے کارنامے عبرت کا تازیانہ بھی ہوتے ہیں اور مینارہ نور بھی۔ ان کے حالات اور حادثات کی دنیا بھی ان کا ماحول اور ان کے حیات و ممات کی دنیا اپنے اندر حیات انسانی کے لیے ممکنات کی ایک دنیا رکھتی ہے۔ شخصیات پر قلم اٹھائے تو محقق کا کام یہ ہے کہ وہ مصلحتوں اور مروتوں سے بالاتر ہو کر ایک صحیح تصویر پیش کرے اور شخصیت کو خواہ مخواہ عظمت کا حامل ٹھہرانے کی سعی لاحاصل نہ کرے اور نہ تعصب اور تنگ نظری سے کام لے۔ چاند میں کرن اور سنگ میں شرر دیکھ لینا ہی تحقیق نہیں ہے، تحقیق اس کے ماورا بھی بہت کچھ ہے۔

تحقیق کے مسائل میں نسخوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی شامل ہے سرکاری کتب خانوں میں موجود نسخوں کی حد تک تو یہ دشواری نہیں ہوتی لیکن نجی کتب خانوں میں نسخوں کا مطالعہ بعض اوقات چند در چند وجوہات کی بنا پر ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ کبھی تو خود "عالموں کی بخیلی" کبھی اس میں حارج ہوتی ہے کہ ان کا پندار یہ گوارا نہیں کرتا کہ ہر کس و ناکس بار امانت اٹھائے یا جس کام کے لیے وہ خود کو اہل جانتے ہیں اور جن زمینوں اور میدانوں پر وہ قابض اور متصرف ہیں کوئی دوسرا مخلصانہ طور پر ہی سہی —— اس میں مداخلت کرے اور ان کی متاع ہنر لوٹ لے جائے۔

دیگر زبانوں میں تحقیق طلب موضوعات کی باضابطہ فہرست شائع ہوتی ہے۔ اگر ہمارے عظیم دانشور بھی مطالعہ کے دوران کسی تحقیق طلب موضوع یا مسئلہ کو دریافت کر لیں تو اسے فہرست موضوعات میں شامل کرا دیں اور ہر سال یونیورسٹیوں سے تحقیق طلب موضوعات کی فہرست مرتب کر کے چھپوانے کا بندوبست کیا جائے تو یہ یقیناً ایک تعمیری اقدام ہوگا اور اس سے نہ صرف حقیقتاً قابل قدر تحقیقی موضوعات کا ذخیرہ ہر وقت دستیاب رہے گا بلکہ مقصدی مطالعہ کی ترویج بھی عمل میں آئے گی۔

تحقیق کے مسائل میں آخری اور پہلا مسئلہ جو خود اساتذہ کی ذات سے وابستہ ہے، یہ ہے کہ غیر جانبداری کے ساتھ دقت نظری سے ریسرچ اسکالرز کا انتخاب کریں تاکہ یہ کلیتاً استعداد پر مبنی انتخاب، تحقیق کی کم معیاری، کم مائیگی اور افراط کا سبب نہ بنے اور نہ ہی وہ محمد اقبال کے اس مصرعے ؎

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

کی عملی تفسیر بن کے رہ جائیں اور نہ ان کے زیر نگرانی کام کرنے والے قیامت صغریٰ برپا کرنے کے مرتکب ہوں۔

★

بشیر بدر

وہ تھکا ہوا مری بانہوں میں ذرا سو گیا تھا تو کیا ہوا
ابھی میں نے دیکھا ہے چاند بھی کسی شاخِ گل پہ جھکا ہوا

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

وہی خط کہ جس پہ جگہ جگہ دو مہکتے ہونٹوں کے چاند تھے
کسی بھولے بسرے سے طاق پر تہِ گرد ہوگا دبا ہوا

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان بھی
مگر اُس دریچے سے پوچھنا وہ درختِ انار کا کیا ہوا

مرے ساتھ جگنو ہے ہم سفر مگر اس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

مٹی میں گیہوں، گنا، دھان اور آلو کی کاشت کی جائے تو فصل بہت شاندار ہوگی۔ اگر زمین ریتیلی ہے تو اس میں مونگ پھلی اور باجرہ ہی بونا چاہیے۔ اگر زمین مٹیار یا چکنی ہے تو اس میں دھان اور چنے وغیرہ کی فصلیں بوئی جائیں تو بھرپور پیداوار ملے گی اور اس کے برخلاف کوئی اور فصل بوئی جائے گی، تو اچھی نہیں ہوگی۔ یہاں ایک بات اور عرض کردوں کہ اچھی پیداوار کے لیے زمین کی جتائی وغیرہ کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے، اور اس سلسلے میں اچھے قسم کے اوزاروں کا استعمال فائدہ مند ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کلٹی ویٹر اور مٹی پلٹنے والا ہل، اگر بہتر ہوں گے تو کام آسانی سے اور بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ کھیتوں کو تیار کرتے وقت فاسفیٹ اور پوٹاش کھاد میں ضرورت کے مطابق یوریا ملا کر مناسب مقدار میں ان کا استعمال بھی ضروری ہے مگر زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ ان کے استعمال سے قبل مٹی کی جانچ کرائی جائے تاکہ ان کی مقدار کم یا زیادہ نہ ہونے پائے، دوسرے فصل بوتے وقت کبھی بھی انگریزی کھادوں کا استعمال نہیں کرنا چاہیے اور کھاد سے زیادہ فائدہ اسی وقت ہوگا جب اس کا استعمال بیج کے نیچے یا اردگرد کیا جائے۔

آبپاشی کے لیے سرکار کی جانب سے ہر گاؤں میں ٹیوب ویل وغیرہ کا بندوبست ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حکومت کی جانب سے کسانوں کو کھاد اور جراثیم کش دوائیں بھی مہیا کی جاتی ہیں اس کے علاوہ کسانوں کو مالیاتی قرض بھی حکومت فراہم کر رہی ہے ترقی آراضی بینک کی جانب سے ٹریکٹر، ٹرالی، پمپنگ سٹ اور دیگر زرعی ساز و سامان کے لیے زمین پر قرض مل جاتا ہے جس کی ادائیگی قسطوں میں ہوتی ہے۔ یہ تمام سہولتیں آج ہمیں حاصل ہیں جس کے نتیجہ میں مہینوں اور ہفتوں کا کام آج چند گھنٹوں میں ہو جاتا ہے چنانچہ آج ہم زرعی پیداوار کے سلسلے میں خود کفیل ہوتے جا رہے ہیں، مگر تعلیم کی کمی کے باعث لوگ اب بھی سرکار کی جانب سے ملنے والی تمام سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ اگرچہ سرکاری کارکن اس سلسلے میں برابر سرگرم ہیں۔ مثال کے طور پر پلانٹ پروٹیکشن آفیسر، اور ان کا اسسٹنٹ ایگریکلچر آفیسر بی ڈی او وغیرہ ہر تحصیل اور ہر بلاک میں ہر وقت صلاح و مشورہ اور مدد بہم پہنچانے کی غرض سے اور کسانوں کو نئی نئی ایجادوں سے روشناس کرانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

**

دیپک قمر

معرفت بشیر بدر
ڈی ۱۲۰، شاستری نگر
میرٹھ

غزل

کاہے چپ سادھی لے منوا، ہنستے گاتے جائیں ہم
اب آئے ہیں نوٹنکی میں، پھر آئیں کہ نہ آئیں ہم

گھونگھٹ کاڑھے گوری تجھ کو بہت سے گیت سکتے
آ جا چھت پر پنچھی بن کر سنگ سنگ اُڑتے جائیں ہم

جھیل کنارے بیٹھے سوچیں، لے شکارہ ٹوٹا سا
بن پتوار اکیلے کیسے، اس کو پار لگائیں ہم

بھادوں کو جھلسائے جاتی دھوپ دھونکی نفرت کی
پریم بدریا بن کر چھائیں سکھ ہی سکھ برسائیں ہم

دکھ دے کر سکھ پایا چاہا من کا چین گنوا بیٹھے
سب کا دکھ لیں، خوشیاں بانٹیں، خود یوں بھی سکھ پائیں ہم

آگ لگی ہے بستی بستی، ہر پل بڑھتی جاتی ہے
اس کی لپٹوں سے اب کیسے، اپنا آپ بچائیں ہم

گھونگھٹ اور مکھوٹا اترا، مکھڑا نکھرا نکھرا سا
آج غزل گوری کا سب کو روپ نیا دکھلائیں ہم

اپنا ہے سنگیت نرالا، کوئی کوئی سنے گا
اکتارہ لے، بنجارہ بن، تانیں نئی اڑائیں ہم

غزلیں

شوکت عمر
قومی آواز لکھنؤ

میری معصوم تمناؤں پہ ہنسنے والو!
یہ وہ کلیاں ہیں جو عادی نہیں مرجھانے کی

میں تو ہر وعدۂ فردا کا یقیں کرتا ہوں
آپ تکلیف نہ فرمائیں قسم کھانے کی

دل کسی دل سے جو ملتا ہے تو رو دیتا ہے
بات دیوانے سے چھپتی نہیں دیوانے کی

ڈوبتے رہتے ہیں ہر روز ہزاروں سورج
ٹوٹتی رہتی ہیں کڑیاں مرے افسانے کی

وہی عالم ہے ابھی تک مری بیتابی کا
وہی سرخی ہے ابھی تک مرے افسانے کی

اس طرح مجھ کو زمانے سے مٹایا شوکت
کوئی سرخی نہیں ملتی مرے افسانے کی

●

ایم۔ ادریس عنبر
ڈپٹی کلکٹر
رائے بریلی

خود مری آنکھوں سے میرا خواب شرماتا رہا
تیرگی میں میرا سایہ مجھ سے کتراتا رہا

وہ کہ خود رو پھول کا پودا ہے جنگل میں اُگا
پھر بھی جانے کتنے گلزاروں کو مہکاتا رہا

دیو قامت پیڑ آندھی میں زمیں پر گر پڑے
دوب کا پودا ہر اک جھونکے سے ٹکراتا رہا

آتشیں نظروں کے آگے دھوپ شرمندہ رہی
آہنی تلووں سے ہر پتھر اماں پاتا رہا

ایک جگنو ساری بستی کا مقدر بن گیا
ہر ستارہ دور سے بس ان کو جھپکاتا رہا

نرم جھونکے اور وہ پچھلے پہر کی خوشبوئیں
آنسوؤں کی چھاؤں میں عنبر سکوں پاتا رہا

●

ڈرامہ

اظہر افسر

سراج الدولہ

افراد :

____ راوی

____ علی وردی خاں

____ میر جعفر

____ واٹسن

____ لارڈ کلائیو

____ چند سپاہی اور درباری

____ چوبدار

(موسیقی)

منظر ۱ : (حاکم بنگال نواب علی وردی خاں کا دربار)

راوی۔ (پس منظر) ۱۷۵۶ء سلطنت مغلیہ کے زوال کا زمانہ ہندستان کے مختلف حصے مرکزی حکومت سے علاحدہ ہوچکے ہیں۔ راجپوتانہ اودھ اور دکن کی طرح بنگال بھی عملی طور پر آزاد ہے۔ حاکم بنگال نواب علی وردی خاں نے مرشد آباد کو پایۂ تخت بنا کر بنگال، بہار اور اڑیسہ پر خود مختار حکومت کا آغاز کر دیا ہے۔

(نرسنگھا بجتا ہے)

چوبدار نمبر ۱ : باادب با ملاحظہ۔

چوبدار نمبر ۲ : باادب با ملاحظہ۔

چوبدار نمبر ۱ : رعایا پرور، حاکم بنگال، منصور الملک۔

چوبدار نمبر ۲ : نواب علی وردی خاں۔

(نرسنگھا بجتا ہے۔)

علی وردی خاں : میر جعفر

میر جعفر : حضور والا۔

علی وردی خاں : یہ لوگ کون ہیں، یہ کیسا شور ہے؟

میر جعفر : حضور والا یہ سید فضل اور آرمینینس سوداگر ہیں۔ ہگلی کی بندرگاہ پر تجارت کرتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی والوں نے ریشم، شکر، افیون اور دوسرے تجارتی سامان سے لدے ہوئے ان کے جہاز لوٹ لیے ہیں

علی وردی خاں : تمہارا مطلب ہے انگریزوں نے۔؟

میر جعفر : جی حضور والا۔

علی وردی خاں : کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم جتنی رعایتیں ان انگریزوں کو دیتے ہیں یہ اتنے ہی ہمارے سر پر چڑھے آرہے ہیں۔ یہ ساتویں شکایت ہے جو ہمارے سامنے لائی گئی ہے۔

سراج الدولہ: نانا حضور۔ شہنشاہِ دہلی کی خدمت میں ان لوگوں نے تحفے تحائف پیش کرکے اور میٹھی میٹھی باتیں کرکے ہندستان سے پہلے تجارت قائم کرنے اور پھر جگہ جگہ تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت کیا حاصل کرلی ہے کہ اب انھوں نے قلعے تعمیر کرنے شروع کر دیے ہیں۔

علی وردی خاں: قلعے۔؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو سراج الدولہ؟

سراج الدولہ: میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں نانا حضور۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک معمولی تجارتی کمپنی ہے جو دوسرے ملکوں سے تجارتی سامان لاکر یہاں کی چیزیں خرید لے جاتی ہے مگر یہ غلط ہے جس ڈھنگ اور جس نہج سے انگریزوں نے ہندستان میں اپنا عمل دخل شروع کر دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندستان میں اپنا حاکم کسی کو نہیں مانتے جو من میں آیا کرتے ہیں۔

سراج الدولہ: جی ہاں۔ نانا حضور اب تو کلکتہ میں قاسم بازار کوٹھی کے پاس انھوں نے ایک بہت بڑا فوجی ڈھنگ کا مضبوط قلعہ بھی تعمیر کر لیا ہے۔ حد یہ ہے کہ مرہٹے فرانسیسی اور دوسرے تاجران کی کوٹھی پر دن رات حملے کرکے انھیں پریشان کیا کرتے ہیں۔

میر جعفر: جی ہاں حضور والا۔

سراج الدولہ: مگر حقیقت اس سے کچھ الگ ہے، ایک تو یہ خودغرض سفید قوم قطعاً پسند نہیں کرتی ہے کہ اپنے سوا کوئی اور ہندستان میں بڑے پیمانہ پر تجارت کرے، دوسرے ہندستان کی بگڑتی ہوئی سیاسی حالت اور افراتفری سے فائدہ اٹھاکر یہ ہر طرف اپنا عمل دخل بڑھانا چاہتے ہیں۔

علی وردی خاں: ہم نے انگریزوں کو ہمیشہ راست باز تاجر سمجھا جتنی رعایتیں ہماری جانب سے انھیں مل سکتی تھیں اس سے کہیں زیادہ ہم نے انھیں دیں۔

سراج الدولہ: مگر نتیجہ ہمیشہ اس صورت میں برآمد ہوا کہ وہ اپنے سامان پر عائد شدہ محاصل تک ادا نہیں کرتے، دوسرے تاجر ٹیکس اور جزیہ دیتے ہیں اور یہ اس سے انکار کرتے ہیں۔

میر جعفر: جی ہاں حضور والا۔

سراج الدولہ: اور آج ان کی جرأت اور ہمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے وہ تحفہ تحائف سے لدا ہوا شاہی جہاز بھی لوٹ لیا جو نانا حضور کے لیے تھا۔ اب نانا حضور اور انتظار نہ کریں، مجھے اجازت دیں کہ میں ان چند انگریزوں کو ان کی حرکات کا مزہ چکھاؤں، انھیں دکھلا دوں کہ بنگال میں بھی کوئی حکمراں موجود ہے اور یہ کہ اب وہ اور اپنی من مانی نہیں چلا سکتے۔

علی وردی خاں: (روکتے ہوئے بڑی نرمی سے) سراج الدولہ، سکون سے کام لو۔ ہو سکتا ہے کسی اور نے جہاز لوٹے ہوں اور الزام انگریزوں پر آگیا ہو، ہم ابھی ایسٹ انڈیا کمپنی کو خط لکھواتے ہیں ان سے جواب طلب کیا جائے گا کہ یہ شکایتیں کہاں تک درست ہیں ان تاجروں کا نقصان ہم بھر دیں گے۔

سراج الدولہ: نانا حضور۔

علی وردی خاں: وہ لوگ سات سمندر پار سے تجارت کرنے آتے ہیں غریب تاجر ہیں۔ لڑائی میں دیر نہیں لگتی سراج۔ مگر ہمیشہ سکون سے کام لینا چاہیے اور دشمنوں سے بھی اچھا سلوک کرنا چاہیے۔

سراج الدولہ: آپ کی ان ہی رعایتوں نے انگریزوں کو سر چڑھایا ہے آپ کا یہ سلوک آپ کو ہم کو اور سارے ہندستان کو لے ڈوبے گا۔ ہماری مثال اس عرب کے خیمے والی ہوئی جس نے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اونٹ پر رحم کھاکر اپنے خیمے کے اندر بلا لیا، مگر اس رحم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عرب ہی کو خیمے کے باہر نکل جانا پڑا

نانا حضور آپ اس بات کو گستاخی سمجھیں یا کچھ اور، مگر میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں بنگال کیا ہندستان کے کسی خطے میں ان کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔

علی وردی خاں: سراج الدولہ!

سراج الدولہ: نانا حضور۔ میں بڑے ادب سے درخواست کروں گا کہ اس بار آپ مجھے نہ روکیں، سردار مدن موہن میر جعفر، امی چند، کل ہماری فوجیں قاسم بازار کوٹھی کی طرف روانہ ہو جائیں گی، اور ہمیشہ کے لیے انگریزوں کو کلکتے سے باہر کر دیا جائے گا۔

علی وردی خاں: ٹھہرو سراج الدولہ۔ سزا سے پہلے ہمیشہ مجرم کا جواب بھی سن لینا چاہیے، میر جعفر!

میر جعفر: حضور والا۔

علی وردی خاں: کلکتہ میں مقیم انگریزوں کے نائب، مسٹر ڈاڈویل کے نام ایک حکم نامہ لکھو۔ لکھو کہ ہمارے دربار میں اس قسم کی شکایتیں پہونچی ہیں کہ تم نے ہگلی کے سید فضل اور آرمینیس سوداگروں پر بلاوجہ ظلم کر کے ان کے کئی لاکھ روپے کی مالیت کے جہاز جن میں سامان لدا ہوا تھا، لوٹ لیے ہیں اور ان سوداگروں نے ہمارے پاس تمہارے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے۔ بس تم کو لازم ہے کہ اس حکم نامے کے ملتے ہی اس نقصان کو جلد سے جلد پورا کر دو، یا اس سلسلے میں کوئی اور عذر تم رکھتے ہو تو پیش کرو، ورنہ تمہارے خلاف مناسب کارروائی کیے جانے پر ہم مجبور ہو جائیں گے۔

میر جعفر: جی حضور والا۔

علی وردی خاں: سراج! ہماری طبیعت کچھ بہتر کچھ ٹھیک نہیں ہے، اب ہم آرام کریں گے، اطمینان رکھو، تم جس وقت کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہو وہ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ انگریزوں سے جواب طلب کرنے میں بھی ہماری مصلحت ہے۔ آؤ چلیں۔

منظر (۲)

نواب علی وردی خاں کے محل کا ایک حصہ

(بستر پر نواب علی وردی خاں دراز ہے۔ آنکھیں بند ہیں)۔

سراج الدولہ: اب طبیعت کیسی ہے نانا حضور کی۔

میر جعفر: آثار تو ٹھیک نہیں ہیں۔ طبیب صاحب نے دوا دی ہے۔ سہ پہر سے سو رہے ہیں۔

(اچانک علی وردی خاں آنکھیں کھولتا ہے، اور کراہتا ہے)۔

سراج الدولہ: نانا حضور۔

علی وردی خاں: سراج۔

سراج الدولہ: کیا حال ہے نانا حضور۔

علی وردی خاں: زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

سراج الدولہ: نانا حضور۔

علی وردی خاں: چراغِ سحری ہوں ہو سکتا ہے گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد ہی بجھ جاؤں۔

سراج الدولہ: نہیں نہیں نانا حضور۔

علی وردی خاں: ہاں سراج ہاں۔

سراج الدولہ: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ عرصے تک آپ کا سایہ میرے سر پر قائم رہے گا۔

(رونے لگتا ہے)

علی وردی خاں: سراج رو نہیں۔ میرے بعد بڑی بھاری ذمہ داریاں تمہارے سر آنے والی ہیں۔

سراج الدولہ: نانا حضور۔

علی وردی خاں :۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کا تاج و تخت تمھارے قبضہ میں ہوگا، اور اس بات کا بھی یقین رکھو کہ میری سانس اکھڑتے ہی تمھارے چاروں طرف دشمن جمع ہوجائیں گے۔ کوئی مرکزی حکومت سے یلغار کرے گا تو کوئی تمھارے پایۂ تخت میں سر اٹھائے گا۔

سراج الدولہ: نانا حضور

علی وردی خاں :۔ رشتہ داروں کو الگ تخت و تاج کی ہوس ہوگی، اور پھر وہ بدیسی تاجر، میر جعفر ؟

میر جعفر :۔ حضور والا۔

علی وردی خاں :۔ میر جعفر، سردار مدن موہن، امی چند، کبھی میر سراج کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ سراج کو ایسے ہی عزیز رکھنا جیسے اب رکھتے ہو۔ سراج !

سراج الدولہ :۔ نانا حضور۔

علی وردی خاں :۔ سراج ! ہمارے سب سے بڑے دشمن انگریز ہیں۔ اُس دن ۔ اس دن دربار میں میں نے جو کچھ کہا وہ صرف مصلحتِ وقت کا تقاضہ تھا دشمن کو کبھی مروّت سے، کبھی رعایت سے اور کبھی عنایتوں سے قابو میں کرنا پڑتا ہے۔

سراج الدولہ :۔ نانا حضور، آپ بالکل بے فکر رہیں، اور بس جلدی سے اچھے ہوجائیں، کسی دشمن کی کوئی مجال نہیں کہ وہ بنگال کے تاج و تخت کی جانب ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکے، اور یہ انگریز تاجر، میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں اس وقت آپ کے سرِ عزیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک انھیں بنگال سے باہر نہ نکال دوں گا چین کی سانس نہ لوں گا۔ نانا حضور۔

علی وردی خاں: سراج !

سراج الدولہ، نانا حضور۔

علی وردی خاں : میں ..... سراج.....

(کراہتا ہوا دم توڑ دیتا ہے)

منظر ۲

سراج الدولہ کا محل

چوبدار: ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے مسٹر واٹسن دردولت پر حاضر ہیں۔

سراج الدولہ، اجازت ہے۔

(دائیں جانب سے واٹسن داخل ہوتا ہے)

سراج الدولہ :۔ آیئے مسٹر واٹسن تشریف رکھیئے۔ اس وقت میں نے آپ کو کچھ کھری کھری باتیں کرنے کے لیے بلایا ہے۔

واٹسن : او۔ ویل۔ ویل۔ ضرور ضرور۔

سراج الدولہ :۔ آپ جانتے ہیں منصور الملک نواب علی وردی خاں حاکم بنگال کا تخت اس وقت خالی نہیں۔ بنگال، بہار اڑیسہ کا حکمران میں ہوں سراج الدولہ۔

واٹسن :۔ ہم آپ کو مبارکباد دیتا ہے۔

سراج الدولہ :۔ شکریہ۔ فرمایئے کہ باغ بہار مقام میں میری اجازت کے بغیر آپ نے ایک نیا قلعہ تعمیر کرلیا۔ کوئی مشورہ کوئی صلاح لی آپ نے مجھ سے۔؟

سراج الدولہ :۔ آپ نے شاہ دہلی سے جو فرمان حاصل کیا ہے وہ صرف اس حد تک ہے کہ آپ بغیر چونگی دیے ہندستان میں تجارت کرسکتے ہیں۔ کیا فرمان میں قلعہ تعمیر کرنے، نئی فصیلیں بنانے اور فوجی طاقت بڑھانے کی بھی اجازت ہے ؟ اس کا بھی ذکر ہے کہ تم حاکم بنگال کے یہاں سے بھاگے ہوئے ہر آدمی کو پناہ دوگے۔؟

واٹسن :۔ ویل۔ اہم....

سراج الدولہ :۔ مسٹر واٹسن ! میں پوچھتا ہوں کس نے آپ کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ آپ دوسرے تاجروں کے مال و اسباب سے لدے ہوئے جہاز لوٹ لیں اور اپنے سوا دوسروں کو تجارت کا موقع نہ دیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس قدر آزادی کس نے دی ہے۔ کیا

یہاں کوئی بادشاہ، کوئی حکمراں، کوئی والی نہیں ہے۔

واٹسن :۔ ویل۔

سراج الدولہ : میں نے اپنی بات ختم نہیں کی مسٹر واٹسن، انگریز محض سوداگر ہو کر صرف تجارت کر کے امن، چین سے زندگی بسر کرنا چاہیں تو وہ اس ملک میں رہ سکتے ہیں ورنہ ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔ آج کے بعد اگر کبھی میرے حکم کی خلاف ورزی یا کوئی توہین ہوئی یا بغیر اجازت کسی نے کام کی اطلاع ملی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ دس دن کے اندر اندر مجھے اس بات کی خبر ملنی چاہیے کہ آپ نے اپنا نیا قلعہ مسمار کر دیا اور میرے مجرم بلب راج کو جسے کمپنی نے پناہ دی ہے واپس بھیج دیا، اور حاکم بنگال کی مرضی پر چلنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔

(واٹسن پاس کھڑے ہوئے درباری کے کان میں کچھ کہتا ہے)

درباری :۔ حضور والا۔ مسٹر واٹسن کہتے ہیں کہ جناب ناراض نہ ہوں، وہ آج ہی کمپنی کے دوسرے ڈائرکٹروں اور کلکتہ کے انگریزوں سے ملاقات کر کے آپ کے احکام کی انہیں اطلاع دیں گے، اور اب جانے کی اجازت چاہتے ہیں۔

سراج الدولہ : بہت بہتر۔ اجازت ہے۔

(واٹسن چلا جاتا ہے)

سراج الدولہ :۔ سردار مدن موہن۔ !

درباری :۔ حضور والا۔

سراج الدولہ :۔ مانک چند کے تحت فوج، گولہ بارود، توپیں بندوقیں، ہاتھی، گھوڑے، ساز و سامان، رسد وغیرہ جتنی مہیا ہو سکتی ہے کوٹھی قاسم بازار کی طرف آج ہی روانہ کر دو۔

درباری :۔ مگر حضور والا نے تو انگریزوں کو دس دن کی مہلت دی ہے :

سراج الدولہ :۔ فوجوں کے روانہ کر دیے جانے میں کیا حرج ہے؟ ہم بے شک اپنے قول کے مطابق دس دن تک جواب کا انتظار کریں گے، اور جیسے ہی یہ مدت ختم ہوگی، ہم کوٹھی قاسم بازار کا محاصرہ کر لیں گے اور فورٹ ولیم پر فوج کشی۔ ــــــ

درباری :۔ جی حضور والا۔

منظر ۴

سپاہیوں کا خیمہ

(دائیں جانب سے فوجی لباس میں سراج الدولہ داخل ہوتا ہے)۔

(پس منظر۔ ہلکا شور)

درباری :۔ حضور والا۔ آپ ؟

سراج الدولہ :۔ ہاں۔ شکر ہے کہ ہم بالکل ٹھیک وقت پر پہونچ گئے۔ خیمے بہت مناسب جگہ پر لگائے گئے ہیں۔ میمنہ اور میسرہ کی کمک کا انتظام بھی خوب ہے۔ آج ۲۰ مئی ہے اور انگریزوں کو جواب کے لیے دی گئی مدت ختم ہو چکی ہے۔

درباری :۔ جی حضور والا۔

سراج الدولہ :۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کے اس قلعہ کے مسمار ہونے کا اور ان کے بنگال سے کوچ کرنے کا وقت آچکا ہے۔ انتظار کس بات کا ہے حملہ کا آغاز کیا جائے۔

(درباری باہر جاتا ہے اور توپ سر کرنے کی آواز آتی ہے)۔

ساتھ ہی لڑائی کا شور شروع ہو جاتا ہے
سراج الدولہ بھی دائیں جانب چلا جاتا ہے
ذرا سی دیر بعد چند سپاہی اور سراج الدولہ

(دائیں جانب سے داخل ہوتے ہیں ایک سپاہی بائیں جانب سے آتا ہے۔)

ایک سپاہی: حضور والا آپ تو کافی زخمی ہو چکے ہیں (خود بھی ہانپ رہا ہے)۔

سراج الدولہ: ان باتوں کو چھوڑو۔ سناؤ قلعہ کے اندر کی کیا خبر ہے۔

سپاہی: حضور والا کو فتح کا مژدہ ہی سنانے کو حاضر ہوا ہوں۔ مسٹر سائیکس، مسٹر وارن ہیسٹنگز، ڈاکٹر فورتھ، کانٹ اور ولیم کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو چکے ہیں۔

سراج الدولہ: اور واٹسن؟

سپاہی: ڈاکٹر واٹسن اور مسٹر چیمبرسن کو ان کے ۱۴۴ ساتھیوں کے ساتھ ہم نے گرفتار کر لیا ہے۔

سراج الدولہ: بہت خوب۔

سپاہی: اور حضور والا۔ اس طرف دیکھئے (بائیں جانب اشارہ کرتا ہے) قلعہ کے سب سے بلند مینار پر انگریزی پرچم کے بجائے حاکم بنگال کا پھریرا لہرا رہا ہے۔

(دائیں جانب سے میر جعفر داخل ہوتا ہے)

میر جعفر: حضور والا کو کوٹھی قاسم بازار اور فورٹ ولیم کی فتح مبارک ہو۔

دوسرا سپاہی: اور انگریزوں کی فراری بھی۔ سوائے ان قیدیوں کے جن کو ہم نے گرفتار کیا ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو گورا یا بدیسی کہلا سکے۔

سراج الدولہ: خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آج میری وہ قسم پوری کر دی جو میں نے اپنے دم توڑتے ہوئے نانا کے سرہانے کھائی تھی۔ اور خطۂ بنگال انگریزوں کے قدموں سے پاک ہو گیا — خدا مجھے توفیق دے کہ میں مدراس بمبئی اور سارے ہندستان سے ان تاجر نما سازشیوں کے قدم اکھاڑ سکوں

سپاہی: جی حضور والا۔

سراج الدولہ: تم نے اس لڑائی میں خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ میں اس قلعہ کی کمان تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ تم اس کے نگراں اور مختار ہو گے۔

سپاہی: ان انگریز قیدیوں کے لیے کیا حکم ہے حضور والا۔

سراج الدولہ: انھیں اس قلعہ کی سب سے تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ سب سے تنگ سب سے تاریک۔ تاکہ انھیں اور ان کے آقاؤں کو پتہ چل سکے کہ کسی کے ملک میں تجارت کے بہانے گھس آنے اور قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

(سپاہی سر خم کرتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

★

انشائیہ

سید اظہر حسین ہاشمی
نعمت اللہ روڈ، لکھنؤ

۱۹۸۲ء جو الوداع

آج صبح جب ہم بیدار ہوئے تو ہم نے اپنے سرہانے میز کے اوپر نئے سال ۱۹۸۲ء کا کلنڈر آویزاں دیکھا۔ اسے دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں نے بڑھ کر استقبال کیا اور خوش آمدید کہا۔ آج سے ہمارے نئے سال کے سفر کا آغاز ہے۔ دنیا اُمید پر قائم ہے اور تمناؤں اور آرزوؤں کا نام زندگی ہے۔ پس ہمیں اپنے وجود سے حسنِ ظن رکھنا چاہیئے کہ ہمارے مستقبل کا ہر ہر قدم ہمیں درخشانی و تابناکی کی طرف لے جا رہا ہے۔ ناگواری و ناکامی کے اندھیرے چھٹتے جا رہے ہیں اور ان میں سے نئے سال کی روشنی کی کرن پھوٹ رہی ہے۔ ہمیں نئے سال کی خوشی یوں بھی ہو رہی ہے کہ آج سے ہماری مدتِ عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ اضافۂ عمر ایسی نعمت ہے کہ دنیا کی عظیم الشان سلطنت اس کا معاوضہ نہیں ہو سکتی۔ یہ انمول ہے اور بجز فیضانِ ربُّ العزت کے کسی اور طرح میسر نہیں آ سکتی۔ پس ہم اپنے رب کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں نئے سال میں قدم رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

نئے سال کے کلنڈر کے ساتھ ساتھ گذشتہ سال کا کلنڈر اپنی جگہ پر بدستور موجود تھا۔ لیکن آج اس کے چہرہ پر نہ پہلی جیسی شگفتگی کی نمود تھی، نہ زندگی کے وجود کی کوئی رمق۔ اس پر سراسر مُردنی چھائی ہوئی تھی جو دلِ مفارقت دے جانے والوں کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ گویا آج اس کے نام و نمود اور عزّ و وقار کا ستارہ ڈوب رہا تھا۔ کل تک جس کے طنطنے نے سارے عالم کو ایک سال تک مرعوب کر رکھا تھا جس کا ہر سو غلغلہ بلند رہا۔ آج اس کی جدائی پر کون ہے جس کے منہ سے افسوس کے دو لفظ نکلیں۔ اسی لیے دُنیا کو جائے عبرت کہا گیا ہے۔ اس وقت ہماری ماضی کی یادیں نقش بن کر ابھر آئیں۔ ان میں خوشی و غم بھی شامل تھا۔ ناکامی و شادمانی بھی اور آرزوؤں اور حسرتوں کی پامالی بھی۔

انسان کو محشرِ خیال کہا گیا ہے لیکن وہ اس سے بھی سوا ہے۔ یعنی ایک طرف وہ قدرت کی لطیف و نفیس، حسین و دلکش صنعت کا بے مثل ازلی نمونہ ہے تو دوسری طرف پیکرِ طلسمِ کائنات ہے۔ اس پر پیدائش سے لے کر طفولیت، نو عمری و جوانی اور ضعف و ضعیفی تک طرح طرح کے خوشگوار و ناخوشگوار مرحلے گزرتے رہتے ہیں جن کو وہ انگیز کرنے پر مجبور ہے۔ یہ مراحل اس خوشی سے گزرتے ہیں کہ اس کے احساس کو جنبش تک نہیں ہوتی۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ خوشی و غم، کلفت و راحت، امید و حسرت، ناکامی و شادکامی کا ایک دوسرے کا پہلو بہ پہلو ساتھ ہے۔ انکا اجتماع ضدین سے انسان عبارت ہے اور انھیں تغیراتِ زندگی نے اس کو اشرف المخلوقات کے

درجہ سے مفتخر کیا ہے۔

ہمارے روزمرہ کے مشاہدات ہیں کہ ایک پودا اگتا ہے اور کچھ مدت گزر جانے کے بعد خشک ہو کر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ شام کو پھول کھلتا ہے اور صبح مرجھا کر گر جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں نئی نئی روحیں روز و شب جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں اور پرانی عدم میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ روزِ آفرینشِ عالم سے ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کب تک جاری رہے گا۔

ہمیں اپنی زندگی پر ناز ہے اور ہم فخر سے پھولے نہیں سماتے لیکن اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اس کا انحصار ہماری سانس کی آمد و رفت پر ہے۔ اگر سانس کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ کسی وقت رک جائے تو ہمارا وجود عدم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
بہرکیف اس سے ہمیں بالکلیہ ہماری بے ثباتی کا سبق ملتا ہے جو نصیحت خیز بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّتِ فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

غرض ہماری انھیں سانسوں سے پل، گھڑی اور گھنٹے بنتے ہیں گھنٹے دن اور ہفتوں میں بدل جاتے ہیں اور ہفتے مہینوں اور سال میں اور سال قرنوں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔

ہمیں نئے اور پرانے سال کے کلنڈر سے خوشی و غم کے فلسفہ کا احساس ہوتا ہے۔ ہر نئی چیز کی آمد ہمارے لیے باعثِ مسرت ہو جاتی ہے اور جو چیز کہ حاصل ہے جب مفارقت اختیار کر لیتی ہے تو افسوس ہوتا ہے۔ اس فلسفہ سے ہمارے فریبِ زندگی کا عقدہ کھل جاتا ہے۔ یعنی ہم جس کو عمر میں اضافہ سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ہماری مدتِ عمر میں ایک سال کا خسارہ ہے۔ اس خسارہ کو ہم کسی طرح پورا نہیں کر سکتے۔ اس کو دوبارہ واپس کرنے کے خواہ کتنے ہی جتن کریں، اس گزر جانے والے سال کو واپس نہیں لوٹا سکتے۔

ہر نیا سال جب آتا ہے تو سب سے پہلے حکومت کے ایوانوں میں استقبال کیا جاتا ہے بلکہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں کوئی سند، ڈگری یا ڈپلوما بغیر اس کے نام سے مہر کے وقعت نہیں رکھتے۔ ریلوں اور بسوں میں پولیس کے دفتروں میں نیا سال چھایا رہتا ہے۔ ڈاک خانہ کا سارا کام بغیر اس کے نام کی مہر کے بیکار مانا جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلے اس کے ٹھپہ کے بغیر ناقابلِ عمل متصور کیے جاتے ہیں۔ نجی کاروبار اس کے وجود کے بغیر بے وقعت تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ عبادت گاہوں، مذہبی اداروں اور خانقاہوں تک میں اس کے وجود کو مقدس مان لیا جاتا ہے۔ غرض جس طرح حکومت کے احکام کا سکہ چلتا ہے اسی طرح نیا سال بھی سکۂ رائج الوقت ہو جاتا ہے۔

اس کرۂ بحر و بر پر دن رات کے پردے اٹھتے اور گرتے رہتے ہیں۔ جب دن کا پردہ اٹھتا ہے تو رات آجاتی ہے اور جب رات کا پردہ اٹھتا ہے تو سحر نمودار ہوتی ہے۔ اس وقت شہروں اور بازاروں میں چہل پہل نظر آتی ہے اور ہمہ وقت گہما گہمی رہتی ہے۔ ہر انسان کسبِ معاش کے لیے سرگرداں نظر آتا ہے۔ اور مشغولِ جہد ہو جاتا ہے۔

اور جب دن ڈوب جاتا ہے تو رات ساری کائنات پر اپنا سیاہ غلاف چڑھا دیتی ہے جس میں ہر شے پوشیدہ ہو جاتی ہے اور ہر وجود معدوم نظر آتی ہے۔ شہروں اور بازاروں میں ہو کا عالم طاری ہوتا ہے۔ مندر اور کلیسا کے کلس اور مسجد کے مینار دیو پیکر اور مہیب نظر آتے ہیں۔ باغات میں تناور درخت ڈراؤنی شکل اختیار کر لیتے ہیں جنگلوں اور بیابانوں میں جن اور بھوتوں کی عمل داری شروع ہو جاتی ہے۔ انسان کو توہم رکھتے وحشت ہوتی ہے۔ ہر شے رات کے طلسم سے مسحور ہوتی ہے۔ مزدور، طالب علم، صحافی، افسانہ نگار اور شاعر ہر ایک پر غنودگی کا غلبہ طاری ہوتا ہے۔ سرکاری پہریدار اور سڑکوں اور دکانوں کے نگہبان غافل ہو کر خدا معلوم کس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جانور اپنے تنفس کی صدائے بے ہنگم سے رات کی تاریکی کا خیر مقدم کر رہے ہوتے ہیں۔ حجروں اور خانقاہوں میں بھی سناٹا نظر آتا ہے عابدِ شب بیدار کی بھی آنکھ جھپک جاتی ہے۔ غرض رات کے وقت درخت کی پتی کی جنبش تک قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

مومن خاں شوقؔ
اشرف محلہ ۲۳-۲-۱۱، ملے پلی
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰

نیا سال آگیا

زخموں کو بھول جاؤ نیا سال آگیا
باتیں نئی سُناؤ نیا سال آگیا

بدلا نظامِ دہر تو چہرے مہک گئے
جھومو خوشی سے گاؤ نیا سال آگیا

مہکی ہوئی فضا ہے تو نکھرا ہوا شعور
پھر تم بھی گنگناؤ نیا سال آگیا

سازِ طرب پہ رقص میں آئے حیاتِ نو
ہر غم کو بھول جاؤ نیا سال آگیا

تلخابۂ حیات میں صہبا انڈیل کر
مہکو، سبو اٹھاؤ نیا سال آگیا

اب بزمِ آرزو میں چراغاں ہے چار سو
محراب و در سجاؤ نیا سال آگیا

اے شوقؔ! اختلاف کی باتوں کو بھول کر
سب کو گلے لگاؤ نیا سال آگیا

سیدہ شانِ معراج
تاریہ گلی۔ شاہجہاں پور

غزل

حال موسم ہی کا پوچھے گا وہ جب پوچھے گا
مجھ سے کب میری اداسی کا سبب پوچھے گا

اس سے ملنے پہ خوشی کیسے چھپائی جائے
کیا بتائیں گے وہ جب وجہِ طرب پوچھے گا

کس کو معلوم ہیں اس دور میں آدابِ نظر
کون اب مرحلۂ ترک و طلب پوچھے گا

میری بستی میں سبھی شام سے سو جاتے ہیں
کون مجھ سے سببِ نالۂ شب پوچھے گا

اپنی تنہائی کو محصور کیے ہیں گھر میں
گھر سے نکلیں گے تو پھر شہرِ طرب پوچھے گا

ڈال لو چہرۂ غمگیں پہ ہنسی کا آنچل
کون اس حال میں رونے کا سبب پوچھے گا

کوچۂ عشق میں کیا عظمتِ سادات کا غم
شانؔ کوئی نہ یہاں نام و نسب پوچھے گا

مزاحیہ

ضیا حسنی
۵۰- چھوٹی بازار
فتح پور

کھونا ایک شاعر کی بیاض کا

ایک دن انور کمال گھبرائے ہوئے آئے اور افسردہ لہجے میں بولے،

"ایک حادثہ ہوگیا"

ان بے چارے کی دردمندی کا یہ عالم ہے کہ راستہ چلتے کسی شخص کے معمولی سی ٹھوکر بھی لگ جائے تو ان کا دل بھر آتا ہے اور آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ یہ اس شخص کی تن من دھن سے مدد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جب تک اس کی چتا کو فرداً فرداً سبھی دوستوں کو سنا نہیں لیتے ان کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ ادھر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ایسے کچے دل کے ہیں کہ آسانی سے کسی غم انگیز واقعہ اور کرب ناک منظر کو سننے یا دیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ سرِ راہ کوئی حادثہ ہوجاتا ہے تو سینہ بچا کے اور آنکھیں چرا کے نکل جاتے ہیں۔ پھر کوئی بلا سر پر آہی جاتی ہے تو چار و ناچار اس کا مقابلہ بھی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ کمال جیسے ہی سر پر مسلط ہوئے ہم نے اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں ان سے کہا،

"اللہ خیر کرے، کیا ہوا میرے بھائی۔؟"

"یہ نہ پوچھیے، شاعروں پر عجب وقت آن پڑا ہے....."

"سچ کہتے ہو کمال! ۱۹۸۲ء نے جیسے شاعروں کو تاک لیا ہے۔ ستون گر رہے ہیں، تانتا سا بندھ گیا ہے۔ شاعرِ انقلاب جوشؔ اور شاعرِ جمال فراقؔ کے غم کو اٹھائے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ شاعرِ مزدور احسانؔ دانش بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ میاں ان کی یاد میں بھی کوئی نشست کا اہتمام کرو۔ یقین کرو! جب ہم نے ان کا یہ شعر کہیں پڑھا تھا ؎

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں انہیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے

اسی وقت ہمارا دل دھڑکا تھا اور ہم نے خیال کیا تھا کہ احسانؔ صاحب کو یہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے جدید شاعر کا روپ تو نہیں دھار لیا ہے یا خدانخواستہ آنے والا کوئی حادثہ ان سے ایسے اشعار کہلوا رہا ہے، اور وہی ہوا کہ وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے؟"

"جی ہاں! احسانؔ دانش کا بھی انتقال ہوگیا اور وہ اپنے حضرتِ معصوم......."

ہم نے احتیاطاً کمال صاحب کو پوری بات کہنے نہیں دی کہ خدا جانے وہ تفصیلاتِ مرگ کو بیان کرنے میں کیسا کرب ناک انداز اختیار کریں کہ ہمیں گھنٹوں دل پکڑ کر بیٹھنا پڑے۔ بات یہ ہے کہ کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا، قدرت کی طرف سے انھیں دردمندی ملی ہے اور

خیر سے شاعر بھی ہیں، لہٰذا ہم نے مداخلت کرتے ہوئے کمال سے پوچھا۔

"کب اور کہاں، انتقال ہوا؟ سچ ہے زندگی کا کوئی ٹھیک نہیں۔ کل معصوم بھائی نعیم کے چائے خانے میں بیٹھے ہوئے لہک لہک کر غزلیں سُنا رہے تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ کل ہی دم میں یہ چراغ بجھ جائے گا اور اس کی روشنی کو ہم ڈھونڈھتے پھریں گے۔ آہ! یہ درد بھری آواز اور یہ پُر خلوص لہجہ زندگی بھر کانوں میں گونجتا رہے گا۔ اس مختصر وقفے میں بیچارے معصوم نے دس غزلیں سنا کر دم لیا تھا۔ ہم ذرا سا پہلو بدلتے تو وہ جھٹ چائے کا آرڈر دے دیتے، یہ سب کچھ وہ اس قدر خندہ پیشانی سے کر رہے تھے کہ گویا ہم ان کی دلکش غزلوں کو سُن کر ان پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے انسان تھے حضرتِ معصوم، افسوس! کیسے نیک اور پُر خلوص لوگ دنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں۔"

اب کمال نے کافی الجھتے ہوئے کہا:

"آپ تو مجھے بولنے ہی نہیں دیتے۔ حضرتِ معصوم کے پھانس بھی نہیں لگی اور وہ بفضلِ خدا بخیر و عافیت ہیں اور آپ انھیں راہیِ ملکِ عدم بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں تو اس حادثے سے آپ کو باخبر کر رہا تھا کہ کوئی ظالم ان کی بیاض اڑا لے گیا۔ اس واقعہ نے تو ان کے دل کی دُنیا ہی ہلا ڈالی انھیں کسی کل چین نہیں اٹھتے بیٹھتے کراہتے ہیں اور شب و روز اسی کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔"

ہم نے اطمینان کی سانس لی اور پھر کہا، ------

"معصوم صاحب کا دم غنیمت ہے۔ خدا انھیں زندہ سلامت رکھے، خوش فکر شاعر ہیں، اچھے دوست ہیں۔ ان کی بیاض کا کھو جانا معمولی نقصان نہیں، وہ واقعی کافی رنجیدہ ہوں گے۔ اپنا ایک ایک شعر یاد آتا ہوگا اور وہ کفِ افسوس ملتے ہوں گے۔ یقین جانو! وہ اپنے ہر شعر سے اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے کوئی ماں اپنے بچوں کو والہانہ طور پر چاہتی ہے وہ جب کوئی اچھا سا شعر سناتے تو جوش میں آ کر کہہ اٹھتے "ذرا کوئی ایسا شعر کہہ کر تو دکھائے۔ فوراً ہی خون تھوکنے لگے گا۔ یہ ایسا شعر کہنا کوئی مذاق نہیں"۔ افسوس! بے چارے معصوم کی برسوں کی محنت پر پانی پھر گیا۔ کمال! چلو ان کے گھر چل کر ان کا غم غلط کریں۔"

"ضرور چلیے اشعر صاحب! وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ دو ... کی بکری کھو گئی تھی تو شہر کے سارے ادیب اور شاعر ان کے یہاں کھنچ کر پہنچ گئے تھے، اور اس بکری کو ڈھونڈھ نکالا تھا اور میری بیاض کھو گئی جو میری شعری زندگی کا سرمایہ تھی تو کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ کسی نے میری ذرا سی دلداری نہیں کی۔ تاجر، کسان، سرکاری نوکر سبھی مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں اور ہم شاعر تو لیو لئے میں بیٹھے رہتے ہیں اور کسی کی پروا نہیں کرتے۔"

غرض ہم سبھی حضرت معصوم کے یہاں پہنچے تو ان کا دل ٹھہر گیا اور وہ دھیرے دھیرے بولنے لگے:

"بھائیو! ان بیس برسوں میں میرے خیالات اور محسوسات میں کافی تبدیلی ہوئی ہے، سوچنے سمجھنے کا انداز بدلا تو وہ سمٹ کر میری غزلوں میں آتا رہا۔ میرے گرد و پیش جو منظر پھیلا ہوا تھا اسے میں احتیاط سے اپنی غزلوں میں سموتا رہا۔ ساتھیو! آپ تو جانتے ہیں کہ غزل کے کوزے میں سمندر کو بند کرنا کوئی آسان کام نہیں، اچھوں اچھوں کو پسینہ آ جاتا ہے۔ جب بیگم میری شاعری کو نشانۂ تنقید بناتیں تو میں اپنی بیاض کو اُن کے سامنے رکھتے ہوئے کہتا۔

"بیگم! یہ میری زندگی کی کمائی ہے۔ تم اس کام کی اہمیت سے واقف نہیں ہو تبھی ایسی باتیں کرتی ہو۔"

"معصوم صاحب! آپ کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے، بیویوں کو اپنے شوہروں کے کارناموں کو نظر انداز کرنے میں کافی مزہ آتا ہے۔ غیر لوگوں کی معمولی باتوں کو سراہنا اور شوہروں کے کارناموں پر خاموش رہنا جیسے ان کی عادت بن گئی ہے۔ آپ بھابھی جان کی بے نیازی کو بالکل محسوس نہ کریں اور شعر کہتے رہیں انشاء اللہ بیاض بھی مل جائے گی۔"

اتنی بات سنتے ہی معصوم صاحب پھر بولنے لگے :

"افسوس! میری حیاتِ شاعری کا یہ بیش قیمت سرمایہ دیکھتے ہی دیکھتے لٹ گیا۔ آپ سبھی جانتے ہیں کہ میں غزل کہہ کر اسے بیاض میں محفوظ کر لیتا تھا اور پھر اسے کسی نشست یا مشاعرہ میں سُنا کر داد و تحسین وصول کرتا تھا۔ افسوس! ظالم وہی چیز اڑا کر لے گیا جو میری خوشیوں کا مخزن تھی اور جسے دیکھ کر میں جیتا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں نے معدودے چند غزلیں ہی رسالوں کو بھیجی تھیں باقی سبھی غیر مطبوعہ ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ غزلیں کن رسالوں میں شائع ہوئی تھیں"۔

وصلؔ بول پڑے :

"آپ نے غلطی کی کہ اپنی غزلیں شائع نہیں کرائیں اور ان غیر مطبوعہ غزلوں کو اُچھالتے پھرے اور اس دور پر نگاہ نہیں رکھی کہ جہاں کوئی اچھی چیز دکھائی دیتی ہے لوگ زبردستی اسے چھین لیتے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل تک بچنے نہیں پاتا۔ معصوم بھائی آپ نے اکٹھا دو سو غزلیں گنوا کر کسی کو شاعر بنا دیا۔ اب وہ نشستوں اور مشاعروں میں انھیں ترنم سے پڑھ کر مزے سے داد و تحسین وصول کرے گا"۔

"یہ تو چوک ہو گئی"۔

انھوں نے دھیرے سے اعتراف بھی کر لیا۔ معصوم تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے تو کمالؔ نے پھر بات شروع کی۔

"اب آپ تھانے میں رپورٹ درج کرا دیجیے اور کسی کثیر الاشاعت اخبار کو اس حادثے کی خبر بھی بھیج دیجیے"۔

"میں سبھی جتن کر چکا ہوں اور اب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں۔ اب تو مجھے اس بات کو زبان پر لانے میں بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ جو لوگ شاعری سے بالکل دلچسپی نہیں رکھتے وہ اس طرح کہتے ہیں — "میاں معصوم کی گانے کی کاپی کھو گئی ہے تو وہ روتے پھرتے ہیں"۔ گھر کی مرغی دال برابر، جب میرے گھر ہی میں میری شاعری کو کبھی اہمیت نہیں دی گئی تو میں دوسروں سے کیا شکایت کروں۔ چنانچہ تھانے میں بھی پہلے بیاض کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا۔ جب میں نے وضاحت کی اور یہ بتایا کہ میں نے خون پسینہ ایک کر کے اس سرمایہ کو اکٹھا کیا تھا تو محرر نے رپورٹ تو درج کر لی لیکن اس طرح کے سوالات بھی کیے :

"آپ کو کسی پر شبہ ہو تو اس کا نام بتائیے۔ سُراغ بتانے سے مجرم کا پتہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے اور بال جلدی کال جاتا ہے، بعض سمجھ دار لوگوں کا شبہ سو فیصد صحیح نکلتا ہے"۔

میں نے صاف کہہ دیا کہ مشغلۂ شعر گوئی کچھ اس طرح مجھے الجھائے رکھتا ہے کہ میں دوسرے کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور آدمیوں کا پرکھنا مشکل کام بھی ہے جو میرے بس کا نہیں۔ آدھی زندگی دھوکے کھانے میں گزر چکی ہے، یوں بھی کسی کے بارے میں کوئی بُرا خیال اپنے دل میں نہیں لاتا۔"

معصوم صاحب نے جیسے ہی بات ختم کی، اوٹ سے بیگم معصوم بولنے لگیں :—

"صاحبو! یہ بیاض جب تک ان کے پاس رہی مجھے برابر دکھ دیتی رہی اور اب کھو گئی ہے تو بھی اذیت دے رہی ہے۔ اس کی تفصیل بھی سنتے چلیے۔ اس ظالم بیاض نے مجھ پر کون سا ظلم نہیں ڈھایا، پہروں رُلایا ہے اور نت نئے دکھ دیتی رہی ہے۔ یقین جانیے مجھے کسی کل چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ مختصر یہ کہ یہ ڈائن سوت بن بیٹھی تھی۔ ایسے کون عورت برداشت کرے گی کہ اس کا شوہر کسی دوسرے سے دل لگائے اور شب و روز اسی کے گن گاتا رہے۔ یہ تو میرا ہی ظرف ہے کہ یہ اس نگوڑی بیاض کو سینے سے لگائے صبح سے شام تک پھرا کرتے تھے اور میں نے اسے حوالۂ آتش نہیں کیا۔ گھر میں آٹا، دال، تیل، گھی، مرچ مصالحے اور ایندھن نہ ہو تو ان کی بلا سے۔ اگر لڑکے بچپن سے ہی ذمے داری نہ سنبھال لیتے تو میاں کی کرکری ہو جاتی۔ یہ اپنی شاعری کو جتنا بانس پر چڑھائیں لیکن مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی، کیونکہ اس شاعری سے ان کی، میری اور اپنے کنبے کی کبھی کوئی

بھلائی ہوتے دکھائی نہیں دی۔ مانا کہ یہ اپنی غزلوں سے دوسرے تیسرے مہینے سو دو سو روپے کما بھی لیتے ہیں لیکن مجھے تو یہ کھوٹا سکہ بھی نہیں دیتے۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ان کے ہاتھ میں روپے ٹھہرتے ہی نہیں۔"

کمال درمیان میں بول پڑے۔

"آپ کی شکایتیں جائز ہیں لیکن بھابھی جان! اب معصوم بھائی کی حالت زار دیکھی نہیں جاتی۔ دیکھیے نا یہ بالکل مجنوں بنے ہوئے ہیں۔ کتنا جبر ہے کہ آپ نے ان سے وہی چیز چھین لی جس کا تعلق ان کے دل سے تھا لہٰذا ہنسنا بولنا، شعر کہنا، کوئی پر لطف بات کرنا یہ سبھی کچھ بھول گئے ہیں۔ ہمیں سو فی صد یقین ہے کہ وہ بیاض آپ کے پاس ہے اور آپ نے انتقاماً اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ آپ انھیں بیاض واپس کر دیں گی تو ان میں از سر نو زندگی عود کر آئے گی۔"

"کمال صاحب! میں کیوں چھپاؤں۔ وہ بیاض ہے تو میرے پاس ہی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے انتقاماً اسے چھپا دیا تھا اور یہ سوچتی تھی کہ ان کے ہاتھوں میں بیاض نہ رہے گی تو یہ میرے ہو رہیں گے، لیکن نتیجہ برعکس ہوا۔ انھوں نے تو واویلا مچا کر آسمان کو سر پر اٹھا لیا ہے۔ ان کی آہ و زاری کا سن کر لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آتے ہیں۔ چار و ناچار میں ان کی خاطر تواضع بھی کرتی ہوں۔ یوں بھی گرہستی کے جنجال کم نہ تھے ایک کام اور بڑھ گیا۔ لہٰذا اس بیاض کو واپس کر دینے ہی میں عافیت دکھائی دیتی ہے۔"

۱۹۸۲ء کو الوداع

صفحہ ۴۱ کا بقیہ

بقول علامہ اقبال ؎

بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے
یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے

بہر صورت یہ دن اور رات اس طرح خاموشی سے گزرتے رہتے ہیں کہ ہمیں ان کے آنے جانے کی آہٹ تک نہیں معلوم ہوتی، جس طرح اپنی سانس کی آمد و رفت کا احساس نہیں ہوتا اسی طرح دن رات کے تغیر کا بھی پتہ نہیں چلتا۔

مگر جب رات کی تاریکی اپنے منتہائے عروج پر پہنچ جاتی ہے تو اس کے قدم آہستہ روی اور خموشی سے پیچھے کی طرف واپس لوٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ رات کے طلسم کا تار و پود بکھرنے لگتا ہے۔ اندھیرا چھٹتا جاتا ہے۔ یہ زندگی پھر باغ و بہار بن جاتی ہے۔

یکم جنوری نئے سال کے آغاز کا دن ہے۔ پرانا سال ہم سے رخصت ہو رہا ہے اور ہم کو الوداع کہہ رہا ہے۔ کل تک جس طرح ۱۹۸۲ء کا جھنڈا سر بلند تھا، آج اس کی جگہ نئے سال ۱۹۸۳ء کا پرچم نسیم صبح سے اٹکھیلیاں کر رہا ہے۔

بقول اقبال ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: شاعر آخر الزماں ۔ جوش ملیح آبادی
مصنف: ڈاکٹر فضل امام
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
قیمت: تیس روپئے

نئی نسل کے نقادوں میں ڈاکٹر فضل امام کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ راجستھان یونیورسٹی جے پور کے شعبۂ اردو و فارسی کے استاد بھی ہیں اور راجستھانی زبان و ادب، امیر اللہ تسلیم، بھوج پوری ادب کا تعارف، افکار و نظریات، جدید ہندی شاعری، اور جوش ملیح آبادی وغیرہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی۔

زیر نظر کتاب "شاعر آخر الزماں، جوش ملیح آبادی" ڈاکٹر فضل امام کی تحقیقی و تنقیدی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جوش کی وفات کے بعد اتنے کم عرصے میں کوئی مبسوط کتاب تیار کر لینا بڑے دل گردے کی بات تھی۔

کتاب میں سب سے پہلے جوش کی حیات کو بہ لحاظ سنین پیش کیا گیا ہے تاکہ ان کی شاعری کا پس منظر سامنے آسکے۔ اس کے بعد ان کی حیات کے اہم واقعات، ان کے مختصر حالات، اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بحیثیت فن کار جوش کی نظم نگاری، غزل گوئی، رباعی نگاری، مرثیہ نگاری، نثر نگاری پر علاحدہ علاحدہ باب قائم کیے گئے ہیں اور ہر باب پر سیر حاصل عالمانہ بحث کر کے جوش کا ادبی مقام متعین کیا گیا ہے۔

جوش پر ایک مکتبۂ فکر کی جانب سے الحاد کا الزام لگایا گیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اپنے دلائل اور خود جوش کے بیانات اور اشعار کے ذریعہ اس الزام کو غلط ثابت کر کے جوش کے عقیدے کو واضح کر دیا ہے۔ مگر فاضل مصنف اس سے متفق ہیں کہ

"جوش کی شخصیت بڑی پُر پیچ ہے اور سادہ بھی۔ وہ کبھی ستر ہتوں میں پوشیدہ نظر آتے ہیں اور کبھی خاک پر تڑپتے ہوئے۔"

نظم نگاری کے باب میں ڈاکٹر فضل امام نے جدید نظم کی مختصر تاریخ اور جوش کی نظم گوئی کی نمایاں خصوصیات مثلاً رومانی شاعری انقلابی شاعری، جنگ آزادی میں جوش کی شاعری کے اہم رول وغیرہ کا بڑا مکمل تجزیہ کیا ہے۔ نظم جدید کے ارتقا کے سلسلے میں انھوں نے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے:

"اگر انیس و دبیر کے مراثی نہ ہوتے تو جدید نظم کو سنورنے اور نکھرنے میں ابھی معلوم نہیں کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑتے۔"

صنائع و بدائع کے متعلق بھی مصنف کا یہ قول بڑا وزنی اور حقیقت پر مبنی ہے:

"انیس اور اقبال کے بعد جوش ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو صنائع و بدائع سے کام لینے کے باوجود صنعتوں کے اسیر نہیں بلکہ ان کے استعمال سے صنعتوں کو معراج نصیب ہوتی ہے۔"

غزل گوئی کے باب میں مصنف نے جوش کی غزلوں کے نمائندہ اشعار پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ان کے یہاں جذبہ بھی ہے اور تخیل بھی، یہاں بھی ان کا تخلیقی ذہن قلب و نظر کی قوس قزح پیدا کر رہا ہے۔ ایک اچھی اور کامیاب غزل جن صفات کی حامل ہونی چاہیے۔ جوش کی غزلیں ان سے متصف ہیں۔

رباعی گوئی کے باب میں مصنف نے رباعی کی تعریف اور مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے جوش کی رباعیوں کو مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کر کے ان کی رباعیوں کے نمونے پیش کیے ہیں خلاً

فلسفہ عیش و نشاط سے متعلق رُباعیاں، رومانی رُباعیاں، اخلاقی رُباعیاں۔ مصنف کا یہ قول بھی بلا خوفِ تردید قابلِ پذیرائی ہے کہ "اس صدی میں جوشؔ سے بڑا اُردو شاعری میں کوئی رباعی نگار شاعر پیدا نہیں ہو سکا ہے۔"

جوشؔ کی مرثیہ نگاری ایک اہم باب ہے جس میں پینتالیس صفحوں کا ایک مقالہ بھی شامل ہے۔ جوشؔ نے تقلید سے گریز کیا ہے اور ایک الگ راستہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے فکر و اسلوب کے نئے نئے تجربے کیے ہیں۔ سماجی شعور اور عصری حسیت کی کارفرمائی ان کے یہاں ملتی ہے۔ جوشؔ کے مرثیوں کے موضوعات انقلابی اور فلسفیانہ ہیں جو فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔

کتاب کا آخری باب جوشؔ کی نثر نگاری کے متعلق ہے جس میں جوشؔ کی نثر کے اقتباسات پیش کر کے ان کی نثر کا تجزیہ کیا گیا ہے مصنف جہاں جوشؔ کی نثر کی خوبصورتی اور اسلوب کی رومانیت کے قائل ہیں، وہیں انھیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ "یادوں کی برات" میں جہاں شخصی خط کے پیش کیے گئے ہیں وہاں جوشؔ اعتدال نہیں برت سکے۔ مصنف اگر "یادوں کی برات" کے ان حصوں کی طرف بھی اشارہ کر دیتے جن میں زبان کی بے راہ روی اور ابتذال کا مظاہرہ ہوا ہے تو تنقید کا یہ پہلو تشنہ نہ رہ جاتا۔ مصنف کا طرزِ بیان بڑا دل کش، صاف ستھرا اور سلجھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں شاعرانہ اسلوب کی جھلک بھی نظر آتی ہے جو قاری کے ذہن کو ایک کیف و سرور بخشتی ہے، مگر ابلاغِ خیال میں حائل نہیں ہوتی۔

مجموعی طور پر یہ کتاب جوشؔ کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کا ایک اچھا وسیلہ ہے جس سے ڈاکٹر فضل امام کے تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر اور زاویۂ فکر کا پتہ بھی چلتا ہے۔

——— (ڈاکٹر) امام مرتضیٰ نقوی

نام کتاب: نیرنگِ تخیل
شاعر: محمد افتخار الحق دلیرؔ عثمانی
ملنے کا پتہ: دلیرؔ عثمانی۔ محلہ نیازیان۔ امروہہ (مرادآباد)
قیمت: دس روپے

نیرنگِ تخیل دلیرؔ عثمانی کا مجموعۂ کلام ہے جس میں حمد، نعت، منقبت، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی دلیرؔ کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں،

"جناب محمد افتخار الحق دلیرؔ عثمانی امروہوی بھی روہیل کھنڈ کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے کہا تو کم ہے مگر اس کم میں بھی اس کثرت کے خصائص جگہ جگہ نظر آتے ہیں....."

دلیرؔ صاحب کی شاعری مشقِ سخن کی دلیری کے صفات سے مملو ہے جس کی وضاحت کے لیے سرِ کتاب کا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

اک حرفِ آرزو ہو تو اس سے بیاں کریں
ہم اپنے مدعا کا ہیں دفتر سیے ہوئے

تین شعر اور نمونتاً پیش خدمت ہیں ؎

میں بتوں کے عشق میں اس درجہ غافل ہو گیا
زنگ آلودہ مرا آئینۂ دل ہو گیا
کشتگانِ ناز میں اب میں بھی شامل ہو گیا
اب تو میرا دل بھی دل کہنے کے قابل ہو گیا
اضطرابِ شوق میں چلنا بھی مشکل ہو گیا
اللہ اللہ ہر قدم ایک ایک منزل ہو گیا

(ڈاکٹر) ذکی کاکوروی

Urdu Monthly

Vol. 37 No. 10
JANUARY 1983
50 paisa

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

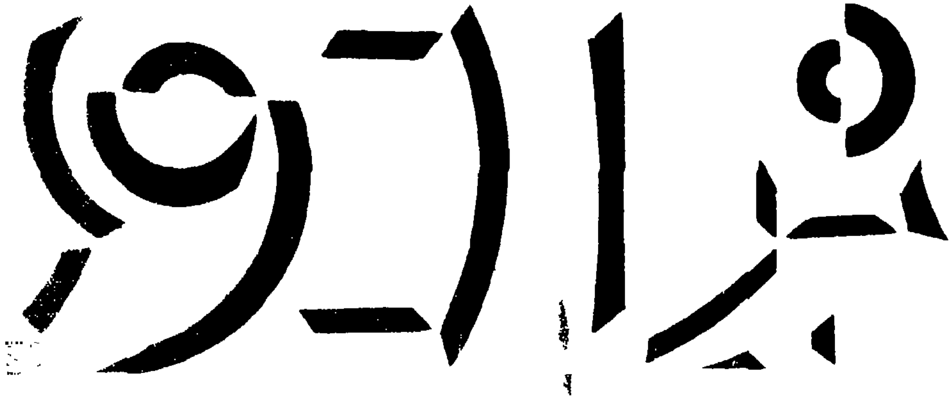
REGD. No. LW/NP.17
Annual Subs.
Rs. 5/-



نیا دور

فروری ۱۹۸۳ء

۵۰ پیسے



عنوانات

نیا دور کے مضامین میں ظاہر کیے گئے خیالات [illegible] ضروری نہیں کہ حکومت [illegible] متفق ہو

جلد ۳۷ | نمبر ۱۱

فروری ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

ناشر: گنگادھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

[illegible] لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ - لکھنؤ

[illegible]

اپنی بات

نئے سال کا سورج طلوع ہوا تھا کہ ہمارے دو نامور اور ممتاز شاعر نشور واحدی اور حرمت الاکرام رحلت فرما گئے۔ نشور واحدی کا انتقال ۴ر جنوری کو ہوا اور اس طرح ایک خوش گو اور خوش نوا شاعر کی سحر آگیں اور مترنم آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی جو تقریباً ۶۰ برسوں سے برصغیر کے گوشے گوشے میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں جادو جگا رہی تھی۔ نشور صاحب ۱۹۱۲ء میں ضلع بلیا میں پیدا ہوئے، الہ آباد کے عربک کالج مصباح العلوم میں عربی، فارسی کی تعلیم، نیز بہت کچھ علوم و فنون اپنے مطالعہ اور محنت سے حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش کے سلسلے میں کانپور چلے آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ عرصہ تک حلیم مسلم کالج میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ مثنوی صہبائے ہند، سفر نشور، آتش و نم، فروغ جام، سواد منزل، گل افشانی گفتار اور تاریخ فلسفۂ بے خودی، ان کی اہم اور قابل ذکر تصانیف ہیں۔ شور نشور، آتش و نم نظموں اور سواد منزل غزلوں کا مجموعہ ہے۔ نشور صاحب سادگی اور شرافت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ موصوف سے راقم حروف کی آخری ملاقات ڈیڑھ دو ماہ قبل انھیں کے دولت کدہ پر ہوئی تھی۔ صحت اگرچہ اچھی نہیں تھی لیکن ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے اور بظاہر نہیں معلوم ہوتا تھا کہ موت ان کا تیزی سے پیچھا کر رہی ہے، اس لیے ۵ر جنوری کے "قومی آواز" میں جب ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو حیرت میں پڑ گیا۔ دورِ حاضر کے غزل گو شعراء میں نشور صاحب کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ یوں تو انھوں نے متعدد نظمیں بھی کہی ہیں لیکن بنیادی طور پر اور ذہنی اعتبار سے وہ غزل ہی کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں جو حسن و لطافت، نغمگی اور موسیقیت ہے، لب و لہجہ میں جو شائستگی اور تازگی ہے، تشبیہوں اور استعاروں میں جو جدت اور ندرت ہے وہ عصر حاضر کے چند ہی شعراء کے حصے میں آئی ہے۔ ان کی غزلوں میں بقول ڈاکٹر محمد حسن صاحب:۔
"بڑی کھری سچائی، جاگتی جگمگاتی تصویر ملتی ہے۔ وہ نئی نویلی دلہن کی طرح پھولوں سے مہکی ہوئی، عطر میں بسی ہوئی کہیں محوِ آرائش، کہیں محوِ گفتار، مچلتی، اٹھلاتی، گاتی، گنگناتی گذرتی ہے۔"

● —— ابھی نشور صاحب کے انتقال کا زخم تازہ ہی تھا کہ حرمت الاکرام بھی چل بسے۔ ان کا انتقال ۶ر جنوری ۱۹۸۲ء کو مرزا پور میں ہوا۔ حرمت الاکرام صاحب ایک طویل عرصے تک جتنی خاموشی کے ساتھ اردو زبان و ادب کے گیسو سنوارنے میں لگے رہے، اسی خاموشی کے ساتھ انھوں نے اپنی موت کو گلے لگا لیا۔ نہ تو ان کی علالت کی خبر اخباروں میں آئی اور نہ موت کی۔ حرمت صاحب ہر قسم کی نمائش پسندی اور جوڑ توڑ سے کافی دور طویل عرصے سے مرزا پور میں ایک طرح کی گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔

انھوں نے کافی کہا اور سنبھل کر کہا۔ ان کی طویل نظم "کلکتہ۔ ایک رباب" کتابی شکل میں دوبارہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ "ہمارے شاعر" کے عنوان سے انھوں نے ہندی میں ایک شعری انتخاب بھی مرتب کیا تھا جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

حرمت صاحب نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا۔ بچوں کے لیے ان کا شعری مجموعہ "کھیل کھلونے" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کے تین شعری مجموعے "اُجالوں کے گیت"، "شہپر" اور "جلوۂ نو" بھی بالترتیب ۱۹۵۰ء، ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے۔ ان کے متعدد مجموعے غیر مطبوعہ بھی ہیں۔

حرمت صاحب ہمارے اُن شعراء اور ان فنکاروں میں ایک نمایاں حیثیت اور ممتاز مقام کے حامل تھے جنھوں نے عصری تحریکوں کا اثر تو ضرور قبول کیا، لیکن عصری تحریکوں میں کبھی بہے نہیں۔ اور اپنی انفرادیت ہمیشہ برقرار رکھی۔ عصری شعور اور عصری تقاضے ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے۔

حرمت الاکرام صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثر میں بھی بلا کا حسن اور لطافت پائی جاتی ہے۔ حرمت صاحب نیا دور کے بھی بڑے کرم فرما تھے اور اسے اپنی نگارشات سے برابر نوازا کرتے تھے۔ انتقال سے چند روز قبل ہی موصوف نے نیا دور کے "فراق نمبر" کے لیے اپنا ایک گرانقدر مضمون ارسال کیا تھا۔

ان نامور اور ممتاز شعراء کے سانحۂ ارتحال پر ادارہ نیا دور سوگوار ہے اور انھیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ایڈیٹر

غزلیں

مشتاق تاباں

[illegible] ۱۱۰۰[illegible]

چراغ بن کے جلے دل گلاب بن کے کھلے
نگوں کی آس کسے ہے ملے ملے نہ ملے

جنوں کی خیر ہو ہم کیا ہمارے دامن کیا
ہزار بار پھٹے ہیں، ہزار بار سِلے

نوائے درد نے رازِ جمال کھول دیا
چمن کو پھول ملے۔ رات کو چراغ ملے

ہوائے دشت بڑی خوشگوار ہوتی ہے
یہ اور بات ہے پتّا کوئی ہلے نہ ہلے

نجانے کون ہے وہ جس کے انتظار میں بھی
نجانے کس سے ہیں بستی کے بام و در کو گلے

ہے یہ بھی اہلِ سیاست کا معجزہ تاباںؔ
کسی کو نیند عطا ہو، کسی کو خواب ملے

فضا ابن فیضی

مئوناتھ بھنجن
یو۔پی

قرضِ جسم و جاں، ہمارے نام باقی ہے ابھی
زندگی ہے تو بہت سا کام باقی ہے ابھی

جسم پر اتنی خراشیں، جیسے پھولی ہو شفق
آ گئے شیا جانے ہو کیا کچھ، شام باقی ہے ابھی

کیسی آندھی تھی، کہ پل بھر میں چٹانیں اڑ گئیں
اک پرندہ ہے، کہ زیرِ دام باقی ہے ابھی

رفتہ رفتہ تشنگی کا آئینہ بن جاؤں گا
رُخ پہ کچھ گردِ شکستِ جام باقی ہے ابھی

آتی جاتی ساعتوں کی، پھر بھی مشکل ہے نجات
ہاتھ میں گو شیشۂ ایّام باقی ہے ابھی

رنجِ آشوبِ معانی سے نہیں ممکن نجات
لفظ کے سینے میں اک کہرام باقی ہے ابھی

لو ہنر والوں کو ڈھونڈھو، ہاتھ میں لے کر چراغ
اب نہ پھر کہنا، ہنر کا نام باقی ہے ابھی

ہے غضب کی چیز، پیچیدہ بیانی بھی فضاؔ
شعر کے ابلاغ میں ابہام باقی ہے ابھی

حسن جاوید
[illegible]

کتبے

حسن جاوید صاحب کا اصل نام خواجہ علی حسن تھا۔ حسن جاوید ان کا قلمی نام تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک طویل عرصہ تک محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش میں سپرنٹنڈنٹ رہے اور بعد میں دوبارہ حکومت مغربی بنگال کے محکمۂ اطلاعات سے وابستہ ہو گئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کا یہ مضمون ان کی حیات میں شائع نہ ہو سکا۔ ——— ایڈیٹر

مزاروں پر کتبے نصب کرنے کی رسم بہت قدیم ہے۔ کتبوں میں متوفی افراد کی تاریخ پیدائش اور وفات کے علاوہ ان کے بارے میں مختصر عبارت کندہ ہوتی ہے جس میں ان کی زندگی، کردار اور شخصیت کی بنیادی خصوصیات کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں عام طور پر اس کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ کتبوں میں زیادہ تر صرف تاریخ پیدائش اور وفات کندہ ہوتی ہے لیکن کچھ کتبے معنویت، گہرے طنز، تیکھے پن اور موثر اظہار حقیقت کے حامل ہوتے ہیں۔ تاریخ میں ایسے کتبوں کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ کچھ مشہور کتبوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اپنے عنفوانِ شباب میں سارا برن ہارٹ کو اس کی عالمگیر شہرت کی بنا پر دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہا جاتا تھا۔ اپنے دورِ انحطاط میں بھی دنیا کی یہ عظیم ترین فلمی اداکارہ اتنی ہی خود پسند تھی جتنا کہ عظیم نپولین۔ اس کے لوحِ مزار پر صرف اس کا نام کندہ ہے۔

ملکہ وکٹوریہ نے ونڈسر کیسل سے متصل فراگ مور ہاؤس میں اپنے شریکِ حیات کے لیے ایک مقبرہ تعمیر کرایا اور وفات کے بعد ملکہ کو اس کے شوہر کے قریب دفن کیا گیا۔ ملکہ نے کتبہ کی عبارت خود تحریر کی تھی جو درجِ ذیل ہے ———

"یہاں بالآخر میں
تمہارے ساتھ محوِ خواب ہوں گی
اور تمہارے ہی ہمراہ
بروزِ قیامت پھر سے جی اُٹھوں گی۔"

سکندر اعظم کے مزار کا کتبہ دُنیاوی جاہ و حشمت کی ہوس کے عبرتناک انجام پر ایک موثر تبصرہ ہے۔ کتبہ کی عبارت یہ ہے ———

"اب اس کے لیے گوشۂ قبر ہی کافی ہے جس کے
لیے کبھی پوری دُنیا تنگ تھی۔"

انگریزی زبان کے مشہور شاعر جان گرے نے "میرا اپنا کتبہ" میں زندگی کو مذاق سے تعبیر کیا ہے ———

"زندگی ایک مذاق ہے، ہر شے اس کی غماز ہے
کبھی میں ایسا سوچتا تھا لیکن اب
یہ حقیقت مجھ پر عیاں ہو گئی۔"

شکسپیئر نے اپنا کتبہ اپنے منفرد انداز میں لکھا: ———

"میرے اچھے ہمدم! عیسیٰ مسیح کی خاطر
یہاں دفن مشتِ خاک کو نہ کریدو
اس پر خدا کی رحمت ہو جو میری ہڈیوں
کو نہ چھیڑے۔
اور لعنت ہو اُس پر جو
میری ہڈیوں کو ہٹائے۔"

ڈین سوفٹ ایک ممتاز طنز نگار اور "گولیورس ٹریولس" کے خالق کا کتبہ اس کے شایانِ شان تھا ———

"یہاں غصب ناک برہمی اب اسے دل شکستہ نہیں
کر سکتی۔"

جان کیٹس انگریزی ادب کے شعراء کے درمیان اپنے مقام کے بارے میں

شخصیت کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں رکھتا تھا۔ اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۷۸۸ء میں اس نے لکھا:۔

"میرا خیال ہے کہ موت کے بعد میں انگریزی کے شعراء
میں سے ایک ہوں گا"

یہی انکساری اس کے خود تحریر کردہ کتبہ کی امتیازی خصوصیت ہے:

"یہاں وہ آسودۂ خواب ہے جس کا نام نقش برآب
تھا"

قطب جنوبی میں کیپٹن اوٹس کے مدفن پر ایک موزوں کتبہ کندہ ہے:۔

"ایک جانباز شریف انسان"۔۔۔۔ اس کی زندگی اور شخصیت کی یہ ایک اجمالی لیکن جامع اور مکمل تفسیر ہے۔

ڈوروتھی پارکر نے جس کی نظم کے یہ اشعار بہت مشہور ہوئے۔۔۔

"مرد شاذ و نادر ان لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں جو عینک لگاتی ہیں"۔۔۔۔ خود اپنا کتبہ لکھا جو سادگی میں پُرکاری اور گہرے تاثر کی اعلیٰ مثال ہے۔ کتبہ کی عبارت یہ ہے:۔

"میری خاک معذرت خواہ ہے"۔

ارل آف روچیسٹر نے چارلس دوئم سے متعلق اپنے منظوم لطیفہ میں ان الفاظ میں چارلس کی تصویر کشی کی ہے۔۔۔۔"ایک خوش طبع بادشاہ، بدنام اور غریب"۔۔۔۔ اس کے کردار اور شخصیت کا نچوڑ یوں پیش کیا ہے:۔۔۔۔

"یہاں محوِ استراحت ہے ہمارا مقتدر فرمانروا
جس کے وعدوں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔
اس نے کبھی کوئی حماقت کی بات نہیں کہی
اور نہ دانشمندی ہی کی"

یہ ایک قبل از مرگ کتبہ تھا جس کا جواب چارلس دوئم نے یوں دیا:۔

"یہ بہت صحیح ہے کیونکہ میرے الفاظ تو خود اپنے ہیں
لیکن میرے افعال میرے وزراء کے ہیں"

ولیم پٹ سے متعلق بائرن کا تحریر کردہ کتبہ بہت تیکھا اور سفاکانہ ہے:۔

"اس سرد پتھر کی سل کے نیچے
موت سے دست و گریباں
وہ جس نے گرجا میں دروغ گوئی کی
آج اپنے (خانقاہ) میں محوِ استراحت ہے"۔

شہنشاہ جہانگیر کی زیرک اور ذہین ملکہ نور جہاں نے اپنے کتبہ کے لیے فارسی میں حسب ذیل شعر کی تخلیق کی جو سوز و گداز کی ایک دنیا اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اس کی درد بھری شام حیات کی مکمل تفسیر ہے۔ یہ شعر اس کے مقبرہ پر کندہ ہے

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

شاہجہاں کی دختر جہاں آرا دہلی کی موتی مسجد میں دفن ہوئی جو اس کی درخواست پر اس کے والد نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کے مقبرہ پر اس کی آخری خواہش کندہ ہے:۔۔۔۔

"میرے مقبرہ کو خاک اور پھولوں کے علاوہ کسی اور شے سے آلودہ نہ کرنے دیا جائے کیونکہ خاک اور پھول ہی ایک پاک روح کے لیے بہترین آرامگاہ ہیں"

انگریزی ڈرامہ نگار بین جانسن کے لوحِ مزار پر یہ کتبہ کندہ ہے:۔

"او۔ کمیاب و فقید المثال بین جانسن"

سر آئزک نیوٹن کے لیے پوپ کا تحریر کردہ کتبہ یہ ہے۔۔۔۔

"فطرت اور فطرت کے قوانین شب کے پردہ میں مستور تھے۔ خدا نے فرمایا۔ نیوٹن عالم وجود میں آجائے اور چاردانگ عالم منور ہو گیا"

مسٹر ڈبلیو۔ ایس گلبرٹ کے لوحِ مزار پر کندہ انتھونی ہوپ کے کتبہ میں مشہور ڈرامہ نگار کی ظرافت کو خوشنما انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے:۔

"حماقت اس کی دشمن تھی اور نکتہ سنجی اس کا ہتھیار"

سینٹ پال میں سر کرسٹوفر رین کا کتبہ، جو اس کے لڑکے نے تحریر کیا تھا اپنی انفرادیت اور ندرت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ کتبہ کے الفاظ ہیں:۔۔۔۔

"اگر آپ اس کی یادگار کو دیکھیں تو گرد و پیش پر ایک نظر ضرور ڈالیں، عظیم شخصیتوں کی حقیقی یادگار کارنامے

ہوتے ہیں ذکر پھر بھی

فلورنس نائٹ انگیل کے لوح مزار پر صرف دو حرف " ایف. این " کندہ ہیں۔ یہ عجز و انکسار کا قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

مشہور شاعر لانگ فیلو کی مشہور شعری تخلیق، فلورنس کے لیے موزوں ترین کتبہ ہوتی۔

" چراغ بکف خاتون اس ملک کی تاریخ میں
ایک معزز، شریف اور جانباز خاتون
کی حیثیت سے زندۂ جاوید رہے گی "

کتبوں کا مقصد عظیم شخصیتوں کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنا ہے۔ تاہم یادگاروں اور کتبوں پر بہترین تبصرہ شیلی کی نظم " اوزی مینڈاس " میں ملتا ہے۔

" میں عہدِ قدیم کے ایک راہ رو سے ملا
اس نے کہا " پتھر کے دو بہت بڑے بغیر دھڑ کے
پاؤں ریگ زار میں استادہ ہیں۔
اور اس کی کرسی پر یہ الفاظ کندہ ہیں،
میں شہنشاہوں کا شہنشاہ، میرا نام اوزی مینڈاس ہے
میری تعمیرات پر نظر ڈالو جو اب بھی مستحکم ہیں۔
ہیہات۔ بجز اُن کے کچھ بھی قائم و دائم نہیں رہتا "

سر جان اسٹرینج کے مشہور کتبہ میں انھیں خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے، وکالت کے پورے پیشہ کی تضحیک کے ساتھ۔

" یہاں ایک دیانتدار وکیل محوِ استراحت ہے اور یہ بات
حیرت انگیز ہے "

اُردو کے مشہور اور منفرد افسانہ نگار منٹو نے اپنے تیکھے انداز میں اپنے لوحِ مزار کے لیے خود لکھا،

" یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینہ میں
فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ
اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار
ہے یا خدا "

اُردو اور فارسی کے چند قدیم اور جدید شعراء کی زندگی، انفرادیت، افتادِ طبع، فکر و نظر اور فلسفۂ حیات و کائنات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، اُن کے اشعار سے ان کے لیے کچھ کتبے تجویز کیے گئے ہیں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مجوزہ کتبے ان کی بنیادی خصوصیات کے مظہر ہوں۔ مجوزہ کتبے درج ذیل ہیں:—

میرؔ:— سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

غالبؔ:— جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ذوقؔ:— لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مومنؔ:— عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

خواجہ میر دردؔ:— فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

سوداؔ:— ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

ڈاکٹر اقبالؔ:— نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

ظفرؔ:— کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

جگرؔ:— جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اصغر گونڈوی:— اک ایک نفس میں ہے صد مرگ بلا مضمر
جینا ہے بہت مشکل مرنا ہے بہت آساں

فانیؔ:— فانیؔ کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یا رب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

چکبستؔ:— زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

یگانہ چنگیزی :۔ پڑے ہو کون سے گوشے میں اب
یگانہ کیوں خدائی ہو چکی بس

محمود رامپوری :۔ موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دُنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

شفیق جونپوری :۔ الوداع اے بے کسی جاتا ہوں میں
آج سے تجھ کو بھی فرصت ہو گئی

روش صدیقی :۔ روش آخر مکمل ہو گئی روداد محرومی
شکستِ سازِ دل بھی اب شریکِ بے زبانی ہے

حسرت :۔ چلو سوئے عدم تم بھی کہ حسرت
وہیں کچھ قدر ہے اہلِ ہنر کی

(نامعلوم) :۔ مرے مرنے سے کچھ پہلے صفِ ماتم بچھا دینا
کہ میں بھی دیکھ لوں کس کس کی چشمِ نم برستی ہے

مجاز :۔ کتبہ کے لیے یہ فارسی مصرعہ اس کی زندگی کی مکمل تفسیر ہے ؎

خوشش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

سراج الدولہ کی شہادت پر راجہ رام نرائن موزوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانہ پہ کیا گزری

یہ شعر سراج الدولہ کے لیے موزوں کتبہ ہو سکتا ہے۔

خیام :۔۔۔

خوش باش دمے کہ زندگانی اینست

حافظ شیرازی :۔۔۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

کتبوں کی اس فہرست میں اہلِ فکر و نظر اضافہ کر سکتے ہیں یہ ایک نئی ادبی کاوش ہو گی۔ اگر ممتاز نثر نگاروں نیز دیگر شعبہ ہائے حیات کی عظیم اور مقتدر شخصیتوں کو بھی اس کے دائرہ میں شامل کر لیا جائے تو اس کی افادیت فزوں تر ہو جائے گی۔ ★

علی احمد جلیلی

جلیل منزل سلطان پورہ
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

غزل

وہ تو یوں کہیے کہ ہم زودپر نہ تھے
ورنہ کس کے ہاتھ میں پتھر نہ تھے

کس قدر ارزاں وفا کی جنس تھی
لوگ جب زخموں کے سوداگر نہ تھے

جو گردش میں نظر آئے تجھے
آج کے انسان تھے ساغر نہ تھے

ذات سے ہم باہر آتے کس طرح
یہ تھی وہ دیوار جس میں در نہ تھے

چھا گئے ساری بساطِ زیست پر
ہائے وہ ارماں جو مٹھی بھر نہ تھے

آج کے بادل بھی کیا بے فیض ہیں
اس جگہ برسے جہاں پر گھر نہ تھے

یوں تو تھے راہوں میں کتنے ہی شجر
ان میں لیکن سایہ دار اکثر نہ تھے

کر گئے ثابت وہی قاتل تجھے
خون کے دھبے جو دامن پر نہ تھے

جو بدن زخمی ہمارا کر گئے
اے علی وہ پھول تھے پتھر نہ تھے

ڈاکٹر احسن نشاط
پوسٹ و مقام مہرونہ گھاٹ
ضلع دیوریا (یوپی)

ناسخ کے چند غیر مطبوعہ اشعار

تحقیقی مشاغل کے سلسلے میں مجھے آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، رامپور (رضا لائبریری)، پٹنہ (خدا بخش لائبریری)، الہ آباد (دائرہ شاہ اجمل) کے کتب خانوں سے مستفید ہونے کے مواقع ملے اس سلسلے میں رامپور اور دائرہ شاہ اجمل (الہ آباد) کے کتب خانوں سے مجھے ناسخ مرحوم کے چند غیر مطبوعہ اشعار دستیاب ہوئے جن کی ادبی افادیت محققین ادب کے نزدیک بہت کچھ ہو سکتی ہے۔

رضا لائبریری رامپور سے دو خاص چیزیں دستیاب ہوئیں۔ اول تو ناسخ کے اصلاح کردہ کچھ قلمی مراثی جن پر ناسخ مرحوم کے قلم سے اصلاحیں موجود ہیں۔ یہ مراثی اصغر حسین اعجاز لکھنوی نبیرہ شجاع الدولہ اور شاگرد رشید حضرت ناسخ کے ہیں۔ اس مجموعہ کا نام "مجموعہ مراثی" ہے۔ یہ نسخہ جناب خبیر لکھنوی نے تحفتاً رضا لائبریری (رامپور) کو عطا کیا تھا۔ اس پر خبیر صاحب کی تحریر بھی موجود ہے جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ واقعتاً یہ مجموعہ مراثی اصغر حسین اعجاز لکھنوی نبیرۂ شجاع الدولہ، شاگرد رشید ناسخ کا ہے۔ مزید برآں مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم نے بھی اس کی تصدیق فرمائی تھی۔ لہٰذا یہ اسناد یقیناً وقیع ہیں۔

دوسری اہم چیز جو قلمی تحریر کی شکل میں ملی اور جس پر مجھے اس وقت کچھ لکھنا ہے وہ ہیں ناسخ مرحوم کے چند غیر مطبوعہ اشعار، جو دیوان طالب علی خاں عیشی رامپوری کے علاوہ کلیات و دواوین ناسخ کے کسی نسخے میں بھی موجود نہیں ہیں۔ اس نسخے کا سنہ کتابت دوم جمادی الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء ہے۔ کاتب کا نام اجودھیا پرشاد ہے اور "بفرمائش غلام حیدر خاں و غلام صفدر خاں" لکھا گیا ہے۔ دیوان عیشی کے اس قلمی نسخے کے آخر میں مختلف شعراء کی ہم طرح اردو غزلیں صائب کے حسب ذیل مقطع پر جمع کی گئی ہیں ؎

گر شبستانے کہ گردد کلک صائب شعلہ ریز
چاک سازد جامۂ فانوس را برتن چراغ

اس نسخے میں جن جن شعراء کے اسمائے گرامی اور ان کی ہم طرح غزلیں شامل ہیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں،

سلیم۔ واقف۔ زائر۔ احمدی۔ مصحفی۔ انیس۔ عیشی۔ آتش۔ ناظم۔ الٰہی۔ اندوہ۔ بسمل۔ ثمر۔ دریا۔ ذوق۔ زار۔ ذکار۔ شمیم۔ فائق۔ ظہور۔ غافل۔ قصور۔ قیس۔ قادر۔ مہر۔ مجرم۔ مسرور۔ ناسخ۔ نالاں۔ نثر۔ وفا۔ وحشت اور ہوش وغیرہم۔

ناسخ کی اس غزل کا مطلع قریب قریب ہر دیوان میں ایک ہی طرح مرقوم ہے۔ لیکن کوئی ایسی نمایاں بات نہیں جو اس غیر مطبوعہ غزل پر اثر انداز ہو۔ دیوان ناسخ نسخۂ رامپور میں وہ مطلع یوں درج ہے ؎

جس مکاں میں ہو ترے رخسار کا روشن چراغ
بے یقیں بن جائیں دیواروں کے سب روزن چراغ

مگر یہی مطلع دیوان عیشی میں یوں مرقوم ہے ؎

ہو وے جس گھر میں ترے رخسار کا روشن چراغ
بے یقیں بن جائیں دیواروں کے سب روزن چراغ

اس طرح صرف "جس مکاں میں" اور "ہو وے جس گھر میں" کے الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یہ مطلع دونوں نسخوں میں من و عن موجود ہے۔ یہ غزل صرف

دو غزل یا مستزاد نہیں بلکہ چہار غزلہ ہے۔ یہ اشعار جن کے غیر مطبوعہ ہونے کا میں دعویٰ کر رہا ہوں مجھے اب تک کسی بھی نسخے میں نہیں ملے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار کسی خاص نشتریت یا اثر کے حامل نہیں مگر ان کی افادیت ان کے غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے میرے نزدیک بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ناسخ کی شخصیت اپنے دور میں ایک دیوپیکر صاحب علم و دانش کی تھی جس کے ہر لفظ کو اہل فن اور اہل علم نے محفوظ کر دیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر کلیات اور دیوان ناسخ کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے۔ لہٰذا ناسخ کے غیر مطبوعہ کلام کا عام طور پر حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ بہرحال وہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ میں نے ان میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے ؎

تیل نکلوانے کی عادت ہے یہ رغبت عطر سے
روشن اس کے حسن کا رہتا ہے بے روغن چراغ

خوشہ چیں اندھا ہے تیرے مسلوں کے کھیت کا
کر رہا ہے جمع گو پروانوں کے خرمن چراغ

وحشت ایسی میرے غم خانے کو ہے چوباڑ کی
راہ تکتا ہے اٹھائے شعلہ کی گردن چراغ

کشتۂ تیغ اجل ہوگا دم پیریٔ صبح
گو بدن پر پہنے ہے فانوس کے جوشن چراغ

پردۂ عصمت ہے تو غش کو حرز زوال
جلتی ہے صرصر تو لیتے ہیں تہ دامن چراغ

ان غیر مطبوعہ اشعار کے بعد اب میں صرف ان چار غیر مطبوعہ مصرعوں کو پیش قارئین کرنا چاہتا ہوں جو مجھے دائرہ شاہ اجمل (الہ آباد) کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئے۔ یہاں قلمی کتب کی ورق گردانی کے سلسلے میں حضرت شاہ غلام اعظم افضل الٰہ آبادی قدس سرہٗ کی ایک قلمی بیاض دستیاب ہوئی۔ یہ وہی حضرت افضل ہیں جن کو ناسخ نے الٰہ آباد کے ایک مشہور رئیس سے بڑی منتوں کے بعد اپنی شاگردی میں لیا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر مولانا سید نذیر احمد صاحبؒ نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ اس بیاض کی تمام تحریریں بخط خاص حضرت افضل ہیں جن کی تصدیق دائرہ ہی کے موجودہ سجادہ نشین حضرت سید احمد شاہ صاحب نے کی جن کی تصدیق پر مجھے اعتماد ہے۔

اس بیاض کے اوپری سرے پر یوں مرقوم ہے:

قطعۂ استاد

قسمت کیا ہر چیز کو قسام ازل نے
جس چیز کے ناسخ کوئی قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانوں کو جلنا
غم ہم کو دیا سب میں جو مشکل نظر آیا

جس طرح ناسخ مرحوم کے متعدد اشعار ضرب المثل کے طور پر زبان زدِ خاص و عام ہیں مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ اشعار ناسخ صاحب ہی کے ہیں اسی طرح اس قطعہ کے آخری دو مصرعے عام طور پر اہلِ علم میں مشہور ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ مصرعے ناسخ ہی کے ہیں۔

اس قطعہ کی شہرت کی وجہ سے میں نے اسے مختلف طبع شدہ دواوین میں تلاش کیا مگر مجھے کسی دیوان میں نہیں ملا۔ البتہ دیوان ناسخ قلمی نسخہ موجودہ آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے سبحان اللہ کلکشن میں اس کے دو مصرعے یعنی مصرعہ دوم و چہارم بمشکل تمام پڑھنے میں آسکے کیونکہ یہ قطعہ حاشیہ پر درج تھا جس کے دو مصرعے کاغذ کی چیپی لگانے کی وجہ سے معدوم ہو گئے تھے۔

ناسخ مرحوم کے مزید غیر مطبوعہ اشعار کی تلاش بھی میرا ایک موضوع علمی ہے۔ آئندہ بھی جتنے ایسے اشعار دستیاب ہوں گے انھیں ضرور پیش قارئین کیا جائے گا۔ **

حواشی

۱ نواب اودھ، ۲ قلمی نسخہ موجود رضا لائبریری (رامپور) ۳ کلیاتِ ناسخ (قدیم ترین نسخہ) موجودہ رضا لائبریری (رامپور) ۴ آتش کا تخلص درج گیا۔ مرقوم ہے خوف طوالت سے ایک تخلص کا ذکر نہیں کیا (راقم) ۵ نقل بمطابق اصل پیش ہے (راقم) ۶ یہ مصرع وزن سے گر رہا ہے مگر نقل بمطابق اصل ہونے کے سبب اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں (راقم) ۷ نام غلام اعظم، تخلص افضل تھا۔ آپ دائرہ شاہ اجمل (الہ آباد) کی مشہور خانقاہ کے صاحب تصرف بزرگ تھے جن کا مزار مقدس آج بھی مرجع خاص و عام ہے (راقم)۔

نعت

یگانہ عماد موج
فتح گڑھ ۔ یوپی

ختمِ رسل پیغمبرِ اعظم صلّ اللہ علیہ وسلّم
دونوں عالم تجھ پہ تصدق تو وجہ تخلیق دو عالم
سرورِ موجوداتِ زمانہ شافعِ محشر رحمتِ عالم
سدرہ سے بھی آگے پہنچ کر کتنا بڑھایا رتبہ آدم
دیدہ و دل کو بخشا تو نے ذوقِ عمل ایمانِ محکم
تیرے کام اور تیری باتیں اہلِ جہاں کو درسِ پیہم
ایسے مزمل ایسے مدثر ابر نیں جیسے نیرِ اعظم
تیری اہنسا اللہ اللہ وقت پہ شعلہ ویسے شبنم
تو خوش ہے تو خالق خوش ہے اے محبوبِ ربِّ دو عالم
اک انگلی سے چاند کے ٹکڑے اعجازِ نبوی تکا عالم
ظلمتِ وہم و شرک میں تو ہی نورِ ہدایت نورِ مجسم
کفر کا طوفاں کشتی ایماں لہریں تیز اور موجیں برہم
موج بگڑ سے ایک سہارا
احمدِ مرسل رہبرِ اعظم

سیّد حرمت الاکرام کی یاد میں

مہدی پرتاب گڑھی
معروف ادیب کمیشن انجینیئر
اور کیشن دو دیوان
پرتاب گڑھ۔

وہ اک قلم جو بظاہر بہت نحیف سا تھا
مگر وہ اتنا توانا تھا
سخت جان اتنا
کہ بے تکان جو فکرِ سخن میں تھا مصروف
لہو سے اپنے کھلاتا رہا ادب میں گلاب
زمینِ شعر کو کرتا رہا تھا جو شاداب
ابھارتا رہا لفظوں سے انجم و مہتاب
نہ جس کو خواہشِ جاہ و حشم نہ مال و متاع
جو بے نیاز تھا شہرت کی ہر تگ و دو سے
جسے ستائشِ اہلِ نظر ہی کافی تھی
جسے ملی تھی متاعِ ہنر شعورِ نظر
ہزار حیف کہ اب ہم سے چھن گیا وہ قلم
وہ اک قلم کہ جو مخزن تھا روشنی کا کبھی
وہ آج دفن ہوا قبر کے اندھیرے میں
مگر دیا ہے جو سرمایۂ سخن اس نے
ملے گا اہلِ نظر سے خراج ابد تک اسے
کہ جسم مرتا ہے روحِ سخن نہیں مرتی

پریم چند: نقیبِ آزادی

"پریم چند نے ساحل سے طوفان کا نظارہ نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے طوفان کے تھپیڑے بھی کھائے تھے۔ ان کی زندگی ہندستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے طوفان سے عملی طور پر نبرد آزما ہونے میں گزری۔ اس طوفان کے مدّ و جزر میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں"[۵۱]۔ ان کا سماج کے ساتھ "جو رشتہ ہے، اسے ہندستانی معاشرے کی تاریخ کے سفر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پریم چند کے وقت کا ہندستانی سماج جس قدر کروٹیں بدلتا ہے اور جو تبدیلیاں اس میں رونما ہوتی ہیں پریم چند نہ صرف یہ کہ ان سے باخبر ہیں بلکہ یہ کہ تغیر لانے والی ان تمام سماجی تحریکوں کے ساتھ ان کی ذہنی ہم آہنگی بھی موجود ہے"۔[۵۲]

ان کا عہد اپنے ماضی سے قدرے مختلف تھا:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ جہاں ایک طرف سماجی گھٹن، سیاسی اضطراب اور اقتصادی بدحالی پورے زوروں پر تھی وہاں ہندوستان میں قومی بیداری کی لہر اٹھ رہی تھی، فکر اور شعور کی رو داخل ہو رہی تھی"۔[۵۳]

ذہنی بیداری کی وہ مخیف لہر جو مستقبل میں بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بننے والی تھی، معرضِ وجود میں آ کر سرگرم عمل ہو چلی تھی، گو کہ عوام کی اکثریت شکست خوردگی کا شکار تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بے شمار یادیں بہت سے زخموں کو تازہ کیے ہوئے تھیں۔ غیر ملکیوں نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے جو ہتھکنڈے اپنائے تھے ان کے اثرات پورے ملک پر خصوصاً عام رعایا پر مرتب ہو چکے تھے۔ حکومت کی معاشی پالیسی کے نتیجے میں عام بے چینی اور بیزاری پیدا ہو رہی تھی۔ وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد غیر ممالک سے واپس آتے، اپنے مشاہدات و تاثرات سے برادرانِ وطن کو آگاہ کرتے۔ اس پس منظر میں سماجی اور مذہبی تحریکوں نے ایک عام سیاسی بیداری کی فضا پیدا کر رکھی تھی جس کے نتیجے میں بعض باشعور سرکاری ملازمین بھی اپنی ملازمتوں سے مستعفی ہونے لگے تھے۔ خود پریم چند نے ۱۵ر فروری ۱۹۲۱ء کو سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔ گاندھی جی کی اس عدم تعاون کی تحریک کو پریم چند نے اپنے افسانہ 'لال فیتہ' میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ قاری کو جنگِ آزادی کی حمایت اور اس میں شرکت پر آمادہ کرتا ہے۔

"انیسویں صدی کے آخری دنوں میں مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی تحریکوں کا زور تھا اور اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس نے ایک سیاسی اور قومی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے ان تحریکوں میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ سیاسی رہنما اس جدوجہد میں مصروف تھے ـــ اور ادیب ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ چنانچہ پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعہ ماضی کی عظمت اور اس کی روحانی صفات کی محبت پیدا کی اور وطن پرستی کا سبق سکھایا"۔[۵۴] انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی ملک کی آزادی کے نغمے گائے اور اپنے پہلے مجموعے 'سوزِ وطن' کے دیباچے میں کہا: "ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِّ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں"۔ انھوں نے ادب کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا ـــ

"جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی

اسی [illegible] نے ہم میں شدت ذکر پیدا ہو، ہماری وحشت دور ہو گی، ہم میں بھائی چارہ اور شجاعت [illegible] پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

[illegible] زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور [illegible] صورت حال کا مقابلہ کریں۔

انگریزی حکومت کے خلاف جو سیاسی تحریک شروع ہوئی تھی اس کی بنیاد وطن دوستی بلکہ ارض پرستی پر استوار تھی۔ انگریز نے برصغیر کو غلام بنا رکھا تھا اور یہاں کی مقدس دھرتی کو اپنے غلیظ قدموں تلے روندتا تھا اور برصغیر کے باشندوں کے یہاں وطن کے طور پر دھرتی اور اس کے ماحول سے ایک شدید وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔ پریم چند کے یہاں یہ وابستگی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اپنی دھرتی سے قلبی لگاؤ، آزادی کے لیے تڑپ اور لگن کا اظہار ان کے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے رسالے 'ہنس' ۱۹۳۰ء کے ایک شمارہ میں نوجوانوں کو بڑے ولولہ انگیز انداز میں جنگ آزادی میں شامل ہونے کی تحریک دیتے ہیں:

"تمہاری آنکھوں کے سامنے دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں ہو گئیں، تم نہیں جانتے؟ روس کی زار شاہی مٹ گئی، ایران کی [illegible] مٹ گئی، ترکی کی شہنشاہیت مٹ گئی، چین کی مانچو [illegible] مٹ گئی، جرمنی کی قیصر شاہی مٹ گئی، یہاں تک کہ [illegible] نے آزادی کی سانس لی، مگر ہندوستان کہاں ہے [illegible] تھا۔ [illegible] کیا تم [illegible] ہو کر [illegible] تم نئے یگ کے نام لیوا ہو، تم [illegible] سے تمہیں اپنے رنگ میں [illegible] نہیں سکتا۔"

[illegible] تم سے امید ہے۔"

۸ مارچ ۱۹۳۲ء کو ہولی کے موقع پر انھوں نے ہولی کے عنوان پر ایک مضمون لکھا اور اس میں انھوں نے غلامی کی لعنت کو جلا کر خاک کر دینے کی تلقین کی:

"ہولی پھر آ گئی، حالانکہ بھارت کی ہولی تو انگلینڈ بہت پہلے سے جلا چکا ہے اور اس نے سارا بھارت جلا کر خاک کر دیا ہے۔ پھر بھی مردے بھارت واسی کسی نہ کسی طرح ہولی مناتے ہی ہیں۔ پر اس سال کی ہولی اور سب ہولیوں سے نرالی ہے اور ہونی چاہیے۔ اس سال ہم لوگ اپنے گھر کی ایک ایک چیز جلائیں گے۔ انگریزی مال خریدنے کا شوق جلائیں گے اور ان سب کے ساتھ ہی ساتھ اپنے سیکڑوں سالوں کی غلامی جلائیں گے۔ جس نظام حکومت نے سارے بھارت میں مفلسی کی ہولی جلائی ہے، اس سال اس نظام حکومت کی ہی ہولی جلائیں گے۔ تبھی ہماری ہولی سچی ہولی ہوگی۔"

ان کے دلی جذبات اور آزادی کے لیے ان کی تڑپ کا اندازہ اس خط سے بھی ہو جاتا ہے جو انھوں نے ۲۰ جون ۱۹۳۲ء کو ہندی کے مشہور صحافی اور ادیب بنارسی داس چترویدی کے نام لکھا:

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کتابیں لکھ دوں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی کا ہے۔ میں آرام سے بیٹھنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں ادب اور آزادی کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں۔"

جنگ پلاسی اور بکسر کی لڑائی کے بعد ٹیپو سلطان کی شہادت نے مسلم حکمرانوں کے اقتدار کے سلسلے میں [illegible] فیصلہ کر دیا تھا [illegible] صدیوں حاکم رہے ان کی حیثیت میں فرق آ چکا تھا [illegible]

اور انحطاط پذیر صورت اور غیر ملکیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور مذہبی قوت نے بہت سے ذہنوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس پس منظر میں متعدد تحریکیں وجود میں آکر سرگرم عمل ہو چکی تھیں ۔۔۔ "۱۷۷۶ء میں مجنوں شاہ نے بنگال کی ترائی سے ایک فقیری تحریک شروع کی جس کا مقصد بنگال میں انگریزوں کے کارخانوں اور اسلحہ کو تباہ کرنا تھا ۔۔۔ اس طرح کی ایک تحریک کرم شاہ (متوفی ۱۸۰۳ء) نے شروع کی جو پاگل پنتھی کے نام سے مشہور ہے"۔[۸] اس کے علاوہ حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اور تیتو میر کی تحریک بھی قابل ذکر ہے۔ لیکن ان تمام تحریکوں میں شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک مجاہدین سب سے اہم ہے — ابتداءً یہ ساری تحریکیں مذہبی رہیں مگر بعدہٗ ان کا دائرہ عمل وسیع اور ان سب کا نصب العین مشترک ہوتا گیا۔ شمالی ہند میں شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک مجاہدین کو مرکزیت حاصل ہوتی گئی۔ وہ تحریک جو مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ، ان کے کردار و رسوم کی درستگی اور ان کی معاشی فلاح کے لیے وجود میں آئی تھی اور جس کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کی اپنی اخلاقی گراوٹ ہے اور ان کی اصلاح اس کے لیے مقدم ہے، انگریزوں کے خلاف پوری طرح صف آرا ہو گئی اور نعرۂ جہاد دے کر حریت کی آگ پورے ملک میں پھیلا دی۔ وطن عزیز کی خاطر ملک کی دیگر تحریکوں کا نصب العین بھی یہی ہوتا گیا۔ گورکھوں، راجپوتوں، مرہٹوں، سکھوں، سندھ کے امیروں اور اودھ کے نوابین کی عمل داریاں ختم ہوتی گئیں۔ انگریزوں کی قوت اور حکومت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ملک کے ہر مکتبۂ فکر کے لوگ انگریزوں کی سازشوں اور فریب کاریوں کو سمجھتے گئے، ان کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے موقع کے منتظر رہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان کی تحریک نے اور بھی زور پکڑا ۔۔۔ "ان کے جانشینوں نے ان کی تحریک کو آگے بڑھایا اور ان کے پیدا کیے ہوئے سیاسی شعور کی روشنی میں ملک کی رہبری کی"۔[۹] شاہ عبدالعزیز نے اس تحریک کی جملہ تمام ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے "انگریزوں کے خلاف فتوے؟ دیا"۔ جذبۂ جہاد سے مغلوب ہو کر مجاہدین سرفروشی کی تمنا میں جام شہادت [illegible] رہے۔ دیگر برادران وطن بھی حب الوطنی سے سرشار ہو کر جذبۂ جہاد [illegible] کھڑے ہوئے۔ اس تحریک کے متوازی سنکر آچاریہ

کے علاوہ بنگوشوں کی سنیاسی تحریک بھی میر قاسم کے زمانے سے بنگال کی حکومت کے مظالم کے خلاف صف آرا رہی تھی۔[۱۰]

رفتہ رفتہ ملک میں ہم آہنگی اور یک جہتی کی فضا قائم ہوتی گئی۔ جذبۂ جہاد سے ملک کا ہر طبقہ بلا تفریق مذہب و ملت سرشار ہوتا گیا:۔

"ہزاروں فقیر، پنڈت، سادھو اور سنیاسی ملک کے گوشے گوشے میں بغاوت کے جذبات ابھار رہے تھے، با اثر علماء نے جہاد پر زور دینا شروع کیا۔ دہلی کی جامع مسجد میں ایک فتویٰ ہوا جس میں انگریزوں کے خلاف ہر مسلمان کے لیے جہاد فرض قرار دیا گیا۔ علماء نے شہروں اور دیہاتوں کے دورے کیے، تقاریر کیں، رضا کاروں نے گھر گھر جا کر چندہ جمع کیا۔ فقیر اور سنیاسی زیادہ تر چھاؤنیوں کے قریب قیام کرتے جہاں سپاہی ان کے معتقد ہو جاتے"۔[۱۱]

جو لوگ میدان جنگ کے بجائے صرف گفتار کے غازی تھے انھوں نے دوسرے طریقے اپنائے۔ انھوں نے ایسے وسائل اختیار کیے کہ "ملک میں مختلف مقامات پر ڈراموں، ناٹکوں اور گیتوں کے ذریعہ عوام کو غلامی کا احساس دلایا گیا"۔[۱۲]

اس طرح ملک میں انگریزوں کے خلاف جو چنگاری سلگائی گئی وہ ۱۸۵۷ء میں بھڑک کر بالآخر شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔ پہلی جنگ آزادی کا آغاز ۱۰ مئی کو میرٹھ کی چھاؤنی سے ہوا۔ میرٹھ سے ان شعلوں کی لپٹ نے پہلے دہلی پھر دیگر شہروں بعدہٗ پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر جو قلعۂ معلیٰ تک محدود تھا، سرفروشوں کی قیادت کے لیے باہر نکل آیا۔ نانا صاحب، رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، حضرت محل، شہزادہ فیروز بخت، عظیم اللہ خاں، کنور سنگھ، راجہ ہرنام سنگھ وغیرہ مختلف محاذوں کو سنبھال کر ڈٹے کھڑے رہے۔ علماء کی ایک خاصی تعداد بڑی تندہی سے سرگرم عمل رہی، اپنی شعلہ بیانیوں سے جذبۂ جہاد ابھارتی رہی اور خود بھی شوق جہاد میں مرتبہ شہادت حاصل کرتی رہی۔ انگریزوں کے خلاف جم کر مورچہ لینے والے علماء کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں نمایاں مقام احمد اللہ شاہ، حاجی امداد اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ کو حاصل ہے۔ لیکن جنگ آزادی کے شعلے جس تیزی سے بھڑکے اسی تیزی سے سرد بھی

پہنچے۔ ... [illegible] انگریزوں کے پاس منظم فوج تھی۔ جدید سامانِ حرب تھا۔ [illegible] ایک بڑی تعداد تھی۔ بے شمار لوگ ذاتی مفادات اور اپنے بھائیوں سے مختلف مفاد رکھنے کے سبب انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کی فوج میں غداروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور کوئی نظم نہ تھا۔ جدید سامانِ حرب کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ باقاعدہ سامانِ حرب کا بھی فقدان تھا۔ منصوبہ کے خلاف وقت سے بہت پہلے ہی یہ مورچہ کھول دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں محض جذبات سے جو نتائج نکلنے چاہیے تھے وہ نکلے۔ یوں شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک سے پیدا ہونے والی پہلی جنگِ آزادی کو مکمل کرنا بظاہر ختم کر دیا گیا مگر "ان کی تحریک نے سرفروشی کا جو جذبہ پیدا کیا تھا وہ ایک عرصہ تک قلب و جگر میں شعلہ کی طرح بھڑکتا رہا۔" "اس تحریک کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں نے یہ جنگ دوش بدوش لڑی تھی۔ اور ہندو مسلم کا سوال کسی شکل میں بھی لوگوں کے سامنے نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام طاقتیں جو کچھ عرصے سلطنتِ مغلیہ کے مدِ مقابل آگئی تھیں، بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں، مرہٹے ایک مدت سے مغلوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے لیکن ۱۸۵۷ء میں پیشوا نے بہادر شاہ کو تسلیم کرنے میں مطلقاً کوئی عذر نہیں کیا۔ نانا صاحب کے خاص مشیروں میں عظیم اللہ خاں شامل تھا۔ رانی جھانسی نے مسلمان توپچی ملازم رکھے۔ احمد اللہ شاہ نے ہندو اور مسلمان دونوں کے مشترکہ اجتماعات میں تقریریں کیں۔"

"۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دراصل ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا"۔ اس کے بعد بدلے ہوئے حالات میں دانشوروں نے از سرِ نو ملکی اور قومی حالات کا جائزہ لیا اور رفتہ رفتہ قومی مفادات کے کام کو آگے بڑھایا۔ "نتیجہ میں عہدِ وسطیٰ کی روایات اور اقدار پر کاری ضرب لگی اور جدید ذہن نے اپنے لیے فکر و عمل کی نئی اور مختلف راہیں پیدا کیں۔"

> "وہ خوف اور سیاسی کیفیت جو ۵۸-۱۸۵۷ء کی بغاوت نے پیدا کر دی تھی، دور ہو رہی تھی، برطانوی حکمتِ عملی کے باوجود زمانے کی زبردست قوتیں ہندوستان [illegible] ملک کی سیاسی وحدت، مغرب کے [illegible] ترقیاں، یہاں تک کہ غلامی کی لعنت بھی جو [illegible] تھی لوگوں کے ذہن میں نئے نئے رجحانات پیدا کر رہی تھیں، صنعت آہستہ آہستہ نشوونما پا رہی تھی اور قومی آزادی کی ایک نئی تحریک ابھر رہی تھی۔"

سارو جنک سبھا، انڈین ایسوسی ایشن، مہاجن سبھا اور [illegible] ایسوسی ایشن کے بعد پورے ملک کی نمائندہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ وہ "تال میل" ختم ہو چکا تھا جو حکومت اور انڈین نیشنل کانگریس کے درمیان قائم ہوا تھا۔ ہوم رول کی مانگ کی جا چکی تھی۔ کچھ سرفروشوں کی جانب سے آزادی کا مطالبہ بھی پیش کیا جا چکا تھا، جس کی خاطر وہ ہر قربانی کے لیے تیار تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس اختلافِ رائے کا شکار ہو کر دو حصوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ ایک گروپ جس کے نمائندے دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ، سر سریندر ناتھ بنرجی، گوپال کرشن گوکھلے اور مدن موہن مالویہ تھے، ہوم رول کے حق میں تھا۔ مکمل آزادی کو قومی مفادات کے خلاف سمجھتا تھا۔ دوسرا گروپ ہر قیمت پر آزادی کا متوالا تھا اور مکمل آزادی کے سوا کسی دوسری بات پر رضامند نہ تھا۔ اس گروپ کی شہرت گرم دَل کے نام سے ہوئی، جس کے نمائندے بال گنگادھر تلک، لالہ لاجپت رائے، بپن چندر پال اور اربندو گھوش تھے جو اپنے اخبار کیسری، مراٹھا اور وندے ماترم کے ذریعہ حکومت کو کڑی نکتہ چینی کا نشانہ بنائے ہوئے تھے اور طلباء کو فوجی تربیت حاصل کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ تقسیمِ بنگال کے بعد مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ بال گنگادھر تلک اور حسرت موہانی کو ان کی خفیہ سرگرمیوں کی بنا پر جیل بھیجا جا چکا تھا۔ حکومت نے مارلے ایکٹ کے تحت عوام کو مراعات دینی چاہیں تو گرم دل نے اس کو ٹھکرا دیا تھا جبکہ دوسرا گروپ اسے قومی مفادات کے حق میں خیال کرتے ہوئے ان سہولتوں کا خیر مقدم کرنے کا خواہش مند تھا۔ پہلی جنگِ عظیم شباب پر تھی۔ تلک رہا ہو کر باہر آچکے تھے مسز اینی بیسنٹ مختلف سیاسی جماعتوں کے اتحاد کے لیے اپنی کوششیں

[illegible] ریشمی رومال تحریک نے زور پکڑا۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس [illegible] حکمرانِ ہند کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا۔ ہندو [illegible] جانب سے ملک بچانے کی کوششیں کامیاب رہیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا۔ انقلاب روس اور اشتراکی نظام عالمی سطح پر اپنے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ برصغیر کا خاص دانشور طبقہ اس سے متاثر ہوچکا تھا۔ رولٹ ایکٹ کے نتیجہ میں جلیانوالا باغ کے حادثہ نے سرفروشوں کو ایک نئی امنگ عطا کی۔ خلافت تحریک نے یک جہتی و ہم آہنگی کی فضا قائم کرتے ہوئے ایک مشترک محاذ کھول دیا۔ ترک موالات کی تحریک نے شدت اختیار کی۔ چترنجن داس نے سوراج پارٹی قائم کی۔ مزدور تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا[۲۶]۔ اشتراکی محنت کشوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کا آغاز کرچکے تھے۔ مزدوروں میں بیداری کی لہر دوڑ چکی تھی۔ رفتہ رفتہ ہوم رول کا مطالبہ کمزور ہوتا گیا۔ مکمل آزادی کی مانگ زور پکڑتی گئی۔ گاندھی جی اپنی عدم تشدد کی بات پر اٹل تھے اور اسے ملک کی فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتے تھے۔ حریت پسند انقلابیوں کا بھی ایک گروپ ابھر کر سامنے آچکا تھا جو تشدد کی راہ پر گامزن تھا اور وطن کی آزادی کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار تھا۔ پریم چند افسانہ 'قاتل' میں ایسے ہی مجاہدوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کا کہنا تھا: "یہ انفرادی جنگ نہیں، انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے۔ میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کرسکتا ہے اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔" افسانہ کا ہیرو 'دھرم ویر' قربانی اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس کی بیوہ ماں اس کے خطرناک عزائم سے خوف زدہ ہے، مگر وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہتا ہے :-

> "دیکھو اماں! کسی سے کہنا مت۔ ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آفت آئے گی۔ مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہوسکے۔ یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔"

دھرم ویر حصولِ آزادی کے سلسلے میں ماں کو اپنے اقدامات کے بارے میں تفصیل بتاتا ہے :-

> "وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہوجائے گا کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کردیے جائیں گے تو آج ہی سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔"

ماں اپنے بیٹے کی ان لرزہ خیز باتوں کو سن کر خوف محسوس کرتی ہے اور اُسے 'سبھا' سے الگ ہوجانے کا مشورہ دیتی ہے۔ دھرم ویر ماں کے جذبات کی قدر کرنے کے باوجود اس سے کہتا ہے :-

> "تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے۔ اسے تمھارے قدموں پر نثار کرسکتا ہوں لیکن مادرِ وطن نے تمھیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آجائے کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت کے لیے تمھیں قتل کرنا پڑے تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منھ نہ موڑ سکوں گا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے لیکن تلوار تمھاری گردن پر ہوگی۔ ہمارے مذہب میں قوم کے مقابلے میں کسی چیز کی حقیقت نہیں اس لیے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔"

پریم چند کی تحریروں پر شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک کا بھی بہت کچھ اثر ملتا ہے۔ جہاد میں شہادت حاصل کرکے زندۂ جاوید ہوجانے کا تصور، وطن عزیز کے لیے مر مٹنے کی تڑپ، آزادی کی خاطر سب کچھ نثار کردینے کی تمنا ایک مجاہد کی نمایاں خوبیاں ہوا کرتی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں اور کرداروں میں جابجا شاہ صاحب کے مجاہدین کا عکس ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں آزادی کی جو تڑپ ملتی ہے وہ بہت کچھ شاہ صاحب کے مجاہدین کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اپنے افسانہ 'جیل' میں اپنے احساسات کو بڑے جذباتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ افسانہ کا ہیرو 'شمبھو' اپنی محبوبہ روپ متی سے کہتا ہے :

> "ذرا سوچو میری جان کی قیمت کیا ہے، ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپئے کی ملازمت! بہت بڑھا تو

تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بدلے یہاں کیا لے گا؟ جانتی ہو، سارے ملک کے لیے سوراج، اتنے عظیم مقصد کے لیے مرجانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔"

'دنیا کا سب سے انمول رتن' میں پریم چند لکھتے ہیں:۔

"وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔"

'چوگان ہستی' میں رانی جانہوی اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر کہتی ہے:

"نوجوانوں سے میں کہوں گی جاؤ اور وِنے کی طرح قربان ہونا سیکھو ـــــ ملک کی آنکھیں تمھاری طرف لگی ہوئی ہیں۔"[۲۴]

'شیخ محمود' میں پریم چند انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"نہیں ہم قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم میدان میں رہیں گے اور دست بدست دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے سینوں میں ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیر و تفنگ کے نشانے نہ برداشت کر سکیں ـــــ ہم دشمن کے مقابلے میں جسم ٹھونک کر آئیں گے اور اپنے پیارے جنت نشاں کے لیے اپنا خون پانی کی طرح بہائیں گے۔"

پریم چند کے عہد میں مذکورہ چند تحریکوں کے علاوہ اور بھی متعدد تنظیمیں، اصلاحی اور فلاحی کاموں میں سرگرم تھیں اور عوام کو دعوتِ فکر و عمل دے رہی تھیں مگر ان سرگرمیوں کے مرکز شہروں میں تھے۔ وسائل کی آسانی کے سبب شہر ایک دوسرے سے مربوط تھے اور اخبارات باخبر رکھنے کا ایک ذریعہ بن چکے تھے۔ لیکن ملک کی آبادی کی اکثریت تو دیہات میں تھی۔ دیہات بھی ایسے، جہاں پہنچنا مشکل ہو پھر وسائل کی اس قدر کمی تھی کہ ان سے رابطہ قائم رکھنا دشوار ترین مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اسی سبب ان تحریکوں کی کاوشیں شہروں میں تو کامیابی سے ہمکنار ہو چلی تھیں مگر دیہاتوں میں ان کے اثرات کا حقہ مرتب ہونا ممکن نہ تھا۔

پریم چند نے بحیثیت ادیب ان تحریکوں اور ان سے متعلق بعض شخصیتوں سے متاثر ہو کر دیہی عوام کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس جذبۂ بیداری کو اپنی تحریروں کے ذریعہ اور بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی جو مختلف تحریکوں کا اصل محرک تھا، ان کو "اس امر کا احساس ہو چلا تھا کہ سیاسی آزادی کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک نچلے طبقے بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کو اس جد و جہد میں شریک نہ کیا جائے"[۲۵] اس لیے انھوں نے سب سے پہلے انھیں "مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنایا"۔ ورنہ اس "سے پہلے دیہات تھے، دیہاتی تھے۔ غربت تھی۔ افلاس تھا، لوٹ کھسوٹ تھی ـــــ ناانصافی تھی، ظلم و جبر تھا، کسان، مزدور کو بھر پیٹ کھانا نصیب نہ ہوتا تھا، بیماری تھی۔ ان کے نام تھے مگر ان کو کوئی جانتا نہیں تھا"[۲۶] پریم چند کی کوششوں سے پہلے پہل لوگوں نے دیہاتی زندگی کو اپنے ملک کی زندگی کا ایک حصہ سمجھنا شروع کیا اور اسی احساس نے رفتہ رفتہ دیہاتی زندگی اور اس زندگی کے چھوٹے بڑے مسئلوں کو سیاسی ادراک کی بنیاد بنا دیا۔ یہاں تک کہ اب ہماری ساری قومی اور سیاسی تحریکوں کا تار دیہاتی اور اس کی زندگی سے بندھا ہوا نظر آنے لگا۔"[۲۷] ★★

حواشی

۱ بیسویں صدی میں اُردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص ۱۶۴
۲ پریم چند اُردو ناول میں ادب برائے زندگی کے محرک، ڈاکٹر نریش (پرواز ادب نومبر ۱۹۸۰ء) ص ۴۶، ۳ منشی پریم چند اُردو میں نئے افسانے کے بانی، رام لال نابھوی (پرواز ادب نومبر ۱۹۸۰ء) ص ۶۶۔
۴ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ ص ۵۶۵-۵۶۶
۵ روشنائی۔ سید سجاد ظہیر۔ ص ۱۱۸-۱۱۹، ۶ نئے تناظر۔ وزیر آغا ص ۵۹-۶۰، ۷ پریم چند اور ہم۔ آل احمد سرور (امکان بمبئی جنوری۔ مارچ ۱۹۸۰ء) ص ۱۵۲، ۸ خدنگِ غدر، مقدمہ خواجہ احمد فاروقی۔ ص ج-د، ۹ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، عبداللطیف مرتب خلیق احمد نظامی۔ ص ۹، ۱۰ خدنگ غدر، مقدمہ خواجہ احمد فاروقی، ص د

۱۱؎ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل ۔ ص ۵۷

۱۲؎ " " " " ص ۵۸

۱۳؎ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، عبداللطیف مرتب خلیق احمد نظامی، ص ۱۲

۱۴؎ " " " " " ص ۳۱

۱۵؎ تحریک آزادی ہند اور مسلمان ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ ص ۴۵،

۱۶؎ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ ۔ ڈاکٹر نعیم احمد ۔ ص ۱۱۱، ۱۷؎ تلاش ہند جواہر لال نہرو ۔ جلد دوم ۔ ص ۹۰ ۔ ۹۱، ۱۸؎ سارو جنک سبھا ۱۸۷۰ء میں پونہ میں، ۱۸۸۴ء میں مدراس میں، ۱۸۸۵ء میں بمبئی میں قائم کی گئی۔ بھارت کا راشٹری آندولن ایوم سنودھانک وکاس، ڈاکٹر جی ڈی تیواری ۔ ص ۲۲ ۔ ۲۳، ۱۹؎ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو اے ۔ او ۔ ہیوم نے بمبئی کے گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کے بھون میں انڈین نیشنل کانگرس قائم کی۔ بھارت کا راشٹری آندولن ایوم سنودھانک وکاس ۔ ص ۳۱،

۲۰؎ اہل ہند کی مختصر تاریخ ۔ ڈاکٹر تارا چند ۔ ص ۵۲۹، ۲۱؎ برطانوی ڈپلومیسی نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی درمیانی خلیج کو وسیع تر کرنے کے لیے بنگال کے صوبہ کو ہندو بنگال اور مسلم بنگال (۱۹۰۵ء) میں تقسیم کیا۔ عتیق صدیقی، آج کل حسرت نمبر ۱۹۸۱ء ۔ ص ۹، ۲۲؎ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی ۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر تارا چند ۔ ص ۲۷، ۲۳؎ حسرت ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں گرفتار ہوئے اور جیل کے دوسرے دن ۲۴ جون کو تلک بمبئی میں ۔ مشاہدات زنداں، عتیق صدیقی "آج کل" حسرت نمبر ۱۹۸۱ء ۔ ص ۱۰، ۲۴؎ جدوجہد آزادی میں مرکزی مجلس قانون ساز کا رول ۔ منورنجن جھا ۔ مترجم غلام ربانی تاباں ۔ ص ۲۴

۲۵؎ ۱۸ مارچ کو قانون پاس ہوا۔ ۶ اپریل کو اس کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا، ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو شام ۳ بجے جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا۔ ۳۷۹ آدمی ہلاک اور ۱۲۰۰ سو زخمی ہوئے۔ تحریک خلافت، قاضی محمد عدیل عباسی ۔ ص ۸۴ ۔ ۸۶، ۲۶؎ جدوجہد آزادی میں مرکزی مجلس قانون ساز کا رول ۔ منورنجن جھا ۔ ص ۹۵ ۔ ۹۶، ۲۷؎ چوگان ہستی، پریم چند ص ۳۶۴، ۲۸؎ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ ۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۵۹۹ ۲۹؎ پیام ولادت گاندھی، پرواز ادب نومبر ۱۹۸۰ء ۔ ص ۶۶

۳۰؎ نیا افسانہ، وقار عظیم ۔ ص ۱۹ ۔

کتوں کی کانفرنس

ہلال پھلواری

ایک دن اخبار میں کچھ یوں خبر تھی بیش و کم
ایک عورت نے دیا ہے بات بچوں کو جنم
اس عجوبہ پر ہزاروں تبصرے ہونے لگے
جتنے غیرت دار کتے تھے وہ سب رونے لگے
شدتِ غم سے ہر اک کتے کو تپ چڑھنے لگا
بولے اب انساں ہماری ہمسری کرنے لگا
ایک کتا تو یہاں تک کہہ گیا جذبات میں
کیا حماقت کی ہے اس نے آج کے حالات میں
جبکہ ساری قوم کے آگے تھا روٹی کا سوال
آج ہی کے دور میں اسکو دکھانا تھا کمال
اس کو لینا تھا جو ہم کتوں کی صحبت کا اثر
اور بھی کچھ خوبیاں تھیں ان پہ کرتی تھی نظر
سب سے پہلے ہم سے لینا تھا اسے درس وفا
آج تک یہ جنس ہے بے بہرہ ہے اور ناآشنا
پہلے ہم سے یہ اصولِ زندگانی سیکھتا
کس طرح ہوتی ہے گھر کی پاسبانی سیکھتا
یہ جسے بھی مارتا ہے مارتا ہے بن کے یار
ہم کسی پر بھی نہیں کرتے کبھی پیچھے سے وار
ہم چھپاتے ہیں نہ کالا دھن نہ کرتے ہیں بلیک
ہم مسلماں ہیں نہ ہندو ہیں ہمارا دھرم ایک
ہم کسی کا بھی نمک کھا کر نہیں کرتے حرام
یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام
ہم بھی ہوتے ہیں کبھی فطری تقاضوں کے شکار
صنفِ نازک کو مگر رکھتے نہیں سر پر سوار
اک ہمارے واسطے رکھا ہے قدرت نے نظام
رات دن ہم نسل سازی کا نہیں کرتے ہیں کام
بات کیا سوجھی ہمیں نیچا دکھانے کے لیے
حرص بھی کرنے چلا بچے بنانے کے لیے

جھانسی کی رانی

نازشؔ پرتاپ گڑھی
بیگم واڑہ۔ پرتاپ گڑھ

تو اندھیرے میں اٹھی شمعِ درخشاں کی طرح
تیری جرأت کے تصدق، تری ہمت کو سلام
تو نے زنجیرِ غلامی کو گوارا نہ کیا
لکشمی بائی! تری روح کی عظمت کو سلام

تیری للکار میں سو تیغ، ہزاروں خنجر
تیرا کردار تھا تہذیبِ وطن کا مظہر

جب تری غیرتِ قومی نے پکارا تجھ کو
سرِ میدانِ وغا جا کے ٹکے تیرے قدم
تو نے پازیب کی جھنکار کو تلوار کیا
اور آنچل کو بنا ڈالا رسیلا پرچم

تو برستے ہوئے شعلوں سے گزر جاتی رہی
خون میں ڈوب کے کچھ اور نکھر جاتی رہی

دشمنِ ہند کی چالیں ترے آگے ناکام
تیری جی داری تھی ہر مکر و دغا پر بھاری
زندگی بھی تری افرنگ کی خاطر زحمت
اور تری موت بھی ٹھہری تھی قضا پر بھاری

جرأت و جہدِ مسلسل کا پیام آتا ہے
قوم کے ہونٹوں پہ جب بھی ترا نام آتا ہے

موت کا جام پیا ہنستے ہوئے میداں میں
سر اٹھا کر سفرِ زیست کیا تھا تو نے
زندگی ملک کی خدمت میں لٹا کر اپنی
زندہ رہنے کا سبق ہم کو دیا تھا تو نے

ہم وہ احسان فراموش کہ سب بھول گئے
حد یہ ہے تیری شہادت کا سبب بھول گئے

"مردِ میداں"! تجھے کیا علم کہ تیرے بیٹے
کس طرح سانس لئے جاتے ہیں کیوں زندہ ہیں
پیش کرتے ہیں تجھے نذرِ عقیدت لیکن
آج ہم لوگ تری روح سے شرمندہ ہیں

قوم کے آئینۂ دل پہ جِلا کر نہ سکے
ہم ترے خونِ گرامی سے وفا کر نہ سکے

آمان اللہ
پرنسپل اسلا...

صدر یار جنگ مرحوم

عہدِ رفتہ کی ایک بے مثال شخصیت

ہندستان پر انگریزی حکومت کے آخری دَور میں شمالی ہندستان کے بڑے بڑے زمیندار، تعلقدار اور رؤسا بڑے ہی با اثر اور ذی لیاقت دار تھے۔ اسمبلیوں اور کونسلوں میں بھی زیادہ تر یہی لوگ پہنچتے تھے۔ ان پر انگریزی حکومت کو بڑا اعتماد تھا اور اسی لیے وہ انھیں مختلف خطابات سے نوازتی رہتی تھی۔ لیکن ان میں سے کچھ بڑے خوددار، محب وطن اور سیاسی اور سماجی بصیرت رکھنے والے باشعور زمیندار اور تعلقدار بھی تھے۔ ان ہی میں ایک بے مثال ہستی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی مرحوم و مغفور، رئیس حبیب گنج ضلع علی گڑھ کی تھی۔ موصوف نہ صرف ایک بہت بڑے زمیندار تھے بلکہ بڑے ٹھاٹ باٹ کے رئیس تھے، لیکن انگریزوں سے نہ تو کوئی خطاب حاصل کیا اور نہ ایوان حکومت تک پہنچنے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے تو بہت چاہا کہ انھیں بھی شیشے میں اتاریں اور کئی مرتبہ خطابات کی پیش کش بھی کی گئی۔ لیکن مرحوم کی خوددار طبیعت، روشن ضمیری اور جذبۂ حب الوطنی کو یہ گوارہ نہ ہوا کہ وہ غیر ملکی حکومت کے خطابات قبول کر کے اس کے وفاداروں میں شامل ہوں۔ غالباً اس کی دو وجوہات تھیں پہلی وہی جذبۂ حب الوطنی اور احساسِ خودداری۔ دوسرے وہ فطرتاً ایک عالم اور علم دوست انسان تھے انھیں کتابوں اور علماء و فضلاء کی صحبت سے عشق تھا۔ انھیں نہ شہرت کی طلب تھی اور نہ اقتدار کی ہوس۔ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت کچھ دیا تھا۔ اس لیے اس کے الطاف و اکرام کی بدولت بڑی شان و شوکت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر اس شان میں نمود و نمائش تھی اور نہ حرص و طمع۔ وہ اگر شان و شوکت کو چھوڑ دیتے تو اللہ والے ہو جاتے، لیکن پھر ان کی شخصیت میں وہ بات ہی نہ ہوتی جو اس طرح ہوئی کہ اللہ نے جو کچھ دیا اسے جذبۂ شکر و احسان سے قبول کیا لیکن زندگی کو پاک و صاف اور ضمیر کو روشن رکھا۔ انھوں نے ساری زندگی لہو و لعب سے دور رہ کر علم پروری میں گزاری۔ مرحوم کی شخصیت کا یہی سب سے عظیم اور روشن پہلو تھا۔ انھوں نے ریاست حیدر آباد کا خطاب "نواب صدر یار جنگ" صرف اس لیے قبول کیا تھا کہ اول تو وہ ایک غیر ملکی حکومت کی جگہ اپنے ہی ملک کی ایک مسلم ریاست کا عطا کردہ تھا۔ دوسرے یہ خطاب انھیں ایک بڑے زمیندار اور رئیس ہونے کی بنا پر نہیں دیا گیا تھا اور نہ اس کے پیچھے حکومت کی وفاداری اور خوشامد کا سوال تھا بلکہ یہ خطاب انھیں خالص علمی اور دینی کارناموں کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ وہ کارنامے جو موصوف نے بحیثیت صدر صدور حیدر آباد میں انجام دیے تھے۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم کا شمار اپنے دور کے عظیم علماء اور مشاہیر میں تھا اور وہ اس دور کی ایک ایسی باکمال اور فاضل ہستیوں میں سے ایک تھے جن کے علمی اور ادبی کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کی تصانیف میں تذکرۂ بابر، علمائے سلف اور سیرۃ الصدیق بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ "ذکر حبیب" اور "ذکر جمیل" سیرت پاک پر دو رسالے بھی بہت مقبول ہوئے۔ آپ کے مضامین کا ایک مجموعہ "مقالاتِ شیروانی" کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی کتابوں پر فاضلانہ مقدمے اور تبصرے بھی مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر تو بہت کچھ

عاصم گونڈوی
معرفت ہفت روزہ "بلیچ ورڈ"
متصل ریلوے جونیئر ہائی اسکول
گونڈہ یو پی

ایک چمن ایک وطن

ایک گگن کے ایک زمیں کے
ایک وطن کے رہنے والے
خوشیوں کی تقسیم پہ خوش ہیں
غم کو بانٹ کے سہنے والے
سچ کہتے ہیں کہنے والے
ہندو مسلم سکھ عیسائی
آپس میں ہیں بھائی بھائی

وقت کا ہے یہ آج تقاضا
نفرت کی دیوار کو ڈھا دیں
پیار، محبت، ہمدردی سے
آذردگی کا نقش مٹا دیں
سارے جہاں کے دل میں بٹھا دیں
ہندو مسلم سکھ عیسائی
آپس میں ہیں بھائی بھائی

عاصم ہر اک فردِ بشر کا
ایک ہے تن من ایک سی جاں ہے
غور سے دیکھو سب کی رگوں میں
آدم ہی کا خون رواں ہے
اور یہ حقیقت سب پہ عیاں ہے
ہندو مسلم سکھ عیسائی
آپس میں ہیں بھائی بھائی

نوید بلاسپوری
۲۰۔ ایف اشرفیہ ۱۸ زون ۳
بھلائی۔ ضلع درگ ایم پی

کیکر کا درخت

ٹھنڈک ہو چشمِ شوق کی دل کا سرور ہوں
شادی کے بعد کہتے ہیں بچے ضرور ہوں
ہوں کم سے کم اگر تو یہ دولت ہے بے بہا
پُر ہو گلِ مراد سے دامانِ مدعا
دو پھول چنیے خاروں سے دامن بچائیے
مطلب یہ ہے کہ ہاتھ سے آگے نہ جائیے
گر چاہتے ہو گھر کو تم اپنے سنوارنا
چادر ہو جتنی پیر وہیں تک پسارنا
ہر گوشہ حسنِ صحنِ گلستاں بنا رہے
ہر ذرہ گھر کا نیرِ تاباں بنا رہے
چھوٹے سے گھر میں چھوٹی سی جنت بنائیے
سکھ شانتی سے چین کی بنسی بجائیے
بچے زیادہ ہوں تو مسلسل عذاب ہو
احساسِ خانہ ساز کی مٹی خراب ہو
بارِ گراں ہو ہستیٔ ناپائیدار پر
چلنا پڑے ہے ان کے لیے نوکِ خار پر
ہر اک جبیں پہ غربت و افلاس کی شکن
ملبوس تار تار ہیں سوکھے ہوئے بدن
ان کی وطن کی شام بھی غربت کی شام ہو
وہ زندگی کہ سانس بھی لینا حرام ہو
ماں باپ ان کے بارِ مشقت سے سرنگوں
ہیں خستہ حال دن کو تو راتوں میں بے سکوں
تعلیم و تربیت سے علاقہ اگر نہ ہو
تزئینِ زندگی کی تمنا اگر نہ ہو
میلا تمام جسم ہو غربت کی دھول سے
الجھا رہے ہے تارِ گریباں ببول سے
کیکر کا یہ درخت خزاں کی بہار ہے
ایسا وجود دیش کی دھرتی پہ بار ہے

محمد اسحاق صدیقی
A-3 گرین ٹاؤن۔ لکھنؤ-۲۲۶۰۱۸

سمندر کا شیر
شارک



جنگل میں شیر کی آواز سن کر جیسے انسان سہم جاتا ہے، ویسے ہی وہ سمندر میں تیرنے والے شارک کی جھلک دیکھ کر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ سمندر سے دور رہنے والوں کو اس سے کوئی خطرہ نہیں، لیکن ساحل کے نزدیک سمندر میں تیرنے والے غوطہ خور اور نیزے سے چھوٹی مچھلیوں کا شکار کرنے والے اکثر شارک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے خونخوار منھ سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔ اور اگر اتفاق سے کوئی بچ بھی جائے تو بازو یا ٹانگ سے محروم ہو جانا معمولی بات ہے۔ اس کے ریزر جیسے تیز دانت اور مضبوط جبڑے ایک ہی وار میں انسان یا بڑی مچھلی کے جسم کے دو ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ اس کی سونگھنے کی قوت اتنی تیز ہوتی ہے کہ اگر سمندر کے دس کروڑ حصے پانی میں ایک حصہ خون ملا ہو تو وہ اس کی بو کو بھی محسوس کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی کوئی شکاری مچھلی کو نیزے سے چھیدتا ہے تو خون نکلتے ہی شارک دفعتاً نمودار ہو جاتی ہے۔ زخمی حالت میں تیرنے والے اور ایامِ حیض میں مبتلا عورتیں اکثر شارک کا لقمہ بن جاتی ہیں۔

شارک کا شمار دنیا کی قدیم ترین مچھلیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے پتھرائے ہوئے ڈھانچوں سے پتہ چلتا ہے کہ اب سے تقریباً چالیس کروڑ سال پہلے یہ مچھلیاں سمندر میں نمودار ہوئی تھیں اور تب سے اب تک ان کی نسل لگاتار چلی آرہی ہے۔ ابتدا میں شارک مچھلیاں بہت بڑی ہوا کرتی تھیں۔ ان کی ایک قسم جس کا نام میگالوڈون (MEGALODON) ہے، تقریباً نوے فٹ لمبی اور بیس ٹن تک وزنی ہوا کرتی تھی۔ اس کے مقابلے میں آجکل کی گریٹ وہائٹ شارک بچہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے سائنس داں شارک کا شمار جھوٹی مچھلیوں میں کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے جسم میں ہڈیاں نہیں ہوتیں۔ جن مچھلیوں کے جسم میں ہڈیاں ہوتی ہیں (ہماری جانی پہچانی مچھلیاں) انہیں سچی مچھلیاں کہتے ہیں۔

نظریۂ ارتقا کی رو سے پہلے جھوٹی مچھلیاں پیدا ہوئیں اور پھر سچی مچھلیاں۔

جیسے ہمارے کان کرّی کے بنے ہوتے ہیں، ویسے ہی شارک کا ڈھانچہ کرّی کا بنا ہوتا ہے۔ اس کرّی میں مضبوطی کے لیے کافی چونا ملا ہوتا ہے۔ سچی مچھلیوں کی طرح اس کے جسم میں ہوا کی تھیلی نہیں ہوتی۔ (یہ تھیلی مشک کا کام کرتی ہے اور مچھلی کو ڈوبنے سے بچاتی ہے) اسی لیے شارک کو ڈوبنے سے بچنے کے لیے دن رات تیرتے رہنا پڑتا ہے۔

اگر وہ تیرنا بند کر دے تو ڈوب جائے۔ دوسری مچھلیوں میں ریڑھ کی ہڈی کا سرا ختم ہونے کے بعد ان سے دُم شروع ہوتی ہے۔ شارک کی ریڑھ کی ہڈی دُم کے اوپر کے سرے تک پھیلی ہوتی ہے۔

شارک کا منہ اس کے تھوتھن کے سامنے نہیں بلکہ کافی پیچھے ہوتا ہے۔ اس کے کان نما دہانے کے کنارے آری کی طرح تیز اور نکیلے دانتوں سے لیس ہوتے ہیں۔ ان دانتوں کی آگے پیچھے کئی قطاریں ہوتی ہیں۔ کھانے کے لیے یہ اپنے اگلے دانت استعمال کرتی ہے۔ جب پہلی قطار کا کوئی دانت ٹوٹ یا گر جاتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لیے پچھلی قطار کا دانت آگے آجاتا ہے۔ گویا شارک کے منہ میں کبھی نہ ختم ہونے والے دانتوں کا ایک خزانہ ہوتا ہے۔ یہ دانت زندگی بھر گرتے اور نکلتے رہتے ہیں۔ وہ اتنے ہی سخت ہوتے ہیں جتنا کہ فولاد۔ اسی لیے شارک بڑی آسانی سے موٹی سے موٹی لوہے کی سلاخ کو اپنے دانتوں سے موڑ دیتی ہے۔

شارک کے جبڑے حیرت انگیز حد تک لچکدار ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بڑے سے بڑا شکار اس کے بھاڑ سے منہ میں سما جاتا ہے۔ وہ اپنے گلپھڑے کی جھریوں سے سانس لیتی ہے، جو اس کے سر کے پیچھے ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ وہ صاف طور پر پانی کے نیچے دیکھ سکتی ہے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ شارک کے منہ میں ہی نہیں بلکہ سارے جسم پر دانت ہوتے ہیں جیسے دوسری مچھلیوں کا جسم چھلکوں (SCALES) سے ڈھکا ہوتا ہے، ویسے ہی شارک کے جسم پر کھال کے دانت ابھرے ہوتے ہیں۔ کل دانتوں کا رُخ ایک ہی جانب ہوتا ہے۔ اسی لیے اگر ایک طرف سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا جائے تو کھال زیادہ سخت نہیں معلوم ہوتی اور اگر دوسری طرف سے (جدھر دانتوں کا رُخ ہوتا ہے) ہاتھ پھیرا جائے، یا جسم کا کوئی حصہ چھو جائے تو خون نکل آتا ہے اور خون کی بو پاتے ہی شارک حملہ کر دیتی ہے۔ شارک کی کھال اتنی سخت ہوتی ہے کہ اسے کاٹنے میں تیز سے تیز چاقو کند ہو جاتا ہے۔

شارک کی بیشتر اقسام تیز رفتار تیراک ہوتی ہیں۔ وہ غذا کی تلاش میں دن رات پانی کی سطح کے نزدیک تیرتی رہتی ہیں، بیشتر درندے جب بھوکے ہوتے ہیں تبھی شکار کرتے ہیں۔ (بھولے بھالے جانور بھی یہ بات جانتے ہیں۔ یہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ اگر درندہ شیر جب شکم سیر ہوتا ہے یا آرام کرتا ہے تو زیبرا اور ہرن بے کھٹکے چرتے رہتے ہیں اور اسے دیکھ کر بھاگتے نہیں۔) شارک اس قانون کی پابند نہیں۔ ماہرین حیوانات نے زندہ شارک مچھلیوں کو پکڑنے کے بعد قید کی حالت میں ان پر جو تجربات کیے ہیں، ان سے پتہ چلا ہے کہ ہر جانور کو دیکھ کر یا اس کی بو سونگھ کر شارک کو بھوک لگ آتی ہے۔ اسی لیے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد وہ کھانے سے منہ نہیں موڑتی بلکہ نئے شکار کا پتہ چلتے ہی اس پر حملہ کر دیتی ہے۔ صرف ایک ہی زمانہ ایسا ہوتا ہے جب اسے کھانے کی طرف رغبت نہیں ہوتی اور اس کی خوراک کم ہو جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب نر مادہ مل کر افزائش نسل کرتے ہیں۔ قدرت نے یہ تدبیر مادہ کی جان بچانے کے لیے کی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بے رحم نر انہیں بھی کھا جاتے۔ یوں بھی شارک کا پیار خون خرابے سے خالی نہیں ہوتا۔ جب نر کسی مادہ کو چاہتا ہے تو اسے ہلکا ہلکا سا کاٹ لیتا ہے۔ افزائش نسل کے زمانے میں نر مادہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ جب یہ زمانہ گزر جاتا ہے تو دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے غول میں مل کر تیرتا ہے۔ یعنی نر مچھلیاں نر کے ساتھ اور مادہ مچھلیاں مادہ کے ساتھ۔

شارک کی بعض قسمیں انڈے دیتی ہیں اور بعض بچے۔ جو بچے دیتی ہیں، ان کے انڈے خود ان کے جسم میں پرورش پاتے ہیں۔ یہ بچے نہ صرف رنگ روپ میں اپنے والدین جیسے ہوتے ہیں بلکہ ویسے ہی خونخوار بھی ہوتے ہیں۔

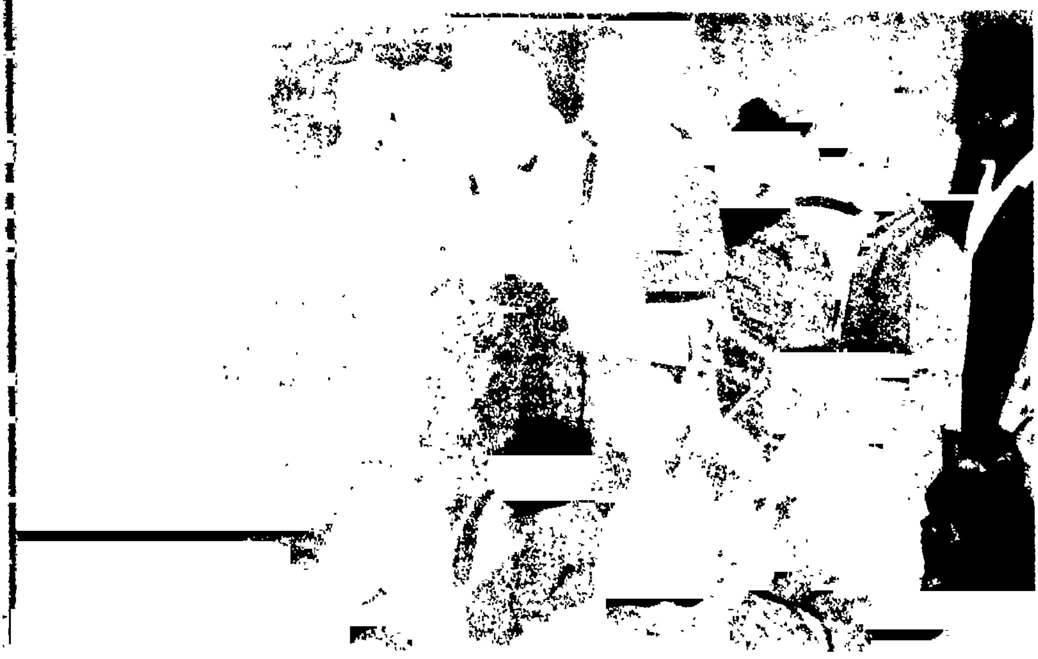
شارک سمندر کے کسی خاص خطے تک محدود نہیں۔ ساحل کے نزدیک کم گہرے پانی میں اس کے ملنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور شمالی امریکا کے ساحل اس کا خاص مسکن ہیں۔ وہ سمندر کے گرم پانی والے خطوں میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس کی بیشتر اقسام کھارے پانی کی مچھلیاں ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض شکار کی تلاش میں تیرتے ہوئے سمندر سے دریاؤں اور جھیلوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقامات پر بھی لوگ غفلت میں شارک کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شارک کی تقریباً دو سو پچاس اقسام ہیں، جن میں سے ۲۷ کا آدم خور ہونا ثابت ہے۔ خونخوار ہونے کے لیے جسامت کی شرط نہیں۔ چھوٹی شارک مچھلیاں دو انچ سے لے کر چھ فٹ تک لمبی ہوتی



یوم جمہوریہ کے موقع پر نئی دہلی میں راج پتھ سے گزرتی ہوئی اتر پردیش کی جھانکی، جس میں بیگم حضرت محل کا عہد اور جنگِ آزادی کے سلسلے میں ان کی جدوجہد کی جھلک پیش کی گئی۔

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲ فروری کو میرٹھ میں عوامی نمائندوں کو خطاب کرتے ہوئے۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ یو۔پی شری سری پت مشرا بھی موجود تھے۔



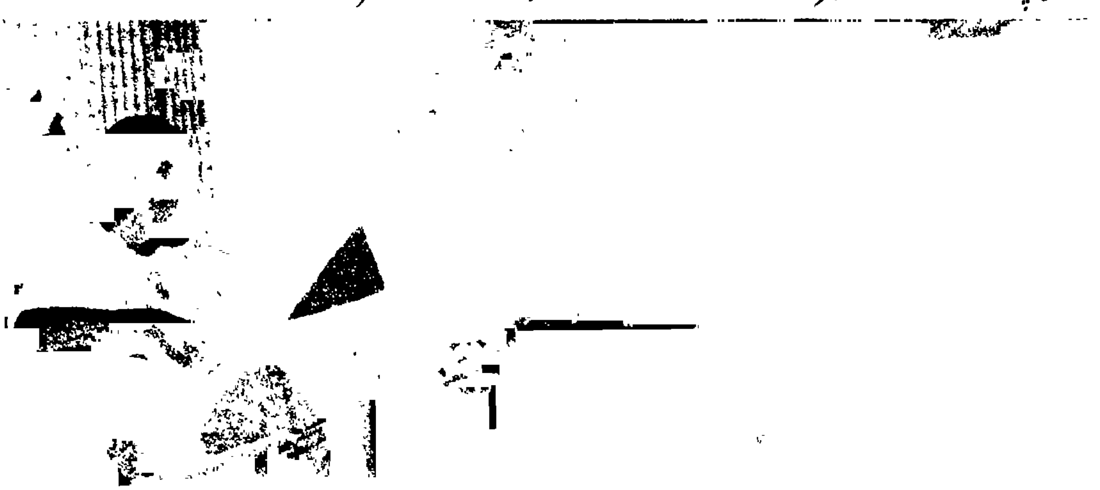


وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۲۳ر



یس شری چندریشور پرشاد نرائن سنگھ ۱۰ر فروری ۱۹۸۲ء کو بیگم حضرت محل
ییں شمع روشن کرکے جشنِ لکھنؤ کا افتتاح کرتے ہوے۔

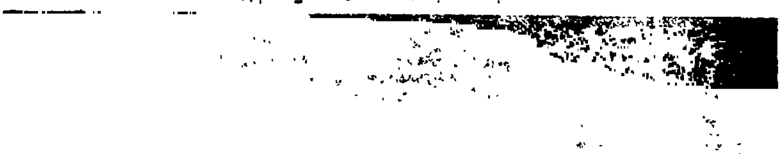
یا چندریشور پرشاد نرائن سنگھ ۱۱ر فروری ۱۹۸۲ء کو راج بھون میں مشہور ستار نواز اُستاد امرت خاں کے فن سے محظوظ ہوتے ہوے





۱۹ء کو کان پور میں جن منگل سنستھا کی جانب سے خاندانی منصوبہ بندی میں صنعتوں اور مزدوروں
ل پر منعقدہ سیمینار میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ۔

گورنر شری چندریشور پرشاد نرائن سنگھ گزشتہ ماہ تلک ہال ودھان بھون میں اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں راما
کے اردو میں منظوم ترجمہ "راماین فراقی" کا اجرا کرتے ہوئے ۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا اور وزیر قومی یک جہتی ڈاکٹر عمار رضوی بھی نظر
آرہے ہیں ۔ اس تقریب میں کالیداس کے ڈرامے مالویکا اگنی متر کے اردو ترجمے کا اجرا وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں ہوا
(اس ڈرامے کا ترجمہ جناب عرفان صدیقی نے کیا ہے)





اودر برج (اناؤ) کا ایک منظر

بھدوئی میں قالین بافی کا ایک مرکز



ہیں جبڑوں کو چبا کر سکتی ہیں۔ آدم خور شارک مچھلیاں پانچ فٹ سے لے کر ۴۰ فٹ تک لمبی ہوتی ہیں۔ شارک کی چند مشہور اقسام یہ ہیں:۔

(۱) وھیل شارک (WHALE SHARK)۔ یہ ساٹھ فٹ تک لمبی اور کئی ٹن وزنی ہوتی ہے۔ سب سے بڑی شارک ہونے کے باوجود یہ ننھی ننھی مچھلیاں اور جھینگے کھاتی ہے۔ جن کے وہ جھنڈ کے جھنڈ نگل جاتی ہے۔ اس کی خاص غذا پلینکٹن (PLANKTON) ہے جو ننھے ننھے حیوانات و نباتات ہوتے ہیں۔ اس کے منہ میں خاص طرح کی چھلنیاں ہوتی ہیں، جن سے چھن کر غذا پیٹ میں پہنچ جاتی ہے اور پانی گلپھڑوں کے ذریعہ باہر نکل جاتا ہے۔ یوں تو اس کے منہ میں ہزاروں دانت ہوتے ہیں لیکن وہ شاید ہی انھیں کبھی استعمال کرتی ہو۔

(۲) باسکنگ شارک۔ یہ وھیل شارک کی قریبی رشتے دار ہے۔ تیس چالیس فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس کے منہ میں بھی خاص طرح کی چھلنیاں ہوتی ہیں۔ یہ صرف پلینکٹن کھاتی ہے۔ پانی کی سطح پر دھوپ کھانا اس کی عادت ہے۔

(۳) تھریشر شارک (THRESHER SHARK) پانچ فٹ سے لے کر بیس فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ یہ اپنی لمبی دم کو پانی پر مار کر چھپاکا پیدا کرتی ہے۔ جب مچھلیاں گھبرا کر بھاگتی ہیں اور اس کے پاس سے گزرتی ہیں تو یہ انھیں سیکڑوں کی تعداد میں چٹ کر جاتی ہے۔

(۴) گریٹ وھائٹ شارک (GREAT WHITE SHARK) یہ سب سے زیادہ خطرناک مچھلی ہے جس کی لمبائی چالیس فٹ تک ہوتی ہے یہ عام طور پر مچھلیاں کھاتی ہے۔ بڑے جانوروں پر حملہ کرتی ہے، اور مل جائے تو انسان کو بھی کھا جاتی ہے۔

(۵) ماکو شارک (MAKO SHARK) یہ آدم خور مچھلی گریٹ وائٹ شارک کی قریبی رشتے دار ہے۔ اس کے منہ میں تقریباً ۲۴۰ دانت ہوتے ہیں جو پانچ قطاروں میں آراستہ ہوتے ہیں۔ یہ دانت اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ ایک ہی وار میں انسان یا بڑی مچھلی کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ اکثر اپنے شکار کو مکمل نگل جاتی ہے۔

(۶) ہیمر ہیڈ شارک (HAMMERHEAD SHARK) پانچ سے لے کر بارہ فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ اس کا چپٹا سر ہتھوڑے نما ہوتا ہے۔ سر کے دونوں سروں پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہوتی ہیں۔ یہ اپنے سر کو دائیں بائیں گھماتے شکار کی تلاش میں گھومتی رہتی ہے۔ یہ بھی آدم خور مچھلی ہے۔

(۷) سوپ فِن شارک (SOUPFIN SHARK) کے پَروں کا شوربہ تیار کیا جاتا ہے جو کافی لذیذ ہوتا ہے۔

شارک کی بعض اقسام کا گوشت کھانے میں اچھا ہوتا ہے۔ بعض کے جگر کا تیل وٹامن اے (A) سے بھرپور ہوتا ہے۔ گوشت اور جگر کا تیل حاصل کرنے کے لیے شارک کا شکار کیا جاتا ہے۔ چھوٹی شارک مچھلیوں مثلاً ماکو شارک کا شکار بنسی اور ڈوری سے کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے نہایت مضبوط ڈور استعمال کی جاتی ہے، جس کے سرے پر کانٹے میں کوئی بڑی مچھلی لگائی جاتی ہے۔ پہلے شارک کو قریب لانے کے لیے پانی میں ایک خاص قسم کا مرکب ڈالا جاتا ہے، جسے چم (CHUM) کہتے ہیں۔ یہ مچھلی کی آنتیں اور خون ملا کر بنایا جاتا ہے۔ شکاری اپنے کو کشتی میں بڑی کرسی سے کس کر باندھ لیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ مچھلی اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ اسے گھسیٹ کر پانی میں لے جا سکتی ہے۔ جب ڈور میں پھنسی شارک بھاگتے بھاگتے تھک جاتی ہے تو اسے ہارپون مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

بحرالکاہل کے بعض جزیروں کے قبائلی شارک مارنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ سخت چھلکے والے تربوزوں کو ابالتے ہیں، اور گرما گرم تربوز اور مچھلیوں کا ڈھیر کشتی میں لاد کر سمندر میں لے جاتے ہیں شارک کو دیکھ کر پہلے وہ مچھلیاں پانی میں پھینکتے ہیں اور جب وہ انھیں کھانے کے لیے جمع ہو جاتی ہیں تو جلتے ہوئے تربوز پانی میں اچھال دیتے ہیں۔ جب شارک مچھلیاں دوسری مچھلیوں کے ساتھ یہ تربوز نگل جاتی ہیں، تو ان کی گرمی اور بھاپ کے پیٹ میں خارج ہونے سے مر جاتی ہیں۔ جب ان کی لاشیں پانی پر تیرنے لگتی ہیں تو ماہی گیر انھیں جمع کر لیتے ہیں۔ اس طرح شارک کا شکار کرنے میں ایک بھی انسانی جان ضائع نہیں ہوتی۔

**

سیّد رؤف رضا
محلہ تاریجی ٹکلی، شاہجہاں پور
(یو پی)

غزل

خواہشوں کا رنگ آنکھوں میں تھا سودا سر میں تھا
حسن منظر میں تھا لیکن کوئی پس منظر میں تھا

منزلیں آواز دیتی تھیں فضا تھی خوشگوار
کوئی کانٹا سا مگر احساسِ بال و پر میں تھا

کو بہ کو سر پھوڑتی پھرتی تھی سجدوں کی ہوس
کون سا جادو نہ جانے اس کے سنگِ در میں تھا

ہر تمنا چاہتی تھی آبیاری کو لہو
آخری آنسو ادھر تحویلِ چشمِ تر میں تھا

سایہ سایہ سوگ میں تھی شامِ غم کی چاندنی
اور میں تنہائیوں کے دشتِ بے منظر میں تھا

میں کہ اک پتھر تھا سو وہ بھی رہینِ انتخاب
تو کہ سرتاپا تراشیدہ کفِ آذر میں تھا

منظور ندیم
بالاپور
ضلع اکولہ مہاراشٹر

غزل

چاند یادوں کا تری پھر ہے چمکنے والا
زخمِ دل پھول کی صورت ہے مہکنے والا

چند لمحے بھی اسے چھاؤں میسر نہ ہوئی
تھک گیا دشتِ محبت میں بھٹکنے والا

کیا ملے گا تجھے اب رات گئے گھر جا کر؟
سو گیا ہوگا تری راہ کا تکنے والا

کاش کچھ روز خوشی اور نہ ملتی مجھ کو
میرا غم تھا تری آنکھوں سے چھلکنے والا

سخت جاں ہم ہی رہے اس کے تعلق میں ندیمؔ
وہ تو تھا شاخ کی مانند لچکنے والا

منظر سلطان
منڈا ٹولہ، بتیاہ، بہار

غزل

بھوت بیتالے دھوئیں کے بادلوں میں کھو گئے
ہم تھکے ہارے مسافر نیند آئی، سو گئے

قتلِ سیلِ نور کا الزام کس پر آئے گا
سب کے سب حمام میں جب ایک جیسے ہو گئے

آنے والی نسل دامن گیر ہوگی ایک دن
کون تھے وہ لوگ جو راہوں میں کانٹے بو گئے

جگنوؤں سے جگمگا اٹھی مری شامِ فراق
اجلے آنسو کالے کالے حرف سارے دھو گئے

آؤ منظر خود لکھیں خاموشیوں کی داستاں
بزم سے اٹھ کر قلم والے سبھی گھر کو گئے

محمد مصباح اللہ
۲۹ مبرم ناظم اسٹریٹ
پلاورم۔ مدراس ۴۳

نامِ کتاب جانِ کتاب!

کسی کتاب یا تصنیف کی قدر و قیمت اور مقبولیت کا دار و مدار جہاں کتاب کے مواد، مصنف کی دلکش طرزِ تحریر، شاندار اسلوبِ نگارش اور فصیح و بلیغ زبان پر ہے وہاں کتاب کی سرخی، عنوان اور نام بھی کسی قدر کتاب کی شہرت کو چار چاند لگانے کے ضامن اور معاون ثابت ہوئے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادبیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار کتابیں ایسی پائی جاتی ہیں جو محض اپنے دلکش اور موزوں نام کے بل بوتے پر آسمانِ ادب پر کہکشاں کی طرح اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہیں۔ اُردو زبان میں بھی ایسی کتابوں کی کمی نہیں ہے جو ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہونے کے علاوہ نام کی موزونیت اور دلکشی کے باعث خاص و عام میں غیر معمولی مقبولیت کی حامل ہیں۔ نام کے متعلق عموماً یہ بات خصوصیت سے کہی جاتی ہے کہ اسم کو مسمیٰ کی صفات، خواص، واقعات اور حالات کا آئینہ ہونا چاہیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کسی کتاب کو مکمل کرنے کے بعد ہر مصنف کی توجہ کتاب کے نام کے انتخاب پر مرکوز ہو جاتی ہے اور اس کی انتہائی دلی تمنا بس یہی ہوتی ہے کہ اپنی کتاب اسم با مسمیٰ ہو، اور نامِ کتاب، جانِ کتاب بن جائے۔

اقلیمِ اُردو ادب کے دامن کی طویل فہرست میں یوں تو بے شمار کتابیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں جو ہر حیثیت سے قابلِ مطالعہ اور قابلِ قدر ہیں لیکن ان میں سے دو چار انمول کتابوں کو، جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں، میں اس لحاظ سے قابلِ ذکر سمجھتا ہوں کہ بہ اعتبارِ موضوع ان کتابوں کے نام کی ندرت کی ادبی دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ کتابیں بھی اپنے نام پر فخر کرتی ہوں۔

ع یہ بھی اک حسن خداداد ہے کہ نام میں ہے (امیر مینائیؒ)

یہ اور بات ہے کہ منتخب کتابیں فنی نقطۂ نگاہ سے بھی ایک خاص امتیاز، شان رکھتی ہیں۔

ہر اعلیٰ پایہ کی کتاب میں نام کے انتخاب کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے جو اس امر کی شاہد ہے کہ مصنف کو نام کے سلسلے میں کس قدر سوجھ بوجھ سے کام لینا پڑتا ہے چنانچہ میں یہاں صاحبِ کتاب کے اُن مختصر کلمات کو بھی بدیۂ ناظرین کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق کتاب کے نام کے انتخاب سے ہے تاکہ ان دلچسپ اقتباسات کے مطالعہ سے قارئین کو اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ مصنف کے لیے کتاب کا نام کتنی اہمیت رکھتا ہے ہر صاحبِ کتاب اس راز سے آگاہ ہے کہ کتاب کے لیے نام ہی وہ مقناطیس ہے جس کی کشش سے قاری کتاب کی طرف از خود مائل ہوتا ہے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران اپنے آپ کو مشغول رکھنے کی خاطر چند مکتوبات جنھیں جیل سے باہر بھجوانے کی انھیں اجازت نہیں تھی، اپنے مخلص دوست نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (رئیس بھیکم پور، ضلع علی گڑھ) کے نام وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے، جنھیں نواب موصوف اپنی فائل کی زینت بناتے رہے۔ مولانا کی رہائی کے بعد یہ دل آویز مکتوبات کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ شمعِ اُردو کا کون ایسا پروانہ ہوگا جس نے مولانا ابوالکلام آزاد کی اس لاجواب کتاب "غبارِ خاطر" کا نام نہ سنا ہو؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان علمی، ادبی اور معلوماتی مکاتیب کی اشاعت کا حال مولانا آزاد ہی کے الفاظ میں سناؤں۔

"یہ تمام مکاتیب نجی کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے۔ لیکن رہائی کے بعد مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا تو مصر ہوئے کہ انھیں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ ان کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سر و سامان کر رہا ہوں۔ جس حالت میں یہ قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے اسی حالت میں طباعت کے لیے دیے گئے ہیں۔ نظرثانی کا موقع نہیں ملا۔"

ادھر یہ کتاب منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوئی اُدھر اُردو دنیا میں اس معرکۃ الآرا تصنیف کی غیر معمولی طور پر پذیرائی ہوئی یہاں تک کہ ایک سال کے اندر اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ کتاب کے نام کے متعلق مولانا آزاد اپنی کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:۔

"میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی، مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصر اور ہم وطن تھے، اور جدّی رشتے سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکروں میں جابجا ان کا ترجمہ لکھا ہے اور سراج الدین خاں آرزو اور آنندرام مخلص کی تحریرات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ میں (مولانا آزاد) یہ نام ان سے مستعار لیتا ہوں ؎

مپرس تا چہ نوشت است کلک قاصر ما
خطِ غبار من است این "غبارِ خاطر" ما؟"

اس کتاب کو شائع ہوئے چھتیس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ لیکن بازار اُردو ادب میں اب بھی اس کی زبردست مانگ ہے کیونکہ یہ اتنی دلچسپ ہے کہ دو ایک بار کے مطالعہ سے سیری نہیں ہوتی۔

فقیر سیّد وحید الدین نے ایک حسین و جمیل اور بصیرت افروز مرقع "روزگارِ فقیر" کے نام سے تیار کیا جسے انھوں نے شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی سیرت کے متعدد حیرت ناک واقعات اور دلکش پہلوؤں سے سنوارا ہے۔ یہ شہرۂ آفاق کتاب اپنی طرز اور نوعیت کی پہلی تصنیف ہے جو اقبالیات کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ بقولِ مصنف:۔

"اس کتاب کا بنیادی موضوع اقبال بحیثیت شاعر نہیں، اقبال بحیثیتِ انسان اور بحیثیتِ عاشقِ رسول ہے۔"

اس تصنیف میں کیا کچھ نہیں ہے؟ بقول فیض احمد فیض:۔ "اقبال کی زندگی کے گھریلو روزمرہ مناظر، ان کی نجی صحبتیں اور رنجشیں، راحتیں اور کلفتیں، ان کے دل کا گداز اور دماغ کی شگفتگی، اقبال کے آنسو اور اقبال کے قہقہے سبھی شامل ہیں۔"

کتاب کے نام کے انتخاب کے سلسلے میں فاضل مصنف کا بیان ہے:۔

"حسنِ اتفاق ہے کہ مجھے اس کتاب کا نام منتخب کرنے میں خاص جستجو کرنا پڑتی اگر مرحوم کی وہ مشہور رباعی اس نام کا ماخذ نہ بن جاتی جس کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟" (اقبال)

اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ "روزگارِ فقیر" وہ زندۂ جاوید اور روشن کتاب ہے جو دنیائے اُردو میں چاند اور سورج کی طرح جگمگا رہی ہے اور اس کی منور شعاعیں پرستارانِ اقبالؒ کو نئی راہیں دکھا رہی ہیں۔

خواجہ کمال الدین نے انگریزی زبان میں ایک کتاب بنام "THE IDEAL PROPHET" تدوین کی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اسلامی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی کیونکہ موضوع کے اعتبار سے انگریزی زبان میں غالباً یہ پہلی اور واحد کتاب تھی جو سیرت النبیؐ پر روشنی ڈالتی تھی۔ تعلیم یافتہ انگریزی داں طبقہ میں یہ کتاب نہایت عقیدت کی نگاہ سے دیکھی اور پڑھی جانے لگی، شاید اس لیے کہ اس سے روشناس ہونے کا ان کے لیے پہلا موقع ملا ہو۔ یہ تصنیف اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ اُردو زبان میں ہوا۔ اس اُردو ایڈیشن کتاب کے

نام کے متعلق سید ضیاء الدین کا بیان ہے:

مولوی خواجہ کمال الدین کی انگریزی کتاب "THE IDEAL PROPHET" کا ترجمہ اُردو میں ہونے لگا تو یہ سوال سامنے آیا کہ اُردو میں کتاب کے نام کا ترجمہ کیا ہونا چاہیے؟ مختلف اصحاب نے اپنی سمجھ اور ذوق کے مطابق مختلف نام بتلائے مگر ان میں سے کوئی نام بھی اصل کتاب کے مفہوم کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا تھا ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو انھوں نے برجستہ فرمایا: "نبیِ کامل!"

اگر میں ان صفحات میں مدراس کے ایک مقبول ترین قدیم سہ ماہی رسالہ کا تذکرہ کروں تو شاید بے محل نہ ہوگا۔ اس جریدہ کے نام کے سلسلے میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوا وہ اس قابل ہے کہ سنہرے حروف میں لکھا جائے اور اس کا مطالعہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جنوری ۱۹۲۹ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا۔ (THE MUSLIM EDUCATIONAL ASSOCIATION OF SOUTH INDIA) کی دعوت پر[۱۰] مدراس تشریف لائے تھے۔ گورنمنٹ محمڈن کالج کی ادبی انجمن کی جانب سے بھی آپ کی آمد کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ[۱۱] کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس وقت کالج کی اُردو سوسائٹی کے سکریٹری یوسف زکریا سیٹھ نے بھری محفل میں اعلان کیا کہ "اُردو انجمن کی جانب سے عنقریب ایک سہ ماہی جریدہ شائع ہونے والا ہے"۔ موصوف نے شاعرِ اعظم سے خواہش ظاہر کی کہ رسالہ کے سرورق کے لیے آپ اپنا ایک دل چسپ اور موزوں شعر مرحمت فرمائیں۔ اس استدعا کو تکمیل سے ہمکنار کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنا وہ مشہور شعر

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

پیش کیا۔ شعر کو پڑھ کر سید یوسف زکریا سیٹھ کی باچھیں کھل گئیں مارے خوشی کے اچھل پڑے اور بیساختہ بول اٹھے: "ڈاکٹر صاحب نے شعر ہی عطا نہیں فرمایا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جریدہ کا نام بھی موصوف ہی نے تجویز کر دیا ہے"۔ پھر انھوں نے مذکورہ بالا شعر حاضرین کو پڑھ کر سنایا اور کہا: "سفینہ! جریدے کا نام ہوگا"۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا دریائے ادب اُردو میں جب تک یہ سفینہ بہتا رہا اپنی سبک رفتار سے سرگرمِ سفر رہا۔ اس رسالہ[۱۲] کے جتنے بھی شمارے منظرِ عام پر آئے وہ اپنے اعلا معیار کی داد پاتے رہے۔ تمل ناڈو کے تعلیم یافتہ اُردو داں طبقہ کے بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ اربابِ علم، دانشوروں اور ملک کے نامور ادیبوں کی رائے تھی کہ "جرائد کی دنیا میں دیگر رسالوں کی بہ نسبت سفینہ کا معیار بلند، ارفع اور اعلا ہے"۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ بہت سی جلیل القدر قابلِ توجہ اور لائقِ مطالعہ کتابیں اپنے معمولی سپاٹ اور بے کیف و بے کشش نام کے باعث قارئین کی توجہ کا مرکز بننے سے قاصر رہتی ہیں۔ اور جس عالمگیر شہرت کی وہ مستحق ہیں اس سے محروم رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جاذبِ نظر نام میں وہ نعمتِ عظمیٰ پنہاں ہے جو سمیٰ کی شناسائی کا ذریعہ اور کامیابی و سربلندی کی ضامن ہے۔ ✱

حواشی:۔ [۱] مولانا آزاد۔ نام محی الدین احمد ۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۸ء [۲] قلعہ احمد نگر کی دور اسیری۔ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء۔ [۳] صدر یار جنگ: نام حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۱۸۶۵ء تا ۱۹۵۰ء، [۴] محمد اجمل خاں سکریٹری مولانا آزاد، غبارِ خاطر کے اصل اور حقیقی محرک۔ [۵] غبارِ خاطر: پہلا ایڈیشن اشاعت مئی ۱۹۴۶ء۔ [۶] فقیر سید وحید الدین، فقیر سید نجم الدین کے ہونہار پسر۔ ان کے گھرانے سے علامہ اقبال کے گہرے مراسم اور دوستانہ تعلقات تھے۔ [۷] روزگارِ فقیر: اشاعت اول ۱۹۵۰ء۔ [۸] رباعی:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟ (اقبال)

[۹] اقبال: شیخ محمد اقبال، نام۔ نومبر ۱۸۷۷ء تا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء۔ [۱۰] علامہ اقبال کا قیام مدراس میں ۵ تا ۸ر جنوری ۱۹۲۹ء "خطبات تشکیلِ جدید" کے سلسلہ میں۔ [۱۱] جلسہ: ۸ر جنوری ۱۹۲۹ء منگل جریدہ سفینہ کے نام کا انتخاب۔ [۱۲] سفینہ کا اجرا ۱۹۲۹ء۔ شمارے ۸ سے زائد۔

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶ - ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ
الہ آباد - ۳

غزل

بازارِ محبت میں یہ قیمت سستی ہے
جتنی ہی یہ مہنگی ہے اتنی ہی یہ سستی ہے

کیوں بادہ و ساغر کا احسان اٹھائیں ہم
اس آنکھ کی مستی میں سو جام کی مستی ہے

ایسے بھی مسافر ہیں خود جن کے لیے قندیل
راہیں بھی ترستی ہیں منزل بھی ترستی ہے

کچھ دیر یہاں رک کر پھر گرمِ سفر ہونا
دیوانو! ٹھہر جاؤ یہ پیار کی بستی ہے

شادابیٔ گلشن کی اللہ رے یہ سختی
اٹھتی ہے گھٹا لیکن کچھ دور برستی ہے

یہ وحشتِ دل آخر لاتی ہے کہاں جوہر
کچھ راز نہیں کھلتا صحرا ہے کہ بستی ہے

سحر اعظمی
بلتھرا روڈ - بلیا (یوپی)

غزل

گلستاں ہو کہ صحرا تیرا دیوانہ جہاں ہوگا
لیے ہاتھوں میں دامانِ جنوں کی دھجیاں ہوگا

جسے تم آتشِ نمرود سے تعبیر کرتے ہو
ہمارا حوصلہ اس آگ میں پل کر جواں ہوگا

بھلا خاطر میں کیا لائیں تجھے اے گردشِ دوراں
یہ دنیا ہے یہاں تو ہر نفس اک امتحاں ہوگا

ہوئے مائل جو رنگ آمیزیوں پر باد کے جھونکے
تو اک اک خارِ صحرائے جنوں کا گل نشاں ہوگا

نوازا ہے جسے حسنِ عمل نے سربلندی سے
وہی لمحہ ہماری زندگی کا جاوداں ہوگا

ہر اک کانٹا خزاں کے دور میں گر بہاراں ہے
صداقت کے لیے نوکِ زباں پر برچھیاں ہوگا

یونہی قائم رہے گی بجلیوں کی شعلہ سامانی
سحر جب تک سرِ شاخِ تمنا آشیاں ہوگا

[illegible]
محلہ [illegible]
بارہ بنکی (یوپی)

غزل

دم بدم قریہ بقریہ کو بہ کو ڈھونڈھو
کوئی مخلص ہو کبھی شاید جا بجا ڈھونڈھو

کھول کر میری کتابِ زندگی میں باب
حرفِ عشرت کوئی میرے دہر ڈھونڈھو

ترک ہوتی ہے کہیں احباب میں یوں گفتگو
دوستو! اسبابِ ترکِ گفتگو ڈھونڈھو

زندگی کب سے مسلسل برسرِ پیکار ہے
زندگی میں کوئی لمحہ صلح جو ڈھونڈھو

مدتوں سے سن رہے ہیں ہم کہانی عشق کی
اب نیا موضوعِ بہرِ گفتگو ڈھونڈھو

زندگی کا کیف گھٹتا جا رہا ہے دم بدم
آج پھر مخمور آنکھوں کے سبو ڈھونڈھو

ساری دنیا کی نظر میں تم ہو آخر بے
اپنے دامن پہ کہ میرا لہو ڈھونڈھو

جسونت سنگھ آزاد
۲۲۴/۱۱ سکٹر، چنڈی گڑھ

فارسی کا عظیم پنجابی شاعر

بھائی نند لعل گویا

فارسی ادب اور شاعری کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ بھائی نند لعل گویا جیسے بے بدل عالم اور قادر الکلام شاعر، جنھوں نے چمنستان شاعری میں اخلاقیات معرفت اور تصوف کے گل ہائے رنگا رنگ بکھیرے ہیں، کی نکتہ آفرینیوں کی مہک ابھی تک گوردواروں کی چار دیواری سے آگے نہیں جا سکی۔ خسرو اسی ملک میں پیدا ہوئے اور اسی میدان کے شہسوار تھے مگر صدیاں بیت جانے کے باوجود انھیں قبول عام اور شہرت دوام حاصل ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

غنی کشمیری، بھائی صاحب کے ہم عصر تھے۔ ان کا کلام بھی زندہ و تابندہ ہے، بلکہ ہندوستان کی حدود کو پار کر کے ایران جا پہنچا ہے۔ اور ان کے اس شعر کا آئینہ دار ہے ؎

با ایران سخن ہا روان می رود
عجب ایران سخن در جہان می رود

اگرچہ بھائی نند لعل گویا نے اپنی زندگی میں اپنی شاعری کو گورو گوبند سنگھ جی کے دربار تک ہی محدود رکھا۔ اور شہرت، صلہ اور نام کی تمنا سے بے نیاز رہے، تاہم ان کی شاعری بے نیازی کے علاوہ کسی ادب دوست اور فارسی شاعری کے شیدائی نے بھی ان کے کلام کے بکھرے ہوئے اوراق کو ہنوز اکٹھا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ہندوستان کے دیگر شعرائے فارسی کے مستند دیوان موجود ہیں وہاں دشمیش کے دربار کے ملک الشعراء کی فکر انگیز عارفانہ شاعری کی داستان دنیائے فارسی میں نظر نہیں آرہی ہے۔ جو ان کا کلام جو میری نظر سے گزرا ہے اس میں جزوی طور پر کئی ایسے مصرعے موجود ہیں جو ایران کے سر برآوردہ شعرا کے دواوین میں ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ ملاحظہ فرمایئے :—

گویا:— ہم دریں دنیا بیابی کام را
خاک بر سر کن غم ایام را۔

حافظ — ساقیا برخیز و درده جام را
خاک بر سر کن غم ایام را

گویا:— مرا در منزل جاناں ہمہ عیش و ہمہ شادی
جرس بیہودہ می نالد کجا بندیم محمل ہا

حافظ:— مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

گویا:— دولت جاوید باشد بندگی
بندگی کن بندگی کن بندگی

مولانا روم:— گر تو خواہی خرمی و دل بندگی
بندگی کن بندگی کن بندگی

گویا:— ناتوانی بندہ شو صاحب مباش
بندہ را جز بندگی نبود تلاش

مولانا روم، ناتوانی بندہ شو سلطاں مباش

مولانا روم کے مصرعہ ثانی کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا لیکن جیسا کہ ظاہر ہے مصرعہ اوّل، ترتیب دیوان گویا میں درج گویا صاحب

...صاحب کے گئے شعر میں موجود ہے۔

میں نے بھائی نند لعل گویا کے شعری مجموعہ میں کئی ایسے مصرعے بھی دیکھے ہیں جو مجموعی طور پر سعدی، حافظ اور مولانا روم کے معلوم ہوتے ہیں بحر و وزن ایک طرف۔ انداز، تخیل اور ترتیب و بندش بھی ویسی ہی ہے ایسے فاضل اور صاحب کمال سخنور کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی دوسرے شاعر کے ثمراتِ جگر کاوی کو ہڑپنے کا خیال بھی دل میں لاسکتا ہوگا۔ یہ بات صاف ہے کہ ان کی شاعری بے اعتنائی کا شکار ہوئی ہے اور ان کے سرمایہ کمال کو محفوظ رکھنے میں تغافل سے کام لیا گیا ہے۔ پھر زمانہ نے بھی اتنی مساعدت نہ کی۔ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد تک فارسی زبان کا سکہ پوری طرح چمک دمک سے رواں رہا، لیکن پنجاب کے اس نامور فرزند کی تخلیقات بدستور گلدستہ طاق نسیاں بنی رہیں۔

۱۹۴۷ء کے ہوشربا ہنگاموں کے دوران بھائی نند لعل گویا کے خاندان سے نسبت رکھنے والے اپنے آبائی شہر ملتان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر حد واہگہ کے اس پار بھائی صاحب کے کلام کے اوراقِ پریشاں کی طرح بکھر گئے۔ ان کے قلمی نسخے اور مستند تصنیفات کی تلاش آسان نہ تھی بہر کیف اس ادبی حادثہ میں امرت سر کی سکھ بک کمیٹی ان کے عقیدت مندوں کے کام آئی۔ اس کی اپیل پر دیوانِ گویا اور زندگی نامہ کے قلمی نسخے اور مطبوعہ کتابیں ان تک پہنچیں، جسے سوسائٹی نے تصنیفات گویا کی صورت میں خاصی محنت اور عرق ریزی کے بعد شائع کیا ہے۔ سوسائٹی نے گورو مہاراج کے دربار کے ملک الشعراء کے سرمایہ کمال کو نابود ہونے سے بچا کر پنجاب، فارسی اور گورو گھر کے پریمیوں کی بلاشبہ گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ لیکن سب سے بڑا اہم کام اس گوہر یک دانہ کے [illegible] کو صحیح شکل میں پیش کرنا ہے۔ انھوں نے غزلیں [illegible] قصیدے بھی، قطعے بھی اور رباعیات بھی۔ ان کی انفرادیت کے [illegible] کرنا ہے کہ [illegible] کا عظیم پنجابی شاعر دنیائے [illegible] آج تک کسی بھی پنجابی ادیب یا شاعر کے سامنے [illegible]

تعجب بالائے تعجب اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ [illegible]

ملک الشعراء کی سوانح حیات کے بارے میں بھی تذکرے خاموش ہیں، ایک آدھ تذکرہ نویس ضرور راوی ہے کہ آپ غزنی کے حاکم علاقے کے میر منشی چھجو رام کے ہاں ۱۶۳۳ء میں تولد ہوئے۔ اور ان کی وفات کے بعد اپنے وطن پنجاب واپس آکر ملتان میں آباد ہوئے۔ یہیں شادی کی اور حاکم ملتان کے دربار میں ملازم ہو کر نائب صوبیداری کے عہدے تک پہنچے۔ لیکن ملازمت راس نہ آئی۔ روحانی تشنگی پیر و مرشد کے دربار میں لے آئی، جہاں بالآخر ملنا کا بے قراری کو قرار آیا اور چشمہ روحانیت سے دل کی تشنگی بجھی۔ مرشد کی محبت ایسی غالب آئی کہ سب کام بیٹوں کو تفویض کر کے ان کے مبارک قدموں میں آ بیٹھے اور فنافی المرشد ہو گئے۔ گورو مہاراج سے ان کا عشق جنون کی حد تک تھا۔ اس کا بین ثبوت یہ اشعار ہیں ۔

دین و دنیا در کمندِ آں پری رخسارِ ما
ہر دو عالم قیمتِ یک تارِ موئے یارِ ما
قدرِ لعل بہ بجز عاشق نداند ہیچ کس
قیمتِ یاقوت داند چشمِ گوہر بارِ ما

ایک اور شعر میں کیا خوب فرمایا ہے ۔

ہر جا کہ دیدہ ایم جمالِ تو دیدہ ایم
ما جز جمالِ دوست تماشہ نمی کنیم

تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ آپ کم و بیش تیس سال مرشدِ کامل کی خدمت میں رہنے کے بعد ان سے اجازت لے کر ملتان آ گئے، اور ۱۷۰۵ء میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

یہ امر باعثِ افسوس ہے کہ پنجاب کے اس دانائے راز کے چمنستان شاعری کی ابھی تک گل بیزی نہیں کی گئی۔ ان کے مخطوطے نایاب ہیں، قلمی دستاویزات اور نسخے کمیاب۔ ان کی تصنیفات جو موجود ہیں، انھیں بھی وسیع حلقہ اشاعت نصیب نہیں۔ تذکرہ نگار ان کی ہستی کے گرد چپ سادھے ہوئے ہیں اور ان کے دروازوں پر دستک دینے والے نہیں ملتے، انقلابات ہیں کہ زمانے کے۔

ویسے اگر بھائی صاحب کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ ان کے اشعار میں سعدی کی سادگی، حافظ کا

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

[illegible] قریشی
[illegible]
لکھنؤ [illegible]

تحریر انجم
معرفت اشتراک وکیل، قاضی پور خورد
گورکھپور۔

شمیم امام آصف
میتھوڈسٹ انگلش اسکول لودی پور
شاہجہاں پور۔

غزلیں

عصر حاضر کے ہر انسان کو پتھر لکھیں
آؤ ہم اپنے زمانے کا مقدر لکھیں

وقت کا کام گزرنا ہے، گزر جاتا ہے
ہم کو تو لکھنا ہے ہم سوچ سمجھ کر لکھیں

اتنے ظالم ہیں مرے دور میں اتنے ظالم
سوچنا پڑتا ہے کس کس کو ستمگر لکھیں

لفظ تاریخ کی پہچان ہوا کرتے ہیں
لکھنا آجائے تو لفظوں کا سمندر لکھیں

حشر کے روز کی مانند ہے ہر روز رشید
جی میں آتا ہے کہ سنسار کو محشر لکھیں

جانے کس موڑ پر آگیا آدمی
پوچھتا ہے خود اپنا پتا آدمی

منزلوں کا تعین ہوا بھی تو کیا
راستوں میں ہی گم ہو گیا آدمی

آ میں اس سے تعارف کرا دوں ترا
تیرے اندر ہے جو دوسرا آدمی

وقت و حالات پر منحصر ہے سبھی
کیا برا آدمی، کیا بھلا آدمی

وقت کے آئینے میں تو دیکھے ذرا
کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا آدمی

اے نئے دور کے جلتے سورج بتا
کھو گیا وہ کہاں چاند سا آدمی

یوں پتا لوگ پوچھے ہیں انجم مرا
جیسے میں شہر کا ہوں نیا آدمی

ہاتھ سے دیوار، سر سے سائباں کو روک لوں
کاش میں احساس کے گرتے مکاں کو روک لوں

راہ میں حائل تھیں میری ان گنت مجبوریاں
جی بہت چاہا کہ جاتے میہماں کو روک لوں

میرے بازو سے زیادہ ہے ہواؤں میں سکت
کس طرح میں خوشبوؤں کے کارواں کو روک لوں

کیا خبر کرنا پڑے اس سے مجھے پھر تصفیہ
بول لینے دوں اسے، اپنی زباں کو روک لوں

میں تو ساحل پر کھڑی اک ریت کی دیوار ہوں
کس طرح بڑھتے ہوئے سیلِ رواں کو روک لوں

اخلاق حسین عارف
۱۵۰ احتشام نگر، پارہ حسن آباد
لکھنؤ - ۲۲۶۰۱۲

اودھ کی تہذیبی میراث اور قومی یک جہتی

فنون لطیفہ میں شاعری، موسیقی اور رقص کو اولیت دی گئی ہے۔ ان فنون نے ہمارے ملک میں قومی یک جہتی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، اردو میں اس ضمن میں بہت بڑا سرمایہ موجود ہے جسے ہمارے مقتدر قلم کاروں نے بڑے خلوص سے تخلیق کیا ہے اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مگر جہاں تک موسیقی اور رقص کا تعلق ہے اس پر نسبتاً کم مواد ملتا ہے۔ اس مضمون میں اس کا مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے، جس سے پتہ چلے گا کہ اس سلسلے میں اودھ کے حکمرانوں نے کیا کردار ادا کیا۔

ہندوستان کی جن عظیم ہستیوں نے ملک کے مختلف مذاہب اور مختلف طبقوں کے افراد کو ایک لڑی میں پرونے کا کام انجام دیا ان میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت امیر خسرو، کبیر داس، سنت سور داس، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خان خاناں، رسکھان اور اسی قبیل کی دیگر برگزیدہ شخصیتیں شامل ہیں۔ ان میں حضرت امیر خسرو نے اپنی نگارشات کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ قومی یک جہتی کا درس دیا بلکہ فن موسیقی کو بھی مالا مال کیا۔ قومی بھجنوں اور ترانوں کے سلسلے میں سوامی ہری داس، بابا رام داس، چاند خاں اور میرا بائی کے نام فراموش نہیں کیے جا سکتے۔

کلاسیکی موسیقی سے قطع نظر بھی ہمارے یہاں کی مستورات مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کے باوجود شادی بیاہ اور دیگر رسموں میں، نیز ہولی اور دسہرہ جیسے عظیم تہواروں کے موقعوں پر ملک کے ہر خطے میں اپنی اپنی زبان میں لوک گیت گاتی ہیں۔ یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے اس ملک میں جاری و ساری ہے۔ جو قومی ایکتا کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

موسیقی کو بارہ سُروں اور مختلف اوزان سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ بارہ برجوں کی اساس پر مبنی ہے۔ سال کے بارہ مہینوں کی اساس بھی شاید اسی پر قائم ہے۔ ان بارہ سُروں اور اوزان یعنی 2 کی تفریق ضروری ہے تاکہ موسیقی میں کارفرما جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کو کلی طور پر سمجھا جا سکے۔

سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ ان ہفت سُروں میں سا اور پا اپنی جگہ قائم رہتے ہیں بقیہ پانچ سُر تیوڑ اور کومل ہوتے ہیں۔ یہ تمام سُر اپنی تخلیق سے اب تک اسی طرح قائم ہیں۔ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ ملک کے تمام علاقوں میں یہی برتے جاتے ہیں جسے قومی یک جہتی کا ایک ستون کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ عہد اکبری میں موسیقی کو بڑا فروغ ملا۔ اس کے دربار کے نو رتنوں میں تان سین اور بیجو باورا استاد الفن گردانے گئے۔ سلاطین بیجاپور اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں بھی اس کی قدردانی ہوئی۔ سلطنت اودھ میں بھی رقص و موسیقی کو بہت بڑھاوا ملا۔ اودھ کے حکمرانوں میں شجاع الدولہ کا نام سب سے پہلے آتا ہے جس کے عہد میں دعوتوں کے موقعوں پر جو جلسے ہوتے تھے ان میں رقص و موسیقی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ شجاع الدولہ موسیقی کے شوقین ہونے کے علاوہ خود بھی اس فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اس لیے ان کے عہد میں نذر فلاذی نے بہت [illegible]
[illegible]
[illegible]

عشرت ظفر
معرفت بیوٹی واچ کمپنی
لال املی کراسنگ سائیکل مارکیٹ
کانپور

ساحر لدھیانوی: نشاط و کرب کا شاعر

جب ہم ساحر کے شعری نگار خانے میں قدم رکھتے ہیں تو ہمارے ذہن کے افق پر دو نقطے طلوع ہوتے ہیں، پھر معاً ایک طلسمی فضا کے زیر اثر یہ دونوں نقطے دو تصویروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پہلی تصویر تو نشاطیہ رنگوں کی آمیزش سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی لہلہاہٹ کا سماں پیش کرتی ہے اور دوسری درد و کرب کی کیفیتوں سے مملو ہوتی ہے۔ نشاطیہ رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر کے ذریعے ساحر کے رومانی مزاج کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے جبکہ کرب کی کیفیات سے لبریز تصویر میں جھانک کر صرف سوز و گداز عشق کو ہی نہیں محسوس کیا جا سکتا بلکہ عصری حسیت کی بھرپور فضا کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

میرے خیال میں ساحر کا رومانی مزاج ہی اس کا اصل شعری مزاج ہے جس کے دوش بدوش عصری کرب بھی اپنے جلوۂ صد رنگ کے ساتھ ساتھ کارفرما ہے۔

ساحر نے ایک جگہ شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ سچی شاعری شخصیت کے اظہار کا نام ہے: جو فنکار اپنے فن کے ساتھ خلوص نہیں برت سکتا وہ سچا فن کار نہیں ہے۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ روحانی استحصال فن کے لیے موت کا سامان ہے۔ اور جب فن کار کا خود سے روحانی و باطنی رشتہ ختم ہو جاتا ہے تو تخلیق فن پر موت کے جیسے کے سائے منڈلانے لگتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہر عظیم فن کار کسی نہ کسی طور پر کسی تحریک سے جڑا ہوتا ہے۔ مگر اس کی ایک انفرادی حیثیت بھی ہوتی ہے۔ ساحر کے یہاں بھی یہی معاملہ ہے۔ ہر چند کہ ترقی پسند تحریک ایک عمدہ چیز تھی جو اس صدی کے اوائل سے خوب پھولی پھلی۔ مگر یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ اس تحریک نے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی انفرادی حیثیت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ساحر کے معاصرین تقریباً سبھی اس تحریک کی کولپیٹ میں آئے لیکن ان میں سے چند نے پھر بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ جب کہ ایک بڑا طبقہ اس ثمر سے محروم ہو گیا اور اپنی انفرادیت کا تحفظ کرنے میں جو فن کار کامیاب رہے انہیں میں ایک نام ساحر کا بھی ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ایک خوش حال اور فعال معاشرے کے تصور سے ذہنوں کو ہمکنار ضرور کیا جو اس تحریک کا ایک مثبت رویہ تھا، مگر اس تحریک کا منفی تاثر بہت مہلک تھا جس نے نوجوانوں کو سرخ انقلاب کے نعروں کے رجحان میں اسیر کر کے ان کے اپنے وجود کی تہوں میں پرورش پانے والی ان ہر دلی سے بڑی حد تک محروم کر دیا جو ایک فرد کی اپنی ذات کا حصہ ہوتی ہیں اور جس کا بہترین پھل تنہائی کا ثمر شیریں ہے جس کی گہرائیوں میں اتر کر فن کار اپنے وجود سے روحانی و باطنی رشتے استوار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ساحر بھی اسی عہد کا شاعر تھا اور اس کے یہاں بھی یہ ضروری تھا کہ ان نعروں کی گونج سنائی دے، مگر میرا خیال ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، جب آپ ساحر کے تخلیقی سمندروں میں غوطہ زنی کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ عصری ضرورت کے زیر اثر یا ایک عوامی ترجمان بننے کے لیے انہوں نے اپنی نظموں میں نعرہ بازی کا انداز اختیار کیا ہے، لیکن اس کی

گویا نقشِ حیرت ہو گئے۔"

نغمہ و موسیقی کے ساتھ ساتھ [illegible] رقص کو جو فروغ حاصل ہوا وہ بھی سلطان عالم واجد علی شاہ کی [illegible] کا رہینِ منت ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں [illegible] پر رقص کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پنجاب میں بھنگڑا، جنوبی ہند میں بھارت ناٹیم، گجرات میں گربا، مہاراشٹر میں [illegible]، آسام میں [illegible]، راجستھان اور اترپردیش میں کتھاکلی، یہ تمام رقص ہندو مسلم تہذیبی سنگم کی ایک مضبوط کڑی ہیں۔

کتھک ہندوستانی رقص کا وہ انداز ہے جو ہندو مسلم تہذیب کے سنگم کی زندہ مثال ہے۔ یہ رقص سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں خاص طور سے پروان چڑھا۔ سری کرشن جی اس رقص کے اہم کردار ہیں اور ہندوستان کے ہر دلعزیز اوتار بھی۔ قرون وسطیٰ میں رام چندر جی اور کرشن جی کی بھکتی کا جذبہ شمال اور جنوب میں یکساں طور سے پایا جاتا تھا۔ ہندوستان بھکتی کا مرکز [illegible] جہاں کے شعرا نے کرشن بھکتی کے نغمے الاپے۔ کتھک رقص کو بھی [illegible] پروان چڑھنا تھا مگر برج کے بجائے اس نے دربار اودھ میں عروج و ارتقا کی منزلیں طے کیں۔

اودھ کے حکمرانوں نے پوشاک و لباس، آداب و اطوار نشست و برخاست، درباری رکھ رکھاؤ اور نظم مجلس وغیرہ میں اپنی راہیں مغل دربار سے علاحدہ متعین کیں۔ انھوں نے کتھک رقص کی پذیرائی کی، جبکہ مغل دربار نے اس سے بے اعتنائی برتی۔

"پنڈت بھیروں دت دریابادی، پنڈت جیو نرائن کی نسل سے تھے، اور پنڈت گوری شنکر کے بیٹے تھے رقص کے علاوہ موسیقی میں بڑے ماہر تھے۔ مردنگ ڈھول بہت اچھی بجاتے تھے۔ لکھنؤ کے اچھے اچھے طبلہ نواز ان کی ڈھول سننے آتے تھے۔ پنڈت جی ڈھول سے ہر ساز کی آواز پیدا کر کے سامعین کو مبہوت کر دیتے تھے۔ موصوف عہد واجد علی شاہ کی یادگار تھے۔"

"[illegible] پرشاد کتھک [illegible]
[illegible]
ساتھ فن موسیقی میں بھی ماہر تھے۔"

کتھک کے مشہور زمانہ فنکار مہاراج [illegible] اور [illegible] بھی عہد واجد علی شاہ میں ہی گزرے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں [illegible] ہندادین نے ناچ کے تمام پہلوؤں کا مظاہرہ کر کے اپنے کو [illegible] ثابت کر دیا۔

سلطان عالم واجد علی شاہ نے رہس اور کتھک کو [illegible] تک پہنچا دیا، اس کی تفصیل میں جانے کی اس مقام پر گنجائش نہیں۔ انھوں نے ہندو مسلم تہذیب ہی کو نہیں بلکہ فارسی اور سنسکرت کی تہذیبی خصوصیات کو سمو کر ہمارے فن اور تہذیب کو ایک نئی شکل عطا کی۔ بادشاہ نے اپنی تین مثنویوں "بحر الفت" "دریائے تعشق" اور "افسانہ عشق" کو رہس کی صورت میں پیش کر کے دلدادگان فن کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان کے رہس کے جلسے قیصر باغ میں واقع حضور باغ اور رحمت منزل وغیرہ میں ہوا کرتے تھے جس میں جوگی کا کردار خود ہی ادا کرتے تھے۔ اس فن کو مقبول عام بنانے میں [illegible] شبہ اگر اس کا چلن عام نہ ہوتا تو امانت کا عوامی ڈرامہ "اندر سبھا" بھی وجود میں آسکتا تھا۔ نہ اس کے بعد اردو میں جو دیگر عوامی ڈرامے لکھے گئے، وہ وجود میں آسکتے تھے۔ رہس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ ایسا ابھرا جسے "رہس دھاری" کہا جانے لگا۔ رہس کا ذکر عہد واجد علی شاہ کے معتبر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔

بادشاہ کے جوگیا بننے کی سالانہ رسم کو ایک عوامی جشن کی صورت دینے کا ذکر بادشاہ نے فارسی میں نظم بند کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"ایک مرتبہ جبکہ [illegible] گھٹائیں گھری ہوئی تھیں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی [illegible] حسین عورتوں کے ہجوم سے پرستان بنا ہوا تھا، اسی عالم میں بادشاہ اس شان سے جوگی بنے کہ جوگیانہ [illegible]

...ہ کمر میں لپٹا ہوا، سچے موتیوں کی راکھ چہرہ پر لگی
...ہ ... اور موتیوں کا کنٹھا گلے میں، سر اگھی
...ہ میں اور "یا ہو" کا نعرہ زبان پر، معشوقۂ خاص اور
...ہ بیگم جوگنیں بنیں۔ ان کی آرائش یہ تھی کہ سبز رنگ
...ی بنارسی چادر زروں کی گاتیاں بدن پر لپٹی ہوئی، سچے
...تیوں کی معطر راکھ چہروں پر ملی ہوئی، سر کے بال
...ھلے ہوئے، گوشوارے اور موتیوں کی لڑیاں چاند سے
...خسا روں پر پڑی ہوئی۔ سازندوں نے طرح طرح کے
...ساز چھیڑے اور مطربوں نے نغمہ کی آواز آسمان تک
...پہنچائی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ ہو، کوئی دل نہ تھا
...جو بے تاب نہ ہو، اتنے میں جوگی جوگنوں کے ہاتھ
...اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے اس ساز اور آواز کے
...عالم میں سے گزرے۔ راگ رنگ ہوا سے برس رہا
...تھا۔ دیکھنے والوں کو ایک پرستان طلسم نظر آرہا تھا۔
بے خودی کا عالم طاری تھا۔ یہ حالت تھی کہ ؎

شجر مست[11]، گل مست، ہر خار مست
زمیں مست، در مست، دیوار مست

یہ مجمع اسی عالم میں پہر دن رہے روانہ ہوا اور شام
کے قریب باغ کے ایک کنج کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا
سحر طراز مغنیوں نے بھیرو کی راگنی اور جھنجھلے میں ناگر کا
یہ خیال گایا اور بجانا شروع کیا ؎
الٹی کر سانورے سے یار کا میں جوگن بھئی رے۔"

"ہندوؤں میں راس لیلا کو مذہبی تقدس حاصل ہے۔[12]
اس لیلا کو جو کوئی عقیدت سے پڑھتا یا سنتا ہے اس کو
بھگوان کی اعلا بھگتی حاصل ہوتی ہے اور وہ نفسانی
خواہشات سے نجات پاجاتا ہے۔"

واجد علی شاہ کے ایجاد کردہ رہس کا یہ پہلو قابل توجہ ہے کہ اس میں جتنے کردار حصہ لیتے تھے انھیں کسی مخصوص عقیدہ یا فکر و نظر کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کرشن، رادھا، گوپیاں، جوگی اور جوگن وغیرہ سبھی یہاں نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لائق توجہ ہے کہ یہ تمام روپ انسانوں کی صورت میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سری کرشن جی اور رادھا کو اردو داں عوام میں مقبول بنانے میں کتھک رقص اور بادشاہ کے ایجاد کردہ رہس کا بہت بڑا ہاتھ ہے

*

شی

...ٹھا ہوا۔ [2] اترا ہوا۔ [3] بڑوں کی مدح۔ [4] گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۲۵۔ [5] لکھنؤ کی تہذیبی میراث صفحہ ۲۶۷ مطبوعہ
[6] تاریخ دریاباد۔ [7] محل خانہ شاہی صفحہ ۵۹ مصنفہ واجد علی شاہ اختر۔ [8] ایک طوائف اچھے صاحب نام جو بیا والی کہلاتی
[9] امراؤ نام جو موہ خانم والی کہلاتی تھی۔ لکھنؤ کا سکندر باغ اسی کے نام سے موسوم ہے۔ محل خانہ شاہی صفحہ ۲۶۔ [10] و [11] عشق نامہ
... ۳۳۰۔ ۳۳۸۔ مصنفہ واجد علی شاہ۔ [12] شری مد بھاگوت گیتا (اردو ایڈیشن) صفحہ ۱۰۸۵

*

رباب رشیدی
[illegible]
شاہجہاں پور

قومی یکجہتی: ہماری تہذیب ہماری روایت

ہمارا عظیم ملک بعض وجوہ کی بنا پر دُنیا میں ایک منفرد و ممتاز مقام رکھتا ہے۔ ہماری ثقافت قوسِ قزح کے رنگوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اور ایک ایسا حسین و دلآویز گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے پھول ایک ساتھ مل کر بہار کا ایک عجب سماں پیش کر رہے ہیں۔ یہ پھول الگ الگ بھی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کی جو شان ہے وہ ہر ہندستانی کے لیے باعثِ مسرت و افتخار ہے۔ مختلف مذاہب، ان گنت فرقے اور انداز فکر، مختلف فلسفے اور عقائد ہندستانی سماج کے سمندر میں چھوٹے بڑے دریاؤں کی طرح شامل ہو کر ہماری تہذیب کو صدیوں سے ایک رشتے میں مربوط کیے ہوئے ہیں۔ اس تنوع نے نہ صرف ہمارے ملک کے شیرازے کو بکھرنے سے بچایا ہے بلکہ پورے سماج کو ایک جاودانی طاقت بھی بخشی ہے اور یہی طاقت ہندستانیت کا عظیم روپ بن کر دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوئی ہے۔ اپنی ہندستانیت ہمیں جان و دل سے پیاری ہے۔ یہی ہندستانیت وقارِ ہمالہ بھی ہے اور آبروئے گنگ و جمن بھی۔ آرزوؤں کا سنگم بھی ہے، بنارس کی صبح اور اودھ کی شام بھی، مالوہ کی شب بھی ہے، لال قلعہ کی سُرخی، قطب مینار کی بلندی، تاج محل کا حسن اور اجنتا کے منظروں کا کیف بھی۔ یہ ہندستانیت پھر تری ہری کی دانشوری اور کالی داس، سور، تلسی، رسکھان، رحیم، جائسی، میر اور غالب کا سرمایہ فن بھی ہے۔ اسی ہندستانیت کا ترانہ اقبال نے گایا، ٹیگور نے اسی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنے نغمات کو ڈھالا۔ لیکن کبھی کبھی اس ہندستانیت پر سازش کی مکڑیاں جالا بننے لگتی ہیں، نفرت کے جھونکے اس کے خدوخال بگاڑنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، تو ہم کانپ اُٹھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہماری تاریخ بگاڑی گئی، یہ سچ ہے کہ ہمارے دلوں میں نفرت کے بیج بوئے گئے اور یہ بھی درست ہے کہ مختلف ذرائع اور مختلف عنوانوں سے ہم کو بکھیرنے کی منظم سازشیں کی گئیں۔ مگر اب جب کہ حقائق روزِ روشن کی طرح سامنے ہیں اور ساری سازشیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہندستان کی عظمت، ہندستان کی طاقت یہی ہے کہ سب سچے ہندستانی بن جائیں اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہیں۔ ایشیا میں ہندستان کی جو حیثیت ہے اسے بعض طاقتیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ اندرونی خلفشار میں اس کو اُلجھا کر آگے بڑھنے سے روک دیا جائے اس سلسلے میں ہر ذریعہ کام میں لایا جا رہا ہے۔ چنانچہ آج قومی یکجہتی وقت کی سب سے بڑی پکار ہے۔ اسی لیے آج ہمارے فرائض بھی کچھ بڑھ گئے ہیں۔ وقت، حالات، تاریخ سب کا تقاضا ہے کہ مل جل کر رہیں ایک ہو کر رہیں۔ جب تک ایک قومی دھارا نہ ہو گا ملک کسی طرح آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ساری زبانیں جو ملک کے طول و عرض میں بولی جاتی ہیں ان کو باقی رکھنا اور ان کی بقا کے لیے پوری کوشش کرنا بھی ہر ہندستانی کا فرض ہے۔ ادب کائی ہے اور زبانیں اس کا اظہار۔ جب ہندستانی ادب کی بات ہوتی ہے۔ بنگالی، تلگو، تامل، سندھی، گجراتی، اُردو، ہندی، غرض کہ ساری زبانوں میں محفوظ سرمایہ ذکر مقصود ہوتا ہے۔

دہلی میں ضلع بارہ بنکی کے باشندوں کی ایک شمالی بستی ہے [illegible] افراد پر مشتمل یہ بستی لال قلعہ کے قریب دریائے جمنا کے ساحل پر آباد ہے۔ ان کا پیشہ ڈھولک سازی ہے۔ ڈھولک خاندانوں میں اکثریت

مسلمانوں کی ہے لیکن ان میں ۱۵ فیصد ہندوؤں کے بھی ہیں۔ یہ لوگ معمولی جھگیوں میں رہتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں تین چار ماہ کے لیے یہ لوگ اپنے آبائی وطن بارہ بنکی چلے آتے ہیں۔ یہ مسلمان اور ہندو ایک ہی چولھے پر کھانا پکاتے ہیں اور ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا کبھی فرقہ وارانہ کشیدگی کی بنا پر ان کے تعلقات خراب ہوئے تو ایک بوڑھے نے جواب دیا کہ مذہب کے نام پر لڑنا جھگڑنا تعلیم یافتہ لوگوں کا کام ہے۔ یہ ہم لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ ہمیشہ پیار محبت سے رہتے آئے ہیں۔ کاش یہ جذبہ، یہ ماحول پورے ملک میں ہر بستی اور ہر قریہ میں پھیل جائے۔

جہاں تک ہماری ریاست اترپردیش کی حکومت کا تعلق ہے تو وہ بھی اس سلسلے میں انتہائی خلوص سے کام کر رہی ہے۔ وزیر اعلا کی سربراہی میں ایک ریاستی قومی یکجہتی کمیٹی سرگرم عمل ہے۔ ضلع قومی یکجہتی کمیٹیاں اور ترقیاتی بلاک نیز تھانہ کی سطح پر بھی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔ قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے جو غیر سرکاری رجسٹرڈ ادارے کام کر رہے ہیں ان کی امداد کا بندوبست بھی ہماری ریاستی سرکار نے کیا ہے۔ شمال اور جنوب کے درمیان لسانی ہم آہنگی قائم کرنے کی غرض سے ریاست کے آٹھ مقامات پر جنوبی ہند کی زبانوں کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ ✱✱

نواب صدر یار جنگ مرحوم

صفحہ ۲۱ کا بقیہ

موٹریں، ہاتھی، گھوڑے، باوردی سپاہی اور سوار، خدمت گاروں کی ایک فوج، غرضیکہ نوابی اور رئیسانہ شان میں بڑی آن بان تھی۔ خود بہترین لباس پہنتے ہی تھے اہلِ خاندان کو بھی اچھے اور عمدہ لباس میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اگر کوئی معمولی لباس پہنتا تو ناگوار گزرتا۔ ان کا خیال تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے تو اس کا استعمال نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے اور اس کی ناشکری ہے۔

نواب صاحب کو شعر و شاعری سے بھی شوق تھا۔ فارسی اور اردو میں کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

شرابِ ناب کے جلوے نگاہِ ناز پہ قرباں!
ابھی سوتے سے آنکھ اس فتنۂ دوراں نے کھولی ہے

یہ شعر حسنِ تغزل، مضمون آفرینی، اور ندرتِ خیال کا ایک اچھوتا نمونہ ہے بزرگوں کی وہ قدریں جو کتابوں میں ملتی ہیں یا بزرگوں سے نسل بعد نسل تک پہنچتی ہیں، نواب صاحب کے اندر دیکھنے کو ملیں۔ ان کی شخصیت نہ صرف علمی اور ادبی شخصیت تھی بلکہ وضعداری، شریف النفسی اور پرہیزگاری کا ایک بے مثال نمونہ تھی۔

نند لعل گویا

صفحہ ۳۲ کا بقیہ

بانکپن اور خسرو کی علمیت کا ملغوبہ ہے۔

اب بھی ان کے نثری اور شعری مجموعوں کے تراجم کیے جا سکتے ہیں اور مطبوعہ کلام کی چھان بین کر کے انھیں دنیائے فارسی سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اہلِ ذوق خصوصاً پنجابی اسے اپنا خوش گوار فریضہ خیال کریں۔

بھائی نند لعل گویا جیسے سحر بیان بار بار جنم نہیں لیتے۔ فارسی ہندستان کے منظر سے برق رفتاری سے اوجھل ہو رہی ہے اور اس عظیم شاعر کے تمام تر سرمایۂ کمال کے فنا ہونے کے آثار نمایاں ہیں۔ اسے کس طرح محفوظ رکھا جائے، یہ بات یہاں کے ادبی حلقوں کے لیے ایک بڑا اہم سوال بنی ہوئی ہے۔

نسیم اختر صدیقی
مصاحب گنج نگریا
لکھنؤ ریا

رُباعیات

شبنم سے شگوفے نے جو یہ فرمایا
اس عمر میں کیا کھویا ہے اور کیا پایا
شبنم نے کہا چشمِ بصیرت ہو تو دیکھ
دھوپ آگے ہے اور دھوپ کے پیچھے سایا

بچو! کبھی آپس میں نہ اَن بن رکھنا
خوداب اب وجد کا یہ گلشن رکھنا
بھٹکیں نہ اندھیروں میں نئی نسل کے لوگ
سورج مری تخلیق کے روشن رکھنا

جنت سے ہوا مشک بداماں آئی
سوئے چمنِ دہر گل افشاں آئی
جاری ہوا فرمانِ اجل زیست کے نام
گویا تنِ بے جان میں اب جاں آئی

جس وقت مرے پاس زر و مال نہ تھا
ابتر تھا مرا حال میں خوشحال نہ تھا
آزاد فضا تھی مری جولاں گہہِ فکر
میں قیدیٔ زندانِ مہ و سال نہ تھا

خواجہ توصیف

پل دو پل

سکھ کی گھڑیاں بیت گئیں دکھ سہنا ہے
کب تک سونی راہوں میں بھٹکے گا من
کب تک کانٹے رُتوں کے چنتے جاؤ گے
کب تک بیتی یادوں سے من بہلاؤ گے
کب تک آشاؤں کے دیپ جلاؤ گے

تم بھی تنہا من بھی تنہا
اس پیڑا کا انت نہیں ہے
پل دو پل خوشیوں کے سپنے
بچوں کے بہلاوے ہیں
ان بے کار کھلونوں سے کب تک کھیلو گے

دکھ تو دکھ ہے
سکھ بھی تو دکھ ہی دیتا ہے
آنسو اور مسکان بھی پل دو پل ہے
تنہائی کی رات بھی اب کٹنے والی ہے
بیت گیا سو بیت گیا
جو ہوگا دیکھا جائے گا —!

شافع قدوائی
قومی آواز لکھنؤ

غزل

کس کی آنکھوں سے غزل کو یہ اشارے ہو گئے
ریت، چہرہ، دھوپ، موسم استعارے ہو گئے

سبز رُتوں کی ردا جب آندھیوں نے چھین لی
خود بخود افشا شجر کے راز سارے ہو گئے

آئے تھے ہم موجِ سمندر سے الجھنے کو مگر
کاغذی کشتی بہا کر بس کنارے ہو گئے

کس نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا تھا رات کو
خواب آنکھوں میں سجا لو ہم تمہارے ہو گئے

وہ پرندوں کی طرح اڑتا گیا شافع مگر
آتے جاتے موسموں کے دکھ ہمارے ہو گئے

سال ۸۴-۱۹۸۳ء کا ریاستی بجٹ

چند اہم خصوصیات

اترپردیش میں آئندہ سال یعنی ۸۴-۱۹۸۳ء کے سالانہ منصوبہ کے لیے ۱۳۰۵ کروڑ روپے کی سب سے زیادہ رقم کے علاوہ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لوگوں کی ترقی سے متعلق کاموں کے لیے ۲۵ کروڑ روپے کی مرکزی امداد متوقع ہے۔ پہاڑی علاقوں میں ترقیاتی کاموں پر آئندہ مالی سال میں ۱۴۰ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جائے گی۔ سالانہ منصوبے کا زیادہ حصہ بجلی، آبپاشی اور آمد و رفت کے وسائل کے "سدھار"، پسماندہ اور غریب طبقوں کی ترقی سے متعلق کاموں پر خرچ کیا جائے گا۔ اس سال ضلع سیکٹر کی اسکیموں کے لیے ۲۸۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے جس میں سے تقریباً ۶۰ کروڑ روپے پہاڑی علاقہ کے ضلع سیکٹر کی اسکیموں کے لیے ہیں۔

★ —— ریاست میں ۲۰ نکاتی پروگرام کو اور زیادہ موثر طور پر عملی شکل دینے کی غرض سے دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی سے متعلق پروگرام کے تحت ۴۵۰۰ قلت زدہ مواضعات میں پینے کے پانی کی سہولت مہیا کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ۳۵۰۰ مواضعات کی بجلی کاری کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ شجرکاری کا نشانہ تقریباً دوگنا کرکے ۲۳ کروڑ سے بھی زیادہ کر دیا گیا ہے۔ خاندانی بہبود پروگرام کے تحت آئندہ سال ۲۰ر۶ لاکھ نس بندیوں کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

★ —— زرعی پیداوار کا نشانہ گزشتہ سال سے ۱۴ لاکھ ٹن زیادہ یعنی ۲۳۰ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ تلہن کی کاشت کا نشانہ ۲۳ لاکھ ٹن رکھا گیا ہے۔

زرعی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے امداد باہمی بینک کے ذریعے ۲۵۰ کروڑ روپے کے قلیل مدتی قرضے اور امداد باہمی ترقی آراضی بینک کے ذریعہ ۷۰ کروڑ روپے کے طویل مدتی قرضے تقسیم کیے جائیں گے اس کے علاوہ ۳۰۰ کروڑ روپے کی مالیت کی کیمیاوی کھاد تقسیم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ٹیوب ویلوں کے رکھ رکھاؤ پر خرچ کی جانے والی رقم کی حد بڑھا کر فی ٹیوب ویل تین ہزار روپے سالانہ کر دی گئی ہے۔

★ —— ریاست کے مختلف اضلاع میں توانائی کامپلکس قائم کیے جائیں گے۔

بامبے ہائی اور ساؤتھ بیسن سے حاصل ہونے والی قدرتی گیس پر مبنی کیمیاوی کھاد کے چار کارخانے بریلی میں آنولہ، بدایوں میں ببرالہ، سلطان پور میں جگدیش پور اور شاہجہاں پور میں قائم کیے جائیں گے۔

پوڑی گڑھوال میں بھارت الیکٹرانکس کی جانب سے دفاعی ساز و سامان تیار کرنے کے لیے ایک کارخانہ قائم کیا جائے گا۔

ہندوستان فوٹو فلم کی جانب سے الموڑہ میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی تجویز ہے۔ دہرہ دون میں سوئس کمپنی کے تعاون سے چھوٹے پیمانہ پر گھڑیاں تیار کرنے کی کل ہند ایسوسی ایشن تقریباً ۴۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک کارخانہ قائم کرے گی۔ آئل انڈسٹریز ڈیولپمنٹ بورڈ ۸۵۰ کروڑ روپے کی لاگت سے علی گڑھ میں ایرومیٹک کامپلکس قائم کرے گا۔ عوامی اور امداد باہمی زمروں کی ۱۲ میں سے سات کھنڈسالی ملوں میں بجٹ سال کے آخر تک پیداوار شروع ہو جائے گی۔

ریاست کے ہر ترقیاتی بلاک میں مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم

کے تحت ۱۰ چھوٹے صنعتی واحدے قائم کرنے اور ٹرائی سم اسکیم کے تحت ۲۵،۲۰۰ افراد کو تربیت دینے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

اتر پردیش ریاستی کھادی و دیہی صنعتی بورڈ ہر ترقیاتی بلاک میں ۵۰ گھریلو صنعتیں قائم کرنے کے لیے آسان شرطوں پر قرضہ دے گا۔

وارانسی میں ریشم ترقیاتی اسکیم شروع کی جا رہی ہے جس کے تحت پانچ ہزار کرگھوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کیا جائے گا۔

* ـــــ بجٹ سال میں ۵ نئے فلاحی مزدور مراکز قائم کرنے کی تجویز ہے مزدور قوانین کے تحت پانچ نئے لیبر دفتر قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔

تین امداد باہمی شکر ملیں سال ۸۳-۱۹۸۲ء سے پیداوار شروع کر دیں گی۔ اس کے علاوہ دو شکر ملوں کی توسیع کا کام اسی سال مکمل ہو جائے گا۔ سمپورن نگر (لکھیم پور) اور پورن پور (پیلی بھیت) میں بھی امداد باہمی شکر ملیں قائم کی جائیں گی۔

ریاست میں تین نئی ڈسٹلریاں قائم کی جا رہی ہیں۔ کھانڈسار یوں پر موجودہ پیرائی سیزن میں لیوی نہیں عائد کی جائے گی۔

* ـــــ سڑکوں اور پلوں کے لیے ۷۹ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کے مقررہ اخراجات میں سے تقریباً ۴۶ کروڑ روپے کی رقم ضلع سیکٹر کے تحت دیہی علاقوں کی سڑکوں کے لیے مختص کی گئی ہے۔ ریاستی زمرہ میں ۱۱۸۰ کیلو میٹر لمبی نئی سڑکوں کی تعمیر، ۵۰۰ کیلو میٹر موجودہ سڑکوں کے سدھار اور نو تعمیر نیز ۵۴ نئے پلوں کی تعمیر کی تجویز ہے۔ ریاست میں آئندہ سال جن اہم پلوں کی تعمیر مکمل ہو جانے کی توقع ہے ان میں ضلع الٰہ آباد میں ٹونس ضلع بارہ بنکی میں گھاگھرا، ضلع رائے بریلی میں سئی، ضلع پیلی بھیت میں دیوہا اور ضلع جون پور میں سئی ندی پر تعمیر ہونے والے پل شامل ہیں۔

شہر لکھنؤ کی رنگ روڈ کے اہم حصے کے تعمیراتی کام کی تکمیل آئندہ سال متوقع ہے۔

* ـــــ دیہی علاقوں میں ۳۹۳ نئے ابتدائی صحت مرکز اور ۱۹۲۵ نئے ذیلی صحت مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔ دیہی علاقوں میں ۱۴۵ معاون صحت مرکز، ۲۳ نئے ایلوپیتھک اسپتال، ۱۰۰ آیورویدک اور یونانی اسپتال نیز ۲۵ نئے ہومیوپیتھک اسپتال قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ضلع اور دیگر سرکاری ایلوپیتھک اسپتالوں میں مریضوں کے مزید ۲۰۰ پلنگوں کا اضافہ کیا جائے گا۔

* ـــــ بجٹ سال میں ۱۲۲۱ پرائمری اور ۱۲۰ مڈل اسکول کھولے جائیں گے اور ۲۳۶۰ پرائمری اور ۱۸۰ مڈل اسکولوں کے لیے عمارتیں تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

کمزور طبقے کے بچوں کے لیے ۱۱،۷۳۲ اسکولوں میں کتب بینک قائم کرنے اور ۴۹،۶۱۰ بچوں کو پوشاک مہیا کرنے کی تجویز بھی ہے۔

جولائی ۱۹۸۳ء میں جلیسر (ایٹہ) اور دیوچند (سہارن پور) میں ڈگری کالج قائم کیے جائیں گے۔ امداد یافتہ ہائر سکنڈری اسکولوں کی پنشن اسکیم کے تحت پنشن پانے والوں اور امداد یافتہ تعلیمی اداروں کی پنشن اسکیم کے تحت پنشن پانے والوں کو مستقبل میں پنشن پر راحت کی قسطیں اسی تاریخ اور شرح سے دی جائیں گی جس تاریخ اور شرح سے سرکاری پنشنروں کو دی جاتی ہیں۔

لکھنؤ میں پوسٹ گریجویشن اور گریجویشن کی سطح پر انجینئرنگ ٹکنالوجی کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی تجویز ہے۔ لکھنؤ میں حکومت کے زیر اہتمام ایک انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ قائم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

ریاست کے ۱۸ اضلاع میں جہاں ڈپلوما سطح کی تکنیکی تعلیم کی سہولت دستیاب نہیں ہے، نئے پالی ٹیکنک قائم کرنے کی تجویز ہے۔ سائنس نیز ماحولیاتی تکنیکی کونسل کی جانب سے ایک پلینیٹیریم، اسپیس میوزیم اور ایک سائنس و ٹکنالوجی میوزیم قائم کرنے کی تجویز ہے۔

* ـــــ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے افراد پر ہونے والے مظالم کے باعث ان میں سے کسی کے فوت ہو جانے پر دی جانے والی امدادی رقم بڑھا کر دس ہزار روپیہ کر دی گئی ہے اور اس امداد کے لیے آمدنی والے اور بغیر آمدنی والے کی تفریق ختم کر دی گئی ہے۔ جسمانی اعتبار سے مستقل معذوری کی صورت میں مالی امداد ایک ہزار روپیہ سے بڑھا کر دس ہزار روپیہ کر دی گئی ہے۔ مظالم کا شکار ہونے والے خاندانوں کی بحالی کے لیے ایک اسکیم کے تحت روزگار کے لیے مالی امداد دی جائے گی۔ اقوام مندرجہ

سر کے دیوار کی طرح حائل ہوتے گئے، اور وہ اپنی پچھلی دنیا سے دُور ہوتی
چلی گئی۔ مسکراتی ذہین آنکھوں پر چشمہ لگ گیا۔ سنجیدگی میں اضافہ یوں
ہوا کہ کنپٹی پر جھولنے والی بالوں کی شریر لٹ خود بخود سفید ہوتی گئی۔ اب وہ
اپنے کالج کی پرنسپل تھی ۔ ذمہ دار اور منتظم۔ اعلا تعلیم یافتہ۔ آئے دن
میٹنگوں میں جاتی۔ سیمینار میں تقریریں کرتی۔ گرلس کالج میں اسکول ڈے
پر جب وہ انعامات بانٹتی تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی اوشا ہے
جس نے اپنی ضدوں اور شرارتوں سے پورے گھر کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔
وہ مارچ کی ایک شام تھی جب وہ آنگن میں اماں سے اپنے کسی
نئے جوڑے کے لیے ضد کر رہی تھی کہ اس کے بڑے بھائی ستیش کے
ساتھ اجے نے پہلی بار اس کے گھر میں قدم رکھا تھا۔ نہ اس کے گھنگھریالے
بال اس کے ماتھے پر پڑے تھے اور نہ ہی وہ سفید کھلے گلے کی قمیص پہنے
تھا اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ تھا۔ اس نے ماں کو تو
دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا تھا مگر اس کی طرف شاید دیکھا بھی نہیں۔
اس کی آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی تھیں اور وہ ستیش بھیا سے بڑے
زور و شور سے کوئی بحث کر رہا تھا ـــــ بڑا اول جلول سا لگ رہا تھا۔
ـــــ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے قطعی مختلف ـــ شاید اسی
لیے اُسی پل وہ اوشا کو بہت اچھا لگا ـــــ اسی شام بھیّا
نے بتایا تھا کہ اجے نے اسی سال انجینیرنگ کالج میں داخلہ لیا ہے۔
اس کے پتا الٰہ آباد میں سرکاری عمارتوں کے ٹھیکیدار ہیں۔ یہاں ہاسٹل
میں رہتا ہے ـــــ ہاسٹل میں دل نہیں لگتا ہے ـ ۔ اور پھر
اوشا کے گھر میں اس کا دل لگتا ہی گیا ـــــ اور اوشا کو معلوم ہی
نہ ہو سکا کہ وہ کب اس کے اتنے قریب آ گیا۔ ۔ کاش کہ اماں اور بابا
کو اپنی بیٹی پر اتنا اعتماد نہ ہوتا اور انھوں نے اجے کو پہلے ہی دن اپنے
گھر آنے سے روک دیا ہوتا تو آج وہ اتنی اکیلی نہ ہوتی ـــــ اوشا
نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے پچھتاوے کے ساتھ سوچا۔
یادوں کو جھٹکنے کے لیے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی
چھٹی ہونے میں آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ تھا۔ دھوپ سبزے سے
اُٹھ کر دیواروں پر جا بیٹھی تھی۔ آج تو گھر جاتے ہوئے بھی ڈر سا لگ رہا
تھا۔ رشمی مہتہ نے اس کے کالج میں کل داخلہ لیا تھا اور کل داخلہ
لینے والی لڑکیوں کے نام آج ہی اس کے سامنے آ گئے تھے۔
سے کالج کی طرف آتی ہوئی لڑکیوں کا جھنڈ تو اس نے بھی دیکھا
کاش کہ ان نئی لڑکیوں میں کوئی اوشا کو بتا سکتا کہ اجے کی
کون سی ہے ۔ اجے کے گھنے سیاہ بال اور روشن آنکھیں
اوشا آج بھی پہچان سکتی ہے ۔ اس کا لانبا ڈیل ڈول ا
ہونٹ اوشا کو اچھی طرح یاد ہیں۔ اگر رشمی اجے جیسی ہو
ہزاروں میں پہچان لے گی ۔ اوشا نے بڑی ہمت سے سوچا
وہ اپنی ماں جیسی ہوئی ـ کیسی ہوگی اجے کی بیوی ـ ؟ اجے
وہ خوش نصیب عورت جسے وہ سب کچھ مل گیا جس کے
کی زندگی رو کھی پھیکی اور بے جان ہے۔ کیا وہ میرے بارے
جانتی ہوگی ، یا اجے نے اس سے وہ سب چھپا لیا ہوگا جسے
کے لیے اس وقت اس کے دل میں ایک طوفان لہریں ما
کہیں ایسا تو نہیں کہ اس عورت نے رشمی کو اس کالج میں
بھیجا ہو کہ اوشا دیکھ لے کہ وہ اس سے کتنا ہار چکی ہے
شکست کا احساس آنسو کا گولہ بن کر اوشا کے حلق میں آ
کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اجے نے اپنی بیوی سے کچھ نہ
اجے کا نڈر اور بیباک انداز، ہر بات کو کھلے دل سے کہ
ہی شاید اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں جز تھا۔ کسی سے
ہونا یا تکلف برتنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا ـ ۔۔ ا
سے لوٹ کر اس نے ستیش اور اوشا کے بیچ بیٹھ کر باتیں
بڑی سادہ لوحی سے کہا تھا کہ میں نے اماں سے کہہ دیا ہے
ہی سے شادی کروں گا ـــــ اس کے سرسری انداز پر
ستیش کے ساتھ وہ اس طرح ہنس پڑی تھی جیسے وہ ا
کسی اور کی بات ہو۔ کاش کہ یہ بات سچ میں کسی اور کی ہو
لے یہ سوچا ہی تھا کہ ٹیچرس کا ایک گروپ کمرے میں داخل
اس کے خیالات کی رو کا رشتہ پھر اپنے ماحول سے۔
چھٹی کا گھنٹہ بج چکا تھا ـــ چہرے پر مسکراہٹ لیے اپ
میں سب کا شکریہ ادا کرتی ہوئی وہ سب کے ساتھ آ
آ گئی ـ اسے بڑا افسوس تھا کہ آج اس نے کوئی کام ا

... یہ جینی نے ... ہو ... بار بار اسے پریشان رکھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اجے کے لیے وہ آج بھی اسی طرح بے قرار ہے اس کی ... ہے۔ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہو کر بھی اجے نے اوشا سے اس کے ... کے لیے کتنی خوشامدیں کی تھیں۔ اوشا کی یادوں میں آج بھی وہ منظر پرانا نہیں ہوا تھا جب ایک صبح دہلی میں اجے کو سفید موٹر میں اس نے اپنے ہاسٹل کے باہر دیکھا تھا۔

بابا کی موت کے بعد پہلی بار اجے کو سامنے دیکھ کر اس کے سارے غم جاگ اٹھے تھے۔ دل چاہا تھا کہ دوڑ کر اجے کے کاندھے پر سر رکھ دے اور اپنا سارا دکھ اس پر انڈیل دے جسے سُنانے لائق کوئی نہ تھا۔ کیونکہ جب بابا کا دیہانت ہوا تھا، اجے ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا۔ مگر اوشا نے ہمیشہ کی طرح ایک بناوٹی بردباری لاد کر اجے سے بات کی۔ اجے نے وہیں موٹر میں بیٹھ کر اوشا کو اپنا پروگرام بتایا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ اوشا کے بغیر دامن پھاڑ کر جنگل میں تو نہ جا پائے گا مگر اس زندگی بھر ادھورا ضرور رہے گا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے علمی کیریئر میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے گا۔ مگر اس کے کسی بہلاوے کی کنجی اس کے ... تالے کو نہ کھول سکی ——— اس کا کیریئر جو اس کے بابا کا خواب تھا، بار بار سامنے آجاتا ——— اور اوشا کو لگتا کہ اب میں وہ اوشا نہیں جو تھی اور ماں بن کر گرہستی کے بوجھ کو اٹھا سکوں ——— اجے نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اوشا کی ہاں یا نہ ہی اس کی تقدیر ہے کیونکہ ماں اس کو شادی کے بغیر امریکہ واپس نہ جانے دے گی ——— دونوں سارا دن گھومتے پھرتے رہے۔ اجے کے جانے کے بعد وہ شام اوشا نے روتے روتے کاٹ دی۔

اس شام کے بعد اوشا نے اجے سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ نئے سال پر اوشا کے نام اجے کے کارڈ پابندی سے آتے رہے اور دو ایک روز میز پر سجے رہنے کے بعد بڑی احتیاط سے ایک لفافے میں محفوظ ہو جاتے ——— یہاں تک کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے جب وہ ملک کے باہر گئی تو وہاں بھی اجے کے کارڈ ملتے رہے تھے ——— مگر پیار میں بھی پرانی ہو گئیں ——— پچھلے سات آٹھ سال سے اُسے اجے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ہر نیا سال یہ دُکھ لے کر آتا کہ آخر اجے اسے بھول گیا ——— اس کے کارڈ کے بغیر اس کی میز ہی نہیں دل کی دُنیا بھی ویران ہی رہتی ——— کاش کہ اجے کو اس نے نہ ٹھکرایا ہوتا۔ کیا مل گیا ان ڈگریوں سے۔ اس عزت اور شہرت کے پیچھے تنہائی اور دکھ کا ناگ سویا ہوا تھا جو آج صرف ایک نام ——— رشمی مہتہ کی چوٹ سے اس طرح پھن پھیلا کر جاگ اٹھا کہ بھاگنے اور منہ چھپانے کے لیے کوئی راستہ ہی نہ رہا ——— اور پھر بہت سوچ وچار کے بعد ہار کر اس نے اپنا ہاتھ اس ناگ کے آگے رکھ دیا۔ اسی لیے صبح جب وہ اٹھی تو اپنے فیصلے کی بدولت تازہ دم تھی ———

آفس پہنچتے ہی۔ کلاسز شروع ہونے سے پہلے اس نے چپراسی کو ہاسٹل بھیجا کہ الہ آباد سے آئی ہوئی نئی لڑکی رشمی مہتہ کو فوراً آفس میں بلا لائے ——— احتیاطاً ایک پرچے پر رشمی مہتہ لکھ بھی دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چپراسی غلطی سے کسی اور لڑکی کو بلا لائے ——— انتظار کا یہ وقفہ بڑی مشکل سے گزرا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ رشمی مہتہ سے نہیں اجے مہتہ سے ملنے جا رہی ہو ——— گھبرائی ہوئی اور ڈری ہوئی ایک معصوم سی لڑکی پرنسپل کے اچانک بلاوے پر جب آفس پہنچی تو اس کی سانس پھول رہی تھی ——— اوشا کو ایک نظر میں ہی رشمی بہت پیاری لگی ——— اس کی بات چیت میں اجے جیسی سادگی اور بھولا پن تھا۔ رشمی نے بی۔ اے کے پہلے سال میں داخلہ لیا تھا۔

"کیا کرتے ہیں تمھارے فادر۔؟

"انجینیر ہیں۔"

کتنے بھائی بہن ہیں تمھارے۔"؟

"دو۔ ایک میں ایک میرا بھائی۔"

(کتنا بھرا پُرا گھر ہوگا ——— اس خوش نصیب عورت کا)

"کون کون سے سبجکٹ ہیں تمھارے"؟

"اکنامکس۔ انگلش اور ہسٹری۔"

اوشا اب آگے کوئی سوال کرنے کے قابل نہ رہی ——— یہی سبجکٹ بی۔ اے میں اوشا کے بھی تھے ——— یہ خیال بجلی بن کر اس کے دل میں کوندا کہ کیا اجے اپنی بیٹی میں اپنی آئیڈیل اوشا کو

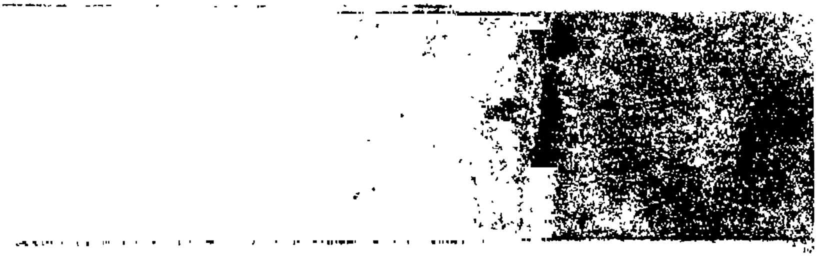
Urdu Monthly

NAYA DAUR

Vol. 37 No. 11
FEBRUARY 1983
50 paisa

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

REGD No.LW NP 12
Annual Subs
Rs. 5.





کی سیرت کا ایک عجیب و غریب اور دلچسپ پہلو یہ تھا کہ یوں تو وہ ہر طرح کی چھوٹی بڑی بات ہر گھر میں پہنچایا کرتی تھیں لیکن بعض لڑکوں اور لڑکیوں کی بڑی بڑی شرارتیں اور راز اپنے سینے میں دفن کر لیتیں اور کبھی زبان پر نہ لاتیں۔

ان کے میاں کو لوگ بابا کے نام سے پکارتے تھے بابا اور ٹیلی ویژن چاچی میں ہر روز جھگڑا ہوتا تھا۔ شام کے وقت تمام کام کاج سے فارغ ہو کر دونوں اپنے دروازے کے کنوئیں پر بیٹھ جاتے اور خوب ایک دوسرے کو کوستے اور گالیاں دیتے۔ بابا ہر روز کہتے "میں تجھے طلاق دے دوں گا شیطان کی اولاد۔ اب میں تجھے اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گا" اس پر ٹیلی ویژن چاچی بھی موٹی سی گالی دے کر کہتیں۔ "مائی ملے؟ خدا کی قسم اب میں تیرے ساتھ نہیں رہوں گی" کبھی کبھی اس کنوئیں میں گرنے کے فیصلے سے بھی آگاہ کرتیں لیکن پھر کسی وجہ سے ارادہ ملتوی کر دیتیں۔ حالانکہ بابا کبھی انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ غرضیکہ ہر روز طلاق ہوتی اور ہر روز خود بخود صلح بھی ہو جاتی۔ گاؤں کے لوگ یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ نوجوان تو اکثر ان کے مکالموں اور ان کے انداز کی نقل بھی اتارا کرتے تھے۔

گاؤں سے جب بھی کوئی لڑکی اپنی سسرال جاتی یا کوئی مرد نوکری پر پردیس جاتا تو ٹیلی ویژن چاچی اس موقع پر ضرور براجمان ہوتیں خوب خوب دعائیں دیتیں اور بلائیں لیتیں۔ ہر روز انھیں چھیڑنے والے اور ان کی گالیاں سننے والے ایسے موقعوں پر اکثر اشکبار ہو جاتے۔ دراصل ٹیلی ویژن چاچی پورے گاؤں کے جذبات کی ترجمانی کرتیں۔

پردیس جانے والے ان کی گالیوں اور دعاؤں کی سوغات اپنے ساتھ لے جاتے۔ کسی کے سر یا پیٹ میں درد ہوتا.... تو فوراً وہ "کسی آسیب" کی نشاندہی کرتیں اور کسی مولوی یا "اوجھا" کو بلانے کی سفارش کرتیں بلکہ کبھی کبھی خود بلا لاتیں۔

میں جب انھیں ٹیلی ویژن چاچی کہتا تو وہ ہنس کر کہتیں "چل ہٹ تو بھی گاؤں کے لڑکوں کی صحبت میں خراب ہو گیا تو پڑھا لکھا ہے شہر میں رہتا ہے" ــــ میں کہتا "لیکن شہر میں ایسی ٹیلی ویژن چاچی کہاں ہے جس کی گالیاں سن سکوں۔ میں تو تیری گالیاں سننے آتا ہوں۔ اس پر ٹیلی ویژن چاچی بلائیں لیتیں اور کہتیں ــــ "خدا تجھے خوش رکھے میری خواہش ہے کہ تجھے اچھی سی نوکری مل جائے"

پھر ایسا ہوا کہ ان کی دعاؤں سے مجھے نوکری مل گئی اور یہ بھی ایک حسین اتفاق تھا کہ مجھے ٹیلی ویژن ہی کے محکمے میں نوکری ملی۔ جب میں گاؤں گیا تو میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی وہ براجمان ہو چکی تھیں، مجھے دیکھتے ہی بولیں "کیوں رے؟ تو تو مجھے ٹیلی ویژن چاچی کہتا تھا لے اب تو ہی ٹیلی ویژن ہو گیا" میں نے کہا "ہاں چاچی! یہ سب تیری دعاؤں کے طفیل ہوا"

"اے تیرے منہ میں گھی شکر۔ خدا تجھے سلامت رکھے اس خوشی میں میں تجھ سے ساڑی لوں گی" وہ بولیں۔

میں نے کہا "چاچی! ایک کیا تیرے اوپر سے تو سینکڑوں ساڑیاں نچھاور کی جا سکتی ہیں۔" ٹیلی ویژن چاچی آبدیدہ ہو کر بولیں ــــ "خدا تیری عمر دراز کرے، یہ بتا اب اپنے گاؤں میں ٹیلی ویژن کب آئے گا۔؟"

میں نے کہا "بس چاچی اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ بنارس میں ٹیلی ویژن کا اسٹیشن بننے والا ہے۔ اب تو بھی جلد ہی ٹیلی ویژن دیکھے گی۔" لیکن ٹیلی ویژن دیکھنا ان کی قسمت میں نہیں تھا۔

کچھ دن بعد ان کے میاں یعنی گاؤں کے "بابا" کا انتقال

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

نشاط سعید
۱ مرھا مہاد تلا روڈ کلکتہ ۱۱

غزل

تم شانِ جنوں اپنی دکھا کیوں نہیں دیتے
دیوانہ بہاروں کو بنا کیوں نہیں دیتے

ہم موڑ بھی سکتے ہیں رخِ گردشِ دوراں
یہ بات زمانے کو بتا کیوں نہیں دیتے

جس آگ سے روشن ہے چراغِ بشریت
ہر دل میں وہی آگ لگا کیوں نہیں دیتے

کب تک یہ بچاتے ہوئے دامن کو چلو گے
گلزار سے کانٹوں کو ہٹا کیوں نہیں دیتے

ہے گوش بر آواز نشاطؔ ایک زمانہ
تم قصۂ دل اپنا سنا کیوں نہیں دیتے

نسیم اختر صدیقی
مصاحب گنج۔ لکھنؤ

رُباعیات

امید کے سورج سے جو کرنیں پھوٹیں
شاطرِ ظلمات کی نبضیں چھوٹیں
آزادیٔ فطرت نے وہ انگڑائی لی
سب عہدِ غلامی کی فصیلیں ٹوٹیں

سورج نے سفر میں ساتھ چھوڑا ہر روز
رُخ اپنا مری سمت سے موڑا ہر روز
منزل کا تعین نہ ہوا تا دمِ مرگ
دم کتنی ہی امیدوں نے توڑا ہر روز

گہرا ہے، دھندلکا ہے، سحر ہے کیا ہے
دھوکا ہے حقیقت ہے، نظر ہے کیا ہے
جلتے ہوئے خیمے نے ہوا سے پوچھا
نیزے پہ یہ خورشید ہے سر ہے کیا ہے

طوفان امنگوں نے اٹھائے کیا کیا
ایوانِ تخیل نے سجائے کیا کیا
افسانے، غزل، گیت، رباعی، نظمیں
دیپک تری یادوں نے جلائے کیا کیا

جب لیس کا کوریڈا اسٹاپ پر رکی تو بڈھے نے اپنا لنگوٹ نما جھولا پرانا اٹھایا ناک پر ٹکی ہوئی عینک کو اوپر چڑھایا اطراف کا جائزہ لیا اور کنڈکٹر سے مخاطب ہوا۔ "کنڈکٹر ـــــ!" کچھ دیر تک جواب کی امید میں اوپر دیکھتا رہا پھر سر جھکا لیا۔ ہانڈے کو جو نہ خیال میں ٹیڑھا ہو گیا تھا اوپر اٹھایا اور دھوتی پر گری ہوئی اس سفید سفید چیز کو ہاتھ سے جھٹکا چھینٹیں اڑا کر جیسے پتلون پر بھی گریں۔ بڈھے نے گھبرا کر میری پتلون کی طرف دیکھا پھر میرے چہرے کی طرف دیکھا اور خفیف لہجے میں بولا۔ "میں چھما چاہتا ہوں۔" وہ مستقل میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ شرمندگی اور خفت سے بوجھل تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے جیب سے رومال نکالتے ہوئے اپنے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ کا لبادہ چڑھا کر کہا۔ تو اس کے چہرے سے خفت اور شرمندگی کے آثار دھل گئے اور وہ مسرور سا ہو گیا۔ وہ برابر میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"اس میں کھیر ہے۔" بڈھے نے ہانڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"اچھا۔" میں نے سلسلے کو یہیں ختم کر دینے کے لیے بہت نارمل آواز میں کہا۔

"میرا بیٹا کھیر بہت پسند کرتا ہے۔" وہ اب بھی میرے چہرے کو تک رہا تھا۔

"اچھا۔" میں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ تو اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

"جب وہ بہت چھوٹا تھا تو ایک بار اس نے کھیر کے لیے بہت ضد کی تھی۔" بڈھا بولنے پر تلا ہوا تھا جیسے اس کے اندر سوالات رہے ہوں جن کا جواب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر دے رہا تھا۔

"۔۔۔ ہائی اسکول ہوں ـــــ میں نے اُسے ـــــ بہت پیٹا تھا

بڈھے نے نظریں ہانڈے پر گڑا دیں اور تصور کی گہرائیوں میں اتر گیا۔

"کیا نام ہے تمھارے بیٹے کا۔" دھیرے دھیرے میرے اندر تجسس جاگ رہا تھا۔

"للّو ـــــ" وہ چونک کر جلدی سے بولا۔ سر اٹھایا عینک درست کی اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے کچھ اس طرح میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں نے اس کے بیٹے کا نام پوچھ کر اس پر کوئی احسان کر دیا ہو۔

"کیا کرتا ہے تمھارا بیٹا۔" غیر ارادی طور پر میں پوچھ بیٹھا۔

"اسپتال میں بھرتی ہے صاحب۔" اس نے اس طرح کہا جیسے اس کا بیٹا فوج میں بھرتی ہو۔

"اسے ٹیکنس (ٹیٹنس) ہو گئی ہے صاحب۔"

"اچھا ـــــ کیسے؟" میں نے تعجب بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنی ہمدردی کا احساس دلانا چاہا۔

"صاحب وہ بڑھئی گیری کرتا ہے گاؤں کے پردھان صاحب کے گھر اسٹول بنا رہا تھا، کیل لگ گئی۔ بس تین روز میں حالت بگڑ گئی، گاؤں کے ڈاکٹر نے تو جواب دے دیا تھا، پردھان صاحب نے بلرام پور اسپتال میں بھرتی کروا دیا تھا، دو دن تک بیہوش رہنے کے بعد کل شام کو ہوش آیا ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے بولتے ہوئے تھک گیا ہو اور سستانے لگا ہو۔

"ڈاکٹر کہتے ہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے کچھ اس طرح میرے چہرے کی طرف دیکھا جیسے مجھ سے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ کیا ڈاکٹر صحیح کہتے ہیں۔

"ہوش میں آ گیا ہے تو ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے تسلی دی۔ اس نے ممنون نظروں سے میری طرف دیکھا پھر کچھ توقف کے بعد بولا ـــــ "میرا بیٹا کھیر بہت پسند کرتا ہے۔" اس نے یہ جملہ اس طرح کہا جیسے پہلی بار کہہ رہا ہو۔ شاید موضوع بدلنے کے لیے اس نے یہ جملہ دہرایا تھا۔

"اچھا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کل جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے کھیر کھانے کی

نکال کر اس کو چکھا اور بولی "بہت میٹھے ہاتھ سے چائے کی ٹرے
تھامی۔ برتن میرے برآمدے کی میز پر رکھ دینا۔ میں اٹھاؤں گی۔"
رمیش اگر شام کو دفتر سے جلدی آجاتا تو اوشا اس کو ایک پیالی
چائے اور کچھ پھل اس وقت بھی بھیج دیتی۔ اس کے علاوہ کھانے
کی دوسری چیزیں بھی اوشا قریب قریب ہر روز رمیش کو پکا کر
دیتی رہتی تھی۔ "رمو یہ دیکھو میں نے کیا پکایا ہے؟" "شام سے
[illegible] تو یہ میں چاب لکھو۔
[illegible] کچھ پھل گیا ہے کھا کے دیکھو۔ سویرے تک تم زندہ بچ گئے
تو کل پھر پکا دوں گی۔" وہ ہنس کر کہتی۔ ان عنایتوں سے مجبور ہو کر
جب رمیش اکثر اوشا کو منع کرتا تو وہ مصنوعی غصے سے کہتی۔
"بہت دنوں سے تمھارے کان نہیں نوچے ہیں۔ ادھر اب
کچھ چھوٹے بڑے دکھائی پڑتے ہیں۔ کہو تو انھیں برابر کر دوں۔"
اور رمیش کو مسکرا کر خاموش ہو جانا پڑتا۔ چائے، ناشتہ
کھانے، اور پھلوں کے علاوہ اوشا کو یوں بھی اسے تحفے دینے
کا شوق تھا۔ کبھی بش شرٹ، یا پتلون کا کپڑا لے آتی۔ کبھی
بنیائن یا رومال یا ٹائی وغیرہ کے ڈبے خرید کر دیتی۔

ایک دن اوشا نے چائے، ٹوسٹ اور انڈے کی کشتی رمیش
کو دیتے ہوئے اسے ایک بہت پرانا اور گھسا پٹا گرم کوٹ پہنے دیکھ
لیا۔ فوراً ضد کی کہ وہ اسے دیدے وہ خود رفو کر دے گی۔ مجبوراً
رمیش نے کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ تیسرے دن رمیش نے
اس کوٹ کو نیچے سڑک پر درزی کی دوکان میں دیکھا۔ ایک ہفتے
کے بعد جب اوشا نے اسے یہ کہہ کر وہ کوٹ دیا کہ "رمو دیکھو یہ
تمھارا کوٹ کیسا ٹھیک ہو گیا ہے" تو رمیش کو واقعی تعجب ہوا۔
نہ صرف رفو، بہت اچھا کیا گیا تھا بلکہ کپڑے کو پلٹ دیئے جانے
سے کوٹ قریب قریب نیا لگنے لگا تھا۔ اس نے شکریہ ادا کرتے
ہوئے کہا "بھابی تمھارے ہاتھ میں کیسے کیسے کمال چھپے ہیں۔ لیکن اپنے
رمو کو رمیش کب بناؤ گی؟ اسے کب تک ویسا ہی بچہ سمجھتی رہو
گی۔ جسے تم میز کے نیچے چھپا کر اس سے بلی کی بولی بلوایا کرتی تھیں۔"
اوشا بے اختیار ہنسنے لگی اور پھر بولی "مسٹر رمیش چندر سریواستو
دیں۔ اسے آپ میرے لیے اس وقت تک رمو ہی رہیں گے
جب تک آپ بلی کی بولی بولتے رہیں گے اور جس دن آپ مسٹر
جیسی حرکتیں کرنے لگیں گے میں آپ سے فوراً ڈر کر آپ کا
رعب ماننے لگوں گی۔"

رمیش بھی اوشا کے لیے کئی تحفے لایا تھا۔ جنھیں اس نے
مسکرا کر قبول کر لیا تھا۔ البتہ ایک دفعہ جب وہ اس کے لیے
کروٹن کے بہت ہی خوشنما پودوں کے چار گملے لایا تو وہ بہت
خوش ہوئی اور اس نے انھیں اپنے برآمدے میں مناسب جگہ
پر رکھ دیا۔ لیکن رمیش کو اپنی یہ کوششیں اوشا کی مسلسل داد و دہش
کے مقابلے میں ایسی ہی مضحکہ خیز معلوم ہوئیں جیسے سورج کو چراغ
دکھانا۔ جس طرح زیادہ پانی دینے سے اکثر پودے مرجھانے
لگتے ہیں اسی طرح اوشا کی مہربانیوں سے وہ اپنی شخصیت کو روز
بروز کم تر ہوتے محسوس کرتا اور اکثر اسے خود اپنے آپ پر
غصہ آتا کہ وہ آخر اوشا کی سخاوتیں برداشت ہی کیوں کرتا
ہے اور ان کو روکنے کی کوئی مثبت کوشش کیوں نہیں کرتا!
ماں کے خط کے متعلق رمیش کا ذہنی ہیجان کچھ کم ہوا تو اسے
یہی طریقہ سب سے معقول دکھائی پڑا کہ وہ اوشا سے ہرگز کچھ
روپیہ نہ مانگے۔ بلکہ ماں کو صاف صاف اپنی مالی حالت سے مطلع کر
دے اور سمجھا دے کہ دو مہینوں کے بعد سے وہ ہر مہینہ پابندی
کے ساتھ اسے پچاس روپیہ بھیجتا رہے گا۔ ماں نا سمجھ نہیں ہے۔ وہ
فوراً مان جائے گی اور خفتہ ٹوک دے گی۔

رمیش دفتر سے اپنے کمرے پر پہنچا تو اس کی آہٹ پا کر اوشا
نے برآمدے سے پکار کر کہا "رمو آج میں کافی بنا رہی ہوں۔
ابھی تیار ہوئی جاتی ہے۔ تب تک یہ سموسے کھا کر بتاؤ کہ ان میں
کتنا زہر ہے۔ کیونکہ میری ملازمہ دو روز کی رخصت پر جاتے
وقت انھیں بنا گئی ہے۔"

رمیش نے برآمدے پر جا کر اوشا کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے
ہوئے کہا "لیکن مجھ پر تجربہ صحیح نہیں ہوگا۔ کیونکہ آپ کا ہاتھ لگ
جانے سے میرے لیے ان کا زہر بھی امرت ہو جائے گا۔"

[illegible] کے عہد [illegible] کلاسیکی [illegible] کہے جاتے تھے بیشتر آباد [illegible] [illegible] سے اس فن میں ایک [illegible] [illegible] الدولہ کے عہد میں زیادہ چمکی۔ انہیں کے عہد میں [illegible]۔ [illegible]۔ کریم بخش۔ رادھا اور ستھو جیسے مشہور و معروف فن کار بھی موجود تھے۔ ان فنکاروں کے علاوہ پنڈت لکشمی نارائن بھی تھے جو کتھک رقص کے بانی کہے جاتے ہیں۔ انہی کے اخلاف میں پرم گرو پرکاش جی مہاراج تھے جن کا ذکر تاریخی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔

[illegible] نے پہلے آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوئے اور کتھک کے [illegible] کی ابتدا انہی سے ہوئی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ موصوف تلوار کی دھار پر بھی رقص کرتے تھے۔ کتھک میں جو کہ ایک سیدھی سادی داستان کو رقص کے پیکر میں بیان کرنے کا نام تھا۔ انھوں نے تنوع اور ندرت پیدا کر کے اسے ترقی یافتہ شکل عطا کی اور اس کا نام کتھک کے بجائے "کتھک نرت و رنگا ترتیہ" رکھا، جیسا کہ اس کی اصطلاح سے واضح ہے یہ کرشن لیلا سے نسبت خاص رکھتا ہے۔ یعنی وہ ناچ ہے جس کے وسیلے سے سری کرشن جی اور ان کی گوپیاں راس لیلا کرتی تھیں۔ سرزمین اودھ کو کتھک سے ہمیشہ دل چسپی رہی۔ چنانچہ ایودھیا کے مندروں میں رام لیلا اور جھولا وغیرہ کے موقعوں پر یہ رقص استوتی [illegible] کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ کتھک میں استوتی سے مراد وہ متبرک بول ہوتے ہیں جن کے مفہوم اور کیفیت کو رقص کے ذریعہ ادا کیا جائے۔

آصف الدولہ کی طرح نواب سعادت علی خاں بھی سرود و نغمہ کے بڑے شوقین تھے۔ ان کے عہد میں بھی پرکاش جی حیات تھے اور ان سے دربار سے وابستہ تھے۔ وہ تلوار پر رقص کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ [illegible] [illegible] پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں [illegible] اور ترقی کی۔ ان کے عہد میں ایک نامی گرامی موسیقار [illegible] شہرت پائی۔ ان کے علاوہ رجب علی اور فضل علی [illegible] قوالی اور [illegible] نامی طوائف شاہی ملازمین میں [illegible] [illegible] قوالوں نے بھی بڑا نام [illegible] [illegible] کا زمانہ بھی اس فن کے ماہرین سے خالی

نہیں۔ خود جہاں پناہ اس قدر شوقین تھے کہ ہر شب [illegible] تماشے منعقد کرتے ان میں نغمہ و سرود کو اولیت دی [illegible]۔ [illegible] محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے [illegible] کی وجہ سے فن رقص اور موسیقی کو دربار میں بار نہیں ملا۔ لیکن دربار کے علاوہ پورے معاشرہ میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اپنے والد بزرگوار کی حیات میں ولی عہد بہادر مرزا محمد واجد علی ان فنون کی سرپرستی فرماتے رہے

واجد علی شاہ کے دربار سے بھی بڑے بڑے باکمال رقاص اور موسیقار وابستہ رہے۔ بادشاہ نے علم موسیقی بڑی ریاضت اور شوق سے سیکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس فن میں استاد کا درجہ حاصل کر لیا۔ واجد علی شاہ نے بہت سی ٹھمریاں اور [illegible] بھی تصنیف کیے تھے۔ واجد علی شاہ کی خصوصی توجہ کی بنا پر لکھنؤ میں موسیقی کے فن نے بڑی ترقی کی۔

بقول مولانا عبدالحلیم شرر "بادشاہ کو دو چیزوں سے عشق تھا ــــ شاعری اور موسیقی"۔ ویسے تو ان کے عہد میں مرثیہ۔ مثنوی۔ واسوخت ڈراما، رہس وغیرہ کو بہت فروغ حاصل ہوا، لیکن بادشاہ کے ذاتی شغف کی وجہ سے موسیقی میں تغزل کا عنصر بہت نمایاں ہو گیا اور ایسی چیزیں سامنے آئیں جن میں ہجر اور جدائی کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اس سلسلے میں پروفیسر کوکب رقم طراز ہیں:۔

"کھماچ، بھیرویں، سیندورا، تلک کامود اور پیلو وغیرہ چھوٹی چھوٹی راگنیاں اہلِ مذاق کے تفنن کے لیے منتخب کی گئیں اور یہی چیزیں [illegible] بادشاہ کو مرغوب تھیں۔ یہ راگنیاں لکھنؤ کی قدرداں سوسائٹی کے مذاق میں یہاں تک سرایت کر گئیں کہ آج سارے ہندوستان میں لکھنؤ کے سفیدے خربوزوں کی طرح لکھنؤ کی بھیرویں بھی مشہور ہو گئی اور سچ یہ ہے کہ بھیرویں لکھنؤ ہی کا حصہ ہے۔ ایسی بھیرویں ہندوستان کے کسی حصے میں نہیں گائی جاتی۔ سوز خوانوں نے بھی ان ہی عام پسند و عام فہم راگنیوں کو زیادہ رواج دیا جو مذہب کی سفارش سے گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک کے گلے میں اتر گئیں۔ یہاں تک کہ نوحہ خوانی کو سُن کر بڑے بڑے باکمال